تاریخ ہند

[ہائی اسکول کے طلباء کے واسطے]

مصنفہ

پروفیسر شیخ عبدالرشید ایم۔ اے ایل ایل بی
چیرمین ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ناشر

ایجوکیشنل بک ہاؤس؟

قیمت ۳ روپیہ ۵۰ نئے پیسے

PRICE. Rs.3/50

باہتمام شری بھگوت سروپ
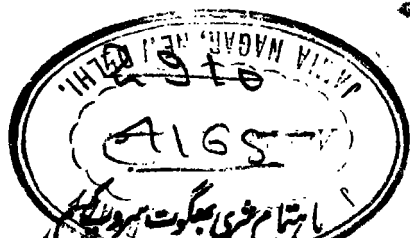
وشوودیالیہ پریس الہ آباد

طبع شد

تاریخ ہند

فہرست مضامین

باب ۱

قدیم تاریخ ہند کے ماخذ

جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے عہد قدیم کی تاریخ لکھنے اور پڑھنے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اُس زمانہ کی کوئی تاریخ موجود نہیں اور ہم مجبور ہیں کہ دوسرے ذرایع سے اُس زمانہ کے واقعات اور حالات معلوم کریں۔ اگرچہ ہر زمانہ کے حالات کے لئے تاریخی کتابوں کے علاوہ پرانے سکّے، عمارتیں اور کتبے وغیرہ نہایت ضروری اور مفید ثابت ہوتے ہیں، لیکن ہمارے ملک کے عہد قدیم کے حالات معلوم کرنے کا ذریعہ صرف یہی چیزیں ہیں۔

کتبے اور سکّے تاریخ کے ماخذوں میں سب سے پہلی جگہ کتبات کو دی گئی ہے اور درحقیقت معلومات کا ان سے بہتر اور زیادہ معتبر ذریعہ اور کوئی نہیں۔ بدقسمتی سے تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے کے کتبات بہت کم دستیاب ہوئے ہیں، لیکن اس کے بعد کے زمانہ کے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ یہ کتبے پتھر یا کسی قسم کی دھات پر کندہ ہیں بعض پر سرکاری تحریریں ہیں اور بعض کسی عمارت کی تعمیر یا بُت کے نصب کئے جانے کے متعلق ہیں۔ اس سلسلہ میں اشوک کے اُن فرامین اور پند و نصائح کا ذکر ضروری ہے جو چٹانوں اور پتھر کے میناروں پر کھدوائے گئے ہیں اور جن سے اس کی سلطنت کی وسعت

حکومت کے اُصول، مذہبی عقائد اور کارناموں کا پتہ چلتا ہے۔ علم تاریخ کے مطالعہ میں کتبات کی اہمیت پر جسقدر بھی زور دیا جائے کم ہے اسواسطے کہ بعض اوقات جو معلومات اُن سے حاصل ہوتی ہے وہ ہمعصر تاریخی کتابوں کی معلومات سے بھی زیادہ دقیق اور معتبر ہوتی ہے۔

سکّے بھی درحقیقت ایک طرح سے دھات پر کندہ کئے ہوئے کتبے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے اکثر واقعات کی تاریخیں اور سن تصدیق کئے جاتے ہیں۔ خاص طور سے باختری اور پارتھی خاندانوں کی تاریخ سکوں ہی کی مدد سے مرتب کی گئی ہے۔

پُرانی عمارتیں

سکوں اور کتبوں کی طرح پُرانی عمارتیں اور اُن کے کھنڈر بھی تاریخ کے طالب علم کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں۔ اُس زمانہ کے تمدن اور طرز معاشرت کو سمجھنے کے لئے ہم ان عمارتوں اور کھنڈروں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں اور بہت سے مفید نتائج پر پہنچتے ہیں۔ مثلاً موہن جوڈارو۔ ہڑپا، نالندا اور تکشلا کے کھنڈروں سے جو حال ہی میں کھود کر برآمد کئے گئے ہیں عہد قدیم کی تاریخ تیار کرنے میں بے انتہا مدد ملی ہے۔ بعض مؤرخوں کی رائے ہے کہ کبھی کبھی جو معلومات ہم کو ان عمارتوں اور کھنڈروں سے حاصل ہوتی ہیں وہ کتابوں کے ذریعہ ہرگز نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ تقریباً دنیا کے ہر مہذب ملک میں گورنمنٹ کی طرف سے پُرانی عمارتوں کی حفاظت اور مرمت کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم ہے۔ ہندوستان میں بھی اسی محکمہ کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے اجداد کی تہذیب اور تمدن کی ہزارہا یادگاریں ملک کے ہر حصہ میں موجود ہیں۔

تاریخ کے علاوہ دوسری کتابیں

تیسری صدی قبل مسیح سے پہلے کے تاریخی واقعات ہم اکثر اُن کتابوں سے جمع کرتے ہیں جو تاریخ کے علاوہ دوسرے فنون پر لکھی گئی ہیں مثلاً مذہبی کتابوں میں اکثر تاریخی واقعات مل جاتے ہیں۔ آگے چلکر تم پڑھوگے کہ عہد قدیم کی تاریخ کے لئے ہندوؤں کی مذہبی کتابیں یعنی وید پُران اور نیم مذہبی رزمیہ مثنویاں یعنی مہا بھارت اور رامائن کسقدر اہم اور مفید ماخذ ہیں۔ بعض اوقات معمولی نظمیں اور ڈرامے اور گاہ بگاہ قواعد اور قانون کی کتابیں بھی بہت کچھ معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہرش چرت شکنتلا اور منو کا کوڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مندرجہ بالا ماخذوں کی حیثیت ہمارے نزدیک اسوجہ سے اور بھی بڑھ گئی کہ اُس زمانہ کی لکھی ہوئی تاریخیں موجود نہیں اور صرف انہیں کے ذریعہ سے ہم عہد قدیم کی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ اگرچہ اس ملک میں آباد ہونے کے بعد آریوں نے اپنی تہذیب اور تمدن کو بہت بڑھالیا تھا اور علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں اُنھوں نے ایک نمایاں ترقی کی تھی لیکن فن تاریخ سے اُن کو زیادہ دلچسپی نہ تھی اور اُنھوں نے اس فن پر کتابیں لکھنے کی کوشش نہیں کی۔ سنسکرت میں ایک بھی تاریخی کتاب پُرانے زمانے کی لکھی ہوئی نہیں ملتی۔ کشمیر کے حالات میں بیشک ایک سنسکرت کتاب راج ترنگنی موجود ہے۔ لیکن یہ بارھویں صدی کی تصنیف ہے اور کشمیر کے علاوہ باقی ہندوستان کے حالات اس میں بہت کم ہیں۔

سیاحوں کے سفرنامے

ان کے علاوہ ہم اُن بدیسیوں کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں اور تذکروں میں

ہندوستان کے حالات لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض تو بغرض سیر و سیاحت یا بہ سلسلۂ سفارت ہندوستان میں خود آئے اور چشم دید واقعات اپنے سفرناموں میں لکھے اور بعض نے دوسروں کے بیانات کو اپنا ذریعہ معلومات بنایا ہے۔ سب سے پہلا شخص جس کی کتاب میں ہندوستان کے حالات ملتے ہیں ہیرودوتس یونانی ہے لیکن اس کے اقوال زیادہ قابل اعتبار نہیں اسلئے کہ سکندر اعظم کے حملہ سے پہلے بیرونی دنیا کو ہند کی حالت سے بہت کم واقفیت تھی۔ اس حملہ کے بعد یورپ والوں کو یہاں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے کا کافی موقع ملا اور اس زمانہ کے یونانی اور رومی مصنفوں کی کتابوں میں ہندوستان کے حالات ملتے ہیں۔ اس سلسلہ میں میگاستھینز کی ہستی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے چونکہ وہ یہاں بحیثیت سفیر کے آیا تھا اور اس کو صحیح حالات معلوم کرنے کا بہت اچھا موقع تھا لیکن افسوس کہ اس کی کتاب کا زیادہ حصہ اب ناپید ہو بہر حال جو کچھ بھی مل سکا ہے وہ اس عہد کی تاریخ کے لئے نہایت اہم اور مفید ثابت ہوا ہے۔

یونانیوں کے بعد ہم کو چینی مورخوں اور سیاحوں سے مدد ملتی ہے۔ دوسری صدی قبل مسیح سے چینی تاریخوں میں ہند کا ذکر شروع ہوتا ہے لیکن ان تاریخی کتابوں سے کہیں زیادہ بیش قیمت وہ سفرنامے ہیں، جن میں چینی سیاحوں نے اس مقدس سرزمین کے حالات لکھے ہیں۔ اُن کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن یہاں صرف اُن دو کا ذکر کرنا کافی ہو جو سب میں زیادہ مشہور اور اہم خیال کئے جاتے ہیں۔ پانچویں صدی میں فاہیان ہندوستان آیا۔ اس کا مقصد اوّلین بدھ مذہب

کی تعلیم حاصل کرنا تھا لیکن اُس نے اپنے سفر کے حالات قلمبند کر کے آئندہ نسلوں پر بڑا احسان کیا۔ فاہیان سے زیادہ مشہور اُس کا نامور ہموطن ہیون سانگ ہے جو ساتویں صدی میں بدھ مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کی غرض سے یہاں آیا اُس نے ہندوستان کے مختلف حصّوں میں سفر کیا اور بہت سے چشم دید واقعات اپنے سفرنامے میں تحریر کئے۔ یہ سفرنامہ اُس زمانہ کے لئے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے لیکن ان سب سے زیادہ نامور اور قابل قدر ہستی مسلمان مؤرخ ابوریحان البیرونی کی ہے جس نے ۱۳ سال کی محنت کے بعد ہندوؤں کی زبان، اُن کے مذہب اور فلسفہ میں کمال حاصل کیا اور تب ہندوستان پر ایک مفصّل اور معتبر کتاب لکھی۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آج بھی اُس عہد کے حالات کے لئے وہ سب سے مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔

اب تم آسانی سے یہ بات سمجھ سکتے ہو کہ عہد قدیم کی تاریخ مرتب کرنے کے لئے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مورخین اور محققین کی کوششوں کے باوجود اُس زمانہ کے تاریخی واقعات میں ترتیب اور تواتر نہیں۔ بہت سے واقعات کی تاریخیں نہیں ملتیں اور اکثر تاریخیں ایسی ہیں جن پر مورخوں میں اختلاف رائے ہے۔ بہرحال یہ کوشش برابر جاری ہے کہ صحیح واقعات اور تاریخیں جس طرح سے اور جس ذریعہ سے بھی معلوم ہو سکیں، معلوم کی جائیں اور یہ کوششیں بہت کچھ کامیاب ثابت ہو رہی ہیں۔

باب ۲

ہمارا ملک

تاریخ اور جغرافیہ کا تعلق

انسان کی زندگی پر اُن طبعی حالات کا اثر ضرور پڑتا ہے جن میں وہ زندگی بسر کرتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم اکثر یہ کہتے ہیں کہ تاریخ اور جغرافیہ میں گہرا تعلق ہے۔ جو لوگ ریگستان اور صحراؤں میں رہتے ہیں وہ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اپنے مویشیوں اور جانوروں کو لے کر چارے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔ تم آگے پڑھو گے کہ اسی سلسلہ میں بہت سی قومیں ہندوستان آگئیں اور یہاں آباد ہو کر اُنھوں نے اپنی زندگی کا طرز بھی بدل دیا۔ دریاؤں کے کنارے پر رہنے والے زراعت پیشہ ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے لوگ اکثر اسی طرح اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ باہر سے آنے والی قومیں بھی یہاں آکر زراعت پیشہ ہو گئیں۔ جزیروں اور ساحلوں کے باشندے عام طور پر تجارت کرتے ہیں اور فن جہاز رانی میں آسانی سے کمال حاصل کر لیتے ہیں۔ پہاڑ، دریا، میدان، ساحل کا اثر آب و ہوا پر پڑتا ہے اور ہر قوم کے اطوار و عادات اور خوراک و لباس آب و ہوا پر ہی منحصر ہیں۔ سرد ملک کے رہنے والے جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں۔ گرم ملک میں لوگ نہ زیادہ محنت کر سکتے ہیں اور نہ مضبوط ہوتے ہیں۔ ہندوستان اسقدر

وسیع ملک ہے کہ اس کو اکثر ایک علیحدہ برّاعظم کہا جاتا ہے اور اس کے مختلف حصوں میں مختلف قسم کی آب و ہوا پائی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہر صوبہ کی معاشرت زبان اور لباس جُداجُدا ہیں۔ بہرحال کسی ملک کی تاریخ سمجھنے کے لیے اس کی جغرافیائی حالات سے کچھ واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

ہندوستان اور اُس کی قدرتی تقسیم

ایشیا کے جنوب میں تین جزیرے سے نما ہیں۔ ان میں سے ایک ہندوستان ہے۔ ہندوستان کو ایشیا سے ایک بڑا کوہستانی سلسلہ علیحدہ کرتا ہے جسے ہم ہمالیہ کہتے ہیں۔ ہمالیہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ ہے اور ایک مسلسل دیوار کی طرح ہندوستان کی شمالی سرحد کو گھیرے ہوئے ہے۔ اُس کی شکل ہلال کی سی ہے جس کے دونوں کنارے شمال کی جانب اُٹھے ہوئے ہیں، ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی ایورسٹ ہے اور اُس کی دوسری جانب تبت کا پلیٹو ہے۔ مغربی سمت میں اس کی کئی شاخیں ہوگئی ہیں جو ہندوستان کو ایران، سیستان اور میکران سے جدا کرتی ہیں۔ اسی طرح سے مشرق کی طرف بھی چند شاخیں ہیں جو بنگال اور آسام کو برما سے علیحدہ کرتی ہیں۔ بلندی کی وجہ سے یہ پہاڑ آسانی سے پار نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن مشرق اور مغرب کی جانب بہت سے درّے ہیں جن کے ذریعہ سے ہمیشہ آمد و رفت رہی ہے۔ انہیں درّوں سے تاجر اپنا مال و اسباب لاتے اور لے جاتے رہے ہیں اور انہیں درّوں سے بہت سی فوجیں اور حملہ آور اس ملک میں داخل ہوئے ہیں۔ مشرقی جانب جنگل بہت گھنے ہیں اور آب و ہوا بھی

اچھی نہیں اس لئے اُس طرف سے بہت کم لوگ آئے ہیں۔ لیکن مغرب کی طرف کئی درّے ہیں جن میں سے درّہ بولان، خیبر اور گومل بہت مشہور ہیں اور اکثر بیرونی حملہ آور انہیں سے آئے ہیں۔

اس ملک کی تاریخ سے ان پہاڑوں اور درّوں کا نہایت گہرا تعلق رہا ہے۔ پہاڑوں نے ایک حد تک تاجروں اور حملہ آوروں کو یہاں آنے سے روکا لیکن درّوں کے ذریعہ یہ لوگ برابر آتے رہے اور سولھویں صدی تک ہندوستان کے تمام نامور فاتح انہیں سے گذر کر اس ملک میں داخل ہوئے۔ یورپ کی قومیں سمندر کے راستوں سے آئیں لیکن آج بھی ہندوستان کو شمال و مغرب کی طرف سے خطرہ ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کے اسی حصّہ میں سب سے زیادہ چھاؤنیاں اور فوجی انتظامات کی ضرورت ہے اس ملک کے لئے یہ پہاڑ بڑی نعمت ہیں۔ شمال کے سارے دریا انہیں پہاڑوں سے پانی لاکر ملک کو زرخیز کرتے ہیں اور اسی وجہ سے باہر کے لوگ اکثر اس کو ہندوستان زرفشاں کہتے ہیں۔

سندھ و گنگا کا میدان

ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور رقبہ میں براعظم یورپ کے نصف سے بھی زیادہ ہے۔ اسکی لمبائی ڈھائی ہزار میل اور چوڑائی دو ہزار میل کے قریب ہے۔ ہمالیہ کے جنوب میں ایک بڑا میدان ہے جس میں تین بڑے دریا سندھ، گنگا اور برہمپتر اور اُن کے بہت سے معاون بہتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں اسی میدان کو آریہ ورت کہتے تھے۔ اس کے جنوب میں ونتھیاچل واراولی پہاڑ ہیں جو اُس کو دکن سے جُدا کرتے ہیں۔

یہ میدان بہت وسیع اور ملک کا سب سے زرخیز خطّہ ہے۔ دریاؤں کی

وجہ سے آب پاشی میں بہت سہولت ہے۔ اپنی وسعت زرخیزی اور راستوں کی آسانی کے سبب سے یہی حصہ ہمیشہ حکومتوں کا مرکز رہا ہے اور ہندوستان کی تاریخ میں تمام بڑی بڑی سلطنتیں اسی میدان میں قائم ہوئیں، پھلیں اور تباہ ہوگئیں۔ آب و ہوا کا اثر رہنے والوں پر اچھا نہیں پڑتا۔ زمین زرخیز ہے اور پانی کثرت سے۔ چنانچہ زراعت میں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں تھوڑی سی توجہ سے پیداوار خوب ہوسکتی ہے۔ ان باتوں کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے باشندے آرام طلب اور کاہل ہو جاتے ہیں۔ یہ تن آسانی اور فرصت اُن کے دلوں میں ایک طرف تو جنگ وجدال سے تنفر اور دوسری طرف مذہب و فلسفہ سے دلچسپی پیدا کر دیتی ہے۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ یہ حصہ ہمیشہ دولتمند رہا ہے اور یہاں کے لوگ اپنی دولت اور کمزوری کی وجہ سے باہر کی حملہ آور قوموں کے شکار بنتے رہے جو اُن سے زیادہ غریب، مگر کہیں زیادہ مضبوط ہوتی تھیں۔

دکن دکن اور شمالی ہند کے درمیان پہاڑ، دریا اور بہت سے دشوار گذار جنگل ہیں جن کی وجہ سے شمالی ہند کی فوجیں بہت کم دکن میں کامیاب ہوسکتی تھیں اور ایک حد تک دکن شمال کے حملوں سے اور وہاں کے تمدن اور تہذیب کے اثرات سے محفوظ رہا۔ دکن میں شمالی ہند کی طرح وسیع اور زرخیز میدان نہیں بلکہ زیادہ تر پہاڑی علاقہ ہے اسی لئے یہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں آسانی سے قائم ہوگئیں اور عرصہ تک آزاد رہیں۔ قدیم زمانہ میں راستے کم بھی تھے اور دشوار بھی، چنانچہ شمالی ہند کی حکومتیں اگر دکن کا کچھ حصہ فتح کرنے میں کامیاب بھی

ہوتیں تو اُن کا قبضہ زیادہ عرصہ تک نہ رہتا تھا۔ تم آگے چل کر پڑھوگے کہ
ایک سے زیادہ حکومتوں نے کوشش کی اور دکن فتح کرنے میں کامیاب
بھی ہوئیں لیکن اُس کا نتیجہ یہی نہیں ہوا کہ دکن کا مفتوحہ علاقہ جلد ہی اُنکے
ہاتھ سے نکل گیا بلکہ اُس پر قبضہ قائم رکھنے کی کوشش میں اُن کو شمالی
ہند میں بھی بے انتہا دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

ساحل ہندوستان کا ساحل ٹوٹا پھوٹا نہیں اور نہ اس کے ساحل کے
قریب جزیرے کثرت سے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کی
قوموں سے پہلے کسی باہر کی قوم نے اس ملک پر سمندر کی جانب سے
حملہ نہیں کیا اور اسی کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اس ملک کے رہنے والوں کو
جہازرانی سے زیادہ دلچسپی نہیں رہی اور اس فن میں انھوں نے کبھی خاص
کمال حاصل نہیں کیا، ہندوستان کی تاریخ میں بحری طاقت کے کارناموں
کا ذکر کہیں نہیں۔ نہ یہاں کے لوگوں نے غیر آباد یا کم آباد جزیروں پر جاکر
اپنی نئی بستیاں بسائیں۔ برخلاف اس کے یہاں کے جاہل لوگ
سمندر کے سفر کو بہت بُرا سمجھتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ بحری سفر
کرنے والے کا مذہب خراب ہو جاتا ہے۔ دونوں ساحلوں کے قریب
پہاڑی سلسلے ہیں جو مشرقی اور مغربی گھاٹ کے نام سے مشہور ہیں۔ ان
ساحلوں پر چھوٹے چھوٹے بندرگاہ ضرور ہیں لیکن ان میں سے اکثر ایسے
ہیں جو بڑے بڑے جہازوں کے لئے تقریباً بیکار ہیں۔ ان حالات سے
صاف ظاہر ہے کہ ہندوستان کے رہنے والے جہازرانی میں کوئی نمایاں
ترقی نہیں کر سکتے تھے اور اب بھی اس فن میں ہم دوسری قوموں کے
مقابلہ میں بہت پیچھے ہیں۔

باب ۳

قدیم ہند کے باشندے

پتھر کا زمانہ

اب سے ہزاروں برس پہلے جو لوگ اس ملک میں رہتے تھے وہ ہم لوگوں سے مختلف زندگی بسر کرتے تھے۔ زمانہ گزرنے کے ساتھ زمین کی بناوٹ اور دریاؤں کے راستے تبدیل ہو گئے ہیں۔ یہ تبدیلی صرف طبعی حالات تک محدود نہیں بلکہ خود انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہی انسان جو پہلے زمانہ میں جانوروں سے ڈرتا تھا اور محفوظ مکانوں اور شہر پناہوں سے گھری ہوئی آبادیوں میں رہتا تھا آج جانوروں کی دنیا کا مالک ہے اور ہوادار اور کھلے ہوئے مکان پسند کرتا ہے۔ یہ زبردست تبدیلیاں ایک دم نہیں ہوئیں بلکہ رفتہ رفتہ حالات بدلتے گئے اور یہ سلسلہ ابھی جاری ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ تہذیب اور تمدن کی کن کن منزلوں کو طے کر کے ہم اس درجہ تک پہنچے ہیں۔ ابتدا میں لوگ غاروں میں رہتے تھے۔ مکانات بنانا نہیں جانتے تھے۔ زراعت سے ناواقف تھے۔ جانوروں کے گوشت اور پھلوں پر گذارہ کرتے تھے۔ ان کو دھاتیں معلوم نہیں تھیں اور اپنے اوزار شلاً چھریاں۔ کلہاڑیاں لعد بھالے وغیرہ سب پتھر کے بناتے تھے۔ جسم کو درختوں کے پتوں اور جانوروں کی کھالوں سے ڈھانکتے تھے۔ مُردوں کو اسی طرح سے چھوڑ دیتے تھے، نہ جلاتے تھے اور

نہ دفن کرتے تھے۔ اس زمانہ میں خوراک حاصل کرنے کا عام طریقہ شکار تھا تاریخ میں اس زمانہ کو پتھر کا زمانہ کہتے ہیں تحقیق کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ لوگ جو اس زمانہ میں ہندوستان میں آباد تھے کس نسل سے تھے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ انڈمن کے باشندوں کی طرح حبشی تھے۔ اُن کا رنگ سیاہ۔ سر چھوٹا۔ بال بڑے۔ قد چھوٹا اور ناک چپٹی ہوتی تھی۔

نیا پتھر کا زمانہ۔ لوہے اور تانبے کا زمانہ

رفتہ رفتہ ان لوگوں نے ترقی کی۔ ضروریات نے نئی نئی ایجادیں کرائیں۔ سب سے زیادہ مفید ایجاد یہ تھی کہ وہ کاشت کرکے اناج اور پھل پیدا کرنے لگے۔ اب نسبتاً زندگی آرام سے بسر ہوتی تھی اور دنیا کی بہت سی باتوں پر سوچنے اور غور کرنے کا بھی کافی وقت ملتا تھا۔ جانوروں کو پالتے اور اُن سے طرح طرح کی خدمتیں لیتے تھے۔ برتن بنائے اور کھانا پکانے لگے۔ اوزار ابھی پتھر ہی کے بناتے تھے لیکن پہلے کے مقابلہ میں بہت صاف اور بہتر ہوتے تھے۔ غاروں میں اس زمانہ کے نقش و نگار ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسقدر ترقی کر چکے تھے۔ لباس کے لئے درختوں کی چھال۔ چمڑا اور روئی استعمال کرتے تھے۔ سونا بھی اُنہوں نے دریافت کر لیا تھا اور اُس سے زیورات تیار کرتے تھے۔ مُردوں کو دفن کرنے لگے تھے۔ یہ زمانہ نیا پتھر کا زمانہ کہلاتا ہے۔ اس عہد میں شمالی اور جنوبی ہند میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بھی قائم ہوگئی تھیں۔ جنوبی ہند میں نئے پتھر کے زمانہ کے بعد لوہے کا زمانہ آتا ہے جس میں لوہا دریافت ہوا اور اُس کا استعمال عام ہوگیا لیکن شمالی ہند میں اس کے بعد تانبے

کا زمانہ آتا ہے۔ تانبے کے اوزار ممالک متوسط، متھرا، کانپور، جنوبی پنجاب اور سندھ میں دستیاب ہوئے ہیں۔ حال ہی میں پنجاب میں ہڑپا اور سندھ میں موہن جو ڈارو کے مقامات پر کھدائی ہوئی ہے اور قدیم تہذیب کے متعلق حیرت انگیز انکشافات ہوئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پانچ ہزار سال پیشتر یہ ایک خوبصورت اور شاندار شہر تھا۔ عمارتیں پکی ہوئی اینٹ کی ہیں۔ پتھر استعمال نہیں ہوتا تھا۔ سڑکیں باقاعدہ اور ترتیب کے ساتھ بنائی گئی تھیں۔ مکانوں میں کنوئیں ہوتے تھے اور غسل خانوں اور تہ خانوں کے آثار بھی ملتے ہیں۔ یہ لوگ جو اور گیہوں کی کاشت کرتے تھے اور جانوروں کا گوشت کھاتے تھے۔ اوزار اور برتن عام طور سے تانبے کے بنتے تھے اور نادار لوگ اس کو زیورات کے لئے بھی استعمال کرتے تھے، اون اور سوت سے کپڑا بنتے تھے۔ زیورات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کافی خوشحال تھے۔ لڑائی میں بھالے۔ کلھاڑی۔ خنجر اور تیر و کمان استعمال کرتے تھے۔ غالباً تلوار نہ تھی۔ بچوں کے مٹی کے کھلونے بھی ملتے ہیں۔ یہ لوگ جوا بھی کھیلتے تھے۔ ایسی مہریں دستیاب ہوئی ہیں جن پر نقوش اور تصاویر کندہ ہیں۔ ان کو پڑھنا اور سمجھنا ہمارے لئے تقریباً ناممکن ہے لیکن اس میں ذرا شک نہیں کہ اس وقت فن نقاشی میں کافی ترقی ہو چکی تھی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی زبان کون سی تھی۔ دیوتاؤں اور دیویوں پر ایمان رکھتے تھے لیکن درختوں اور جانوروں کو ان کے مذہب میں کافی دخل تھا۔ مُردوں کو دفن بھی کرتے تھے اور جلاتے بھی تھے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ اسقدر قدیم زمانہ میں بھی ہندوستان کے

رہنے والے کس قدر ترقی کر چکے تھے۔

دراوڑ اور اُن کی معاشرت

آریوں کی آمد سے قبل ہندوستان کے بیشتر حصہ میں دراوڑ قوم آباد تھی صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ دراوڑ لوگ کون تھے اور کہاں سے آئے تھے بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ اس ملک کے قدیم باشندے تھے بعض لکھتے ہیں کہ شمال مغرب اور شمال مشرق سے یہاں آئے تھے۔ بہرحال یہ قیاسات ہیں اور یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ لوگ برتن بنانا جانتے تھے۔ ابتدا میں پتھر کے اوزار استعمال کرتے تھے لیکن بعد میں جب لوہا دریافت ہو گیا تو اُس سے اپنے اوزار اور ہتیار تیار کرتے تھے۔ وہ چھوٹے قد اور کالے رنگ کے ہوتے تھے۔ اُن کی آنکھیں سیاہ اور ناک چوڑی تھی۔ چھوٹے چھوٹے سرداروں کے زیر حکومت تھے۔ اگرچہ اُن کا اعتقاد تھا کہ نظام عالم ایک زبردست طاقت کے تحت میں ہے یعنی قادر مطلق پر اُن کا ایمان تھا لیکن پھر بھی وہ بھوتوں کی پوجا کرتے تھے اور قربانیاں کر کے اُن کو خوش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ سال کا حساب چاند سے لگاتے تھے۔ وہ کشتیاں تیار کرتے تھے اور لڑائی سے خوش ہوتے تھے۔ دراوڑوں کے علاوہ اور قومیں بھی یہاں آباد تھیں مثلاً کول بھیل اور گونڈ۔ یہ لوگ دراوڑوں کے مقابلہ میں کم مہذب تھے۔ ممالک متوسط اوڑیسہ اور وسط ہند کے پہاڑی علاقوں اور جنگلوں میں اب بھی اُن کی اولاد موجود ہے۔ اسوقت تک اُن کی معاشرت میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی ہے بدن پر سوائے ایک لنگوٹی کے کچھ نہیں ہوتا بال لمبے لمبے ہوتے ہیں اور جانوروں کا

شکار کرکے اُن کا گوشت کھاتے ہیں۔ تیر اور کمان کا استعمال جانتے ہیں۔ جنگلوں سے نکلکر شہروں اور آبادیوں میں آنا پسند نہیں کرتے۔

منگول

وہ قبیلے جو شمال مشرق سے آکر برہمپتر کی وادیوں میں آباد ہوئے منگول کہلائے کیونکہ اُن کا اصلی وطن چین اور منگولیا تھا۔ اُن کا رنگ زرد۔ ناک چپٹی۔ بال سخت اور سیاہ ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ کول اور دراوڑ قوموں کے ساتھ خلط ملط ہوگئے لیکن ملک کے اندرونی حصّوں میں زیادہ آگے نہیں بڑھے۔ صدیوں بعد اسی نسل کے اور قبیلے جو تاریخ میں ہُن کے نام سے مشہور ہیں، شمال مغرب کے درّوں سے اس ملک میں داخل ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی سلطنت بھی قائم کی اور اُن میں سے کچھ لوگ دکن تک پہنچ گئے۔ اُن کے مفصل حالات تم آگے چل کر پڑھوگے۔

آریہ اور دوسری قومیں جو بعد میں آئیں

آریہ قوموں کے حالات اگلے باب میں مفصل طور سے لکھے جائیں گے۔ آریہ کے معنی ہیں شریف انسان۔ یہ لوگ اپنی تہذیب اور تمدّن پر بہت فخر کرتے تھے اور ہندوستان کے باشندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ آریوں کے بعد اور مسلمانوں سے پہلے کئی قومیں شمال مغرب کے درّوں سے داخل ہوئیں جن کا ذکر آگے آئیگا۔ پہلے ایرانی آئے پھر یونانی اُن کے بعد شاک، ہن یوہ‌کی وغیرہ قومیں ہندوستان میں مختلف اوقات پر آئیں۔ ساتویں صدی سے عرب لوگ آنے لگے۔ اُنھوں نے سندھ فتح کیا اور وہیں آباد ہوگئے اور ہندوستانی عورتوں سے شادیاں کریں۔ اس کے

بعد وسط ایشیا میں ترکوں کو عروج ہوا اور سلطان محمود غزنوی کے زمانہ سے ترکوں کے حملے شروع ہوئے۔ ترک، افغان، مغل سب آئے اور یہاں اپنی اپنی سلطنتیں قائم کیں۔ یہ سب مسلمان تھے۔ یہاں آکر یہیں کے ہو رہے اور اسی ملک کو اپنا وطن بنالیا۔ مسلمان صوفیوں نے تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا اور ہندوستان کے ہزارہا آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے۔ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تیرہویں صدی میں کافی تعداد ہندی مسلمانوں کی موجود تھی۔ بعض لوگ تعصب اور جہالت کی وجہ سے کہتے ہیں کہ مسلمان پردیسی ہیں اور اس ملک سے اُن کو کوئی خاص تعلق اور محبت نہیں۔ یہ غلط ہے۔ زیادہ تعداد مسلمانوں کی ایسی ہے جن کے آباو اجدا دیا تو ہندی تھے جنہوں نے اسلام قبول کرلیا اور یا اُن کی شادیاں یہاں کی عورتوں سے ہوئی تھیں۔ اس حیثیت سے ہندی مسلمانوں کا وطن ہندوستان ہی ہے جس کے لئے اُنہوں نے بے شمار قربانیاں کی ہیں۔ مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے بعد یورپ کی قومیں سمندر کے راستہ سے ہندوستان آئیں۔ غرض کہ ہندوستان کی ۳۵ کروڑ آبادی میں مختلف نسلوں کا خون موجود ہے۔ یہ لوگ مختلف مذاہب کے پیرو ہیں اور مختلف زبانیں بولتے ہیں۔

زبانیں اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس سے یہ نتیجہ بآسانی نکل سکتا ہے کہ ہندوستان جیسے ملک میں بے شمار زبانیں بولی جاتی ہونگی۔ ہر نئی قوم جو ملک میں داخل ہوتی ایک نئی زبان اپنے ساتھ لائی تھی۔ جب آریہ یہاں آئے تو اُنہوں نے سنسکرت کو رواج

دیا۔ کچھ زمانے کے بعد عام لوگ پالی زبان بولتے تھے گوتم بدھ اور اشوک کے عہد میں یہی زبان بولی جاتی تھی۔ اس کے بعد متعدد پراکرت زبانیں شلاً برج بھاشا، مگدھی وغیرہ بولی جانے لگیں، جن کو ہم آجکل ہندی کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ عربی اور فارسی اور ترکی زبانیں یہاں آئیں۔ ان سب زبانوں کے اختلاط سے ایک نئی زبان وجود میں آئی جو اُردو کہلاتی ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ہر صوبہ کی علیحدہ زبان ہے۔ بنگال میں بنگالی سندھ میں سندھی۔ پنجاب میں پنجابی۔ صوبہ سرحد میں پشتو۔ گجرات میں گجراتی۔ مہاراشٹر میں مرہٹی اور دکن میں تامل، تیلیگو، ملائم اور کناری وغیرہ بولی جاتی ہیں۔ اب انگریزی نے بھی رواج پا لیا ہے اور سارے ملک میں پڑھے لکھے لوگ اس کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ ان حالات کا ہی نتیجہ ہے کہ لوگوں میں اس مسئلہ پر اختلاف ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کونسی ہے یا کونسی ہو سکتی ہے۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ ہندی اور اُردو ملی ہوئی زبان جس کو اکثر لوگ ہندوستانی کہتے ہیں۔ کم و بیش ملک کے ہر حصہ میں سمجھی جاتی ہے۔

باب ۴
آریہ لوگ

آریوں کا وطن نوع انسانی کی وہ نسل جو آریہ کے نام سے مشہور ہے غالباً تین ہزار سال قبل مسیح یا اس سے بھی پہلے ہیں

ملک میں داخل ہوئی۔ یہ لوگ شمال و مغرب کے پہاڑی دروں سے آئے اور اولاً پنجاب کے دریاؤں کے کنارے آباد ہوئے۔ یہ صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا اصلی وطن کونسا تھا کیونکہ اس مسئلہ پر مورخین میں اختلاف ہے۔ غالباً یہ لوگ یورپ اور ایشیا کے درمیان بحیرۂ آرال اور بحیرۂ اسود کے کنارے کے وسیع مرغزاروں میں زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں یہ ایک مدت تک رہے۔ رفتہ رفتہ یہ میدان سوکھنے لگا۔ ان طبعی تبدیلیوں کی وجہ سے اُن کو اپنا اصلی وطن چھوڑنا پڑا اور اپنے مویشی، گھوڑے، بال بچے اور اسباب وغیرہ ساتھ لے کر نئے چراگاہوں کی تلاش میں چلدیے ان میں سے بعض قبیلے یورپ کی طرف چلے گئے۔ چنانچہ موجودہ انگریزی۔ یونانی فرانسیسی۔ اطالوی۔ جرمن اور یورپ کی دوسری قومیں انھیں کی اولاد میں سے ہیں۔ ترک وطن اور بہتر چراگاہوں کی تلاش کا سلسلہ عرصہ تک جاری رہا اور جس طرح سے کچھ لوگ یورپ کی طرف چلے گئے تھے۔ اسی طرح سے دوسری شاخ ایران اور افغانستان پہنچ گئی اور یہاں سے سوات۔ کابل۔ کرم اور گومل ندیوں کی گھاٹیوں میں سے گذر کر ہندوستان میں داخل ہوئے۔ یہاں ان کو ہندوستان کے قدیم باشندوں سے سخت مقابلہ کرنا پڑا۔ لیکن آریہ لوگ فنون جنگ میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کافی ترقی کر چکے تھے اس لئے وہ اپنے مخالفوں پر غالب آئے اور ان میں سے اکثر شکست کھا کر بھاگ گئے اور پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ اب افغانستان۔ پنجاب۔ راجپوتانہ اور سندھ کے مختلف حصے آریوں کے قبضہ میں آگئے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ آگے بڑھتے گئے اور ساتھ ہی اُن کے قبیلے ہندوستان میں داخل ہوتے رہے یہاں تک کہ

جنوب میں بندھیاچل تک مشرق میں بنگال اور مغرب میں کاٹھیاوار تک سارا ملک اپنے قبضہ میں لے لیا۔ بعد میں وہ دکن میں بھی پہنچ گئے۔

شکل و شباہت آریہ لوگ قد کے لمبے اور رنگ کے گورے تھے اُن کے چہرے بیضاوی اور پیشانی بلند تھی۔ ہاتھ پیر بڑے بڑے۔ سر لمبا اور ناک نکیلی ہوتی تھی۔ زمانہ قدیم میں وہ دنیا کی مہذب ترین قوموں میں سے تھے۔ زمین کی کاشت کرتے تھے، مویشی پالتے تھے، گاڑیاں اور کشتیاں بناتے تھے۔ تانبے اور لوہے کے برتن اور ہتھیار استعمال کرتے تھے اون اور سوت سے کپڑا بنتے تھے۔ اعداد اور شمار سے واقف تھے اور مہینوں کا حساب چاند سے لگاتے تھے۔

وید قدیم آریوں کے حالات ہم کو اُن کی مقدس کتابوں میں ملتے ہیں۔ اس زمانہ کی نہ کوئی تحریر ہمارے پاس ہے اور نہ کوئی تاریخ نہ کتبے ملتے ہیں اور نہ سکے، جس سے کچھ پتہ چلے لیکن اُن کے منتروں اور گیتوں کے وہ مجموعے جو ویدوں کے نام سے مشہور ہیں، دنیا کی سب سے قدیم اور مقدس کتابوں میں شمار ہوتے ہیں اور تاریخ کے طالب علم کے لئے معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔ اگر ہمارے پاس اسوقت وید موجود نہ ہوتے تو ہمارے لئے یہ اندازہ لگانا تقریباً ناممکن تھا کہ اس زمانہ کے آریہ لوگ ترقی کی کون کون سی منزلیں طے کر چکے تھے۔

زمانہ تالیف کے لحاظ سے ویدوں میں سب سے قدیم رگ وید ہے۔ اس کے علاوہ تین اور وید یعنی یجر وید۔ سام وید اور اتھروید بعد میں مرتب ہوئے۔ رگ وید کے بعض حصے بہت قدیم ہیں۔ سام وید میں رگ وید کی بہت سی نظموں کو اس طرح سے بدلا ہے کہ وہ گانے میں اچھی طرح سے

آئیں۔ یجر وید میں زیادہ تر وہ گیت ہیں جو قربانی کے موقع پر گائے جاتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کا زمانہ وہ تھا۔ جبکہ پروہت اور پنڈتوں کا اثر قائم ہو چکا تھا۔ آتھرو وید میں زیادہ تر دعائیں اور منتر ہیں چونکہ یہ تینوں وید بعد میں مرتب ہوئے ہیں اس لئے زمانہ قدیم کے حالات معلوم کرنے کا سب سے بہتر ذریعہ رگ وید ہی ہے۔ بعد میں اور کتابیں بھی لکھی گئیں۔ مثلاً برہمن جن میں ویدوں کے اشعار کا مطلب نثر میں بیان کیا گیا ہے۔ آرنیک اور اُپنشد میں مذہب اور فلسفہ کے باریک مسائل پر بحث کی گئی ہے۔

ویدوں کے زمانہ میں سیاسی حالت

ہندوستان میں آکر آریوں نے خانہ بدوشی کی زندگی کو چھوڑا اور مستقل آبادیاں بسائیں۔ یہ بستیاں زیادہ تر دریائے سندھ اور پنجاب کے دوسرے دریاؤں کے کنارے آباد تھیں۔ ان بستیوں اور گاؤں کے چاروں طرف یا تو خندقیں یا مٹی کی دیواریں بنا کر جنگلی جانوروں اور دشمنوں سے اپنی جان اور مال کی حفاظت کرتے تھے۔ آریہ قوم بہت سے خاندانوں میں منقسم تھی۔ باپ خاندان کا سردار ہوتا تھا۔ جب بیٹے جوان ہوتے تو وہ شادی کر لیتے اور اس طرح سے نئے خاندانوں کی بنیاد پڑ جاتی۔ بہت سے خاندانوں کے ایک جگہ ہو جانے سے ایک قبیلہ بن جاتا تھا۔

قبیلے کا سردار راجہ ہوتا تھا۔ لڑائی کے موقع پر سب لوگ اُس کے حکم پر عمل کرتے تھے۔ اکثر اوقات راجہ کے بعد اُس کا بیٹا راجہ تسلیم کر لیا جاتا تھا لیکن کبھی کبھی خاص حالات میں ایک نیا راجہ منتخب کر لیتے تھے۔ امن

کے دنوں میں وہ عدل و انصاف کا کام کرتا تھا اور پروہت کی مدد سے جانوروں کی قربانی اور دیگر مذہبی رسومات ادا کرتا تھا۔ برہمن لوگ راجاؤں کے خاص صلاح کار ہوتے تھے۔ اور نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ بعد میں قربانی اور دیگر مذہبی رسومات کی ادائگی کا کام برہمنوں کے ہی سپرد کر دیا گیا اور یہی وجہ تھی کہ لوگوں پر اُن کا اثر برابر بڑھتا گیا۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ راجہ کے اختیارات غیر محدود تھے۔ اس کی مدد کے لئے ایک مجلس (سبھا) ہوتی تھی جو سیاسی معاملات پر بحث کرتی تھی۔ راجہ اپنی رعیت سے بجائے محصول کے نذرانہ قبول کرتا تھا اور مال غنیمت بھی اُس کو ملتا تھا۔ راجہ اور اُس کے امیر رتھ پر سوار ہو کر لڑتے تھے لیکن معمولی سپاہی پیادہ جنگ کرتے تھے۔ راجہ اور اُس کے سردار حکومت اور جنگ کے فرائض انجام دیتے تھے اور اس طبقہ کا نام راجن یا چھتری ہو گیا۔ باقی عام لوگ جو زراعت یا تجارت کرتے تھے ویش کہلائے۔ ہندوستان کے قدیم باشندے یعنی کول اور دراوڑ جن کو آریوں نے مغلوب کر لیا تھا اور جو اُن کی معمولی خدمات انجام دیتے تھے ایک علیحدہ طبقہ شمار ہوتا تھا جو شودر کہلاتا تھا۔

اقتصادی حالت اور معاشرت ہندوستان میں آباد ہو جانے کے بعد آریہ لوگوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ترقی کی۔ عام لوگ تو مٹی بانس اور چھپروں سے تیار کئے ہوئے مکانوں میں رہتے تھے لیکن مالدار لوگ بڑے بڑے محل بنواتے تھے۔ جن میں عمدہ قسم کے دروازے اور ستون ہوتے تھے۔ ان کی عام غذا دودھ، مکھن، غلہ، ترکاریاں اور پھل تھی۔ گوشت کھاتے تھے۔

مگر کثرت سے نہیں۔ جانوروں کا شکار بھی کرتے تھے۔ ناچ اور گانے کے بہت زیادہ شوقین تھے۔ شراب خواری، قمار بازی کا بھی رواج تھا۔ قربانی کے وقت ایک نشہ اور عرق پیتے تھے۔ جو لوگ چوری اور ڈاکہ زنی کرتے تھے وہ برادری سے خارج کردئے جاتے تھے۔ کپڑا بنا جانتے تھے۔ اور اون، سوت اور چمڑا۔ لباس کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ کشتیاں تیار کرتے اور دریاؤں کو انھیں کے ذریعہ سے عبور کرتے تھے۔ اس زمانہ میں سکوں کا رواج نہ تھا۔ اور لین دین کا طریقہ یہ تھا کہ ایک جنس کے بدلے میں دوسری جنس مل جاتی تھی۔

آریہ سوسائٹی میں عورتوں کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور مذہبی رسومات کی ادائگی میں اکثر وہ مردوں کے ساتھ شامل ہوتی تھیں بہت سے منتر ایسے ہیں جو عورتوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں۔ گھر کا سارا انتظام انھیں کے سپرد ہوتا تھا۔ اپنے شوھر کی خدمت گزاری وہ اپنا عین فرض سمجھتی تھیں۔ بالعموم شوہر کے انتخاب میں لڑکیوں کی رائے ضروری خیال کی جاتی تھی۔ بچپن کی شادی کا رواج نہ تھا۔ بیوہ عورتوں کی شادی بھی ہوجاتی تھی۔ خیرات کرنا خاص طور سے ایک اچھا اور نیک کام خیال کیا جاتا تھا۔ مرد اور عورتیں دونوں رنگین کپڑوں کا استعمال کرتے تھے اور زیور بھی پہنتے تھے۔ مہمان کی بہت خاطر کرتے تھے۔ تعلیم کا بہت چرچا تھا۔ اکثر شاگرد استاد کے پاس ہی رہتے تھے اور اپنے استاد کی خدمت اپنے لئے باعث فخر اور عزت سمجھتے تھے۔

آریوں کا مذہب

رگ وید کو غور سے مطالعہ کرنے پر ظاہر ہوتا ہے کہ آریوں کے مذہبی خیالات اور رسم و رواج

میں کیا کیا تبدیلیاں ہوئیں اور اُنھوں نے کہاں تک اس میں ترقی کی۔ ابتداء
میں ان کا مذہب نہایت صاف اور سادہ تھا۔ وہ قدرت کے مناظر
اور اُس کی طاقتوں کو پوجتے تھے۔ سُورج، چاند، سحر کی روشنی، بجلی،
طوفان، آگ اور ہوا کی پوجا کی جاتی تھی۔ سوریہ دن کا دیوتا تھا۔ صبح
یعنی اُشا ایک حسین عورت خیال کی جاتی تھی۔ رُودر طوفان کا اور اگنی
آگ کا دیوتا تھا۔ اسی طرح سے اندر بارش اور وآیو ہوا کے دیوتا سمجھے
جاتے تھے۔ پجاری لوگ ان دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے
اور اُن کے قہر سے بچنے کے لئے قربانی کرتے اور دُعائیں مانگتے تھے۔
اُن کا اعتقاد تھا کہ مرنے کے بعد نیک اور اچھے آدمیوں کی روحیں یَم
کے ساتھ سچائی اور نور میں رہتی ہیں۔ بُرے آدمیوں کی روحیں ہمیشہ
تاریکی اور ظلمت میں پڑی رہتی ہیں۔ لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ آریوں
نے زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی۔ چنانچہ اُن کے مذہبی اعتقادات میں
بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ نئے دیوتاؤں کا اضافہ کرلیا گیا۔ پڑھے
لکھے لوگوں کا یہ ایمان ہوگیا ہے کہ ان تمام قوتوں پر ایک زبردست قوت
ہے جس کے تحت میں یہ سب کام کرتی ہیں۔ اب وہ قادر مطلق کی ہستی پر ایمان
لے آئے جس کی قدرت کاملہ کے یہ سب مظاہر ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ
اس زمانہ میں نہ مندر تھے اور نہ مورتی پوجا۔ کچھ مدّت کے بعد آریہ لوگ
پنجاب سے نکل کر گنگا کے زرخیز میدان میں پہنچ گئے۔ یہاں ان کو ہندستان کے
قدیم باشندوں سے لڑنا پڑا۔ یہ کش مکش پہلے سے زیادہ سخت اور طویل تھی،
لہذا قبیلوں کی جگہ بڑی بڑی قوموں نے لے لی اور قدرتی طور پر ان قوموں کے
سردار بہت زیادہ طاقتور ہوگئے۔ اُن کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئیں،

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی جگہ زبردست حکومتیں قائم ہوگئیں جن کا حال تم آگے چل کر پڑھوگے۔

باب ۵

رامائن اور مہابھارت کا زمانہ

رامائن اور مہابھارت ویدوں کے زمانہ کے بعد جو دو ہزار قبل مسیح سے ایک ہزار قبل مسیح تک مانا جاتا ہے رزمیہ نظموں کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اس عہد کے حالات معلوم کرنے کا ذریعہ رامائن اور مہابھارت ہیں اور سہولت کی وجہ سے ہم اس کو رامائن اور مہابھارت کا زمانہ کہتے ہیں۔ ان دونوں نظموں کے علاوہ غالباً ہندوؤں کی دوسری مقدس کتابیں۔ براہمن۔ آرنیک اور اُپنشد بھی اسی زمانہ میں مرتب ہوئیں۔ ہندوؤں کا ایمان ہے کہ وید۔ براہمن۔ آرنیک اور اُپنشد الہامی کتابیں ہیں۔ یہ شُرتی کہلاتی ہیں۔ رامائن اور مہابھارت میں وہ روایات ہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں۔

رامائن اور مہابھارت پڑھ کر ہم اُس زمانہ کے اخلاقی، سیاسی اور مذہبی حالات معلوم کرسکتے ہیں۔ اسی لحاظ سے یہ ہمارے لئے معلومات کا ایک زبردست ذخیرہ ہیں۔ علاوہ اس کے ہندو قوم پر ہمیشہ سے ان نظموں کا گہرا اثر رہا ہے۔ بعض ہندو تو مہابھارت کو پانچواں وید کہتے ہیں۔ رامائن اور مہابھارت کی

تصنیف کی تاریخ ٹھیک طور پر نہیں بتلائی جا سکتی۔ رامائن کے مصنف والمیک رشی ہیں۔ اس میں چوبیس ہزار اشعار ہیں۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں گوسوامی تلسی داس نے رامائن کا ترجمہ ہندی میں کیا جو شمالی ہندوستان کے ہندو خاندانوں میں اب تک پڑھا جاتا ہے۔ مہابھارت کے مصنف ویاس جی ہیں اس میں بھی چوبیس ہزار اشلوک تھے لیکن بعد میں اضافہ کر دیا گیا یہاں تک کہ ایک لاکھ ہو گئے۔ رامائن اور مہابھارت میں جو واقعات ہیں وہ تم پہلے پڑھ چکے ہو لیکن بھگوت گیتا کے متعلق کچھ لکھنا ضروری ہے۔

بھگوت گیتا شری کرشن جی نے مہابھارت کی جنگ میں پانڈوؤں کا ساتھ دیا۔ ہندو لوگ سری کرشن جی کو اوتار مانتے ہیں۔ لڑائی میں جب ارجن نے دیکھا کہ بہت آدمی اپنے اور نیز دشمن کے ہلاک ہوئے جاتے ہیں تو وہ لڑائی سے بیزار ہو گئے اور چاہتے تھے کہ کنارہ کشی اختیار کریں۔ لیکن سری کرشن جی نے اُن کی ہمت افزائی کی اور بہت سے اُپدیش دیئے۔ اُن کو بتایا کہ ایک چھتری کا کیا دھرم ہے۔ روح کبھی نہیں مرتی۔ اگر ایک شخص مرگیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ روح اُس کا جسم چھوڑ کر چلی گئی۔ اس کے بعد پھر دوسرے جنم میں نمودار ہوگی۔ سچائی کے لئے لڑائی بھی جائز ہے۔ انسان کو اپنا ارادہ اور نیت ٹھیک رکھنا چاہئے۔ ان اُپدیشوں کے مجموعہ کا نام بھگوت گیتا ہے۔ یہ بہت مقدس کتاب سمجھی جاتی ہے اور آج کل تقریباً ہر مشہور زبان میں اس کا ترجمہ ہوگیا ہے۔ اکبر بادشاہ کے عہد میں اُس کے دربار کے مشہور شاعر فیضی نے اس کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا تھا۔

آریہ سلطنتیں رامائن اور مہابھارت کے زمانہ میں آریہ لوگ گنگا کی وادی میں آباد ہو گئے تھے اور غالباً آریہ تہذیب کا اثر

دکھن تک پہنچ چکا تھا۔ دراوڑوں سے آریوں کی لڑائی ختم ہو چکی تھی اور دونوں قومیں آپس میں خلط ملط ہونے لگی تھیں۔ یہ قیاس اسلئے کیا جاتا ہے کہ اب ایسے دیوتاؤں کا ذکر آتا ہے جو پہلے نہیں تھے۔ یہاں آباد ہونے پر آریوں نے بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔ جن میں پانچ بہت مشہور ہیں۔ کورو جس کا پایہ تخت ہستناپور تھا۔ اس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

پانچال۔ اس خاندان میں پانچ قبیلے تھے اس لئے پانچال کہلاتا ہے۔ انکی سلطنت گنگا اور جمنا کے درمیان کے علاقہ میں واقع تھی اور اس کا پایۂ تخت کامپل تھا۔

کوشل۔ یہ سلطنت اُس خطّہ میں تھی جو اب اودھ کہلاتا ہے۔ اس کی راجدھانی اجودھیا تھی۔

ودیھ۔ یہ کوشل سے پورب کی طرف واقع تھی۔ اس کا دارالسلطنت متھلا تھا۔

کاشی۔ جس کو آج ہم بنارس کہتے ہیں۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں کوشل کے راجہ نے ودیھ سلطنت کو فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور گوتم بدھ کے زمانہ میں کاشی سلطنت کوشل کا ایک صوبہ تھا۔

سیاسی حالت اور رسم و رواج شمالی ہند کا وہ حصہ جہاں آج بڑی ریاستیں قائم ہوئی تھیں۔ آریہ تہذیب اور تمدن کا مرکز خیال کیا جاتا تھا۔ ان کے قرب و جوار میں خود مختار قبیلے تھے جن میں سے بعض نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے اور بعض آریہ تہذیب سے موثر ہو چکے تھے۔ آریہ سوسائٹی میں اب قبیلوں کی جگہ بڑی بڑی سلطنتوں نے لے لی تھی۔ شروع شروع میں راجہ لوگوں کا نمائندہ ہوتا

تھا اور ایک مجلس کے مشورے سے سلطنت کا کام کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ راجہ کی طاقت اور اختیارات زیادہ وسیع ہوتے گئے اور وہ اپنی رائے سے کام کرنے لگا۔ راماین اور مہابھارت کے زمانہ میں راجاؤں کا رتبہ اس قدر بلند ہوگیا تھا کہ وہ اوتار مانے جاتے تھے۔

اس زمانہ میں لوگوں کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ آزاد طبیعت اور نڈر ہوتے تھے۔ صرف دو کپڑے پہنتے تھے۔ ایک دھوتی اور ایک چادر عورتیں وفادار۔ پاک دامن اور شوہر پرست ہوتی تھیں۔ مہابھارت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آریوں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ترقی کی تھی ایک طرف تو چھتری راجہ بڑی بڑی حکومتوں کی بنیاد ڈال رہے تھے اور دوسری طرف بڑے بڑے علماء فلسفہ اور مذہب کے اہم مسائل حل کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن میں وہ اخلاقی کمزوریاں بھی نظر آتی ہیں جو دولت اور ترقی کا لازمی نتیجہ ہیں مثلاً یہ کہ جوئے کا رواج بہت عام ہوگیا تھا۔

باب ۶

ذاتوں کی تقسیم اور برہمنوں کا عروج

ذات کا آغاز

ذات کا مسئلہ ہندوستان کے اہم ترین سیاسی اور معاشرتی مسائل میں سے ہے۔ اسوقت ہندو قوم میں

لاتعداد ذاتیں ہیں۔ لیکن قدیم زمانہ میں نہ ذاتوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی اور نہ قواعد میں اس قدر سختی جیسی کہ آجکل ہے۔ پچھلے باب میں تم پڑھ چکے ہو کہ آریہ لوگ ویدوں کے زمانہ میں پیشہ کی بنا پر مختلف جماعتوں میں منقسم تھے براہمن اور سوتر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ جب گنگا کی وادی سے مشرق اور جنوب کی طرف بڑھے تو اُن کی تعداد بہ نسبت اُن لوگوں کے جن میں جاکر وہ آباد ہوئے تھے کم تھی۔ یہاں اُن کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا جن کے رسم و رواج۔ طرز معاشرت اور مذہبی عقائد اُن سے مختلف تھے۔ اسوقت اُنھوں نے یہ محسوس کیا کہ اُن کی تہذیب ہندوستان کی قدیم تہذیب کے اثر سے اسی حالت میں بچ سکتی ہے کہ وہ علیحدہ رہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے علیحدگی اختیار کی اور ہندوستان کے قدیم باشندوں کو اپنے مقابلہ پر کم درجہ کا انسان تصور کرنے لگے۔ یہ علیحدگی زمانہ گزرنے کے ساتھ بڑھتی گئی آریوں کی مختلف جماعتیں بھی الگ الگ ہوگئیں۔ مذہبی رسومات کی ادائگی کا کام اب برہمنوں کے لئے مخصوص ہوگیا۔ حکومت اور ملک کا انتظام چھتریوں کے ذمہ ہوا۔ ویش تجارت اور کاشتکاری کے علاوہ دوسرے پیشوں سے محروم ہوگئے۔ شودروں کا فرض یہ تھا کہ برہمنوں۔ چھتریوں اور ویشوں کی خدمت کریں۔ اس سلسلہ میں یہ بتلانا ضروری ہے کہ یہ تقسیم حالات اور واقعات سے مجبور ہوکر کی گئی تھیں۔ مذہبی رسومات کی ادائگی اور ملکی معاملات کی ذمہ داریاں اس قدر وسیع ہوگئی تھیں کہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ مختلف فرائض مختلف طبقوں کے سپرد کردئے جائیں اور ایک طبقہ کے لوگ دوسرے طبقہ والوں کے کام میں دخل نہ دیں۔ بعد میں یہ قوانین بہت سخت ہوتے گئے۔

اب برہمنوں اور چھتریوں میں اعلیٰ رتبہ حاصل کرنے کے لئے کشمکش شروع ہوگئی۔ برہمنوں نے جواب تک دوسرے کام کرنا عار نہیں سمجھتے تھے صرف پڑھانا اور مذہبی امور کا انجام دینا اپنے ذمہ لیا۔ چونکہ اس کام میں ہر وقت مقدس کتابوں اور دیوتاؤں سے واسطہ رہتا تھا اسی لئے رفتہ رفتہ برہمن سوسائٹی میں سب سے اعلیٰ مانے جانے لگے اور ان کی بڑی عزت ہونے لگی۔ چھتریوں کو دوسرا درجہ ملا۔ اس کے بعد ویش اور پھر شودر تھے۔ ان چار جماعتوں کے علاوہ ایک نئی جماعت پیدا ہوگئی جو چنڈال کہلاتی تھی ادنیٰ قسم کے سارے کام چنڈال قوم کے لوگوں کے سپرد ہوئے۔ چنڈال اس قدر ذلیل خیال کئے جاتے تھے کہ اُن کا سایہ پڑنے سے آدمی ناپاک ہوجاتا تھا۔ یہ لوگ شہر کے اندر نہیں رہ سکتے تھے بلکہ آبادی کے باہر اپنی بستیاں قائم کرلیتے تھے۔

منوسمرتی منوسمرتی سنسکرت نظم میں ہندو دھرم شاستر کی ایک قدیم کتاب ہے جس کی تالیف کا زمانہ صحیح طور پر نہیں بتلایا جا سکتا۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ برہمنوں کے اثر کی وجہ سے ذات کے قوانین نہایت سخت ہوگئے تھے۔ اس میں مختلف ذات کے لوگوں کے فرائض صاف طور پر بیان کئے گئے ہیں۔ آئندہ تاریخ پر اس کتاب کا یہ اثر ہوا کہ ذات کی تقسیم اور زیادہ سخت ہوگئی۔ عورتوں کا رتبہ پہلے سے بہت کم ہوگیا تھا۔ شودروں کی نہایت ابتر حالت تھی۔ برہمن کا فرض ہے کہ وید پڑھے اور پڑھائے۔ یگیہ کی رسم ادا کرے۔ دولتمند ہے تو خیرات کرے ورنہ بھیک مانگ کر زندگی بسر کرے۔ شودر لوگ اور عورتوں کو وید پڑھنے یا یگیہ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں۔ عورتوں کو چاہئے کہ ہر حالت میں شوہر

کی فرماں برداری کریں۔ چھتری کا کام یہ ہے کہ وہ رعایا کی حفاظت کرے خیرات کرے اور یگیہ کرے۔ ویش کا دھرم یہ ہے کہ مویشی پالے۔ تجارت اور کھیتی کرے اور روپیہ قرض دے۔ شودر کے لئے صرف ایک کام ہے اور وہ یہ کہ ہمیشہ اپنے آقا کی خدمت گزاری میں مستعد رہے۔

ذات کی خوبیاں اور عیوب

ذات کا رواج صرف ہندوستان ہی میں ہے اور اس ملک کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ ذات کی خوبیاں ہیں لیکن اس سے نقصانات زیادہ پہنچے ہیں۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ لوگوں میں ایثار کا مادّہ پیدا ہوتا ہے اور اپنی قوم کے لوگوں کے لئے ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ گناہوں اور بُرے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں کیونکہ ان کو ہر وقت یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ذات سے علیحدہ نہ کر دئے جائیں۔ ضرورت اور مفلسی میں ذات والے ہی اُن کی مدد کرتے ہیں اور تباہی سے بچاتے ہیں۔ چونکہ ہر خاندان کا مخصوص پیشہ ہوتا ہے اس لئے ہر نئی نسل کے ساتھ اس خاندان کے لوگ اس مخصوص پیشہ میں زیادہ کمال حاصل کرتے جاتے ہیں۔ ایک اور فائدہ یہ ہے کہ سیاسی انقلابات اور ملکی معاملات کا سوسائٹی پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں اکثر سیاسی انقلابات رونما ہوئے اور نظام حکومت بدلتا رہا لیکن سوسائٹی کی وہی حالت رہی جو پہلے تھی۔

ذات کے نقصانات بھی بہت ہیں اور ہزاروں برس سے ہم اس کا تاوان دے رہے ہیں۔ ذات کی سختی کی وجہ سے ہندوستانی باہر والوں اور باہر والے ہندوستانیوں کو نہیں سمجھ سکے۔ ایک غیر ملک کا رہنے والا

یا کسی دوسرے مذہب کا پیرو ملیچھ (پاپی) سمجھا جاتا ہے کہ جس کے چھونے سے آدمی ناپاک ہوجاتا ہے۔ ایک ذات والا دوسری ذات والے کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے اور ایسے حالات میں یہ ناممکن ہے کہ برادرانہ تعلقات پیدا ہوسکیں یا لوگ مل کر ملک کی بھلائی کے لئے کوئی کام کرسکیں۔ ہر شخص کو وہی پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو اُس کے بزرگوں کا تھا چاہے فطرتاً وہ اُس کے لئے موزوں ہو یا نہ ہو۔ نیچی ذات والے ذلیل اور خوار سمجھے جاتے ہیں اور یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ہمیشہ وہ اور اُن کی اولاد اسی طرح ذلیل اور خوار رہے گی۔ کسی حالت میں بھی وہ اس پستی سے نہیں نکل سکتے۔ برخلاف اس کے اونچی ذات والے معزز خیال کئے جاتے ہیں۔ وہ مغرور ہوجاتے ہیں اور اپنی شرافت نفس پر بیجا گھمنڈ کرنے لگتے ہیں۔

ذاتوں کی تقسیم بہت پرانی ہے اور اس ملک کی زندگی میں اس طرح پیوست ہوئی ہے کہ ایک دم سے اس کا دور کرنا ناممکن ہے لیکن بہرحال ہم یہ کوشش کرسکتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اس کی بندشوں کو ڈھیلا کریں۔ کیونکہ اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اس ملک کی ترقی کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔

برہمنوں کا عروج اور اُن سے بیزاری

یہی زمانہ تھا جبکہ براہمنوں نے عروج حاصل کیا۔ منوسمرتی میں برہمنوں کی عظمت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ "برہمن ایشور کے اقا ہیں دنیا کی ہر چیز برہمنوں کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ برہمن کی جان لینے سے بڑا دنیا میں کوئی پاپ نہیں۔ برہمن خواہ کوئی جرم کرے راجہ اُس کے

قتل کا حکم نہیں دے سکتا۔ اگر برہمن کو اُس نے ناخوش کردیا تو وہ اُس کو
شراپ یعنی بددعا دے کر تباہ کرسکتا ہے۔ گنگا کی زرخیز وادی میں آباد
ہونے کے بعد آریوں کے تمدن میں زبردست تبدیلیاں ہوگئیں۔
اب وہ بہت زیادہ مہذب ہوگئے تھے۔ سیاسی اور معاشرتی زندگی
کے علاوہ مذہبی زندگی میں بھی انھوں نے بہت ترقی کرلی تھی۔ نئے دیوتاؤں
اور دیویوں کی پوجا ہونے لگی اور رسومات مذہب کا جزو اعظم خیال کی جانے
لگیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ فلسفہ اور مذہب کے اُن مشکل مسائل پر غور کرنے
لگے جن کا شروع میں کہیں ذکر بھی نہیں۔ آواگون کے مسئلہ پر سب کا
اعتقاد تھا۔ توہم پرستی کا بھی زور شروع ہوگیا۔ قربانیوں اور دیگر رسومات کی
ادائیگی میں اس قدر پیچیدگیاں پیدا ہوگئیں کہ اب سوائے برہمنوں کے جن
کی زندگی اس کے لئے وقف تھی اور کوئی ان کو سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔
چنانچہ مذہبی اور قومی معاملات میں برہمنوں کی ہر وقت ضرورت پڑتی تھی۔
اور چونکہ ان کے فرائض کا تعلق دیوتاؤں اور ہستیوں سے تھا اس لئے عام
لوگوں کی نظروں میں اُن کی عزت اور اہمیت برابر بڑھتی گئی اور جیسا کہ منو
کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ لوگ اُن کو اوتار سمجھنے لگے۔

ان مشکل مسائل پر غور و خوض کرنے سے لوگوں کے دلوں میں شکوک پیدا
ہوتے گئے۔ مثلاً روح کی حقیقت۔ خدا کا وجود۔ موت اور زندگی کی کیفیت۔
یہ وہ مسائل ہیں کہ جس قدر ان پر غور کرتے تھے اسی قدر اُن کے شکوک اور
زیادہ بڑھتے تھے۔ اسی زمانے میں نئے رشی منی اور مجدد پیدا ہوتے ہیں اور
ان مشکلات کے حل کرنے کے لئے نئے طریقے بتلاتے ہیں۔ یگیہ کرنا بالکل
فضول ہے۔ اس سے انسان کی زندگی بہتر نہیں ہوسکتی۔ روح مت

ہونے والی چیز نہیں بلکہ دوسرے جسم میں منتقل ہو جاتا ہے اور ہمیشہ اسی طرح موت اور حیات کے چکر میں پھنسی رہتی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ رُوح کو اس آواگون کے چکر سے نجات دے۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ جنگلوں میں تپسیا کرنے سے انسان ان مصیبتوں سے نجات پا سکتا ہے۔ لیکن تپسیا سوائے برہمنوں کے اور کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد برہمنوں کی مخالفت شروع ہوئی اور اس قدر بڑھ گئی کہ لوگ ان سے اور اُن کے مذہب سے بیزار ہونے لگے۔ ان ہی اختلافات کے باعث نئے مذہبی فرقے پیدا ہوئے جن میں سے بُدھ اور جین مت بہت مشہور ہیں۔

باب ۷

بُدھ اور جین مذہب

ساتویں صدی قبل مسیح کے آخر اور چھٹی صدی کے شروع میں بہت سے نئے فرقے وجود میں آئے۔ ان میں سے ہر ایک کا یہی مقصد تھا کہ ایسا راستہ تلاش کیا جائے جس سے انسانی روح کو آواگون کے جال سے نجات ملے ان میں سے صرف ان دو مذہبوں کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے ہندوؤں کے تمدن اور خیالات پر ایک زبردست اثر کیا اور جن کے پیرو آج تک دنیا کے مختلف حصّوں میں پائے جاتے ہیں۔

مہاویر | جین مذہب کے بانی کا نام وردھمان تھا۔ ان کی ماں وِسیالی

کے راجہ کنگ کی بہن تھیں اور اُن کے باپ سدھارت ایک دولتمند اور با اثر چھتری سردار تھے بیس سال کی عمر میں گھر بار چھوڑکر وردھمان جنگل میں چلے گئے دو سال تک انھوں نے سنیاسیوں کی زندگی بسر کی اس کے بعد دنیا کو یہاں تک ترک کیا کہ کپڑے بھی اُتار پھینکے اور سچائی کی تلاش میں دس برس تک ملک بہار میں گھومتے رہے۔ چالیس سال کی عمر میں انھوں نے اعلان کیا کہ ان کو صحیح علم حاصل ہوگیا ہے اور اپنی عمر کے بقیہ تیس سال انھوں نے اس نئے مذہب کی اشاعت میں صرف کئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے ودیہہ۔ مگدھ اور کوشل ریاستوں کے مختلف حصوں میں سفر کیا بہت سے لوگ ان کے پیرو ہوگئے اور جین کہلائے۔

مہاویر کی تعلیم اور اُن کے پیرو

مہاویر کہتے تھے کہ زندگی کا مقصد دنیا کی مصیبتوں اور آواگون کے چکّر سے نجات پانا ہے۔ یہ نجات مذہب کے تین بیش قیمت جواہرات حاصل کرنے سے مل سکتی ہے۔ یعنی صحیح ایمان۔ صحیح علم اور صحیح عمل۔ آخری بات یعنی صحیح عمل میں پانچ چیزیں شامل ہیں۔ یعنی جھوٹ مت بولو۔ چوری مت کرو۔ شراب نہ پیو۔ اپنے خیالات اور اعمال کو پاک رکھو۔ جان داروں کی جان نہ لو۔ مہاویر اہنسا پر بہت زور دیتے تھے۔ جینیوں کا خیال ہے کہ ہر چیز حتیٰ کہ ہوا۔ آگ۔ پانی۔ پتھر اور لکڑی تک میں جان ہے۔ لیکن ان کا استعمال ضروری ہے مہاویر عبادت اور ریاضت پر بھی بہت زور دیتے تھے۔ وہ ذات کے قائل نہ تھے اور ان کے نزدیک ہر شخص خواہ وہ شودر ہی کیوں نہو موکش یعنی نجات حاصل کرسکتا ہے۔

جین مذہب ہندوستان کے باہر نہیں پھیلا لیکن اس ملک میں جینیوں کی تعداد اس وقت بھی ۱۳ لاکھ کے قریب ہے یہ لوگ زیادہ تر تجارت پیشہ

اور متمول ہیں۔ قحط اور خشک سالی کے موقعوں پر بہت فیاضی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کی فیاضی اور دریا دلی کی بدولت آج ہندوستان میں جانوروں کے بہت سے اسپتال قائم ہیں۔ مہاویر بت پرستی کے خلاف تھے۔ لیکن ان کے پیرو اُن کے اور اُن کے گرو پارسناتھ کے بتوں کو پوجتے ہیں۔ مہاویر کے بعد جینیوں میں دو فرقے ہو گئے۔ دگمبر جو ننگے رہتے ہیں اور شویتامبر جو سفید کپڑے پہنتے ہیں۔

گوتم بدھ کی پیدائش اور ابتدائی حالات

ساتویں صدی قبل مسیح میں شاکیہ قوم نے نیپال کی سرحد پر ایک چھوٹی سی حکومت قائم کی تھی جس کی دارالسلطنت کپل وستو تھا۔ گوتم کا باپ راجہ شدّھودھن یہیں کا رئیس تھا۔ گوتم کی تاریخ ولادت تحقیق کے ساتھ نہیں بتلائی جاسکتی۔ لیکن اکثر مورخوں کا خیال ہے کہ ان کی پیدائش ۵۵۷ ق۔م میں ہوئی۔ شدّودھن کی بیوی مہامایا اپنے باپ کے گھر جارہی تھیں کہ راستہ میں لمبنی گاؤں کے قریب ایک باغ میں گوتم پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ کا جلد ہی انتقال ہو گیا اور گوتم کو اس کی سوتیلی ماں نے پالا۔ شدّھودھن ایک معزز دولتمند راجہ تھا اور اس کے لڑکے نے وہی تعلیم حاصل کی جو اس کی حیثیت کے لئے ضروری تھی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس کی شادی ہو گئی اور ایک لڑکا بھی پیدا ہوا۔ گوتم کے لئے دنیا کی ہر نعمت اور آسائش موجود تھی اور وہ نہایت آسانی سے عیش و آرام کی زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے گوتم کو نہ سلطنت اور حکومت کے معاملات سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ عیش و عشرت سے۔ وہ ہر وقت مغموم رہتا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی خاص

فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ نہایت رحمدل تھا اور لوگوں کی مصیبت کو نہیں
دیکھ سکتا تھا۔ اکثر سوچتا کہ "یہ لوگ اندھے، لنگڑے لولے اور بیمار کیوں
ہیں؟ انسانوں میں دولت اور صحت میں فرق کیوں ہے؟ کیا دکھ اور موت
ضروری ہیں؟ کیا گناہ اور رنج لازمی ہیں؟" یہ مسائل تھے جن کو وہ
حل کرنا چاہتا تھا۔ آخرکار اس نے یہ طے کیا کہ گھر بار چھوڑ کر دنیا میں
پھرے اور انسان کو اس مصیبت سے نجات دلانے کا راستہ معلوم کرے چنانچہ
ایک رات جب محل میں سب بے خبر سو رہے تھے وہ اُٹھا اور اپنی بیوی اور
بچہ پر ایک آخری نظر ڈال کر روانہ ہوگیا۔ شہر سے نکل کر اس نے اپنے
قیمتی کپڑے اور جواہرات اپنے رتھ بان چنا کو دیدیئے اور خود فقیرانہ لباس
پہن کر جنگل کی طرف چلا گیا۔ گھومتا پھرتا وہ مگدھ کی راجدھانی راج گرہ
کے پاس ایک جنگل میں پہنچا۔ یہاں اس کو دو برہمن سنیاسی ملے ان کے پاس
رہ کر برہمن فلسفہ اور مذہب کی تعلیم حاصل کی لیکن اس سے اس کو اطمینان
قلب حاصل نہ ہوا۔ چنانچہ وہاں سے چل کر وہ گیا کے جنگلوں میں پہنچا اور
نہایت سخت ریاضت شروع کردی۔ چھ برس تک اس نے مختلف طریقوں
سے اپنے جسم کو تکلیفیں پہنچائیں۔ اس عرصہ میں پانچ سنیاسی اس کے چیلے
بھی ہوگئے۔ لیکن یہ چیلے اس کے ساتھ زیادہ عرصہ تک نہ رہ سکے اور
اس کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے۔ چھ سال کی متواتر ریاضت اور جسمانی تکالیف
کے باوجود بھی وہ اپنا مقصد حاصل نہ کرسکا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد وہ
ایک برگد کے درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ۴۹ دن برابر غور و فکر میں ڈوبا
رہا اور آخرکار اس کو صداقت کا جلوہ نظر آیا۔ جس صداقت کی
روشنی کو انسانوں۔ جانوروں۔ سنسان جنگلوں۔ بہتے ہوئے چشموں

اور تاریک راتوں میں تلاش کرتا پھرتا تھا وہ اس کے دل ہی میں موجود تھی۔
اس معرفت کے حاصل کرنے کے بعد وہ بُدھ یعنی عارف کہلانے لگا۔
وہ سمجھتا تھا کہ اُس کا یہ فرض ہے کہ اس سچائی کے پیغام کو بنی نوع
انسان تک پہنچائے۔ لہٰذا اس نے اپنی زندگی کا بقیہ حصّہ اپنے مذہب
کی اشاعت اور تبلیغ میں صرف کیا۔ اس کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ بُدھ مذہب
آج دنیا کے سب سے بڑے اور مشہور مذاہب میں شمار کیا جاتا ہے۔

بدھ مذہب کی اشاعت

اب اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے
بُدھ پھر دنیا کی طرف لوٹے سب سے پہلے
انھوں نے بنارس اور اس کے قرب و جوار میں وعظ دئے۔ لوگوں نے اُنکے
پیغام کو نہایت غور سے سنا اور ہزاروں کی تعداد میں اُن کے پیرو ہو گئے۔
اپنے چیلوں کو تبلیغ کے لئے دوسرے مقامات پر بھیجدیتے تھے۔ یہاں سے
چل کر مہاتما بُدھ مگدھ کی راجدھانی راج گریہ پہنچے۔ شہر میں داخل ہوئے
تو دیکھا کہ یگیہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ قربانی کے لئے سو بھیڑیں موجود
تھیں۔ راجہ۔ پنڈت اور عام لوگوں کا بڑا مجمع تھا۔ بدھ وہیں ٹھہر گئے
اور اس مجمع کو مخاطب کر کے کہا کہ اے لوگو! جانور بھی ہماری طرح سے جان
رکھتے ہیں، تم کو کیا حق ہے کہ ان کی جانیں ضائع کرو۔ کیا تم میں اتنی طاقت
ہے کہ ان کو ان کی جانیں پھر واپس دیدو؟ مجمع پر اس وعظ کا بہت اثر ہوا
اور ایک کثیر تعداد ان کی پیرو ہو گئی۔ یہاں سے گوتم بدھ اپنے والد سے
ملاقات کرنے کی خاطر کپل وستو پہنچے۔ راجہ شدّودھن ان کو بھکاری کے لباس
میں دیکھ کر ناراض ہوئے اور کہا کہ تم نے اپنے خاندان کی عزت کو خاک میں
ملادیا۔ بیٹے نے جواب دیا۔ میرے بزرگ تو سب بُدھ تھے۔ ان سب کی

گزر اوقات کا ذریعہ بھیک ہی تھا۔ بھیک مانگنا آپ کے لئے شرم کی بات ہوگی۔ میرے لئے تو یہ شرم کی بات نہیں"۔ اس پر بڈھے راجہ نے بھی بدھ مذہب قبول کیا۔ اس کے بعد گوتم کی بیوی یشودھرا اور اس کا بیٹا راہل بھی بدھ مت میں داخل ہوگئے۔ چالیس سال اسی طرح بدھ نے اپنے مذہب کی اشاعت کی اور ہزارہا مرید کئے۔ آخر کار ۴۸۳ ق۔م میں کشی نگر میں وفات پائی۔

بدھ کی تعلیم گوتم بدھ کی تعلیم نہایت سادہ تھی۔ ان زمانہ کے دوسرے لوگوں کی طرح ان کا خیال تھا کہ زندگی میں سوائے مصیبتوں کے اور کچھ نہیں، مصیبتوں کا سلسلہ موت سے ختم نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ فوراً ہی دوسری زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ زندگی کا مقصد یہی ہے کہ آواگون کے چکر سے نجات حاصل ہو۔ برہمنوں کا خیال تھا کہ قربانیاں اور چند دیگر مقررہ رسومات کے پورا کرنے سے انسان نجات حاصل کرسکتا ہے۔ جینی کہتے تھے کہ جسم کو تکلیف دینا اور سخت ریاضت نہایت ضروری ہیں۔ بدھ کی تعلیم ان سے بالکل مختلف تھی۔ ان کے خیال میں حرص و ہوس اور نفسانی خواہشات تمام مصیبتوں کی جڑ ہیں۔ ان کو مٹا کر ہی انسان پاک زندگی بسر کرسکتا ہے اور مصیبت سے بچ سکتا ہے۔ پاک زندگی کے لئے یہ آٹھ خوبیاں یا نیکیاں ضروری ہیں۔ صحیح ایمان۔ صحیح مقاصد۔ صحیح گفتگو صحیح عمل۔ صحیح روزی۔ صحیح کوشش۔ صحیح خیالات۔ صحیح فکر۔ ان نیکیوں کے ذریعے سے انسان نجات حاصل کرسکتا ہے۔ قربانی کرنا اور رسوم کی پابندیاں بالکل بے کار ہیں۔ ان اصولوں کے علاوہ درستی اخلاق کے لئے بزرگوں کی عزت اور والدین اور اولاد کی محبت کا بھی سبق دیا۔ فرض شناسی، سخاوت، عجز انکسار، صبر، قناعت اور انسان بلکہ ہر جاندار سے ہمدردی کرنا ہر شخص

کے لئے ضروری ہے۔ مہاویر کی طرح گوتم بدھ بھی ذات کے فرق کو نہیں مانتے تھے اور ہر شخص ان کے مذہب میں داخل ہو سکتا تھا۔

بدھ مذہب کا عروج اور اُس کے اسباب

بُدھ کی زندگی ہی میں بہت سے لوگ اُن کے پیرو ہوگئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے مذہب کی یہ ترقی جاری رہی، یہاں تک کہ ایک زمانہ میں بُدھ مذہب ہندوستان کے ہر حصّہ میں پھیل گیا۔ اور اس کے باہر لنکا، برما، چین اور دیگر ملکوں میں بہت لوگ اس مذہب کے پیرو ہوگئے۔ بُدھ مذہب کی ترقی کے لئے جن لوگوں نے کوشش کی ان میں سب سے زیادہ مشہور خاندان موریہ کا تیسرا بادشاہ راجہ اشوک تھا۔ اشوک کی کوششوں اور اس کی شاندار کامیابی کی تفصیل آگے آئے گی۔ دوسری صدی عیسوی میں راجہ کنشک نے اس مذہب کو قبول کیا اور اس کی اشاعت کے لئے بہت کوشش کی۔

بدھ مذہب کی ترقی کے بہت سے اسباب ہیں۔ اس کی بنیاد ایسے وقت پڑی جب کہ براہمنوں کی سختیاں لوگوں کو ان سے بیزار کر چکی تھیں۔ بدھ مذہب کی تعلیم سادہ اور صاف تھی اور قدرتی طور پر برہمنوں کے پیچیدہ مسائل کے مقابلہ میں لوگوں کے دلوں پر اس کا اثر زیادہ ہوتا تھا۔ بدھ ذات کے فرق کو نہیں مانتے تھے اور نیچی سے نیچی ذات والا اُن کے مذہب میں داخل ہو کر نجات حاصل کر سکتا تھا۔ بدھ اپنا وعظ عام فہم زبان میں دیتے تھے اور ہر شخص ان کی تعلیم کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ برہمن لوگ سنسکرت زبان استعمال کرتے تھے جس کو براہمنوں کے علاوہ اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ چھتریوں نے جو برہمنوں کے مخالف تھے ان کے اثر کو

کم کرنا چاہتے تھے۔ بدھ مذہب کی ترقی کے لئے پوری کوشش کی اور ہر طریقے سے مدد کی۔

جین اور بدھ مذہب کا مقابلہ

بہت سی باتوں میں مہاویر اور گوتم بدھ کی تعلیم یکساں ہے۔ لیکن ان میں زبردست اصولی فرق بھی ہیں۔ دونوں تناسخ کے مسئلہ کو مانتے تھے اور اہنسا پر زور دیتے تھے۔ ویدوں کو دونوں نہیں مانتے تھے ذات کے فرق اور یگیہ کو بیکار سمجھتے تھے۔ لیکن دونوں میں اصولی فرق یہ تھا کہ مہاویر کے نزدیک نجات حاصل کرنے کے لئے تپسیا کرنا اور جسم کو طرح طرح کی تکلیف دینا ضروری ہے۔ بدھ کے نزدیک خواہشات کا مٹانا اور درمیانی راستہ نہایت ضروری ہیں۔ جین مذہب بہ نسبت بدھ مذہب کے ہندو مذہب سے زیادہ قریب ہے۔

باب ۸
ہندوستان پر سکندر اعظم کی فوج کشی

ہندوستان پر ایرانیوں کا حملہ

چھٹی صدی قبل مسیح میں شمالی و مغربی ہندوستان میں بہت ہی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ جو آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ اس زمانہ میں ایران کا بادشا

دارا اوّل تھا۔ اُس کی سلطنت مغرب میں بغداد اور بابل تک اور مشرق میں افغانستان تک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے ہندوستان بھی فتح کرکے اپنی وسیع سلطنت میں شامل کرے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنے ایک مشہور سپہ سالار اسکائی لاکس کو بھیجا اسکائی لاکس اٹک پر کشتیوں میں سوار ہوکر دریائے سندھ کے راستہ سے بحیرۂ عرب تک پہنچا اور وہاں سے اپنے وطن کو واپس چلا گیا۔ اس طرح سے گاندھار۔ سندھ اور مغربی پنجاب دارا کے قبضہ میں آئے اور سلطنت ایران میں شامل کرلئے گئے۔ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ایرانیوں نے ہندوستان کے حصّہ پر کتنی مدت تک حکومت کی۔ لیکن ۴۷۹ء ق۔م میں جب دارا کے بیٹے زرکسیز نے یونان پر حملہ کیا تھا تو ہندوستانی تیرانداز ایرانی فوج میں موجود تھے۔ مگر سکندر کے حملے سے پہلے ہندوستانی ایرانیوں کو اپنے ملک سے نکالکر آزادی حاصل کرچکے تھے۔

سکندرِ اعظم کی فتوحات

سکندرِ اعظم یونان کی مشہور ریاست مقدونیا کے بادشاہ فلپ کا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کی وفات پر بیس سال کی عمر میں وہ تخت پر بیٹھا۔ وہ ایک باہمت، بلند حوصلہ اور بہادر نوجوان تھا۔ اور اس کا شمار دنیا کے مشہور فاتحوں میں ہوتا ہے ۳۳۴ء ق۔م میں اس نے ایران پر حملہ کیا اور پانچ سال بعد سُغد اور باختر کو فتح کرتا ہوا افغانستان

کے علاقہ میں داخل ہوا۔

ہندوستان پر حملہ

۳۲۷ء ق۔م میں وہ کوہ ہندوکش کے درّوں میں سے گزرتا ہوا ہندوستان کی طرف بڑھا۔ یہاں اُس نے اپنی فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصّہ درۂ خیبر کی طرف روانہ ہوا۔ دوسرے حصّہ کے ساتھ وہ خود گیا اور سرحدی قبیلوں کی سرکوبی کرکے راستہ کو محفوظ کیا۔ بہرحال ۳۲۶ء ق۔م کے شروع میں سکندر نے دریائے سندھ کو اوہند کے مقام پر عبور کیا۔ اسی جگہ ٹکشلا کے راجہ امبھی نے اس کا خیر مقدم کیا اور کچھ عرصہ تک سکندر راجہ آمبھی کا مہمان رہا۔

ٹکشلا

اس وقت شمالی مغربی ہندوستان میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ ان کے باہمی تعلّقات کشیدہ تھے اور یہ ناممکن تھا کہ وہ متحد ہوکر دشمن کا مقابلہ کریں۔ ٹکشلا کا راجہ امبھی اپنے پڑوسی راجہ پورس کا جانی دشمن تھا۔ اس نے سکندر اعظم سے دوستانہ تعلّقات اس لئے قائم کئے تھے کہ اس کو پورس کی طرف سے خطرہ تھا۔ ٹکشلا اُس زمانہ میں ہندوستان کے مشہور شہروں میں سے تھا۔ حال ہی میں یہاں ایک بڑے شہر کے کھنڈرات نکلے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک بڑی یونیورسٹی تھی جس میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے۔ لوگ خوشحال اور راجہ دولتمند تھا۔ یونانیوں نے بہت سی عجیب و غریب رسوم کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ غریب والدین اپنی کنواری لڑکیوں کا سر بازار نیلام کرتے تھے۔ مُردوں کو کھُلی جگہ میں ڈال دیتے تھے کہ گدھ کھا جائیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ راجہ امبھی نے اپنے معزز

مہمان کی خدمت میں دس ہزار بھیڑیں اور تین ہزار بچھڑے پیش کئے تھے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے لوگ گوشت کھاتے تھے اور یہ کہ ایرانی تہذیب کا اثر شمالی مغربی ہند پر موجود تھا۔

جھیلم کی لڑائی ۳۲۶ ق۔م

سکندر نے چند روز ٹکسلا میں آرام کیا اور موسم برسات کے شروع میں جھیلم کی طرف روانہ ہوا۔ پورس (پوروا) جس کی سلطنت جھیلم اور چناب کے درمیان واقع تھی ایک بہادر اور طاقتور راجہ تھا۔ اس نے سکندر کی اطاعت قبول نہ کی اور جنگ کے لئے تیار ہو گیا۔ جب سکندر جھیلم کے کنارے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کا دشمن اپنی فوج لئے ہوئے دریا کے دوسری طرف موجود ہے۔ چونکہ دریا اس وقت طغیانی پر تھا۔ سکندر اس کو آسانی سے عبور نہ کر سکا۔ چند روز تک دونوں لشکر اسی طرح پڑے رہے لیکن ایک اندھیری رات میں سکندر کچھ فوج ہمراہ لے کر دریا کے کنارے شمال کی جانب روانہ ہو گیا۔ سولہ میل کے فاصلہ پر اس کو موقعہ مل گیا اور رات ہی رات میں دریا پار کر کے وہ دوسری طرف پہنچ گیا۔ اب یونانی سپاہی ہندوستانی فوج کی طرف بڑھے اور کرّی کے میدان میں دونوں کا مقابلہ ہوا۔ سکندر کے ساتھ اس وقت چھ ہزار پیادے اور چار ہزار سوار تھے اور پورس کی فوج میں تیس ہزار پیادے۔ چار ہزار سوار، تین سو رتھ اور دو سو ہاتھی تھے۔ ہندوستانی فوج نہایت دلیری سے لڑی لیکن آخر میں اسکو شکست ہوئی۔ بارہ ہزار آدمی مارے گئے اور نو ہزار زندہ گرفتار ہوئے۔ یونانیوں کی فتح کا سب سے بڑا سبب سکندر کی ذاتی قابلیت اور ہوشیاری تھی لڑائی کے بعد پورس سکندر کے سامنے لایا گیا۔ سکندر نے اُس کا

ملک اس کو واپس دے دیا۔

سکندر کی واپسی

اس شاندار فتح کی یادگار کے طور پر سکندر نے اسی مقام پر دو نئے شہر آباد کئے اور دریائے چناب کو پار کر کے راوی کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد اس نے سانگلہ پر حملہ کیا تھوڑی ہی فاصلہ پر گنگا کی وادی میں مگدھ کی وسیع اور دولت مند سلطنت واقع تھی۔ سکندر چاہتا تھا کہ بیاس کو پار کر کے اس سلطنت کو بھی فتح کرے۔ لیکن جب وہ دریائے بیاس کے کنارے پہنچا تو اس کے سپاہیوں نے آگے بڑھنے سے قطعاً انکار کیا۔ ان کو اپنا وطن چھوڑے ہوئے عرصہ گذر گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ واپس جائیں۔ سکندر کی کوشش کام نہ آئی اور اس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ واپس ہونے سے پہلے سکندر نے اپنی فتوحات کی آخری حد یعنی بیاس کے کنارے بارہ قربان گاہیں تیار کرائیں تاکہ اس کی فتوحات کی یاد قائم رہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ان عمارتوں میں سے ایک کا بھی پتہ نہیں چل سکا۔

دریائے جہلم کے کنارے پہنچکر اس نے کشتیوں کا ایک بیڑا تیار کیا اور دریا ہی کے راستہ سے دریائے سندھ میں داخل ہوا۔ فوج کے کئی حصے اس بیڑے کی حفاظت کے لئے دریا کے دونوں کناروں پر چلتے تھے۔ راستے میں اُس کو بہت سے جنگجو قبیلوں سے لڑنا پڑا اور ایک موقع پر جان سخت خطرے میں پڑگئی تھی لیکن اس کے چند وفادار اور بہادر سپاہیوں نے اس کو بچا لیا۔ سکندر کا یہ دستور تھا کہ مفتوحہ ممالک میں وہ نئے شہر آباد کرتا۔ چنانچہ اس دریائی سفر کے دوران میں بھی اس نے چند شہر آباد کئے جن میں سے پٹالہ یعنی حیدر آباد سندھ سب سے زیادہ

مشہور ہے۔ سندھ کو اس نے اپنی سلطنت کا ایک صوبہ بنایا اور دریائے سندھ کے مخرج پر پہنچکر اپنی فوج کو دو حصّوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ شمالی وچبتان میں درّہ بولن کے راستہ سے روانہ ہوا۔ سکندر خود جنوبی بلوچستان کی طرف سے گیا اور باقی فوج جہازوں میں سوار ہوکر سمندر کے راستہ سے واپس ہوئی۔ ۳۲۴ ق۔م میں وہ ایران واپس پہنچ گیا اور اس کے ایک سال بعد جون ۳۲۳ ق۔م میں اس نے وفات پائی۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۳۳ سال کی تھی اور تیرہ سال اُس کی تخت نشینی کو گزرے تھے۔

سکندر کے حملہ کا ہندوستان پر اثر

سکندر کو ہندوستان سے گئے ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ یہاں کے لوگوں نے یونانیوں کی مخالفت شروع کردی اور بہت جلد اُن کو دریائے سندھ کے پار بھگا دیا۔ یہاں تک کہ فتوحات کا تعلق ہے۔ سکندر کی ہندی فتوحات سب سے کم دیرپا ثابت ہوئیں۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ حملہ اپنے فوائد اور نتائج کے لحاظ سے ہماری تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ سکندر کے ہمراہ بہت سے عالم اور فاضل یہاں آئے اور اس طریقہ سے ممالک مشرقی کے متعلق اہل مغرب کی معلومات بہت وسیع ہوگئی۔ نئے نئے بحری و برّی راستے معلوم ہوئے جن کی وجہ سے تجارت کو بہت ترقی ہوئی اور باہمی تعلّقات اور تبادلۂ خیالات سے علوم اور فنون اور مذہبی رسومات پر گہرا اثر پڑا۔

بہرحال یہ واقعہ ہے کہ سکندر کے بعد ہندوستان میں پہلی مرتبہ ایک وسیع اور زبردست سلطنت قائم ہوئی۔ جس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ لوگ

بیرونی حملہ کے خوف سے اب اس کے لئے تیار تھے کہ اپنے آپ کو ایک طاقتور حکمران کے سپرد کردیں۔ شاید یونانیوں کی وسیع سلطنت کو دیکھ کران کو اس کا بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ ایک بڑی سلطنت طوائف الملوکی سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ سکندر کی وفات پر اس کے سردار آپس میں لڑنے لگے اور چندر گپت موریہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر شمالی ہندوستان پر قبضہ کرلیا اور اپنی قابلیت سے بہت جلد ایک وسیع اور طاقتور حکومت کی بنیاد ڈالی۔

باب ۹

سلطنت موریہ

مگدھ گنگا کی وادی میں جو ریاستیں قائم ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے مشہور اور طاقتور ریاست مگدھ تھی۔ مگدھ کا پہلا خاندان جس کے حالات ہم کو ملتے ہیں ششو ناگ خاندان سے مبسار جو مہاویر اور گوتم کا ہمعصر تھا اسی خاندان کا پانچواں راجہ تھا۔ اس نے اپنی شادی کوشل کی راجکماری سے کی اور اس طرح سے اپنی قوت میں اضافہ کیا۔ روایت ہے کہ اس کے بیٹے اجات شترو نے اس کو مار ڈالا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ اجات شترو نے پہلے کوشل کے راجہ کو شکست دی اور پھر لچھویوں کے دارالسلطنت ویسالی کو فتح کیا۔ اجات شترو کی ان فتوحات

سے مگدھ کا علاقہ کوہ ہمالیہ کے دامن تک پہنچ گیا۔ دریائے سون اور
گنگا کے سنگم کے قریب اس نے ایک قلعہ بنوایا جس کے گرد بعد میں قدیم
ہند کا مشہور شہر پاٹلی پتر آباد ہوا۔ ششوناگ خاندان کے آخری راجہ
مہانند نے ایک شودر عورت سے شادی کر لی تھی۔ اس نے ایک حجام
مہاپدم نند سے اپنے شوہر کو مروا ڈالا۔ مہاپدم نند نے ایک نئے خاندان
کی بنیاد ڈالی جو نند کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان کے حالات
بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ دولتمند
اور طاقتور تھے۔ سکندر کے حملہ کے وقت نند خاندان کا آخری راجہ،
مگدھ میں سلطنت کر رہا تھا۔ اس راجہ نے چندرگپت کو جو شاہی خاندان
سے تعلق رکھتا تھا مروانا چاہا۔ لیکن وہ اپنی جان بچا کر پنجاب کی طرف
بھاگ گیا اور وہاں سکندر سے ملاقات کی سکندر کے چلے جانے کے بعد
پنجاب کے قبائل کی مدد سے چندرگپت نے یونانیوں کو ملک سے نکال کر
پنجاب پر قبضہ کر لیا اور ایک زبردست فوج لے کر مگدھ پر چڑھائی کی
اور نند خاندان کے راجہ کو قتل کر کے ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی جو
تاریخ ہند میں موریہ خاندان کے نام سے مشہور ہے۔

چندرگپت کی سلطنت

چندرگپت موریہ ۳۲۱ ق۔م میں تخت نشین
ہوا۔ اس کے کچھ حالات بدھ، جین اور
یونانیوں کی کتاب میں ملتے ہیں۔ حال ہی میں دربار میسور نے سنسکرت
کی ایک دلچسپ کتاب ارتھ شاستر شائع کی ہے اس کا مصنف
چندرگپت کا وزیر چانکیہ یا کوٹلیہ ہے۔ اس کتاب میں سیاست اور
حکومت کے اصولوں پر بحث کی گئی ہے۔ موریہ خاندان کے زمانہ ہی سے ہمارے

ملک کی صحیح تاریخ شروع ہوتی ہے۔ ہم کو صحیح تاریخیں بھی ملتی ہیں اور ایک بڑی سلطنت کے انتظام حکومت کی تفصیل بھی۔

چندرگپت ایک بہادر اور بلند حوصلہ بادشاہ تھا۔ سلطنت کا انتظام نہایت ہوشیاری سے کرتا تھا۔ یہ تم پڑھ چکے ہو کہ سکندر کے بعد جب پنجاب کے قبائل نے بغاوت کی تھی تو چندرگپت اُن کا سرگروہ تھا۔ یہ بغاوت کامیاب ہوئی اور چندرگپت نے پنجاب پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح سے اپنے وزیر چانکیہ کی مدد سے اس نے مگدھ کے آخری نند راجہ کے خلاف سازش کرکے مگدھ کا تخت چھین لیا۔ رفتہ رفتہ اس نے نربدا کے شمال کا سارا ملک خلیج بنگال سے لیکر بحر عرب تک اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ سکندر کی وفات کے بعد اس کے سردار آپس میں لڑنے لگے۔ بارہ سال کی متواتر خانہ جنگیوں کے بعد اس کے ایک سردار سلیوکس نے مغربی اور وسط ایشیا پر قبضہ کرلیا۔ سکندر کے اس جانشین کی خواہش تھی کہ ان صوبوں کو فتح کرکے جہاں سے یونانی نکال دئے گئے تھے ہندوستان کے اس حصے پر بھی قبضہ کرے جہاں سکندر نہ پہنچ سکا تھا۔ چنانچہ ۳۰۵ ق۔م میں ایک بڑی فوج کے ساتھ اس نے سندھ کو عبور کیا۔ لیکن اب حالات بدل گئے تھے۔ چندرگپت بھی مقابلہ کے لئے آیا اور یونانی حملہ آور کو شکست فاش دی۔ لڑائی کے بعد دونوں میں صلح ہوگئی۔ چندرگپت نے سلیوکس کو پانچسو ہاتھی دیئے اور سلیوکس نے اپنی بیٹی کی شادی چندرگپت سے کردی اور ساتھ ہی ہندوکش تک کا وہ تمام علاقہ جسے ہم افغانستان کہتے ہیں چندرگپت کے حوالے کیا۔ سلیوکس نے اپنا ایک سفیر میگستھنیز نامی چندرگپت کے دربار

میں بھیجا جو ایک عرصہ تک پاٹلی پتر میں رہا۔ اس نے ہندوستان کی پیداوار۔ طرز معاشرت۔ رسم ورواج۔ مذہب اور انتظام حکومت کا حال لکھا ہے میگستھینز کی اصل کتاب مفقود ہے اور اب اس کے صرف وہ اجزار ملتے ہیں جنہیں دوسرے مصنفوں نے اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے۔

میگستھینز

میگستھینز نے بہت سی باتیں چشم دید لکھی ہیں لیکن کچھ ایسی بھی ہیں جو اس نے دوسروں سے سنی ہیں۔ چنانچہ اس کے بیانات میں بہت سے ایسے قصے ہیں جو قطعاً ناقابل اعتبار ہیں۔ علاوہ اس کے وہ یہاں کے تمدن اور زبان سے ناواقف تھا اور یہاں کے رسم ورواج کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا تھا۔ اس کے اقوال کو پڑھتے وقت ان باتوں کو مد نظر رکھنا چاہیئے۔ وہ لکھتا ہے کہ چندر گپت کو موت کا ہر وقت خطرہ ہے اور اس کی حفاظت کے لئے مسلح عورتوں کا ایک دستہ موجود رہتا ہے۔ دن میں ایک مرتبہ اسے اپنی شکل لوگوں کو دکھلانی ضروری ہے۔ وہ فریادیں خود سنتا ہے اور مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے۔ شاہی محل کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ بادشاہ کا محل دنیا میں سب سے زیادہ شاندار تھا۔ یہ زیادہ تر لکڑی کا بنا ہوا تھا۔ ستونوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا اور جا بجا سونے چاندی کی بیلیں اور پرندے بنے ہوئے تھے۔ مگدھ کا پایۂ تخت پاٹلی پتر سون اور گنگا کے سنگم پر واقع تھا جہاں اب پٹنہ، بانکی پور آباد ہے۔ شہر کی لمبائی ۹ میل اور چوڑائی ۲ میل تھی۔ حفاظت کے لئے اس کے چاروں طرف لکڑی کی شہر پناہ تھی جس میں ۶۴ دروازے اور ۵۷۰ برج تھے۔ خندق کے لئے دریائے سون کا پانی

آتا تھا۔ یہ خندق چھ سو فٹ چوڑی اور تیس ہاتھ گہری تھی۔

فوجی نظام

چندر گپت کے عہد میں مگدھ کی جنگی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اس کے پاس چھ لاکھ پیادے تیس ہزار سوار اور نو ہزار ہاتھی تھے۔ اس کے علاوہ رتھ بھی تھے جن کی تعداد معلوم نہیں۔ رتھ میں بالعموم دو سپاہی اور ہاتھی پر تین تیرانداز ہوتے تھے۔ اس حساب سے چندر گپت کی فوج کی کل تعداد تقریباً سات لاکھ تھی۔ میگستھنیز صاف طور سے لکھتا ہے کہ سپاہیوں کی تنخواہ اور اسلحہ شاہی خزانہ سے ملتے تھے۔ اس کثیر فوج کے انتظام کے لیے ایک محکمہ جنگ قائم تھا۔ فوج کا کل انتظام تیس آدمیوں کی چھ چھوٹی چھوٹی کمیٹیوں کے سپرد تھا۔ یعنی پیادہ و سوار فوج۔ جنگی ہاتھی اور رتھ وغیرہ کا انتظام علیحدہ علیحدہ کمیٹی کے سپرد تھا۔ ہر کمیٹی میں پانچ ممبر تھے۔ ہر سوار کے پاس دو بھالے اور ایک ڈھال ہوتی تھی۔ پیادہ سپاہی کا خاص ہتیار تلوار تھی اس کے علاوہ تیر اور کمان بھی استعمال کرتے تھے۔ کمان کو بائیں پیر کی مدد سے کھینچکر تیر چھوڑتے تھے۔

نظام حکومت

دارالسلطنت کے انتظام کے لئے بھی تیس ممبروں کی ایک مجلس تھی جو پانچ پانچ آدمیوں کی چھ کمیٹیوں پر منقسم تھی۔ پہلی کمیٹی کے سپرد صنعت اور دستکاری کا انتظام تھا۔ دوسری کمیٹی باہر سے آنے والے مسافروں اور سوداگروں کی نگہبانی کے لئے تھی۔ تیسری کے سپرد اموات و پیدائش کا رجسٹر تھا۔ چوتھی تجارت اور ناپ تول کے آلات کی جانچ پڑتال کے لئے تھی۔ پانچویں کارخانوں کی دیکھ بھال کرتی۔ چھٹی کمیٹی کا کام یہ تھا کہ خرید و فروخت کے متعلق قوانین بنائے

اور جو اشیاء بازار میں فروخت ہوں اُن پر چنگی لگائیے۔
میگستھینز نے سلطنت کے صوبوں کی حکومت کی تفصیل نہیں لکھی ہے صوبہ داروں کی صحیح تعداد بھی نہیں معلوم۔

آمدنی کے ذرائع

راجہ کی آمدنی کا سب سے بڑا حصّہ کسانوں سے ملتا تھا جن سے پیداوار کا ۱/۴ حصّہ وصول کیا جاتا تھا۔ آب پاشی کا ایک مستقل محکمہ قائم تھا۔ جو نہروں اور بندوں کو درست رکھتا اور زمین کی پیمائش کرتا تھا۔ لگان کے علاوہ اشیاء تجارت پر ٹیکس تھا۔ جنگلات اور دیگر ذرائع سے بھی راجہ کو کافی آمدنی تھی۔ اس آمدنی کو قائم رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ تجارت میں ہر قسم کی آسانیاں پیدا کی جائیں چنانچہ سڑکوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک علیحدہ محکمہ قائم تھا۔ پاٹلی پُتر سے شمالی مغربی سرحد تک ایک ہزار میل لمبی سڑک موجود تھی۔ ہر نصف کوس پر ایک پتھر گاڑ دیا گیا تھا تاکہ فاصلہ کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

جرائم اور اُن کی سزا

جرائم کا ارتکاب بہت کم ہوتا تھا۔ لیکن جو شخص کوئی جرم کرتا تو اُس کو نہایت سخت اور عبرت انگیز سزا دی جاتی۔ مثلاً ٹیکس ادا کرنے سے بچنے کی کوشش کرنا ایک سنگین جرم تھا جس کی سزا موت تھی۔ بادشاہ کے خلاف بغاوت یا سازش سب سے سنگین جرم خیال کیا جاتا تھا اور اس کے مجرم کو زندہ آگ میں ڈال دیتے تھے۔ لیکن غالباً سب سے زیادہ خوفناک چیز یہ تھی کہ اقبال جرائم کے لئے ملزم کو اذیت اور تکلیف پہنچانا قانوناً جائز تھا۔ ارتھ شاستر کے مصنف نے اذیت کے اٹھارہ ہولناک طریقے بتلائے ہیں۔ وہ کہتا ہے

نہ ہر روز ان میں سے نیا طریقہ استعمال کرنا چاہیے اور زیادہ سنگین جرموں میں ایک سے زیادہ بلکہ سب استعمال کرنے چاہئیں۔

عام حالت میگستھینز کے زمانہ میں ذات کے قوانین کافی سخت تھے لوگ آرام اور اطمینان سے رہتے تھے۔ وہ نہایت خوش حال تھے۔ سادگی اور کفایت شعاری کی زندگی بسر کرتے تھے قربانی کے موقعوں کے علاوہ شراب نہیں پیتے تھے۔ غلام رکھنے کا دستور تھا لیکن غلاموں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے رہتے۔

چندرگپت کی وفات مندرجہ بالا حالات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ چندرگپت ایک ہوشیار۔ بہادر۔ جنگجو اور مطلق العنان بادشاہ تھا۔ لیکن وہ اپنے ملک کا انتظام نہایت توجہ سے کرتا تھا اور یہی سبب تھا کہ اس کی رعایا آرام کی زندگی بسر کرتی تھی چندرگپت نے چوبیس سال تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور اس کے بعد جینیوں کی ایک روایت کے موافق وہ تارک الدنیا ہوگیا اور ایک جینی مرد کے ساتھ جنوبی ہندوستان کے جنگلوں میں چلا گیا اور سنیاسیوں کی طرح رہنے لگا۔ اس رشی کے مرنے کے بعد اس نے وہیں (میسور کے علاقہ میں) فاقہ کشی کرکے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

بندوسار چندرگپت کے بعد اس کا بیٹا بندوسار ۲۹۸ق م کے تخت پر بیٹھا۔ بندوسار کے عہد کے حالات کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ لیکن کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس نے اپنے باپ کی سلطنت کو جنوب کی طرف اور بڑھایا کیونکہ اشوک کے زمانہ میں سلطنت کلنگ کو چھوڑ کر دکن کا بیشتر حصہ سلطنت موریہ میں شامل تھا۔ مگر یہ صرف قیاس ہے جس کے لئے

ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔

باب ۱۰

اشوک سنہ ۲۷۲-۲۳۲ ق۔م

اشوک کی تخت نشینی بندوسار کے بعد اس کا بیٹا اشوک تخت نشین ہوا۔ اشوک عہد قدیم کا سب سے مشہور اور بڑا بادشاہ سمجھا جاتا ہے۔ مسلمانوں سے پہلے کسی کی سلطنت اسقدر وسیع نہیں ہوئی جتنی کہ اُس کی تھی۔

فتح کلنگ سنہ ۲۶۱ ق۔م اپنے باپ کے زمانہ میں اشوک ٹکشلا اور اُجین نئے صوبوں میں گورنری کا کام کرچکا تھا۔ اس لئے تخت نشینی کے وقت وہ امور سلطنت سے ناواقف نہ تھا۔ خاندانی روایات کا اس پر کافی اثر تھا شاہی شان وشوکت اور ملک گیری کا وہ اسی قدر دلدادہ تھا جیسے کہ اُس کے باپ اور دادا جس کا ثبوت ہم کو کلنگ کے حملے میں ملتا ہے۔ ریاست کلنگ سمندر کے کنارے مگدھ سے مشرق کی جانب واقع تھی میگستھینز کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فوجی قوت میں وہ مگدھ کے علاوہ سب سے بڑھی ہوئی تھی اور اسی بنا پر وہاں کا راجہ اشوک کی اطاعت قبول کرنے پر راضی نہ ہوا۔ اشوک نے ایک زبردست فوج کے ساتھ حملہ کرکے اُس کو فتح کرلیا۔ اس لڑائی میں ایک لاکھ آدمی ہلاک ہوئے

اور ڈیڑھ لاکھ زندہ گرفتار ہوئے اور اس سے بھی زیادہ قحط اور وبا کے شکار ہوئے۔ ان واقعات کا اس کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ اُس کے خیالات بالکل بدل گئے اور اُس نے عہد کیا کہ وہ آیندہ کبھی لڑائی نہ لڑے گا۔

۲۵۶ ق م کے ایک کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اشوک کو اس قتل و غارت سے انتہائی صدمہ ہوا تھا۔ اُس نے ہندو مذہب کو ترک کیا اور اُپ گپت نامی گرو کے کہنے سے بدھ مذہب اختیار کیا اور اپنی زندگی کے بقیہ حصّہ کو اسی مذہب کی اشاعت کے لئے وقف کر دیا۔

اشوک کا دھرم

اشوک کا دھرم درحقیقت بدھ مذہب کے بنیادی اصولوں پر مبنی تھا۔ اُس نے تین باتوں پر زور دیا ہے۔ اوّل یہ کہ جانداروں کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔ دوم یہ کہ والدین، اُستاد اور بزرگوں کا ادب کرو۔ اور تیسرے سچ بولو اور اپنے آپ کو قابو میں رکھو کیونکہ سارے دھرم کا نچوڑ یہی ہے۔

اس واقعہ سے اُس نے کتبوں میں کسی مذہبی پیشوا کا کہیں ذکر نہیں کیا بعض مورخ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ یہ احکامات ہر مذہب و ملت کے آدمیوں کے لئے تھے اور وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اُن کو بدھ مذہب والوں کے لئے مخصوص کر دے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اشوک صرف خود ہی بدھ مذہب کا پیرو نہیں تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی اشاعت دنیا کے ہر حصّہ میں کی جائے اور اس کے لئے اُس نے ہر ممکن کوشش کی۔

اشاعت مذہب

ان اصولوں کی اشاعت کے لئے اشوک نے جو طریقے اختیار کئے اُن کی تفصیل تاریخ کے طالب علم کے لئے دلچسپ بھی ہے اور ضروری بھی۔

نئی رسوم کا اضافہ

(۱) اپنی زندگی میں اصلاح کی۔

لوہ ذات

(۲) کتبات کے ذریعے یہ اصول اپنی رعایا تک پہنچائے۔

(۳) ہندوستان اور باہر کے ممالک میں مبلغ بھیجے۔

(۴) پاٹلی پتر کی مجلس منعقد کی۔

اشوک کی زندگی سب سے زیادہ موثر طریقہ غالباً یہی تھا کہ اُس نے اپنی زندگی کی زندہ مثال قائم کی۔ بدھ مذہب اختیار کرنے سے پہلے وہ شاہانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ شکار اور لڑائی سے اُس کو دلچسپی تھی۔ ہزارہا جانور اُس کے باورچی خانہ کے لئے ذبح کئے جاتے تھے لیکن اب اُس نے یہ سب چیزیں ترک کر دیں اور جانداروں کی جان لینا بڑا گناہ سمجھتا تھا۔ شاہی محلات میں گوشت بند کر دیا گیا لیکن عام لوگوں کو اجازت تھی کہ وہ بعض جانوروں کا گوشت بعض مخصوص دنوں میں کھا سکتے تھے۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ اشوک نے جن جانوروں کو ممنوع قرار دیا تھا اُن میں گائے بیل اور سینگ دار جانور شامل نہیں تھے۔ اگرچہ ارتھ شاستر میں ان کا مارنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ اشوک کا برتاؤ دوسرے مذہب والوں کے ساتھ نہایت اچھا تھا۔ وہ متعصب اور تنگ نظر نہیں تھا۔ جس قدر زمانہ گذرتا جاتا تھا وہ مذہب کی طرف کھنچتا جاتا تھا۔ سنہ ۲۴۹ ق۔م میں وہ متبرک مقامات دیکھنے کو نکلا اور بنی۔ کپل وستو۔ بدھ گیا۔ سارناتھ اور کشی نگر کی سیر کی۔ آخر زمانہ میں وہ باقاعدہ بھکشوؤں کی جماعت (سنگھ) میں داخل ہوا اور فقیرانہ لباس پہنکر مذہب کی تبلیغ کے لئے مختلف حصوں میں گھوما۔

کتبات اشوک کے مذہبی عقائد۔ اخلاقی اصول اور آئین حکومت بلکہ اس عہد کے حالات کا پتہ اُن کتبات سے چلتا ہے جو اُس نے

ے میناروں پر کندہ کرا دئے ہیں۔ یہ کتبے ہمالیہ سے
ور خلیج بنگال سے بحرِ عرب تک ملک کے مختلف حصوں میں نکلے
ہیں جن سے اس کی سلطنت کی وسعت کے علاوہ اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے
کہ اُس زمانہ میں تعلیم کا چرچا تھا۔ عہد مذکور کی سیاسی اور تمدنی حالت کا بھی
ان سے بہت کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

اشوک کی لاٹیں جن میں سے بعض بعض پچاس فٹ سے زیادہ بلند ہیں قدیم
ہند کی فن سنگ تراشی کا بے بہا نمونہ ہیں۔ افسوس ہے کہ اُس کے عہد کی
عمارتیں موجود نہیں اور فن تعمیر کی ترقی کا کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکتا لیکن اُس
کے مینار اور سارناتھ کے سنگ تراشی کے نمونے جو موجود ہیں یہ صاف ظاہر کرتے
ہیں کہ یہاں کے لوگوں نے اس فن میں بہت کمال حاصل کر لیا تھا۔

بیرونی ممالک میں تبلیغ

اشوک چاہتا تھا کہ مذہب کی تبلیغ صرف اسی
ملک تک محدود نہ رہے بلکہ دنیا کے ہر حصہ
میں اگر ممکن ہو تو اس کی تبلیغ کی جائے۔ اس خیال سے اُس نے بدھ مذہب کے
مبلغین لنکا۔ تبت۔ برما اور مصر۔ شام اور یونان تک بھیجے۔ ان تمام مقامات
میں سب سے زیادہ کامیاب لنکا کا مشن تھا۔ یہاں اشوک نے اپنے بھائی
مہندر اور بہن سنگھ مترا کو بھیجا تھا۔ لنکا میں بہت سے لوگوں نے بدھ مذہب
اختیار کر لیا اور اب تک اس جزیرہ میں بدھ کافی تعداد میں ہیں۔ دوسرے
ممالک کی بابت کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مبلغین کس حد تک کامیاب ہوئے
مگر اس میں شک نہیں کہ یہ اشوک ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ بدھ مذہب آج
دنیا کے بڑے مذہبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

پاٹلی پُتر کی مجلس

اپنے عہد حکومت کے آخری زمانہ میں اشوک نے

ایک بڑی مجلس پاٹلی پُتر میں منعقد کی۔ بدھ عالموں نے رسوم کا اضافہ یں ترمیم کی۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ بدھ مذہب کے ماننے والوں وہ ذات ہمیشہ اتحاد قایم رہے۔

اشوک کا اُصول سلطنت

اشوک نے مذہبی رنگ اختیار کرنے کے بعد حکومت کے اصول کو بھی بدل دیا۔ وہ زیادہ تر خوش رہتا تھا اور فریادی ہر وقت اس کے پاس جا سکتا تھا۔ وہ اپنی رعایا کو مثل اپنے بچوں کے سمجھتا تھا اور ہر طرح سے اُن کی دلجوئی کرتا اور آرام پہنچاتا۔ اس نے سڑکوں کے کنارے سایہ دار درخت لگوائے اور کنوئیں تیار کرائے اور آدمیوں اور حیوانوں کے لئے اسپتال کھلوائے سلطنت کے معاملات میں اشوک چاہتا تھا کہ نیکی اور رحمدلی سے لوگوں کے دلوں پر قابو پائے۔

اشوک نہایت فرض شناس بادشاہ تھا۔ اُس کا قول ہے کہ "میں اپنی کوشش اور کام سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔ عوام الناس کے فائدے کے لئے مجھ کو کام کرنا چاہیے کیونکہ کام سے بہتر اُن کو فائدہ پہنچانے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔ میں یہ تمام جانفشانی کس لئے کرتا ہوں؟ اس لئے کہ میں اُس قرض کو ادا کرسکوں جو ہر جاندار کا میرے ذمہ ہے اور جن کو میں یہاں خوش کرتا ہوں ممکن ہے کہ وہ بعد میں نجات حاصل کرسکیں" یہ باتیں صرف کہنے ہی کی نہیں تھیں وہ اپنی وسیع سلطنت پر چالیس سال تک نہایت امن اور سکون سے حکومت کرتا رہا۔ اُس کے دورِ حکومت میں یہ ممکن نہیں تھا کہ ظالم اور جابر اپنی سزا کو نہ پہنچے۔ اُس کے زمانہ میں کہیں اُس کے خلاف بغاوت نہیں ہوئی۔ نہ کسی نے اُس کی مخالفت کی چنانچہ اشوک عہد قدیم کے حکمرانوں میں ایک بلند مرتبہ رکھتا ہے۔

...ی وفات اور موریہ خاندان کا زوال

اشوک کی وفات ۲۳۲ سنہ ق۔م میں ہوئی اور اُسی وقت سے موریہ خاندان کا زوال شروع ہو گیا۔ اشوک کے بعد اُس کے دو پوتے دشرتھ اور سامپرتی تخت نشین ہوئے۔ غالباً دشرتھ مگدھ اور شرقی حصہ پر قابض تھا اور سامپرتی مغربی صوبوں پر لیکن اس سے زیادہ نہ ان کے متعلق کچھ معلوم ہے اور نہ ان کے جانشینوں کے۔ اتنا ظاہر ہے کہ موریہ سلطنت برابر کمزور ہوتی گئی اور مختلف صوبے رفتہ رفتہ خود مختار ہو گئے۔ موریہ خاندان کے آخری راجہ برھدرتھ نامی کو اُس کے سپہ سالار پشیہ متر نے قتل کرا دیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔ پشیہ متر نے جس خاندان کی بنیاد ڈالی وہ شنگ خاندان کے نام سے مشہور ہے۔

باب ۱۱

مگدھ کا زوال۔ شنگ۔ کانو اور آندھر خاندان

شنگ خاندان

موریہ خاندان کے آخری راجہ کو اُس کے سپہ سالار پشیہ متر نے دھوکے سے فوج کے معائنہ کے وقت مروا ڈالا اور خود راجہ بن کر ایک نئے خاندان کا بانی ہوا جو شنگ کے نام سے مشہور ہے۔ اس خاندان میں دس راجہ ہوئے لیکن پشیہ متر ہی سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اُس نے ۱۸۵ سنہ ق۔م سے ۱۴۹ سنہ ق۔م تک حکومت کی۔

اور اس خاندان میں شمال مغربی ہند پر کابل کے یونانی نژنی رسوم کا اضافہ
حملہ کیا اور مگدھ تک پہنچ گیا لیکن پشیہ متر نے اُس کو شکست دیکر واپس دوڑا
دیا۔ اس کے بعد پشیہ متر نے اشومیدھ یعنی گھوڑے کی قربانی کا جشن منایا۔
یہ رسم صرف ایک طاقتور اور زبردست راجہ ادا کر سکتا تھا۔ اشومیدھ کی
رسم ادا کرنے اور مناندر کو شکست دیکر بھگا دینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے
کہ پشیہ متر کی فوجی قوت بہت زیادہ تھی۔ پشیہ متر ہندو مذہب
کا پیرو تھا اور برہمنوں کی بڑی عزت کرتا تھا۔ غالباً بدھ مذہب
والوں کی یہ روایت کہ وہ اُن کے مذہب کا جانی دشمن تھا صحیح نہیں۔
پشیہ متر کے بعد اُس کا بیٹا اگنی متر راجہ ہوا۔ پتنجلی جو سنسکرت کا مشہور
قواعدداں گذرا ہے پشیہ متر کا ہمعصر تھا۔ اُس کی کتاب میں کہیں کہیں
پشیہ متر کے حوالے ملتے ہیں۔

کانو خاندان شنگ خاندان کا آخری راجہ دیو بھوتی بدچلن اور
عیاش مزاج تھا۔ ۷۳ء ق۔م میں وہ اپنے برہمن
وزیر واسدیو کے اشارے سے قتل کر دیا گیا۔ واسدیو تخت پر بیٹھا اور
ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی جو کانو خاندان کے نام سے مشہور ہے
اس خاندان میں چار راجہ ہوئے اور اُن کا زمانہ حکومت صرف ۴۵ سال
ہے۔ اس خاندان کے حالات زیادہ نہیں معلوم لیکن اُس کا آخری راجہ
۲۸ء ق۔م میں ایک آندھر خاندان کے راجہ کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

آندھر خاندان آندھر خاندان میں تیس راجہ ہوئے اور اُن کی
حکومت تقریباً ساڑھے چار سو برس تک قائم رہی۔
اُن کی سلطنت شروع میں گوداوری اور کرشنا کے دہانوں

۔ لیکن بعد میں اُنہوں نے اس کی حدود کو بہت بڑھا لیا
یہاں تک کہ ایک زمانہ میں دکن کے اس کنارے سے اُس کنارے
تک سارا ملک اُن کی سلطنت میں شامل ہو گیا تھا۔ میگستھنیز کے زمانہ
میں بھی یہ ایک طاقتور سلطنت تھی۔ اشوک کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے
کہ آندھر خاندان نے مگدھ کے راجہ کی اطاعت قبول کرلی تھی۔ لیکن اشوک
کے بعد دوسرے صوبوں کی طرح آندھر کا راجہ بھی خود مختار ہو گیا۔ ۲۸ ق۔م
میں آندھر راجہ نے کانو خاندان کے آخری راجہ کو قتل کر کے اس خاندان
کا خاتمہ کیا۔ دوسری صدی عیسوی کے شروع میں آندھر خاندان
کے راجاؤں نے گجرات اور مالوہ کی سلطنتوں سے جنگ شروع کی
جس کا سلسلہ ایک مدت تک جاری رہا۔ گوتمی پتر ستکرنی نے
سترپ نہاپان کو شکست دی۔ لیکن کچھ عرصہ بعد سترپ رُدر دمن نے
آندھر راجہ کو جو اُس کا داماد تھا شکست دی۔ ۲۲۶ء کے بعد آندھر
خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ آندھر خاندان کے راجہ ہندو مذہب کے پیرو تھے
لیکن بدھ مذہب کے ماننے والوں کو ستاتے نہیں تھے۔ بہت سے بدھ
مندر جو چٹانوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں انہیں کے زمانہ کی یادگار ہیں۔

برہمن مذہب کا عروج | موریہ خاندان کے زوال کے بعد برہمنوں
کے مذہب کو پھر فروغ حاصل ہوا۔ اشوک
کے زمانہ میں بدھ مذہب ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گیا تھا
اور اب بھی عام لوگ زیادہ تر اسی مذہب کے پیرو تھے۔ لیکن شنگ،
کانو اور آندھر خاندان کے راجہ ہندو مذہب کے ماننے والے تھے۔ اسلئے
قدرتاً ان کے زمانہ میں ہندو مذہب اور اُس کے ساتھ ساتھ برہمنوں کو

عروج ہوا۔ برہمنوں نے اپنے مذہب میں بہت سی نئی رسوم کا اضافہ کر لیا تھا جن کا وجود ویدوں کے زمانہ میں کہیں نہ تھا۔ اس کے علاوہ ذات کی پابندیاں نہایت پیچیدہ اور سخت ہو گئی تھیں۔ ذاتوں کی تعداد روزانہ بڑھ رہی تھی ان سب باتوں کا ثبوت ہم کو ہندوؤں کی مشہور قانون کی کتاب منوسمرتی میں ملتا ہے۔ برہمنوں کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ سنسکرت زبان کو بھی فروغ حاصل ہونے لگا۔ اب کتبات میں بھی یہ زبان استعمال ہونے لگی۔ ستر پ رُدرآدمن کا مشہور کتبہ جو گرنار میں نکلا ہے اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

باب ۱۲

ہند کے یونانی اور سیتھی حکمراں

باختر و پارتھیا کی خود مختاری

سکندر کی وفات کے بعد اُس کی سلطنت اُسکے سپہ سالاروں نے آپس میں تقسیم کر لی۔ ان میں سے ایک سیلیوکس نیکوٹار تھا جس کا ذکر چندر گپت موریہ کے عہد میں آچکا ہے۔ جس زمانہ میں ہندوستان پر اشوک حکمراں تھا اس وقت سیلیوکس کا جانشین اُس کا پوتا تھا۔ یہ ایک مغرور اور نااہل بادشاہ تھا۔ چنانچہ اُس کے زمانہ میں سلطنت کے دو بڑے صوبے یعنی باختر اور پارتھیا ہوگئے۔ باختر میں یونانی صوبہ دار یاغی ہو گیا تھا اور

اُس نے ایک خود مختار ریاست کی بنیاد ڈالی۔ لیکن پارتھیا میں بغاوت نے ایک قومی رنگ اختیار کر لیا۔

باختره کے یونانی بادشاہ تیسری صدی ق-م کے آخر میں شام کے یونانی بادشاہ انتیاکوس اعظم نے باختر پر فوج کشی کی لیکن باختر کے بادشاہ نے اس کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور سنہ ۲۰۶ ق-م میں باختر کی خود مختاری اُس کو تسلیم کرنی پڑی۔ باختری خاندان کا چوتھا بادشاہ دمتریوس تھا۔ اس نے افغانستان کے علاوہ پنجاب اور مغربی ہند کا کچھ حصہ فتح کیا۔ اسی لئے اسکو "ہندیوں کا بادشاہ" کہتے ہیں۔ لیکن وہ زیادہ عرصہ تک چین سے نہ بیٹھ سکا۔ کیونکہ باختر میں ایک سردار نے جس کا نام یوک راتی دیس تھا سنہ ۱۷۵ ق-م میں بغاوت کی اور ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی۔ باختر پر قبضہ کرنے کے بعد یوک راتی دیس نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دمتریوس سے اُسکے ہندی مقبوضات چھین لئے۔ لیکن جب وہ ہندوستان سے واپس جا رہا تھا تو اُس کے لڑکے نے اُس کو مار ڈالا۔ اُس زمانہ کے سکوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے شمال مغرب میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ جن کے حکمراں اپنے آپ کو خود مختار سمجھتے تھے۔ ہندوستان کے لوگ یونانیوں کو یون کہتے تھے۔ یہ نام ہم کو سنسکرت کتابوں میں ملتا ہے۔ پراکرت میں اس کی شکل تبدیل ہوگئی اور یَون کی بجائے یون ہو گیا۔ چنانچہ اشوک کے کتبوں میں لفظ یون ہی استعمال کیا گیا ہے۔

منا ندر یون سرداروں میں سب سے زیادہ مشہور منا ندر ہے جو کابل میں تقریباً سنہ ۱۶۰ ق-م سے سنہ ۱۴۰ ق-م تک حکومت

کرتا رہا۔ یہ سندھ، کاٹھیاواڑ اور راجپوتانہ کو فتح کرتا ہوا گنگا کی وادی
میں سے گذر کر پاٹلی پتر تک پہنچا۔ لیکن مگدھ کے راجہ پشیہ مترنے نہایت
کامیابی کے ساتھ اُس کا مقابلہ کیا اور اُس کو واپس ہونا پڑا۔ مناندر ایک
منصف مزاج اور ہردل عزیز بادشاہ تھا۔

پالی زبان کی مشہور کتاب "ملندا پان ہو" یعنی "ملندا کے سوالات"
اسی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ کتاب مناظرہ کی شکل میں ہے جس میں ملندا
یعنی مناندر اور بدھ گرو ناگ سین بدھ مذہب کے عقائد پر فلسفیانہ بحث
کرتے ہیں۔ آخر کار ناگ سین مناندر کو قایل کر دیتا ہے اور وہ بدھ مذہب
کا پیرو ہو جاتا ہے اس کے بعد باختری سلطنت کا زوال شروع ہوتا ہے۔
سنہ ۱۴۰ ق م اور سنہ ۱۳۰ ق م کے درمیان اس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

ہند کے پارتھی حکمراں

باختری سلطنت کے زوال اور پارتھیا کے
عروج کا ایک ہی زمانہ تھا۔ پارتھیا کے
مشہور بادشاہ متراوتیس اوّل (سنہ ۱۷۱ تا سنہ ۱۳۶ ق۔م) نے ٹکشلا کا
علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر کے ایک نیا صوبہ بنا دیا تھا۔ متراوتیس ثانی
کے زمانہ میں پارتھیوں کی سلطنت وادی سندھ کے جنوبی حصہ تک پہنچ گئی
لیکن اُس کے بعد یہاں کے صوبہ دار نے علیحدہ سلطنت قایم کر لی۔ سنہ ۲۰ء
میں اس پر گندوفاریس نے قبضہ کر لیا۔ اس نے تقریباً چالیس سال حکومت
کی۔ اور اس کی سلطنت میں پنجاب کے علاوہ سندھ اور ہرات بھی شامل
تھے اُس کے بعد اُس کے سلطنت کے دو حصے ہو گئے جن میں سے پنجاب
کشن خاندان کے قبضہ میں آگیا۔ گندوفاریس کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ
وہ خالص پارتھی تھا۔ اس جگہ یہ بتلانا ضروری ہے کہ وسط ایشیا کے

بہت سے خانہ بدوش لوگ جو شک کے نام سے مشہور ہیں اپنے وطن سے چل کر باختر اور پارتھیا کے علاقوں میں داخل ہوئے۔ پارتھیا کے بادشاہوں سے ان خانہ بدوشوں کی جنگ کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ آخرکار متراداتیس اوّل کے زمانہ میں انھوں نے پارتھیا کی اطاعت قبول کرلی۔ اکثر کتابوں اور کتبوں میں شک اور پارتھیوں کا ذکر ساتھ ساتھ ہے لیکن ہندوستان میں پارتھی حکومت زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہی۔

کشن قوم دوسری صدی قبل مسیح میں وسط ایشیا کی ایک قوم ہینگ نو نامی نے دوسری قوم یوچی کو شکست دے کر مجبور کیا کہ وہ اپنے چراگاہوں کو چھوڑ کر مغرب کی جانب بھاگیں۔ یہ لوگ سیر دریا کے شمال میں جہاں شک قوم آباد تھی پہنچ گئے اور اُن کو وہاں سے نکال دیا۔ شک لوگ باختر اور پارتھیا کے علاقوں میں داخل ہوئے اور بعد میں افغانستان کے جنوبی حصوں میں آباد ہو گئے۔ لیکن یوچی بھی زیادہ عرصہ تک وہاں نہیں رہ سکے۔ ایک تیسری قوم نے اُن پر فوج کشی کی اور وہاں سے نکال دیا۔ یوچیوں کے پانچ قبیلے تھے جن میں سے کشن قبیلہ سب سے زیادہ طاقتور اور با اثر تھا۔ شاید پہلی صدی عیسوی کے شروع میں کشن قبیلہ کے سردار کدفیس اوّل نے باقی چار قبیلوں کے سرداروں کو شکست دے کر اپنی بادشاہی کا اعلان کردیا۔ کدفیس نے اپنے زمانہ میں کابل، قندھار اور ٹکشلا کے علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیے اور اُن یونانی اور پارتھی ریاستوں کا خاتمہ کردیا جو کابل کی وادی میں قائم ہو گئی تھیں۔ ۴۰ء میں کدفیس اوّل نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا کدفیس دوم اُس کا جانشین ہوا۔ اس کے زمانہ میں کشن طاقت اور

سلطنت بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ سکوں کے مطالعہ سے بعض مورخ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کدفیس کی سلطنت شمالی ہندوستان میں پنجاب سے بنارس تک اور جنوب میں نربدا تک پہنچ گئی تھی۔ در مالوہ اور مغربی ہند کے شک ست راپ اُس کے مطیع تھے۔

پہلی صدی عیسوی کے آخر میں چین کے مشہور سپہ سالار پان چاؤ نے ترکستان کو فتح کر لیا۔ کدفیس دوم نے چینیوں کے اس فاتح سپہ سالار کو روکنے کے لئے ستر ہزار فوج روانہ کی۔ لیکن چینیوں نے نہایت آسانی سے اس فوج پر فتح پالی۔ اس شکست کے بعد کدفیس دوم شاہ چین کا باجگذار ہو گیا۔ کدفیس دوم کے بعد کنشک بادشاہ ہوا۔ یہ نہیں معلوم کہ کنشک کا اُس سے کیا تعلق تھا۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ وہ اُس کا بیٹا نہ تھا۔ قرائن سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ کنشک کی تخت نشینی اور کدفیس کی وفات میں کچھ زمانہ کا فرق ہے۔

کنشک

بدھ مذہب والوں کے نزدیک کنشک بھی اشوک کی طرح ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ شروع زمانہ کے مورخوں نے اُس کے حالات نہیں لکھے۔ اس کی تخت نشینی اور وفات کی تاریخیں بھی یقین کے ساتھ نہیں معلوم غالباً وہ ۱۲۰ء میں تخت پر بیٹھا اُس نے کشمیر کو فتح کر کے اپنی حکومت میں شامل کیا اور پارتھیوں پر بھی فتوحات

حاصل کیں۔ لیکن اس کے جنگی کارناموں میں سب سے زیادہ نمایاں اُس کی وہ فتوحات ہیں جن کے ذریعہ سے اُس نے کاشغر یارقند اور ختن کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ اس طرح سے کنشک نے اُس شکست کا بدلہ لیا جو کدفیسس دوم کو چینی فوج کے مقابلہ میں ہوئی تھی۔ کنشک کے زمانہ میں کشن سلطنت نے بہت زیادہ ترقی کی۔ اس کی سلطنت شمالی ہندوستان میں گنگا کی وادی تک اور جنوب میں نربدا تک پہنچ گئی تھی اور ہندوستان کے باہر افغانستان۔ کاشغر۔ یارقند اور ختن کے علاقے اُس میں شامل تھے۔

کنشک کا مذہب

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ بدھ مذہب والے کنشک کو بھی اشوک کی طرح اپنے مذہب کا بڑا حامی سمجھتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ آخر زمانہ میں کنشک نے یہ مذہب اختیار کر لیا تھا لیکن یہ نہیں معلوم کہ اس کی کیا وجوہات تھیں۔ اس سے پہلے وہ بہت سے دیوتاؤں کی پرستش کیا کرتا تھا جن میں زرتشتی۔ ایرانی ہندی اور یونانی دیوتا شامل تھے۔ بدھ مذہب اختیار کرنے کے بعد بھی اُس کے سکوں پر بُدھ کے ساتھ ہندی، ایرانی اور زرتشتی دیوتا موجود ہیں۔ اس سے کم از کم اسقدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے اشوک اور کنشک کے خیالات میں بہت فرق تھا اور بدھ مذہب والوں کی یہ روایت زیادہ قابل اعتبار نہیں کہ اس مذہب کے قبول کرنے کے بعد اشوک کی طرح اُس کو بھی رنج تھا کہ اُس نے لڑائیاں کیوں لڑیں اور اس قدر کشت و خون کیوں کیا۔ بلکہ ایک دوسری روایت یوں بیان کی جاتی ہے کہ لوگ اُس کی لڑائیوں سے اسقدر تنگ آ گئے

تھے کہ اُس کو قتل کرکے جان چھڑائی۔ بہرحال یہ صحیح ہے کہ اشوک کے بعد ہندوستان میں بُدھ مذہب کا سب سے زبردست حامی کنشک ہی تھا۔

کنشک کی مجلس

بُدھ مذہب کے ماننے والوں میں اختلافات اسقدر بڑھ گئے تھے کہ کنشک نے بُدھ علماء کی ایک مجلس کشمیر میں منعقد کی جس میں پانچسو مختلف علماء شریک تھے۔ ان لوگوں نے بہت بحث مباحثہ کے بعد جو اصول طے کئے وہ تانبے کے ٹکڑوں پر کندہ کرائے اور اُن کو ایک استوپ میں جو اسی غرض سے تعمیر کرایا گیا تھا دفن کر دئے گئے ممکن ہے کہ ایک دن یہ تختیاں کسی خوش قسمت محقق کو مل جائیں۔

کنشک کی وفات اور اُس کے جانشین

کنشک کے بعد ہوشک تخت نشین ہوا۔ اُس کے حالات کا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن اس کے کثیر التعداد سکوں سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ کشن سلطنت اس زمانہ میں عروج پر تھی۔ اُس نے ۱۸۰ء کے قریب وفات پائی اور باسدیو تخت نشین ہوا۔ اس نام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کشن قوم پر ہندوستان کا کہاں تک اثر ہوگیا تھا۔ باسدیو کے عہد میں کشن سلطنت کا زوال شروع ہوا اگرچہ پنجاب اور کابل میں کشن خاندان کے بادشاہ پانچویں صدی تک حکمراں تھے جب کہ اُن کا خاتمہ گورے ہونوں نے کیا۔ لیکن باسدیو کے بعد کشن سلطنت نہایت کمزور ہوگئی تھی۔ کچھ دنوں بعد یہ لوگ ساسانیوں کے باجگذار بن گئے۔

بُدھ مذہب بُدھ مذہب میں اسوقت تک بہت سی تبدیلیاں ہوگئی تھیں جن کو یہاں صرف اختصار کے ساتھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ سب سے نمایاں فرق یہ تھا کہ اب بُدھ کی مورت کی پوجا کی جاتی تھی اور اُس کو خدائی صفات سے موصوف کرتے لگے تھے۔ تم پڑھ چکے ہو کہ اشوک کے زمانہ میں بُدھ مبلّغین دنیا کے مختلف حصّوں میں اس مذہب کی تبلیغ کے لئے بھیجے گئے تھے۔ ان ممالک میں اس مذہب پر دوسری قوموں کا اثر شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اس میں وہ باتیں داخل ہوگئیں جن کا شروع میں کہیں ذکر بھی نہ تھا۔ ابتدا میں بُدھ کا احترام بحیثیت ایک گرو یا اُستاد کے کیا جاتا تھا۔ لیکن اب لوگ اُس کی پوجا کرنے لگے اور اُن کی درگاہ تک دعا کی رسائی کے واسطے اور اوتاروں (یا بُدھ ستوں) کی شفاعت چاہنے لگے۔ اس طرح سے بُدھ مذہب کے دو بڑے فرقے ہوگئے۔ ایک ہینیان اور دوسرا مہایان جو بُدھ کی پرستش کرتا تھا اور اُن کی مورت پوجتا تھا۔ کنشک کے زمانہ میں شمالی ہند پر اس فرقہ کا بہت اثر تھا اور اُس کے پیروؤں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ہینیان فرقہ کے لوگ جنوب میں خاص کر لنکا میں کثرت سے تھے۔ اُنھوں نے بُدھ مذہب کی ابتدائی سادہ تعلیم کو ویسے ہی قائم رکھا۔

عُلوم وفنون کنشک کے عہد میں بُدھ مذہب کے تین مشہور مصنّف یعنی ناگارجون۔ اسوگوش اور لسومتر ہوئے ہیں۔ اسوگوش شاعر بھی تھا اور ادیب بھی۔ اور اُس کے ساتھ اُس میں مذہبی جوش بھی بہت زیادہ تھا۔ چرک جو قدیم زمانہ میں نہایت نامور طبیب ہوا ہے

کنشک کے دربار میں ملازم تھا۔

کنشک کو فنِ تعمیر اور سنگتراشی سے بہت دلچسپی تھی ٹیکسلا کے کھنڈرات اُسی کے ذوقِ تعمیر کی یادگار ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ ترقی اُس زمانہ میں سنگتراشی کے فن میں ہوئی۔ جو بت ٹیکسلا کے کھنڈرات سے برآمد ہوئے ہیں۔ اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یونانی کاریگروں کا اثر اس فن پر بہت نمایاں ہے۔ چنانچہ گوتم کے بعض مجسّمے یونانی دیوتاؤں سے ملتے جلتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ اثر ملک کے اندرونی حصّوں میں بھی پھیلتا گیا۔ یونانیوں کا اثر فن سنگتراشی کے علاوہ دوسری چیزوں پر بھی تھا۔ مثلاً ہندی سکوں پر یونانی دیوتاؤں کی تصویریں ہیں۔ ایک کتبہ سے ثابت ہوتا ہے کہ کنشک نے شاہانِ روم کا لقب "قیصر" اختیار کر لیا تھا۔

بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات

ہندوستان اور مغربی ایشیا کے ملکوں میں تجارتی تعلقات بہت زمانہ سے قائم تھے لیکن دوسری اور تیسری صدی عیسوی میں اس تجارت کو بہت فروغ ہوا۔ شام کا مشہور شہر پالمیر ہندوستان کی تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ چین کی اشیار تجارت بھی انہیں ہندوستانی راستوں سے ایشیائے کوچک پہنچتی تھی۔ اس کے علاوہ سمندری راستوں سے بھی سوداگر اپنا مال لے جاتے تھے۔ ہندوستان سے قیمتی پتھر۔ موتی۔ مسالے۔ روئی۔ ریشم اور ململ وغیرہ بیرونی ممالک کو بھیجے جاتے تھے اور وہاں سے سونا اور دوسری دھاتیں یہاں آتی تھیں۔

باب ۱۳

گپت خاندان سنہ ۳۲۰ء سے سنہ ۶۵۰ء تک

چندر گپت اوّل

چوتھی صدی عیسوی میں گپت خاندان کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس خاندان کا پہلا مشہور راجہ چندر گپت تھا۔ اُس کی شادی لچھوی خاندان کی ایک شہزادی سے ہوئی تھی جس کا نام کمار دیوی تھا چندر گپت نے اپنے ہمنام چندر گپت موریہ کی طرح مگدھ پر قبضہ کیا اور پاٹلی پتر کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ اس نے بہت جلد قرب و جوار کی ریاستوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت گنگا و جمنا کے سنگم تک بڑھالی۔ وہ نہایت طاقتور اور دلیر بادشاہ تھا۔ اُس نے خود تو مہاراج دھیراج کا لقب اختیار کیا اور مہادیوی کمار دیوی کا لقب اپنی رانی کو دیا۔ لچھوی خاندان میں شادی کرنے سے اس کی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہوگیا۔ اُس کے سکوں پر اُس کے نام کے ساتھ کمار دیوی کا نام بھی کندہ ہے اور سمدر گپت اس پر فخر کرتا ہے کہ وہ کمار دیوی کا بیٹا ہے۔ بہرحال چندر گپت کے عہد میں اس خاندان کو کافی عروج ہوگیا تھا اور وہ اپنے آپ کو اس قابل سمجھتا تھا کہ اپنے نام سے ایک نیا سمت جاری کرے۔ یہ سمت اُس کی تخت نشینی کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے اور اُس کا پہلا سال ۲۶ فروری سنہ ۳۲۰ء سے شروع ہو کر ۱۵ مارچ سنہ ۳۲۱ء کو ختم ہوا۔ ہندوستان میں

اس سمت کا رواج کئی صدی تک رہا۔ افسوس ہے کہ اُس کے مختصر عہد حکومت کے حالات اس سے زیادہ نہیں ملتے۔ اُس نے ۳۳۰ء میں وفات پائی۔

سمدر گپت ۳۳۰-۳۷۵ء

گپت خاندان کا سب سے مشہور بادشاہ سمدر گپت تھا جس نے تقریباً نصف صدی تک نہایت شان و شوکت سے حکومت کی اور شمالی و جنوبی ہند میں اپنی بہادری اور قابلیت کا سکہ جما دیا۔ اس کے حالات ہمیں ایک کتبے میں ملتے ہیں۔ جو اُس نے الہ آباد میں اشوک کی لاٹ پر کندہ کرایا تھا۔ اس میں بہت کچھ مبالغہ ہے اور بہت سے نام ایسے ہیں جن کا پتہ و مقام آسانی سے نہیں معلوم کیا جا سکتا۔ لیکن اُس کی سلطنت اور فتوحات کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے اُس نے گنگا کی وادی میں اُن راجاؤں پر حملہ کیا جو ابھی تک خود مختار تھے اور اُن کی ریاستیں اپنی وسیع سلطنت میں شامل کر لیں۔ اس کے بعد اُس نے جنگل میں رہنے والی وحشی قوموں پر فوج کشی کی اور اُن کو اپنا مطیع بنایا۔ آخر میں اُس نے دکن کی ریاستوں پر وہ مشہور حملہ کیا جس کی وجہ سے اُس کا نام ہندوستان کے بڑے اور نامور فاتحوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دکن کے حملہ کی ابتدا اُس نے مہاندی کی وادی سے کی۔ یہاں کے راجہ مہندر کو شکست دیتا ہوا کلنگ میں داخل ہوا اور بہت سے مشہور شہروں اور قلعوں پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد گوداوری کو عبور کر کے ونگی کے راجہ پر حملہ کیا اور وہاں سے آگے بڑھ کر کانچی پورہ (کانجی ورم) اور پالکا (پال گھاٹ) کے پلّو راجاؤں کو شکست دی۔ پھر اُس نے مغرب کی طرف رُخ کیا اور مہاراشٹر اور خاندیش

کے راجاؤں کو مغلوب کرتا ہوا اپنے دار السلطنت کو واپس ہوا۔ ان تمام فتوحات میں اُس کے تقریباً تین سال (سنہ ۳۴۰ تا ۳۵۰ء) صرف ہوئے۔

سمدرگپت کی سلطنت مشرق میں برہمپتر سے لے کر دریائے جمنا اور چنبل تک اور شمال میں ہمالیہ سے لے کر نربدا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سی قرب وجوار کی ریاستیں بھی اُس کی مطیع تھیں۔ دکن کی ریاستوں کو اُس نے اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا بلکہ بہت سا مال و زر لے کر وہاں کے راجاؤں کو اُن کے علاقے واپس کر دئے۔ اس کتبہ سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کابل اور بلخ کے کشن بادشاہوں سے سمدرگپت کے دوستانہ تعلقات تھے۔ لنکا کے بدھ راجہ میگھ ورمن نے سمدرگپت کی خدمت میں بہت سے تحائف اور سفیر بھیجکر اس امر کی اجازت لی کہ وہ بودھی درخت کے قریب ایک خانقاہ بنوا دے تاکہ لنکا سے آنے والے زائرین کو قیام کی دقت نہ ہو۔ یہ عظیم الشان خانقاہ ہوان سانگ چینی سیاح کے زمانہ تک موجود تھی۔

سمدرگپت کی وفات اور ذاتی اوصاف

سمدرگپت کی وفات کی صحیح تاریخ نہیں معلوم لیکن محققین کا خیال ہے کہ اُس کا انتقال سنہ ۳۷۵ء میں ہوا۔ اپنی فتوحات وسعت سلطنت اور ذاتی قابلیت کے لحاظ سے سمدرگپت ہندوستان کے بڑے بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دکن سے واپس آنے پر اُس نے اشومیدھ یگیہ یعنی گھوڑے کی قربانی کی رسم ادا کی۔ اس موقع پر بہت سے راجہ جو اس کی اطاعت قبول کر چکے تھے موجود تھے۔ اس کا ذکر الٰہ آباد والے کتبے میں نہیں جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ تقریب

اُس کی عمر کے آخری حصّہ میں منائی گئی۔ اس کی یاد قائم رکھنے کے لیے جو سکّے بنائے گئے تھے اُن میں ایک طرف گھوڑے کی تصویر ہے اور دوسری طرف اُس کی رانی کی۔ سمدر گپت اپنے اجداد کی طرح ہندو مذہب کا پیرو تھا۔ لیکن وہ بُدھ مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہیں کرتا تھا اور مشہور بُدھ مصنّف واسو بندھو پر وہ بہت مہربان تھا۔ خود بھی تعلیم یافتہ تھا اور عالموں کی قدر کرتا تھا۔ اُس کو شاعری اور موسیقی سے بہت دلچسپی تھی اور بہت اچھے شعر کہتا تھا۔ اُس کے ذوق موسیقی کا اندازہ اُس سکّہ سے کیا جاتا ہے جس میں وہ پاؤں لٹکائے ہوئے بیٹھا ستار بجا رہا ہے۔

چندر گپت وکرمادتیہ
۴۱۵-۳۷۵ء

سمدر گپت کا جانشین چندر گپت ثانی تھا آخر میں اُس نے وکرمادتیہ کا لقب اختیار کر لیا تھا۔ شمالی ہندوستان میں وکرمادتیہ یا بکرماجیت کے عدل و انصاف اور شان و شوکت کے قصّے اسی طرح مشہور ہیں جیسے بغداد میں ہارون الرشید کے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے بہت سے قصّے محض غلط اور بے بنیاد ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ چندر گپت ثانی اپنے باپ کی طرح ایک جنگجو۔ بہادر اور ہوشیار بادشاہ تھا۔ سمدر گپت کی طرح موسیقی اور شاعری سے اُس کو بھی دلچسپی تھی اور علم کی سرپرستی اور ہنر پروری میں تو وہ اپنے باپ سے بھی سبقت لے گیا تھا۔ کالیداس اُسی کے نو رتن میں سے ہے۔ تخت نشینی کے وقت چندر گپت ثانی کی کافی عمر تھی۔ مگر پھر بھی اُس نے تقریباً چالیس سال حکومت کی اور مالوہ۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

چندرگپت کے عہد کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے۔ تم اوپر پڑھ آئے ہو کہ ہندوستان کے مغربی حصوں میں شک خاندان کے سرداروں نے اپنی خودمختار ریاستیں قائم کرلی تھیں۔ شروع شروع میں یہ لوگ کشن سلطنت کے باجگذار صوبہ دار تھے اور ست راپ کہلاتے تھے۔ لیکن مدّت سے یہ خودمختار راجہ تھے حالانکہ اب بھی ست راپ ہی کے نام سے مشہور تھے۔ ست راپوں کے دو خاندان تھے۔ پہلا خاندان مہاراشٹر میں حکومت کرتا تھا۔ اس کا خاتمہ اندھر خاندان کے مشہور راجہ گوتمی پتر کے ہاتھ سے ہوا۔ دوسرا خاندان اُجین میں تھا۔ تاریخ میں یہ لوگ ست راپ مالوہ کہلاتے ہیں۔ ردر دمن اسی خاندان کا سب سے مشہور راجہ تھا۔ اُس کے زمانہ میں یہ سلطنت بہت وسیع اور طاقتور تھی۔ چندرگپت ثانی کا ہمعصر اس خاندان کا اکیسواں راجہ رُدر سنہا تھا۔ چندرگپت نے اسی راجہ کو شکست دیکر اُس کے ملک کو اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا۔ اس حملہ کی صحیح تاریخ نہیں معلوم لیکن سکوں سے اسقدر پتہ چلتا ہے کہ یہ حملہ ۳۸۸ء کے بعد ہوا۔ آخری ست راپ کے متعلق مشہور ہے کہ چندرگپت نے اُس کو ایک غیر شخص کی بیوی کے ساتھ دیکھا اور فوراً ہی اُس کو قتل کردیا۔

مالوہ اور گجرات کے شامل ہوجانے سے گپت سلطنت سمندر کے کنارے تک پہنچ گئی تھی۔ ہندوستان کا یہ حصّہ نہایت خوش حال اور دولتمند تھا اس لئے کہ قدیم زمانہ سے بیرونی ممالک کی تجارت یہیں کے بندرگاہوں کے ذریعہ سے ہوتی تھی اور ملک کے اندر اُجین اس تجارت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ یہ شہر بہت زمانہ سے ہندوستان کے مقدس ترین شہروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ لیکن گپت سلطنت کی اس توسیع کے بعد اُجین کی

اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور وہ پاٹلی پتر کے مقابل کا بلکہ اس سے بہتر حیثیت کا شہر ہو گیا تھا۔

چینی سیاح فاہیان
۳۹۹ء - ۴۱۰ء

فاہیان چینی سیاحوں میں سب سے پہلا شخص ہے جو ہندوستان آیا۔ وہ ختن ہوتا ہوا پامیر کے پہاڑی راستوں میں سے گذر کر ہندوستان میں داخل ہوا۔ فاہیان کے یہاں آنے کا اصلی مقصد بدھ مذہب کی مقدس کتابیں اور صحیح روایات کا جمع کرنا تھا اس لئے اس نے دوسرے معاملات کی طرف قطعی توجہ نہ کی۔ یہاں تک کہ اپنے زمانہ کے بادشاہ کا بھی کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن پھر بھی اس کے سفرنامے میں بہت سی مفید چیزیں ملتی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ لوگ خوشحال تھے۔ راستے محفوظ تھے اور اُن پر مسافروں کے لئے قیام گاہیں بنی ہوئی تھیں۔ پاٹلی پتر میں ایک بڑا اسپتال تھا۔ یہاں اُس نے تین سال قیام کیا اور سنسکرت زبان سیکھی۔ اشوک کے محلات کی وہ بہت تعریف کرتا ہے۔ اُس کو یہاں کی آب و ہوا پسند تھی۔ جرائم کی سزائیں سخت نہ تھیں۔ اکثر اوقات جرمانہ پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ رہزنی کے جرم میں مجرم کا داہنا ہاتھ کاٹ لیا جاتا تھا۔ فاہیان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت کا انتظام نہایت معقول تھا۔ راجہ رعایا کے معاملات میں بہت کم دخل دیتا تھا۔ مذہبی معاملات میں تعصب سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔ تجارت میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ تھی۔ لوگ جانداروں کو نہیں مارتے تھے۔ شراب، لہسن اور پیاز سے نفرت کرتے تھے۔ بازاروں میں قصابوں کی کوئی دوکان نہ تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وسط ہند میں اہنسا پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ شمالی

ہندوستان میں بدھ مذہب کا کافی اثر تھا اور متعدد خانقاہیں موجود تھیں جن میں ہزاروں بھکشو آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اُس کے زمانہ میں بدھ مذہب کا زوال شروع ہو گیا تھا کیونکہ گیا۔ کپل وستو اور کسی نگر جیسے مقدس مقامات کو وہ لکھتا ہے کہ ویران نظر آتے ہیں۔

کمار گپت و سکند گپت

چندر گپت ثانی کی وفات پر اُس کا بیٹا کمار گپت ۴۱۳ء میں تخت پر بیٹھا۔ اُس نے چالیس سال تک سلطنت کی لیکن اُس کے عہد حکومت کے حالات کہیں نہیں ملتے۔ غالباً اُس نے اپنی جدّی سلطنت میں اضافہ کیا اس لئے کہ سمدر گپت کی طرح اُس نے بھی اشومیدھ یگیہ کی رسم ادا کی۔ ۴۵۵ء میں سکند گپت تخت پر بیٹھا۔ کمار گپت کے آخری زمانہ میں پشیہ متر نامی قوم نے جو شاید ایرانی تھی گپت سلطنت پر حملہ کیا۔ لیکن شکست کھائی۔ سکند گپت کی تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وسط ایشیا کی ایک بدوی قوم ہون نے حملہ کیا۔ سکند گپت نے اس حملہ کو کامیابی کے ساتھ روکا۔ لیکن اس کے بعد بھی ہون قوم کے حملے جاری رہے۔ ان حملوں سے گپت سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا اور اُس کے ٹکڑے ہو گئے۔ گپت خاندان بالکل تو ختم نہیں ہوا کیونکہ اُس کے بعد بھی اُن کی حکومت کئی پشت تک قائم رہی لیکن اُن کی سلطنت کی وسعت اور عظمت بہت کم ہو گئی۔ آخری راجہ کمزور اور ناقابل تھے اور ہونوں کے حملے نہیں روک سکے۔

باب ۱۴

گورے یا سفید ہون

سکند گپت کے عہد میں وسط ایشیا کی ایک خانہ بدوش قوم نے ہندوستان پر حملے شروع کئے اور آخر کار شمالی مغربی ہند کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرکے اپنی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ سکند گپت نے اس وحشی قوم کے پہلے سیلاب کو نہایت کامیابی کے ساتھ روک کر چند سال کے لئے اس مصیبت کو ٹال دیا تھا۔ اس خوفناک قوم کی جس کو یورپ کے لوگ "افتالوی" اور ہندوستانی "ہون" کہتے ہیں۔ ایک شاخ پانچویں صدی میں ماوراالنہر پر قابض ہو گئی تھی۔ ہندوستان میں عام طور سے باہر سے آنے والی وحشی قوموں کو ہون کہنے لگے تھے اسلئے اُن کی اس شاخ کا نام جو ماوراالنہر میں آباد ہو گئی تھی سفید ہون ہو گیا۔ ماوراالنہر سے نکل کر ہونوں نے ایران اور ہندوستان کی طرف رُخ کیا اور رفتہ رفتہ ایران اور کابل کو فتح کر لیا۔ سنہ ۴۸۴ء میں اُنہوں نے فیروز ساسانی کو قتل کیا۔ ہندوستان پر اُن کے حملے اس سے قبل ہی شروع ہو گئے تھے لیکن ایرانیوں کی شکست کے بعد ہندوستان کا راستہ اور زیادہ صاف ہو گیا۔ پہلے پنجاب پر قبضہ کیا اور پھر گپت سلطنت کے مغربی حدود پہ پہنچ جائے۔ یہاں تک کہ سنہ ۴۶۷ء میں گپت راجاؤں کی حکومت صرف مگدھ خاص اور چند قریبی اضلاع پر رہ گئی تھی۔

تورامن

ہونوں کا پہلا سردار جس نے ہندوستان میں حکومت کی

بنیاد ڈالی تورآمن تھا۔ اُس نے سنہ ۴۹۹ء میں مالوہ فتح کیا اور ہونوں
کی سلطنت شمالی مغربی ہند سے لے کر جمنا تک اور جنوب میں نربدا تک
پھیل گئی۔ تورآمن نے سیالکوٹ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیکر باقاعدہ
سلطنت کا انتظام شروع کیا اور اپنے آبائی پیشہ یعنی لوٹ مار میں بہت
کمی کردی۔ لیکن وہ مالوہ فتح کرنے کے بعد زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہا۔
سنہ ۵۰۲ء میں اُس نے وفات پائی۔ ولبھی کے راجہ جنھوں نے مشرقی گجرات
میں اپنی علیحدہ سلطنت قائم کرلی تھی۔ تورامن کے زمانہ ہی میں ہونوں کے
خراج گزار ہوچکے تھے۔

مہرگل تورامن کے بعد اس کا بیٹا مہرگل تخت نشین ہوا۔ اپنے باپ
کی طرح اُس نے بھی مہاراجہ کا لقب اختیار کیا۔ وہ شیوپرست ہندو
تھا اور بدھ مذہب سے سخت نفرت کرتا تھا۔ بدھ مذہب کی روایات اُسکی
سفاکی اور جوروستم سے بھری ہوئی ہیں۔ مہرگل کے ابتدائی زمانہ میں ہونوں
کی سلطنت اپنے عروج پر تھی اور ایران اور ختن سے لے کر وسط ہند تک
پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع سلطنت کا صدر مقام بامیان تھا اور غالباً مہرگل
اور اس کا باپ اسی حکومت کے ماتحت تھے۔ بہرحال چونکہ ہونوں کے
مظالم ناقابل برداشت تھے۔ ہندوستان کے بہت سے راجہ اور رئیس وسط
ہند کے راجہ یشودھرمن کے ساتھ مل کر مہرگل کے مقابلہ کے لئے تیار ہوئے
اور سنہ ۵۲۸ء میں اُس کو شکست فاش دی۔ مہرگل جان بچاکر کشمیر کی طرف
بھاگ گیا۔ کشمیر کے راجہ نے اس پر رحم کھایا اور ایک چھوٹی سی جاگیر عطا کی۔
لیکن مہرگل نے اپنے اس مربی کو دھوکے سے قتل کرکے کشمیر کے تخت پر قبضہ
کرلیا۔ اس کے بعد بھی اس کے مظالم کا سلسلہ جاری رہا اور کہا جاتا ہے کہ

ہزاروں بے گناہ اُس کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ مہرگل کی وفات ۵۴۲ء یا اُس کے قریب ہوئی جبکہ ہونوں کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ اس کے پچیس سال بعد ترکوں نے ان کے صدر حکومت کا بھی قلع قمع کر دیا۔ ہندوستان میں مہرگل کی شکست کے بعد ان کی سلطنت تقریباً ختم ہو گئی تھی اور جو ہون قوم کے لوگ یہاں موجود تھے وہ دوسری قوموں میں ایسے مل جل گئے کہ اُن کا کوئی نسلی امتیاز باقی نہ رہا۔

گپت خاندان کا زوال

سکند گپت کے بعد اس کا بھائی تخت پر بیٹھا اور اس کی مختصر حکومت کے بعد اُس کا بیٹا نرسنگھ گپت تخت نشین ہوا۔ نرسنگھ گپت بالادت کی چینی سیاح ہیون سانگ نے بہت تعریف کی ہے اُس کو بدھ مذہب سے گہری دلچسپی تھی۔ بدھوں کے علمی مرکز نالند میں اُس نے ایک نہایت شاندار مندر بنوایا تھا جس کا ذکر چینی سیاح نے اپنے سفرنامے میں کیا ہے۔ مہرگل کے خلاف یشودھرمن کے ساتھ نرسنگھ گپت بھی لڑا تھا۔ لیکن مہرگل کے شکست کھانے کے باوجود بھی گپت سلطنت کے زوال کو کوئی نہیں روک سکا۔ نرسنگھ گپت اس فتح کے دو سال بعد مرگیا اور اس کے جانشین اسقدر نااہل ہوئے کہ سلطنت برابر کمزور ہوتی گئی۔ اب اُن کی ریاست صرف مگدھ ہی تک محدود تھی جہاں وہ آٹھویں صدی کے پہلے نصف حصہ تک حکومت کرتے رہے۔

ولبھی کی سلطنت

پانچویں صدی کے آخر میں جب گپت سلطنت کا زوال شروع ہو گیا تھا تو گجرات کے مشرقی حصہ میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد پڑی۔ اس کا بانی ایک سردار تھا جو کسی زمانہ

میں گپت راجہ کا سیناپتی (سپہ سالار) تھا۔ اُس نے اپنی خود مختار سلطنت
کی راجدھانی کے لئے ولبھی شہر کا انتخاب کیا۔ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے کہ
تورامن اور مہرگل کے زمانہ میں یہاں کے راجہ ہونوں کے خراج گزار تھے۔
لیکن ہونوں کی زوال کے بعد اس خاندان نے بہت ترقی کی۔ ولبھی ہندوستان
کے بڑے اور خوش حال شہروں میں سے تھا۔ ساتویں صدی میں وہ بُدھ
علوم کا اتنا ہی بڑا مرکز تھا جیسے کہ بہار میں نالند۔ ولبھی کے راجہ خود تو
ہندو مذہب کے پیرو تھے لیکن بُدھ اور جین مذہب والوں کے ساتھ وہ
بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔ اُن کی وُسعت نظر کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت
ہوسکتا ہے کہ اُن کا دار السلطنت بدھ علوم کا ایک بڑا مرکز تھا۔ ہرش نے
اس سلطنت پر حملہ کیا اور وہاں کے راجہ کو سخت شکست دی لیکن بعد
میں دونوں میں صلح ہو گئی۔ ۷۷۰ء میں عربوں نے ولبھی پر حملہ کیا اور اسکو
تباہ کر دیا۔

باب ۱۵

ہرش وردھن

عہد ہرش کے ماخذ چھٹی صدی کے آخری پچاس سال ہندوستان کی تاریخ میں نہایت تاریک ہیں کیوں کہ
اس زمانہ کے تاریخی حالات ہم کو کہیں نہیں ملتے۔ لیکن ساتویں صدی کے

شروع ہوتے ہی قنوج کی سلطنت کے واقعات مل جاتے ہیں۔ جن کی بناء پر مورخوں نے اس عہد کی تاریخ مرتب کی ہے۔ کتبات اور سکوں کے علاوہ دو کتابیں اس عہد کی اب تک موجود ہیں۔ پہلی تو ہرش کے درباری شاعر "بان" کی مشہور نظم ہرش چرتر اور دوسری ہیون سانگ چینی سیاح کا سفرنامہ۔ ہرش چرتر کی حیثیت سے تاریخی تصنیف نہیں کہی جا سکتی کیونکہ شاعر کا مقصد تاریخ نہیں بلکہ اپنے ممدوح کی تعریف تھی۔ اس میں مبالغہ سے بہت کام لیا گیا ہے۔ ہرش کی خوبیوں کو بڑھانے اور عیوب کو چھپانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے تاریخ کے طالب علم کے لئے وہ ایک نہایت مفید اور کارآمد کتاب ہے اور اس کی اور ہیون سانگ کے سفرنامے کی مدد سے اس زمانہ کے بہت سے صحیح واقعات معلوم ہو گئے ہیں۔ چینی سیاحوں میں ہیون سانگ کا رتبہ سب سے بلند ہے اور اس کا سفرنامہ سب سے زیادہ اہم۔

ہرش کا خاندان اور تخت نشینی

ہونوں کے زوال پر ہندوستان میں متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئیں۔ انہیں میں سے ایک تھانیسر کی ریاست تھی تھانیسر بہت پرانا اور مقدس شہر تھا۔ ویدوں کے زمانہ ہی میں اس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ مہابھارت کی لڑائی تھانیسر ہی کے قریب کرکشیتر کے میدان میں ہوئی تھی اور اسی جگہ محمد غوری اور پرتھوی راج کی وہ مشہور لڑائیاں ہوئیں جن کے بعد شمالی ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی۔

وردھن خاندان کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہو سکے ہیں۔ بان کہتا ہے کہ راجہ ہرش کے خاندان میں بادشاہت کئی پشتوں سے تھی لیکن

اس قول کی تصدیق نہیں ہو سکتی اس لئے یہ زیادہ قابل اعتبار نہیں بالخصوص جبکہ کتبوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہرش کا دادا ادتیہ وردھن ایک سردار تھا جس کی شادی مگدھ کے شاہی خاندان میں ہوئی تھی اس شادی کے بعد ادتیہ وردھن کی قوت بہت بڑھ گئی۔ چنانچہ اس کے بیٹے پربھاکر وردھن نے مہاراجہ دھراج کا لقب اختیار کیا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ پربھاکر وردھن کے زمانہ میں تھانیسر خود مختار ہی نہیں بلکہ ایک معزز اور با اثر ریاست تھی اور بہت سے سردار اس کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ بان کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ پربھاکر ایک بہادر اور جنگجو راجہ تھا اس نے قرب و جوار کی ریاستوں کے علاوہ گاندھار اور مالوے کے راجاؤں سے بھی جنگ کی تھی۔ جس وقت پربھاکر نے وفات پائی تو اس کا بڑا بیٹا راج وردھن ہونوں کے مقابلہ کے لئے گیا ہوا تھا اور اس کے چھوٹے بھائی ہرش وردھن کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی۔ وہ بھی کچھ دور تک اپنے بھائی کی مدد کے لئے گیا۔ لیکن پربھاکر کی بیماری کی خبر ہرش کو پہنچ گئی اور اس لئے وہ پہلے تھانیسر واپس پہنچا۔ ہرش کے آتے ہی پربھاکر مر گیا۔ بعد میں راج وردھن بھی پہنچ گیا۔ رانی یشومتی نے اپنے شوہر کے ساتھ جلکر جان دیدی۔ راج وردھن اپنے باپ کا جانشین ہوا اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد مالوہ کے راجہ نے اس کے بہنوئی گرہ ورمن کو جو قنوج کا راجہ تھا قتل کر کے اس کی بہن راجیشری کو قید کر لیا۔ راج وردھن خبر پاتے ہی قنوج روانہ ہو گیا۔ اس نے قنوج کو آسانی سے واپس لے لیا لیکن بنگال کے راجہ ششانک نے اس کو دھوکے سے بلا کر قتل کر دیا۔ اس خبر نے ہرش کے دل میں انتقام کی آگ بھڑکا دی اور اس نے

دشمنوں سے بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

ہرش کو معلوم ہوا کہ اُس کی بہن مالوے سے بھاگ کر وندھیاچل پہاڑ میں چھپ گئی ہے۔ چنانچہ اُس نے اپنے ایک سردار بھانڈی کو سسانک کے مقابلہ کے لیے بھیجا اور خود راجیشری کی تلاش میں چلا۔ خوش قسمتی سے ہرش وقت پر پہنچ گیا اور اپنی بہن کو خودکشی سے بچا لیا۔ ہرش اپنی بہن کی بہت عزت کرتا تھا اور اکثر معاملات میں اس کے مشورے پر کام کرتا تھا۔ بان اپنی نظم ہرش چرتر اس مقام پر جہاں راجیشری اور ہرش ملتے ہیں ختم کر دیتا ہے۔

مالوے سے واپسی پر دربار کے لوگوں نے ہرش کو تخت پر بٹھلایا۔ شروع میں تو وہ اس اہم ذمہ داری سے بچنا چاہتا تھا لیکن بعد میں راضی ہو گیا۔ اُس نے اپنا دارالسلطنت بجائے تھانیسر کے قنوج کو قرار دیا۔

ہرش کی فتوحات

بنگال کے حملہ کے وقت کامروپ (آسام) کے راجہ نے ہرش کے پاس سفیر بھیجے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں میں نہایت خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ہرش ایک بہادر نوجوان تھا اُس کے حوصلے بہت بلند تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ تمام ہندوستان پر اُسی کی سلطنت پھیلی ہوئی ہو۔ اس آرزو کو پورا کرنے کی غرض سے اُس نے ایک نہایت شاندار فوج تیار کی جس میں پچاس ہزار پیادے بیس ہزار سوار اور پانچ ہزار ہاتھی تھے۔ پانچ سال تک وہ برابر لڑائی میں مصروف رہا اور پنجاب کے علاوہ شمالی ہندوستان کی تمام ریاستیں اس کی سلطنت میں شامل ہو گئیں۔ اس کی خواہش تھی کہ شمال کی طرح دکن کی ریاستوں کو بھی فتح کر کے اپنے تحت میں لے آئے۔ اس حملہ کی تیاریاں بہت بڑے پیمانہ پر کی گئیں۔ اُس کی فوج میں اب ساٹھ ہزار ہاتھی (اس میں مبالغہ معلوم ہوتا ہے) اور ایک لاکھ

سوار تھے۔ لیکن اس عظیم الشان لشکر کے باوجود بھی ہرش کو دکن میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ دکن کے مشہور چالوکیہ خاندان کے نامور حکمران پلکشن ثانی نے ہرش کی فوج کا نربدا ندی کے کنارے پر مقابلہ کیا اور شکست دی۔ ہرش مجبور ہو کر وہاں سے واپس ہوا لیکن بعد میں ولبھی اور مالوے کے راجاؤں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور اس طرح سے اس ناکامی کی تلافی ہو گئی۔ ۶۴۳ء میں یعنی مرنے سے پانچ سال پہلے ہرش نے خلیج بنگال کے ساحل پر گنجم پر فوج کشی کی۔ یہ اس کا آخری جنگی کارنامہ تھا۔ اس کے بعد اُس نے کوئی لڑائی نہیں لڑی۔

ہرش کے ذاتی اوصاف

ہرش کی عمر کا بیشتر حصہ لڑائی میں گذرا تھا جس کا اس کی تندرستی پر کافی اثر ہوا۔ ۶۴۷ء میں جب اُس نے وفات پائی تو اُس کی سلطنت نربدا کے شمال میں راجپوتانہ اور پنجاب کے علاوہ تمام شمالی ہندوستان میں پھیل چکی تھی جن راجاؤں کی ریاستیں اُس نے سلطنت میں شامل نہیں کی تھیں وہ اس کے باجگزار تھے۔ زبردست فاتح ہونے کے علاوہ ہرش سلطنت کے کام میں بھی بہت ہوشیار تھا۔ اپنے ملک میں برابر دورہ کرتا رہتا تھا تاکہ اُس کو ہر بات سے صحیح واقفیت حاصل ہو جائے۔ ہیون سانگ نے اس کے انتظام کی بہت تعریف کی ہے آخر عمر میں وہ بدھ مت کا پیرو ہو گیا تھا اور اس زمانہ میں مذہبی رنگ اُس پر بہت زیادہ تھا۔ لیکن ہندو اور جین مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ اُس کا برتاؤ نہایت اچھا تھا۔ جس چیز سے ہرش کو شہرت دوام حاصل ہوئی ہے وہ اُس کا ذوق علم تھا۔ وہ خود بھی ایک بڑا ادیب تھا اور دوسرے عالموں اور فاضلوں کی بھی بہت قدر کرتا تھا۔ رتناولی اور ناگانند ڈرامے اُسی کی

تصنیف ہیں۔

ہیون سانگ

چین میں بدھ مذہب کافی پھیل چکا تھا اور وہاں سے بہت سے خوش عقیدہ زائرین ہندوستان اس غرض سے آتے تھے کہ اپنے مذہب کے مقدس مقامات کی زیارت کریں اور یہاں سے روایات اور تبرکات جمع کرکے لے جائیں۔ اس سے پہلے چینی سیاح فاہیان کا ذکر تم پڑھ آئے ہو۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ مشہور ہیون سانگ ہے جس کا سفرنامہ تاریخی معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ ہے۔ ہیون سانگ ساتویں صدی کے شروع میں ایک معزز خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کو بچپن ہی سے مذہب اور علم سے دلچسپی تھی تعلیم سے فارغ ہو کر اس نے درویشانہ زندگی اختیار کرلی اور ہندوستان آنے سے پہلے ہی وہ اپنے علم اور تقدس کی بدولت بہت کچھ شہرت حاصل کرچکا تھا لیکن اس کی تکمیل کے لئے ہندوستان کا سفر اور مقامات مقدسہ کی زیارت نہایت ضروری تھی۔ چنانچہ ۶۲۹ء میں وہ اس عظیم الشان سفر کے لئے روانہ ہو گیا حالانکہ اسوقت چینی حکومت کی طرف سے وہاں کے لوگوں کو باہر جانے کی ممانعت تھی۔ تاشقند اور سمرقند ہوتا ہوا کابل کے راستہ سے وہ اکتوبر ۶۳۰ء میں پشاور پہنچا۔ دو برس تک سندھ اور کشمیر کی خانقاہوں میں قیام کیا۔ پھر تھانیسر، متھرا اور قنوج ہوتا ہوا بدھ مذہب کے مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے اجودھیا، پریاگ اور کپل وستو گیا۔ وہاں سے گیا اور پٹنہ ہو کر نالندا آیا۔ یہاں اس نے سنسکرت زبان سیکھی اور اپنے مذہب کے متعلق بہت معلومات حاصل کیں پھر آسام وسط ہند اور مالوے میں سفر کرتا رہا۔ ۶۴۳ء میں جب کہ وہ اپنے سفر کا بیشتر حصہ ختم کر چکا تھا تو ہرش سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ہرش

بہت جلد اُس کا گرویدہ ہوگیا اور اُس کو اپنے ہمراہ لے آیا۔ قنوج پہنچکر اس نے ایک زبردست جلسہ کیا کہ اُس کا معزز مہمان بُدھ مذہب پر تقریریں کرے۔ اس مجلس میں بہت سے بدھ برہمن اور جین عالم مدعو کئے گئے تھے اور چونکہ راجہ کے پنج سالہ جشن کا زمانہ بھی قریب تھا بہت سے خراج گذار راجہ بھی موجود تھے۔ جس عمارت میں یہ جلسے ہو رہے تھے اس میں ایک اونچا مینار بُدھ کی ایک طلائی مورت رکھنے کی غرض سے تیار کیا گیا تھا۔ جلسے ختم ہونے نہ پائے تھے کہ اس عمارت میں آگ لگ گئی اور کچھ عرصہ بعد ہرش پر ایک ناکام قاتلانہ حملہ بھی ہوا۔ ملزم گرفتار کر لیا گیا اور معلوم ہوا کہ یہ کام برہمنوں کی سازش سے کیا گیا تھا۔ یہاں سے ہرش اپنے معزز مہمان کو پریاگ لے گیا جہاں اُس نے پنج سالہ جشن منایا۔ یہ اس قسم کا چھٹا جشن تھا۔ اس موقع پر ہرش نے اپنا خزانہ اور مال و جواہر نہایت فیاضی اور دریا دلی سے بُدھ جین اور ہندو مذہب کے دُرویشوں کو تقسیم کئے۔ یہاں تک کہ اُس نے اپنے کپڑے تک بھی خیرات میں دیدئے۔ اس کے بعد ہیون سانگ اپنے ملک کو واپس چلا گیا۔ وطن پہنچکر اُس نے اپنی زندگی کے باقی بیس سال ترویج مذہب اور تعلیم ہی میں صرف کئے۔ ہندوستان کا سفرنامہ ۶۴۸ء میں مکمل ہو گیا تھا۔ ہیون سانگ ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اُس کا سفرنامہ ساتویں صدی کے حالات کے لئے نہایت مفید اور ضروری کتاب ہے۔ اسی سفرنامہ کی بدولت آج ہمیں ہرش کی سلطنت کا مفصل حال معلوم ہے چونکہ ہیون سانگ ایک عالم اور ایماندار شخص تھا اُس نے اس سفرنامے میں جو کچھ بھی لکھا ہے تحقیق کرکے لکھا ہے اور اسی لئے اُس کے بیانات قابل اعتبار ہیں۔

باب ۱۶

ہندی تمدن چوتھی صدی سے آٹھویں صدی تک

مذہب

بعض مورخین کا خیال ہے کہ قدیم تاریخ ہند میں گپت راجاؤں کا زمانہ عہدِ زرّیں کہلانے کے قابل ہے۔ یہ خیال ایک حد تک درست ہے اس لئے کہ ملکی انتظام کی خوبیوں کے علاوہ اس خاندان کے راجہ علوم وفنون کی ہر طرح سے سرپرستی کرتے تھے۔ چنانچہ مختلف فنون میں اسقدر ترقی ہوگئی تھی کہ اب بھی اُس کو دیکھ کر ہم تعجب کرتے ہیں۔ تم نے اوپر پڑھا ہے کہ اشوک کے زمانہ میں بُدھ مذہب تمام ملک میں پھیل گیا تھا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ برہمن اور جین مذہب ہندوستان سے نیست ونابود ہوگئے تھے۔ برخلاف اس کے برہمن مذہب کے ماننے والوں نے اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش شروع کردی تھی۔ ان دونوں مذہبوں کی باہمی کشمکش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے عقائد اور رسومات میں بہت سی تبدیلیاں نظر آنے لگیں۔ دونوں نے ایسی رسومات اختیار کرلیں جن کا عام لوگوں پر زیادہ اثر ہوسکے۔ مثلاً بہت سے دیوتا اور دیویوں پر ایمان رکھنا۔ بت پرستی اور دیوتاؤں کے نام پر بڑے بڑے مندر بنانا اور جلوس نکالنا۔ ان رسومات کو مذہب کا ایک جزو بنا دینے میں پہلا قدم بدھ مذہب والوں نے بڑھایا لیکن بعد میں برہمن مذہب اس میں سبقت لے گیا۔ ان اصلاحوں کے بعد جو نئی شکل برہمن مذہب نے اختیار کی اُسی کو ہندو مذہب کہتے ہیں۔ موریہ

اور کشن خاندان کے عہد میں بُدھ مذہب کو عروج ہوا۔ اسی طرح سے گپت راجاؤں کے زمانہ میں ہندو مذہب نے ترقی کی۔ لیکن پھر بھی بُدھ مذہب کا اثر باقی تھا چنانچہ فاہیان کی شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کے ہر حصّہ میں اُس کے ماننے والے کثرت سے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ ہندو مذہب کا بھی نیا دور شروع ہوگیا تھا اور اُس کا اقتدار برابر بڑھ رہا تھا۔ اُجین کے ست راپ بھی ہندو مذہب ہی کے پیرو اور سرپرست تھے۔ رفتہ رفتہ ہندو مذہب کا اثر بُدھ مذہب کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہوگیا۔ ہیون سانگ کے بیانات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بُدھ مذہب کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ اُس کے مقدّس مقامات تباہ اور برباد ہو چکے تھے۔ ہندو مذہب کی ترقی کے ساتھ اُن رسومات کا بھی رواج زیادہ ہوگیا جو اس مذہب کے ساتھ مخصوص ہیں۔ مثلاً ذات کی قیود اور پابندیاں اب بہت زیادہ سخت ہوگئیں۔ برہمنوں کی عزت اور اثر بہت بڑھ گیا۔ ہندوؤں نے بُدھ مذہب سے اہنسا کے مسئلہ کو لے لیا تھا اور اب گوشت کھانے سے وہ بھی پرہیز کرنے لگے تھے۔

علوم و فنون ہندو مذہب کی ترقی اور برہمنوں کے عروج کے ساتھ ہی ساتھ سنسکرت کا بھی رواج زیادہ ہوگیا۔ اس زمانہ میں سنسکرت کی بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سے چند نہایت مشہور ہیں۔ گپت خاندان کے عہد میں جو مذہبی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اُن میں سب سے زیادہ اہم پران ہیں۔ ان کی تعداد اٹھارہ ہے اور ان کے علاوہ اٹھارہ اُپ پران (چھوٹے پران) بھی ہیں ان کے بعض حصّے بہت پُرانے ہیں۔ لیکن وہ بھی اس زمانہ میں از سرِ نو لکھے گئے ہیں۔

مذہبی تصانیف کے علاوہ ڈرامہ ۔ ریاضی ۔ نجوم اور طب پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں ۔ کالیداس کا نام شہرت دوام حاصل کر چکا ہے ۔ آریہ بھٹ، برہم گپت اور وراہ مہراس زمانہ کے مشہور علم نجوم کے ماہرین تھے ۔ واسو بندھو جو بہت مشہور بدھ مصنف ہے چندر گپت اور سمدر گپت کا ہمعصر تھا سمدر گپت اُس پر بہت مہربان تھا ۔

کالیداس ڈرامہ نویسوں اور شاعروں میں کالیداس کا نام سب سے زیادہ مشہور ہے ۔ بعض لوگوں نے اُس کو شیکسپیر ہند بھی کہا ہے ۔ کالیداس منڈسور (مالوہ) میں پیدا ہوا اور اس طریقہ سے اُس کا تعلق اُجین سے تھا جو اُسوقت تجارت اور تہذیب کا ایک بڑا مرکز تھا ۔ جب چندر گپت نے اُجین فتح کیا تو کالیداس بھی اُس کے درباریوں میں داخل ہوا ۔ وکرمادتیہ کے نورتن مشہور ہیں ۔ کالیداس بھی اُن میں سے ایک تھا ۔ کالیداس کی شروع کی تصانیف چندر گپت کے زمانہ کی ہیں اور آخری تصانیف کمار گپت اوّل کے زمانہ کی ۔ اُس کا سب سے مشہور ڈرامہ شکنتلا ہے ۔ اس کے علاوہ کمار سنبھو ۔ میگھ دوت اور رگھو ونش بھی اُسی کی تصانیف ہیں ۔

فنون سمدر گپت موسیقی کا بڑا ماہر تھا ۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس فن کی سرپرستی کس حد تک کرتا ہوگا ۔ لیکن اس زمانہ میں بہت زیادہ ترقی فن تعمیر ۔ سنگتراشی اور مصوری نے کی ۔ فن تعمیر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ اب ایران کی تقلید سے ہندوستانی کاریگر آزاد ہو گئے اور نئے نئے طرز اپنے خود ایجاد کئے ۔ فن تعمیر کے ساتھ سنگتراشی میں بھی بہت زیادہ ترقی ہوئی ۔ ضلع جھانسی میں دیوگڑھ

کے مندر پر جو پتھر کا بنا ہوا ہے۔ ہندی سنگتراشی کے بہترین نمونے موجود ہیں۔ بھیتر گاؤں ضلع کانپور کا اینٹوں کا مندر اس سے بڑا ہے۔ وہ شاید وکرمادتیہ کے زمانہ کا ہے۔ اس زمانہ کے کاریگر دھاتوں کے کام میں بھی پوری مہارت رکھتے تھے۔ دلی میں جو لوہے کی لاٹ موجود ہے وہ سمدرگپت کے زمانہ کی ڈھلی ہوئی ہے۔ تانبے کی بہت بڑی بڑی مورتیں ڈھال لیا کرتے تھے۔ بدھ کی ایک مورت جو اسی فٹ لمبی تھی چھٹی صدی کے آخر میں بہار میں ڈھالی گئی تھی اور اسی کی ایک مورت ساڑھے سات فٹ اونچی برمنگھم کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ اجنتا کے غاروں میں سے دو بہترین غار اسی زمانہ کے ہیں۔ ان غاروں کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس پہلے جب کہ اوزار نہایت بھدے ہوتے تھے اور سائنس نے ترقی نہیں کی تھی ہندوستان کے کاریگروں نے کس قدر خوبصورت نمونے اپنے کمالات کے پیش کئے ہیں۔ پہاڑوں اور چٹانوں کو تراش کر بڑے بڑے کمرے تیار کئے گئے ہیں۔ اسی طرح سے ان غاروں میں جو نقاشی کا کام کیا گیا ہے وہ دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ ہندوستان میں مصوری کا فن اسوقت بہت ترقی کر چکا تھا بعض تصاویر کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ یہ زندہ ہیں۔ غرض کہ گپت خاندان کے زمانہ میں فن تعمیر سنگتراشی اور مصوری اپنے انتہائی کمال کو پہنچ چکے تھے۔ ہرش کے زمانہ میں فن سنگتراشی کا کمال تو ضرور قائم رہا لیکن دوسرے فنون یقینی روبہ زوال تھے۔ سنگتراشی کی ترقی کا بڑا سبب بت پرستی اور بت تراشی کا رواج تھا۔

ملک کی حالت

اس زمانہ کے حالات کے لئے ہمارے پاس دو چینی سیاحوں کے سفرنامے موجود ہیں۔ افسوس ہے

کہ فاہیان اپنے خاص مقصد کے علاوہ دوسرے معاملات کی طرف بہت کم توجہ کرتا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ گپت راجاؤں کا انتظام معقول تھا۔ اکثر لوگ فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے راستوں پر مسافروں کے لئے قیام گاہیں موجود تھیں۔ لوگ نہایت آزادی سے آتے جاتے تھے اور کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جرائم کی سزائیں ہلکی تھیں۔ رہزنی کے جرم میں مجرم کا دستِ راست کاٹا جاتا تھا برخلاف اس کے ہیون سانگ کے سفرنامے سے بہت معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔ ہرش کے انتظام کی چینی سیاح تعریف کرتا ہے کہ وہ بہت مستعد حکمراں تھا اور ملک کے مختلف حصوں میں اکثر دورہ کرتا تھا۔ لیکن راستے اسقدر محفوظ نہ تھے جیسے فاہیان کے زمانہ میں چنانچہ ہیون سانگ کو کئی جگہ رہزنوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ملزم کو آگ میں ڈال کر یا زہر دے کر دیکھا جاتا تھا کہ اُن چیزوں کا اثر ہوتا ہے یا نہیں اور اسی سے اُس کی بے گناہی یا جرم ثابت کرتے تھے۔ حکومت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ مالگزاری کا روپیہ تھا۔ کاشتکار سے اُس کی آمدنی کا چھٹا حصہ لیا جاتا تھا۔ دوسرے محصول بہت کم تھے۔ ہیون سانگ ذکر کرتا ہے کہ وقائع نویسوں کا ایک محکمہ علیحدہ تھا لیکن افسوس ہے کہ اُن کی تحریروں میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ ورنہ اُس زمانہ کی تاریخ اور حالات کے لئے یہ بہت مفید ثابت ہوتیں۔

باب ۱۷

راجپوت سنہ ۸۰۰ - ۱۲۰۰ء

راجپوتوں کا نسب ہرش کی وفات کے بعد اُس کی سلطنت کا شیرازہ منتشر ہوگیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جو سلطنت حکمراں کی ذاتی قابلیت کی وجہ سے قائم ہو اور جس کی بنیاد مضبوط نہ ہو وہ کسقدر آسانی سے ختم ہو جاتی ہے۔ ساتویں اور آٹھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں بہت سی نئی ریاستیں قائم ہوئیں جو اکثر آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ ان ریاستوں کے راجہ راجپوت کہلاتے تھے۔ راجپوت کون تھے اور اُن کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ خود راجپوتوں کا دعویٰ ہے کہ وہ قدیم ویدوں کے زمانے کے چندر ونشی اور سوریہ ونشی چھتری راجاؤں کی نسل سے ہیں۔ یعنی چاند اور سورج کی اولاد میں سے ہیں اور اسی بنا پر وہ اپنے آپ کو چھتری کہتے ہیں لیکن لفظ "راجپوت" قدیم کتابوں میں نہیں ملتا۔ اور اکثر محققین کی رائے ہے کہ راجپوت قدیم چھتریوں کی اولاد سے نہیں۔ تم اوپر پڑھ آئے ہو کہ گپت خاندان کے عروج سے پہلے اور نیز اُس کے زوال کے بعد متعدد قوموں کے لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے اور یہیں آباد ہوگئے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ یہاں کے باشندوں میں مل جل گئے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ مذہب اور تمدن کے لحاظ سے

ہندو ہی ہوگئے اور اُن میں اور ہندوستان کے باشندوں میں کوئی فرق باقی نہ رہا۔ اس نئی نسل کے لوگ وسط ایشیا کے رہنے والوں کی طرح جنگجو اور لڑائی کے شوقین اور ہندوستان کے باشندوں کی طرح مذہبی رسوم اور روایت کے دلدادہ تھے۔ ان ہی کے سردار راجپوت کہلاتے تھے۔ برہمنوں اور ہندو مذہب کے وہ بہت بڑے حامی تھے۔ لہذا زمانہ گذرنے کے ساتھ اُن کا یہ دعویٰ کہ وہ قدیم چھتریوں کی اولاد میں ہیں عام طور پر تسلیم کرلیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آٹھویں صدی سے ہندو سوسائٹی میں راجپوتوں کو وہی مرتبہ اور عزت حاصل ہے جو پُرانے زمانہ میں چھتریوں کو حاصل تھی۔ بہرحال بعض مورخوں کی رائے ہے کہ وہ خالص آریہ نسل سے نہیں بلکہ سیتھین۔ شک اور ہون قوموں کا خون بھی اُن کی رگوں میں موجود ہے۔

مذہب ہیون سانگ کے سفرنامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ملک میں ہندو مذہب دوبارہ اقتدار حاصل کررہا تھا اور بُدھ مذہب کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ مگر پھر بھی ساتویں صدی تک اُس کا اثر کافی تھا۔ راجپوت ریاستوں کے قائم ہوجانے کے بعد ہندو مذہب نے بہت جلد ترقی کی۔ راجپوت اسی مذہب کے پیرو تھے اور اس کی ہر طرح سے حمایت کرتے تھے بُدھ مت کی تعلیم اُن کے اُصولوں کے خلاف تھی۔ اُن کا پیشہ لڑائی تھا اور وہ نہایت دلیر اور بہادر ہوتے تھے۔ وہ اہنسا کو کیسے مان سکتے تھے اور اُس پر کس طرح سے عامل ہو سکتے تھے؟ ہندو مذہب کی اشاعت میں اُنہوں نے بہت مدد دی۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہندو مذہب نے جو اب نئی شکل اختیار کی تھی وہ قدیم ویدک مذہب سے بہت کچھ مختلف تھی۔ نئی قوموں کے

افراد جنہوں نے یہ مذہب اختیار کر لیا تھا اپنے ساتھ نئی نئی رسوم اور اثرات لائے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے نئے دیوتاؤں کی پوجا ہونے لگی۔ ظاہری رسوم کی ادائیگی پر بہت زیادہ زور دیا جانے لگا۔ روز بروز نئے نئے فرقے وجود میں آنے لگے۔ چنانچہ ایک طرف تو ہندو مذہب کے پیرو اور حامیوں کی تعداد بڑھتی گئی اور دوسری طرف اُن کے مذہبی عقائد اور خیالات میں بہت سی تبدیلیاں ہوتی گئیں۔ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لئے ایک زبردست ریفارمر کی ضرورت تھی۔ کمارل بھٹ نے جو ایک عالم اور جوشیلا برہمن تھا ان خرابیوں کے روکنے کی کوشش شروع کی۔ وہ لوگوں کو سمجھاتا تھا کہ اُن کا مذہب ویدک زمانہ کے لوگوں کی طرح سادہ اور صاف ہونا چاہیئے۔ کمارل بھٹ کے بعد اور اُس سے زیادہ کامیابی کے ساتھ یہ کام شنکر اچاریہ نے انجام دیا۔ شنکر اچاریہ آٹھویں صدی کے آخر میں ملابار میں پیدا ہوئے۔ وہ سنسکرت کے بہت بڑے عالم تھے اور نہایت فصاحت اور بلاغت کے ساتھ تقریر کر سکتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد یہی قرار دیا تھا کہ ہندو مذہب کی اصلاح کریں اور اُنہوں نے اپنی مختصر زندگی میں تمام ملک کا دورہ کر کے وعظ اور تقریروں کے ذریعہ سے ویدوں کی تعلیم کی اشاعت کی۔ اس کے علاوہ بہت سی کتابیں بھی لکھیں۔ اُنہوں نے توحید کا سبق بھی سکھایا اور اُس کا ثبوت وہ ویدوں ہی سے دیتے تھے۔ اسی لئے اُس کا نام اُنہوں نے ویدانت رکھا تھا۔ شنکر اچاریہ نے یہ کام بہت صحیح وقت پر کیا اور اُن کی ان کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ ہندو مذہب نے بدھ مذہب پر پوری کامیابی حاصل کی اور سارے ملک میں پھیل گیا۔

راجپوتوں کی خصوصیات راجپوت بہت بہادر تھے اور اپنے

وطن۔ خاندان اور عورتوں کی عزّت کے لئے جان کی بھی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔ اُن کی مہمان نوازی مشہور تھی ہمیشہ سچ بولتے اور دشمن کے ساتھ چاہے اُس کو شکست ہی ہوگئی ہو نہایت فیاضی کا برتاؤ کرتے ۔ مردوں کی طرح عورتیں بھی دلیر اور پاک دامن تھیں۔ اُن کی دلیری کا سب سے بیّن ثبوت جوہر کی رسم میں ملتا ہے ۔جب لڑائی میں دشمن سے بچنے کی کوئی اُمید باقی نہ رہتی تو ایک بڑی چتا بنا کر سب عورتیں جل کر خاک ہو جاتیں۔ اُس کے بعد قلعہ کا پھاٹک کھول دیا جاتا اور راجپوت سپاہی گیروا لباس پہن کر نکلتے اور لڑتے لڑتے جان دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ راجپوتوں کی یہ خصوصیات کم ہوتی گئیں اور اُن کی کمزوریاں بڑھتی گئیں۔ راجپوتوں میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ معمولی باتوں پر آمادۂ جنگ ہو جاتے تھے ۔ راجپوت خاندان ہمیشہ آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ اُن کے لئے تقریباً یہ ناممکن تھا کہ متحد اور متفق ہو کر دشمن کا مقابلہ کرسکیں اور اُن کی تباہی اور بربادی کا سب سے بڑا سبب آپس کا نفاق ہی تھا۔ راجپوت افیون کا بہت استعمال کرتے تھے ۔ لڑکی کی پیدائش کو بہت بُرا سمجھتے تھے ۔ اور اکثر بچپن ہی میں لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیتے تھے۔ ستی کا رواج بھی اس زمانہ میں بہت عام تھا۔

علوم و فنون راجپوت راجہ علوم و فنون کی سرپرستی بھی دل کھول کر کرتے تھے ۔ اُن میں سے ہر ایک چاہتا تھا کہ اُس کے دربار میں بڑے بڑے شاعر اور مصنّف ہوں ۔چنانچہ اس زمانہ میں مذہبی تصانیف کے علاوہ بہت سے ڈرامے اور دوسری کتابیں تصنیف ہوئیں۔ بعض راجہ خود بہت بڑے عالم اور شاعر تھے ۔ اس عہد کا سب سے مشہور

شاعر بھوبھوتی قنوج کے دربار میں تھا۔ اس کا مقابلہ اکثر کالیداس سے کیا جاتا ہے۔ ماگھ۔ پدم گپت اور ہرش بھی مشہور شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ کشمیر کے نامور شاعر کلھن نے کشمیر کی منظوم تاریخ راج ترنگنی اسی زمانہ میں لکھی۔

فن تعمیر میں بھی نمایاں ترقی ہوئی۔ مذہبی جوش کی وجہ سے کثرت سے مندر تعمیر کیے گئے اور اُن میں ہر قسم کے کمالات دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بندیل کھنڈ میں کھجوراہو کا مندر اور اُڑیسہ میں جگناتھ پوری کا مندر اسی زمانہ کا ہے۔ آبو پہاڑ کا جین مندر گیارہویں صدی میں تعمیر کیا گیا تھا۔ الورا کا کیلاش مندر اور اجنتا کے مندروں کی نقاشی اور مصوری میں سے اکثر اسی زمانہ کی یادگار ہیں۔

شمالی ہند کی خود مختار ریاستیں

اس زمانہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ اُن کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

کشمیر

کشمیر کے حالات ہم کو راج ترنگنی میں ملتے ہیں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ لیکن ساتویں صدی سے پہلے کے صحیح حالات نہیں دستیاب ہو سکے۔ کشن خاندان کے زوال کے بعد کشمیر میں ایک خود مختار ریاست قائم ہو گئی۔ ہیون سانگ دو سال تک اس ریاست میں گھومتا رہا وہ کہتا ہے کہ وہاں کے راجہ نے اُس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا۔ لیکن اس کا نام نہیں بتلاتا۔ آٹھویں صدی میں کشمیر کے راجہ جین کے باجگزار تھے۔ اس زمانہ کا سب سے مشہور راجہ للتادت تھا جس نے ۷۳۳ء کے

قریب قنوج کے راجہ کو شکست دی۔ اس کے علاوہ قرب وجوار کی اور ریاستیں بھی اُس نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں۔ اُس کی مشہور یادگار مارتانڈ کا مندر ہے جس سے ہم کشمیر کے فن تعمیر کی خصوصیات کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ بارھویں صدی میں ایک اور مشہور راجہ جے سمہہ ۱۱۲۷-۱۱۵۵ء میں ہوا ہے جس کے درباری شاعر کلہن نے راج ترنگنی لکھی ہے۔ ۱۳۴۰ء میں ایک مسلمان سردار نے تخت پر قبضہ کیا اور اُس وقت سے کشمیر کی بادشاہت مسلمانوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

کشمیر کے راجہ اپنے ظلم اور تشدد کے لئے بدنام ہیں۔ ان میں اکثر بہت لالچی اور ظالم تھے۔ رعایا کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر روپیہ وصول کرتے تھے راج ترنگنی میں ان مظالم کو بہت مفصل طریقہ سے بیان کیا گیا ہے۔

نیپال ریاست نیپال قدیم زمانہ میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اشوک کے عہد میں وہ مگدھ کی باجگزار تھی۔ اس کے بعد سمدر گپت کے کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان سرحدی ریاستوں میں جو اُس کی مطیع تھیں ریاست نیپال بھی شامل تھی۔ گپت خاندان کے زوال کے ساتھ نیپال پھر خودمختار ریاست ہو گئی۔ آٹھویں اور نویں صدی میں نیپال کے راجہ تبت کے خراجگزار تھے۔ لیکن نویں صدی میں وہ پھر ایک خودمختار ریاست ہو گئی۔ تیرھویں صدی میں نیپال کی حکومت ایک نئے خاندان میں منتقل ہوئی اور اٹھارویں صدی میں گورکھوں نے اس کو فتح کر کے اپنی سلطنت قائم کی۔ اب تک اسی قوم کے راجہ یہاں حکومت کرتے ہیں۔

کامروپ کامروپ یا آسام کی ریاست بھی کشمیر کی طرح قدرتی طور پر محفوظ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ تقریباً ہمیشہ ایک خودمختار ریاست

تھی۔ سمدر گپت کے زمانہ میں کامروپ کا راجہ مگدھ کا خراجگزار تھا۔ ساتویں صدی میں کامروپ کے راجہ نے ہیون سانگ کو اپنے ملک میں بلایا اور اسکی بہت عزت و تواضع کی حالانکہ نہ وہ خود بدھ مذہب کا پیرو تھا اور نہ اس کی رعایا۔ تیرہویں صدی میں شمالی برما کی "شانی" قوم اہوم نے کامروپ پر حملہ کیا اور رفتہ رفتہ تمام ریاست پر قبضہ کرلیا۔ یہاں آباد ہوجانے پر اُن لوگوں نے اپنا مذہب اور زبان ترک کرکے ہندو مذہب اور رسم و رواج اس طریقہ سے اختیار کئے کہ اُن کے اصلی مذہب اور زبان کا نشان تک باقی نہ رہا۔

قنوج

ہرش کے بعد اُس کے وزیر نے قنوج پر قبضہ کرلیا اور ایک چینی سیاح پر حملہ کیا جس کا بدلہ لینے کی غرض سے تبت کے راجہ نے ایک بڑی فوج بھیجی۔ اس کی مدد سے چینی سیاح نے اس کو شکست دی اور گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے بعد کے حالات کچھ صحت کے ساتھ نہیں ملتے لیکن سنہ ۷۳۱ء میں قنوج کے راجہ یشوورمن نے اپنا ایک سفیر چین کے دربار میں بھیجا تھا۔ سنہ ۷۴۰ء میں کشمیر کے راجہ للتادت نے یشوورمن کو شکست دی اور قتل کرڈالا۔ نویں صدی کے شروع میں بنگال کے راجہ دھرم پال نے قنوج کے راجہ کو تخت سے اتار کر ایک اور شخص کو راجہ بنادیا لیکن چند ہی سال بعد پرہیار راجہ ناگ بھٹ نے قنوج کو فتح کیا (سنہ ۸۱۶ء) اور اپنے خاندان کی بنیاد ڈالی۔

ناگ بھٹ دراصل گوجر قوم کا راجہ تھا۔ یہ قوم چھٹی صدی میں ہندوستان میں داخل ہوئی اور کئی ریاستیں اپنی قائم کرلیں۔ ہیون سانگ کے زمانہ سفر میں یہاں کے راجہ چھتری نسل کے خیال کئے جانے لگے تھے۔ اسی قوم گوجر کی ایک شاخ پرہیار تھی جس کے راجہ ناگ بھٹ نے سنہ ۸۱۶ء میں قنوج کی سلطنت پر

قبضہ کر لیا۔ ناگ بھٹ اور اُس کے بیٹے رام دیو کے حالات نہیں ملتے۔
اُن کے جانشین راجہ مہیر نے جو بھوج کے لقب سے مشہور ہے تقریباً پچاس
سال تک حکومت کی۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اُس کی وسیع سلطنت اودھ سے
مشرقی پنجاب تک تھی۔ راجپوتانہ اور گجرات بھی اُس کی قلمرو میں شامل تھے۔ گویا
کہ اُس کی مغربی حدود دریائے ستلج اور جنوبی حد نربدا تھی۔ لیکن مالوہ اور وسط ہند
میں خود مختار ریاستیں موجود تھیں۔ اس طرح سے بھوج کے زمانہ میں قنوج کی
ریاست نہایت وسیع اور دولتمند تھی۔ اُس کے بعد اُس کا بیٹا مہندر پال
تخت نشین ہوا۔ مہندر کے پوتے مہی پال کے زمانہ میں دکن کے راشٹر کوٹ
راجا اندر نے ۹۱۶ء میں قنوج پر حملہ کیا اور فتح کر لیا۔ اُس کے جاتے ہی مہی پال
پھر واپس آگیا۔ لیکن اب قنوج کی قوت اور شوکت ختم ہو چکی تھی۔ بہت سے صوبے
خود مختار ہو گئے۔ سلطان محمود غزنوی کے حملہ کے وقت قنوج کا راجہ راج پال تھا۔
اُس نے محمود کی اطاعت قبول کر لی تھی اور اسی وجہ سے اپنے ہمسایوں کے ہاتھ
سے مارا گیا۔ گیارہویں صدی میں قنوج پر گہروار راجپوتوں کا قبضہ ہو گیا۔ راجہ
جے چند اسی خاندان سے تھا۔ اس کا حال تم آگے پڑھو گے۔

اجمیر و دہلی چوہان اور تومر

چوہان راجپوت سانبھر میں حکومت کرتے تھے گیارہویں
صدی کے آخر میں اجائے دیو نے اجمیر کی بنیاد ڈالی۔
بارہویں صدی میں چوہانوں کی قوت بہت زیادہ بڑھی
اور دہلی کی ریاست بھی اُن کے قبضہ میں آگئی۔ اس خاندان کا سب سے
مشہور راجہ پرتھوی راج تھا۔ وہ بہت بہادر اور دلیر سپاہی تھا شاعروں اور
عالموں کی قدر کرتا تھا۔ پرتھوی راج قنوج کے راجہ جے چند کی لڑکی کو اُس کے
باپ کی مرضی کے خلاف لے آیا تھا اور اُس سے شادی کر لی تھی۔ اس واقعہ

نے چوہان اور گہروار یا راٹھور راجپوتوں کو ایک دوسرے کا جانی دشمن
بنا دیا تھا جس کا نتیجہ دونوں کے حق میں بہت بُرا ہوا۔ پرتھوی راج نے
۱۱۸۲ء میں بندیلکھنڈ کے چندیل راجہ پر حملہ کیا اور اُسکو شکست دی لیکن اس
کا سب سے مشہور جنگی کارنامہ ترائن کی پہلی لڑائی ہے جس میں اُس نے ہندو
راجاؤں کو جمع کر کے محمد غوری کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور اُس کو بھگا دیا
لیکن ایک سال بعد ۱۱۹۲ء میں محمد غوری پھر واپس آیا اور اُسی ترائن کے
میدان میں پرتھوی راج کو شکست دیکر گرفتار کیا اور قتل کروا دیا۔

دہلی میں تومر خاندان کے راجپوت حکومت کرتے تھے۔ دہلی کا شہر
دسویں صدی میں آباد ہوا اگرچہ اندرپرست مہابھارت کے زمانہ میں بھی مشہور
جگہ تھی۔ لیکن دہلی کی اہمیت مسلمانوں کی سلطنت قائم ہو جانے کے بعد ہی
بڑھی ہے۔ گیارہویں صدی میں تومر راجپوتوں نے اپنی سلطنت کی بنیاد
ڈالی اور تقریباً ایک سو سال تک وہ حکومت کرتے رہے۔ بارہویں صدی
میں راجہ انگ پال تومر کی وفات کے بعد پرتھوی راج چوہان نے دہلی پر
قبضہ کر کے تومر خاندان کا خاتمہ کر دیا۔ پرتھوی راج کی شکست کے کچھ عرصہ
بعد دہلی پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور قطب الدین ایبک کے زمانہ میں وہ
اسلامی سلطنت کا پایۂ تخت ہو گیا۔

بندیل کھنڈ نویں صدی عیسوی میں ایک چندیل سردار ننوک نامی نے
اس ریاست کی بنیاد ڈالی۔ دسویں صدی کے شروع
میں چندیل خاندان کے راجہ ہرش دیو نے قنوج کے راجہ مہی پال کو
اندرراجہ کے خلاف مدد دی اور دوبارہ اُس کو قنوج کا تخت دلوا دیا۔
ہرش کے بیٹے یشوورمن (۹۳۰-۹۵۰ء) نے کالنجر کا قلعہ کالاچوری

راجپوتوں سے چھین لیا اور اُس کے بعد قنوج کے راجہ دیو پال پر حملہ کیا اور وہاں سے وشنو کی طلائی مورتی لاکر کھجوراہو کے مندر میں رکھی۔ یہ مندر اسی راجہ نے بنوایا ہے اور اس زمانہ کی بہترین عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یشو ورمن کے بیٹے دھنگا نے پچاس سال (سنہ ۹۵۰-۹۹۹ء) تک حکومت کی۔ غزنی کے امیر سبکتگین نے جب ہندوستان پر حملہ کیا تو چندیل راجہ دھنگا بھی جے پال کی مدد کو گیا تھا۔ اُس کے بیٹے گنڈا (سنہ ۹۹۹-۱۰۲۵ء) نے محمود غزنوی کے خلاف انند پال کو مدد دی تھی۔ سنہ ۱۰۱۸ء میں محمود نے قنوج پر فوج کشی کی۔ وہاں کے راجہ راج پال نے اس کی اطاعت قبول کرلی۔ چندیل راجہ گنڈا نے راج پال کی اس بزدلی پر اُس کو سزا دینے کے لئے ایک فوج بھیجی اور اُس کو مروا ڈالا۔ اس پر محمود چندیلوں سے بدلہ لینے کے لئے آیا۔ لیکن گنڈا میدان جنگ میں اس کا مقابلہ نہ کرسکا اور قلعہ کالنجر اُس کے حوالے کردیا۔ گنڈا کے بعد چندیلوں اور کالاچوریوں میں ایک مدت تک جنگ ہوتی رہی۔ سنہ ۱۱۶۵ء میں پرمال دیو تخت پر بیٹھا لیکن سنہ ۱۱۸۲ء میں اُس کو بھی پرتھوی راج کے خلاف شکست ہوئی۔ مہوبہ کے دو بہادر جوان آلہ اور اودل جن کے بہت سے قصے مشہور ہیں اسی راجہ کے درباری تھے۔ قطب الدین ایبک نے سنہ ۱۲۰۲ء میں چندیل ریاست پر حملہ کیا پرمال دیو نے بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ لیکن صلح ہونے سے قبل ہی وہ مرگیا اس کے بعد چندیل سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ قطب الدین نے چندیلوں کی دارالسلطنت مہوبہ میں اپنا گورنر مقرر کیا اور اس ریاست کو غوری سلطنت میں شامل کرلیا۔

مالوہ | مالوے میں نویں صدی سے پرمار خاندان کے راجہ حکومت کررہے

تھے یہ لوگ علم کی سرپرستی کے لئے مشہور ہیں۔ لیکن وہ اپنی سلطنت کی وسعت بہت زیادہ نہیں بڑھا سکے۔ اُن کو ہمیشہ دشمنوں سے سامنا کرنا پڑتا تھا۔ چاروں طرف سے طاقتور ریاستیں اُن کو گھیرے ہوئے تھیں یعنی جھوبہ کے چندیل۔ چیدی کے کالاچوری۔ گجرات کے سولنکی اور دکن کے چالوکیہ خاندان۔ پرمار خاندان کا سب سے مشہور راجہ بھوج ہوا ہے۔ یہ خود بھی شاعر تھا اور عالموں کی قدر بھی کرتا تھا۔ نجوم سے بھی کچھ واقفیت رکھتا تھا۔ دھار میں اُس نے ایک سنسکرت کی بڑی درسگاہ قائم کی تھی اور اس کے علاوہ ور بھی عمارتیں بنوائی تھیں۔ بھوپال کے جنوب میں بھوجپور کی جھیل اسی راجہ کی بنوائی ہوئی ہے۔ اس کی فتوحات کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ اُس کی وفات کے بعد مالوہ کی ریاست کمزور ہو گئی۔ علاءالدین خلجی نے اس کو سلطنت دہلی میں شامل کر لیا۔

گجرات گجرات میں سولنکی خاندان حکمراں تھا جس کی بنیاد دسویں صدی کے وسط میں پڑی تھی۔ اُن کا پایۂ تخت انہلواڑہ تھا۔ ۱۰۲۴ء میں جب سلطان محمود نے سومنات پر حملہ کیا تو سولنکی راجہ بھیم اُس کے مقابلہ کے لئے آیا تھا اس خاندان کا سب سے مشہور راجہ کماریال ہوا ہے۔ اُس نے جین مذہب قبول کر لیا تھا اور جانوروں کی قربانی بند کرا دی تھی۔ اُس نے نئے مندر تعمیر کرائے اور پرانے مندروں کی مرمت کرائی جن میں سومنات کا مشہور مندر بھی شامل ہے۔ تیرھویں صدی کے وسط میں سولنکی خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور گجرات کی سلطنت بگھیلا خاندان میں منتقل ہو گئی۔ علاءالدین کے عہد میں راجہ کرن کو شکست ہوئی اور گجرات خلجی سلطنت کا ایک صوبہ ہو گیا۔

چیدی ریاست چیدی میں کالاچوری خاندان کے راجہ حکومت کرتے

تھے۔ نویں صدی کے آخر میں راجہ کلا کو قنوج کے راجہ بھوج اور دوسرے پڑوسیوں سے لڑنا پڑا۔ گیارہویں صدی میں گنگا دیو (سنہ ۱۰۱۵-۱۰۴۰ء) نے اپنی سلطنت کو بہت وسعت دی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کرن (سنہ ۱۰۴۰ء) تخت پر بیٹھا۔ شروع شروع میں اس نے بھی بہت سی فتوحات حاصل کیں۔ مالوہ کے راجہ بھوج کے زوال میں بہت کچھ حصہ راجہ کرن ہی کا تھا۔ بنگال کے پال راجاؤں کے خلاف بھی ابتدا میں کرن کامیاب ہوا لیکن آخر میں اس کو شکست ہوئی۔ چندیل اور چالوکیہ راجاؤں نے بھی اس کو شکست دی۔ ان شکستوں سے کالاچوری خاندان نہایت کمزور ہو گیا۔ چنانچہ جب مالوہ کے راجہ لکشمی دھر نے چیدی پر حملہ کیا تو بغیر کسی دقت کے اس کو فتح کر لیا اس کے بعد اس خاندان کی کوئی اہمیت باقی نہ رہی۔ تیرہویں صدی کے شروع میں گوداوری کے کنارے پر جو کالاچوری کے مقبوضات تھے وہاں دو نئی اور خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں یعنی وارنگل اور دیوگری اور کالاچوری ریاست کا وہ حصہ جو نربدا کے کنارے پر واقع تھا گجرات کے بگھیل راجاؤں کے قبضہ میں آ گیا۔

بہار اور بنگال بہار اور بنگال ہرش کی سلطنت میں شامل تھے۔ اس کی وفات پر یہاں بھی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ آٹھویں صدی میں راجہ گوپال نے پال خاندان کی بنیاد ڈالی۔ راجہ گوپال کے حالات معلوم نہیں۔ لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنی تمام زندگی اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے میں صرف کی ہوگی۔ وہ بدھ مذہب کا پیرو تھا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا دھرم پال تخت پر بیٹھا اس نے پینتالیس سال تک حکومت کی اور اس کے زمانہ میں اس سلطنت کو بہت ترقی ہوئی۔ باپ کی

طرح وہ بھی بدھ مذہب کو مانتا تھا۔ اس نے گنگا کے کنارے پر ایک بدھ کا مٹھ بنوایا جس میں ۱۰۰ استاد اور ۶ کالج تھے۔ دھرم پال کے بعد اس کا بیٹا دیوپال تخت پر بیٹھا۔ بنگال میں یہ مشہور ہے کہ پال خاندان کا سب سے طاقتور راجہ دیوپال ہی تھا۔ باپ کی طرح دیوپال کی مدت حکومت بھی بہت طویل تھی۔ اس خاندان کا نواں بادشاہ مہی پال تھا جس کے زمانہ میں جنوب ہند کے چولا راجہ راجندر نے بنگال پر حملہ کیا اور مہی پال کو شکست دی۔ ۱۰۸۴ء میں رام پال تخت پر بیٹھا اس کے زمانہ میں بدھ مذہب کا زوال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ اس کا اثر زائل ہونے لگا۔ رام پال اس خاندان کا آخری بڑا راجہ تھا۔ اس کے جانشین بہت کمزور اور نااہل تھے اور بارھویں صدی میں سین خاندان نے اُن کی سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

سین خاندان کی بنیاد گیارھویں صدی میں سمنت سین نے ڈالی تھی۔ سمنت سین کا بیٹا ہمنت سین تھا اور اس کا بیٹا اور جانشین وجا سین ہوا۔ اُس کے زمانہ میں سین خاندان کی قوت بہت زیادہ بڑھ گئی اور پال سلطنت پر بھی سین خاندان کا قبضہ ہو گیا۔ اس کا بیٹا بلال سین برہمنوں کے مذہب کا بڑا حامی تھا اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کے لئے اُس نے بہت کوشش کی۔ بلال سین خود بھی ایک عالم راجہ تھا اور دوسرے عالموں کی قدر کرتا تھا۔ اس کا بیٹا لکشمن سین اس خاندان کا آخری راجہ تھا کیونکہ اسی کے عہد میں محمد بن بختیار خلجی نے بنگال فتح کیا اور اس وقت سے وہ دہلی کی سلطنت کا ایک صوبہ ہو گیا۔

باب ۱۸

دکن اور جنوبی ہند کی ریاستیں

دکن در اصل سنسکرت لفظ دکشن کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے لغظی معنی ہیں "جنوب" اور ملک کے اس حصّہ کا نام ہے جو کرشنا اور نربدا کے درمیان واقع ہے۔ یہ خطّہ چاروں طرف سے سمندر اور پہاڑوں سے گھرا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہاں دراوڑ لوگ آباد تھے۔ آریوں کی یورش ساتویں صدی قبل مسیح کے بعد شروع ہوئی۔ اس وقت تک دراوڑ بھی تہذیب اور تمدن میں کافی ترقی کر چکے تھے۔ تیسری صدی قبل مسیح میں دکن سلطنت موریہ میں شامل تھا۔ اشوک کے کتبات میں دکن کی دو قوموں کا ذکر ہے۔ راشٹر کوٹ جن کی وجہ سے دکن کا مغربی حصّہ مہاراشٹر کہلاتا ہے اور آندھر جن کا حال تم پہلے پڑھ چکے ہو۔ اشوک کے بعد دکن میں آندھر ریاست خود مختار ہو گئی۔

آندھر ستواہن خاندان کے عہد میں اس ریاست نے بہت عروج حاصل کیا۔ اس خاندان کے راجاؤں نے چار سو برس سے زیادہ حکومت کی۔ (سنہ ۲۳۰ ق م سے سنہ ۲۳۶ء تک) اور سنہ ۲۷ ق م میں مگدھ کے آخری کنو راجہ کو شکست دی۔ اس خاندان نے گجرات اور مالوہ کے ستراپوں کا مقابلہ بھی کیا۔ سنہ ۱۲۰ء میں راجہ گوتمی پتر نے برار، مالوہ اور گجرات کو فتح کیا۔ اس سلطنت کے دو بڑے صوبے تھے۔ اس عہد میں فن تعمیر اور

سنگتراشی کو بہت ترقی ہوئی۔ غاروں کے مندر تعمیر ہوئے۔

پلّو ستواہنوں کے بعد ساڑھے تین سو برس تک دکن کی تاریخ کے مفصل اور صحیح حالات معلوم نہیں۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ پلّو ایرانی نسل سے تھے اور "پلّو" دراصل پہلوی کی دوسری شکل ہے۔ کچھ لوگوں کا قیاس ہے کہ یہ دکن ہی کی قوموں میں سے ایک فرقہ تھا۔ بہرحال اُنھوں نے گوداوری کے جنوب میں اپنی ریاست قائم کی جس میں کانچی ورم نہایت بارونق اور مشہور شہر تھا۔ چوتھی صدی میں پلّو راجہ نے سمدرگپت کا مقابلہ کیا تھا۔ اُس کے جانشین چندرگپت وکرمادتیہ نے اپنی ایک لڑکی کی شادی پلّو راجہ رودرسین کے ساتھ کی۔

چالوکیہ خاندان چھٹی صدی عیسوی میں شمالی ہندوستان کے چالوکیہ راجپوت دکن میں داخل ہوتے اور پلّوؤں کے پائے تخت بادامی پر قبضہ کر لیا۔ پلّو، کرشنا اور تنگ بھدرا کے پار چلے گئے اور دو سو برس تک ان میں اور چالوکیوں میں جنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ چالوکیہ خاندان کا سب سے مشہور اور نامور راجہ پلکیشن تھا۔ وہ ۶۰۸ء میں تخت پر بیٹھا اور پینتیس برس تک حکومت کرتا رہا۔ اس کا سب سے مشہور کارنامہ وہ لڑائی ہے جس میں اُس نے ہرش وردھن کو دریائے نربدا کے کنارے شکست دی۔ اس کے کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ گجرات۔ مالوہ۔ دنگی اور کانچی پور فتح کئے اور پلّوؤں سے برابر لڑتا رہا۔ دنگی میں اُس نے اپنے بھائی وشنو وردھن کو گورنر مقرر کیا۔ بعد میں اسی وشنو وردھن کی اولاد نے اپنی ایک خود مختار ریاست قائم کر لی جو تاریخ میں مشرقی چالوکیہ کے نام سے مشہور ہے۔ چالوکیوں نے جنوبی

ہند میں چول اور پانڈیہ راجاؤں سے دوستانہ تعلقات پیدا کیے۔ پل کیشن اب ہندوستان کے بڑے راجاؤں میں شمار کیا جانے لگا۔ اُس کی سلطنت مشرقی ساحل سے مغربی ساحل تک اور شمال میں نربدا سے لے کر جنوب میں بیلار ندی تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی فوج بہت زبردست تھی۔ ہیون سانگ چینی سیاح ۶۳۹ء میں دکن گیا تو اُس نے پل کیشن سے ملاقات کی۔ وہ اس راجہ کو کشتری بتلاتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ نہایت فیاض اور مہربان ہے اور اُس کے خیالات نہایت بلند۔ فوج کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ ہاتھیوں کو بھی شراب پلا کر مست کیا جاتا تھا۔ اس کی قوت کا شہرہ ایران تک پہنچ گیا تھا اور وہاں کے بادشاہ خسرو ثانی نے ایک سفیر پل کیشن کے دربار میں ۶۲۵ء میں بھیجا۔ اجنتا میں اس واقعہ کی ایک تصویر اب تک موجود ہے جس میں ایرانی سفیر اپنے بادشاہ کا خط پل کیشن کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔ پل کیشن کی آخری عمر میں پلوؤں نے پھر اس کے ملک پر حملہ کیا اور اُس کی راجدھانی واتاپی کو تباہ کر ڈالا۔ اسی جنگ کے دوران میں پل کیشن مر گیا۔ اس کے بیٹے وکرمادتیہ نے پلوؤں سے اپنا موروثی ملک چھین لیا۔ لیکن پلوؤں سے لڑائی جاری رہی۔ اس وجہ سے چالوکیہ سلطنت برابر کمزور ہوتی گئی اور ۷۵۳ء میں راشٹر کوٹ قبیلہ کے ایک سردار نے اس خاندان کا خاتمہ کر کے سلطنت کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔

راشٹر کوٹ راشٹر کوٹ راجہ بڑے جنگجو تھے اور اپنے قرب و جوار کی ریاستوں سے لڑتے رہتے تھے۔ راجہ کرشن اوّل (۷۶۰ء-۷۷۵ء) نے الورا کا مشہور کیلاش مندر چٹانوں کو تراش کر بنوایا

تھا۔ ۹۷۳ء میں اس خاندان کے آخری راجہ کو اس کے ایک سردار نے
تخت سے اُتار دیا اور خود راجہ بن گیا۔ چونکہ یہ سردار چالوکیہ خاندان سے
تھا۔ اس لئے اُس کے خاندان کے راجہ تاریخ میں کلیانی کے چالوکیہ
راجہ کہلاتے ہیں۔ اس خاندان میں تقریباً دوسو برس تک حکومت رہی۔

چالوکیہ اور راشٹر کوٹوں کے عہد میں ہندو مذہب نے بہت جلد بدھ
مت کی جگہ لے لی۔ لیکن دوسرے مذہبوں کے ماننے والوں کو ایک حد
تک مذہبی آزادی حاصل تھی۔ پل کیشن کے دربار میں ایک جین شاعر تھا۔
ان راجاؤں کے سرپرستی میں سنسکرت اور تیلگو زبانوں کو خوب ترقی ہوئی۔
اسی طرح فن تعمیر، سنگتراشی اور نقاشی نے بھی بہت ترقی کی جس کا ثبوت
الورا اور اجنتا کے غاروں اور مندروں میں ملتا ہے۔ ان راجاؤں
نے اپنی دولت اور طاقت کی وجہ سے اسقدر شہرت حاصل کر لی تھی کہ عرب
مورخوں نے بھی اُن کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے۔

کلیانی کا چالوکیہ خاندان

۹۷۳ء میں تیلا نے آخری راشٹر کوٹ
راجہ کو گدی سے اُتار کر اُس کے ملک
پر قبضہ کر لیا اور چونکہ یہ چالوکیہ خاندان سے تھا اس لئے یہ خاندان تاریخ
میں کلیانی کا چالوکیہ خاندان کہلاتا ہے۔ اس خاندان کے راجہ عام طور
پر جنگجو تھے اور ہمیشہ اپنے قرب و جوار کی ریاستوں سے برسرپیکار رہتے
تھے۔ چنانچہ چول خاندان کے راجہ سمی راج راج نے کلیانی پر حملہ کیا
اور بہت قتل و غارت کیا۔ لیکن گیارھویں صدی کے وسط میں راجہ سمیشور
گدی پر بیٹھا اور اس نے اپنے ہمعصر چول راجہ دھراج کو دریائے کرشنا
کے کنارے شکست فاش دی اور قتل کر دیا۔ اس خاندان کا سب سے

مشہور راجہ وکرمانتا تھا جس نے ۱۰۷۶ء سے ۱۱۲۶ء تک حکومت کی
اُس کے بعد چالوکیہ خاندان کا زوال شروع ہوگیا اور ان کی سلطنت
کے حصوں پر رفتہ رفتہ دیوگری اور ہوئسل کے راجاؤں کا قبضہ ہوگیا۔

ہوئسل خاندان

اس خاندان کا بانی وشنو وردھن کو سمجھنا چاہیئے
جس نے ۱۱۴۱ء میں وفات پائی اگرچہ کہ اس
خاندان کے راجہ ۱۱۹۰ء تک خودمختار نہیں ہوئے۔ ابتدا میں وشنو وردھن
جین مذہب کا پیرو تھا لیکن راماج کے اثر سے اُس نے جین مذہب چھوڑ کر
ہندو مذہب اختیار کیا اور اپنا نام بھی بدل کر وشنو وردھن رکھا۔ اُس کے
عہد میں بہت سے عمدہ اور قابل تعریف مندر تعمیر ہوئے۔ اس خاندان نے
وشنو وردھن کے پوتے ویر بلالہ کے زمانہ میں بہت ترقی کی لیکن ۱۳۱۰ء
میں علاء الدین خلجی کے مشہور سردار ملک کافور نے اُس کو فتح کر کے
سلطنت دہلی میں شامل کر لیا۔

یادو اور کاکتی خاندان

ہوئسل راجاؤں کے علاوہ دکن میں دو
خاندان اور حکمراں تھے۔ یادو خاندان
کے راجہ دیوگری میں اور کاکتی خاندان کے راجہ وارنگل میں حکومت کرتے
تھے۔ یہ تینوں ریاستیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں۔ آخر کار سلطان علاء الدین
خلجی کے عہد میں تینوں دہلی کی باجگذار ہوگئیں۔ سلاطین دہلی کی تاریخ
میں ان کا ذکر کیا جائیگا۔

جنوبی ہند کی ریاستیں

جنوبی ہند سے ہمارا مطلب اُس خطے
سے ہے جو دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا
کے جنوب میں ہے۔ یہاں قدیم زمانہ سے تین سلطنتیں قائم تھیں۔ پانڈیہ

بالکل جنوب میں تھے۔ چیرملا بار ساحل پر حکومت کرتے تھے اور چول دریائے کاویری کے ملک پر حکمراں تھے۔

پہلی صدی قبل مسیح میں ان ریاستوں نے خوب ترقی کی تھی اور روم ومصر وغیرہ سے تجارتی تعلقات قائم کئے تھے لیکن دوسری صدی عیسوی میں پلوخاندان نے ایک زبردست ریاست کی بنیاد ڈالی اور قدیم ریاستوں نے لڑنا شروع کیا اور اُن کو مغلوب کرلیا۔ لیکن پلوؤں کو چالوکیوں اور اُن کے بعد راشٹرکوٹوں سے لڑنا پڑا۔ ان کو دونوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ چالوکیہ راجہ پل کیشن دوئم نے پلوراجہ مہیندر ورمن اوّل کو شکست دے کر اس کا ایک صوبہ اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ پلوؤں کے زوال پر چول خاندان کو عروج حاصل ہوا اور راجندر چول نے برما تک اپنی فوجیں بھیجیں۔ اڑلیسہ پر حملہ کیا اور انڈمن اور نکوبار کو فتح کیا۔ اُس نے کلیانی کی چالوکیہ شاہزادی سے شادی کی۔ اس طرح اس کے بیٹے کلوتنگ میں دونوں خاندان یکجا ہو گئے۔ آخر کار یہ تمام ملک سلطنت دہلی میں شامل ہوگیا۔

ان سلطنتوں کے حکمرانوں نے علم وادب کی بہت سرپرستی کی۔ ان کے زمانہ میں تامل ایک شائستہ زبان ہوگئی۔ بدھ، جین اور ہندو مذاہب رائج تھے۔ فن تعمیر کو بھی خوب ترقی ہوئی۔ بڑے بڑے مندر تیار ہوئے۔ ابتدائی زمانہ میں بدھ مذہب کے ماننے والے سب سے زیادہ تھے۔ لیکن پلوؤں کے عہد اور اُن کی سرپرستی میں ہندو مذہب نے دوبارہ ترقی کی۔ راماناج کی تبلیغی کوششوں نے وشنو کی پوجا کو رواج دیا۔ دکن اور جنوبی ہند کے شاندار مندر اور بتکدے اسی زمانہ کی تہذیب کی یادگار ہیں۔

رامانج یہ ویشنو مذہب کے بہت بڑے حامی تھے پہلے انہوں نے ترچناپلی کے قریب ہی سکونت اختیار کی تھی۔ لیکن چول راجہ ادھیراجندر کی سختی کی وجہ سے اُن کو وشنو وردھن کی سلطنت میں آنا پڑا۔ یہاں اُن کو بہت کامیابی ہوئی اور راجہ نے خود جین مذہب چھوڑ کر اُن کی پیروی اختیار کی۔ ادھیراجندر کے مرنے کے بعد رامانج واپس چلے گئے۔ اُن کی زندگی کے واقعات کی صحیح تاریخیں نہیں بتلائی جاسکتیں۔ مورخوں کا خیال ہے کہ بارھویں صدی کے وسط میں اُنہوں نے وفات پائی۔ وہ شنکر آچاریہ کے اصولوں کے بہت زیادہ مخالف تھے۔

باب ۱۹

اسلام کا عروج اور فتح سندھ

آنحضرت کی ابتدائی زندگی اسلام دنیا کے بڑے مذہبوں میں سے ہے۔ اسوقت ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد آٹھ کروڑ سے زیادہ ہے اور ایشیا و افریقہ میں کئی ملک ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی آبادی اور حکومت قائم ہے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ صاحب عرب کے مشہور شہر مکہ میں ۵۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد ماجد کا نام عبداللہ اور دادا کا نام عبدالمطلب تھا۔ بچپن ہی میں آنحضرت کے والدین نے اس دنیا سے کوچ کیا۔ جب آپ کی عمر دس سال کی تھی تو دادا کا بھی انتقال ہوگیا۔

آپ نے تجارت شروع کر دی تھی اور ایک بیوہ کا مال جن کا نام خدیجہ تھا بغرض تجارت باہر لے جایا کرتے تھے۔ کچھ مدت کے بعد خدیجہ نے آنحضرت سے شادی کر لی۔ ابتدا ہی سے آپ نے اسقدر ایمانداری سے کام کیا کہ لوگوں نے آپ کو "امین" کا لقب دیا تھا۔ شادی کے وقت آپ کی عمر ۲۵ سال کی تھی اور خدیجہ کی ۴۰ سال۔

آپ کی نبوت اور تعلیم اس وقت عربوں کی حالت بہت ابتر تھی۔ وہ آپس میں لڑتے رہتے تھے جھوٹ بولتے تھے۔ شراب پیتے اور جوا کھیلتے تھے۔ بت پرستی کا رواج عام تھا مختصر یہ کہ ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ لیکن آنحضرت پر اس ماحول کا کوئی اثر نہ ہوا۔ شہر کے باہر ایک غار تھا۔ آپ وہاں تشریف لیجا کر مراقبہ کیا کرتے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں آپ کو نبوت عطا ہوئی اور آپ پر وحی نازل ہونے لگی۔ اب آپ نے اعلان فرما دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے کہ میں اس کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچا دوں۔ اسوقت سے آپ نے اسلام کی اشاعت شروع کر دی۔ آپ نے فرمایا کہ پتھر کو پوجنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ سب کا معبود اللہ ہے۔ اسی نے عالم کو پیدا کیا ہے اور وہی دونوں جہان کا مالک ہے آپ نے اس پر بھی زور دیا کہ سب انسان برابر ہیں اور غریب سے غریب آدمی ایک بڑے آدمی کے ساتھ بیٹھکر کھانا کھا سکتا ہے اور برابر کھڑا ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے۔ اسلام نے جس مساوات کا سبق دیا ہے وہ دوسرے مذہبوں میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ اسلام نے بہت جلد ترقی کر لی۔

ہجرت عرب کے لوگ بہت جاہل تھے۔ وہ آنحضرت کے جانی دشمن

ہو گئے وہ کہتے تھے کہ بتوں کی پوجا ہمارے خاندانوں میں ہمارے بزرگوں سے چلی آئی ہے۔ ہم اس کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں۔ آنحضرت اور آپ کے ساتھیوں کو انہوں نے بہت تنگ کیا۔ آخر کار آپ اپنے رفیق ابو بکرؓ کو ساتھ لے کر مدینہ تشریف لے گئے۔ وہاں کے لوگوں نے آپ کی تعلیم کو غور سے سُنا اور آپ پر ایمان لے آئے۔ اس طرح سے بہت جلد مسلمانوں کی تعداد کافی بڑھ گئی۔ اب مسلمانوں نے آنحضرت کے ساتھ جا کر مکّہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد اسلام نے بہت ترقی کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں عرب کا سارا ملک مسلمان ہو گیا۔

خلافت راشدہ سنہ ۶۳۲ء میں آنحضرت نے اس جہان سے کوچ فرمایا آپ کے بعد چار خلیفہ ہوئے ہیں جن کا عہد خلافت تاریخ اسلام میں خلافت راشدہ کہلاتا ہے۔ اس زمانہ میں کوفہ، دمشق اور بغداد پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ خلافت راشدہ کے بعد بھی فتوحات اور تبلیغ مذہب کا سلسلہ جاری رہا۔ اسلام نے عربوں کو بالکل بدل دیا تھا۔ بدوؤں کے وہ نیم وحشی اور خانہ بدوش قبیلے جو اپنی تمام قوتیں خانہ جنگی اور خونریزی میں صرف کرتے تھے اب ایک متحد قوم بن گئے تھے۔ اس انقلاب عظیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب دنیا کی کوئی طاقت عربوں کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکی اور سو برس کے اندر اُن کی سلطنت ہسپانیہ سے لیکر دریائے سندھ تک پھیل گئی۔ تبلیغ مذہب میں اُن کی کامیابی اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ غرضیکہ فتح سندھ سے پہلے شمالی افریقہ۔ مصر۔ شام۔ عراق اور ماوراءالنہر اُن کی سلطنت میں شامل تھے اور یہاں کی رہنے والی اکثر قومیں مشرف بہ اسلام ہو چکی تھیں۔

سندھ پر مسلمانوں کے ابتدائی حملے

اہل عرب ہندوستان سے ناواقف نہ تھے ان کے تجارتی تعلقات جنوبی ہند کے بندرگاہوں سے بہت پُرانے تھے۔ سندھ پر عربوں کا سب سے پہلا حملہ حضرت عمرؓ خلیفہ ثانی کے عہد میں ہوا تھا۔ جب ایران اور مکران فتح ہو جانے کے بعد عربی سلطنت سندھ کی سرحد تک پہنچ گئی تھی۔ امیر معاویہ کے عہد میں خشکی کے راستے سے مہلب ابن ابی صفرہ نے سندھ پر حملہ کیا اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ عرب لوگ سمجھ گئے کہ جب تک وہ افغانستان کو فتح نہ کر لیں ہندوستان پر خشکی کے راستہ سے حملہ کرنے میں اُن کو کامیابی نہ ہوگی۔

محمد بن قاسم کا حملہ ۷۱۱-۱۲ء

سندھ پر پہلا کامیاب حملہ ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کی سرکردگی میں ہوا۔ اس حملہ کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ لنکا کے بادشاہ نے خلیفہ کے واسطے کچھ تحفے بھیجے تھے۔ سندھ کے لٹیروں نے آٹھ جہاز راستہ میں لوٹ لئے اس پر خلیفہ نے ایک سپہ سالار کو ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا لیکن سندھیوں نے اُس کو بھی مار ڈالا۔ چنانچہ حجاج بن یوسف نے جو بصرہ کا گورنر تھا سندھ پر باقاعدہ حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی اور اس کام کے لئے اپنے نوجوان عزیز محمد بن قاسم کو منتخب کیا۔

محمد بن قاسم بلوچستان کے راستہ سے سندھ میں داخل ہوا اور سب سے پہلے دیبل کے شہر کو فتح کیا۔ یہاں اپنی فوج کا ایک حصہ چھوڑ کر وہ آگے بڑھا نیرون کے لوگوں نے بغیر مقابلہ کئے ہوئے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ محمد بن قاسم نے کشتیوں کا پل باندھ کر دریائے سندھ کو پار کیا اور راجہ داہر کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ راوڑ کے قلعہ کے قریب بڑی زبردست

جنگ ہوئی داہر اور اُس کے ساتھی بڑی بہادری سے لڑے لیکن عربوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔ راجہ کے ہودج میں آگ لگ گئی اُس کا ہاتھی بھاگ گیا اور راجہ مارا گیا۔ اس کے بعد بھی اُس کی رانی نے قلعہ کے اندر سپاہیوں کو اکٹھا کر کے مقابلہ جاری رکھا لیکن اب کامیابی کی کوئی امید باقی نہ تھی اور عربوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ یہاں سے محمد بن قاسم برہمن آباد کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے بھی اُس کی اطاعت قبول کر لی۔ اب جنوبی سندھ کا تمام علاقہ اُس کے قبضہ میں آگیا تھا لہذا اُس نے ملتان کی طرف جو شمالی سندھ کا سب سے بڑا شہر تھا رُخ کیا۔ ملتان بھی فتح کر کے اُس نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ان فتوحات سے محمد بن قاسم کا حوصلہ بہت بلند ہو گیا اور وہ چاہتا تھا کہ یہ سلسلہ جاری رکھے۔ یہ کام اس کے لیئے مشکل نہ تھا کیونکہ وہ سندھ کے لوگوں میں اسقدر ہر دلعزیز ہو گیا تھا کہ بغیر کسی دقت کے اس نے ایک کثیر فوج جمع کر لی تھی لیکن عین اُس وقت جبکہ وہ اس نئے حملہ کی تیاریاں کر رہا تھا اس کو گورنری سے معزول کر دیا گیا اور سندھ کا یہ نوجوان فاتح عراق عجم کے مشہور شہر واسط میں قید کر دیا گیا اور وہیں قتل کیا گیا۔ محمد بن قاسم کے قتل کے متعلق یہ غلط روایت مشہور ہو گئی ہے کہ خلیفہ کے پاس داہر کی دو لڑکیاں قید کر کے بھیجی گئی تھیں اُنہوں نے خلیفہ سے محمد بن قاسم کی شکایت کی جس پر خلیفہ نے اُس کو سزائے موت کا حکم دیا اور ان لڑکیوں نے یہ شکایت اس لئے کی تھی کہ وہ اُس سے اپنے باپ کا بدلہ لینا چاہتی تھیں۔ لیکن یہ روایت عربی تاریخوں میں نہیں۔ بعد کی لکھی ہوئی کتابوں میں ہے۔ اس لئے قابل اعتبار نہیں۔

محمد بن قاسم کے ذاتی اوصاف اور اس کا نظام حکومت

جس وقت محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو اُس کی عمر ۱۷ یا ۱۸ سال

کی تھی لیکن ہمت بہادری اور قابلیت کے لحاظ سے وہ عمر رسیدہ آدمیوں سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ سندھ میں اُس کی تین سال کی فتوحات سکندرِ اعظم کے ہندی فتوحات سے کسی طرح کم شاندار نہیں اور یہ یقینی امر ہے کہ اگر اُس کو موقع ملتا تو وہ شمالی ہند کا بہت بڑا حصہ فتح کر لیتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ذاتی اور خاندانی جھگڑوں کی وجہ سے نئے خلیفہ سلیمان بن عبدالملک اور نئے والی عراق صالح بن عبدالرحمٰن نے حجاج کے خاندان کو تباہ کیا اور اسی سلسلہ میں محمد بن قاسم کو بھی مروا ڈالا۔

محمد بن قاسم نے صرف ملک فتح کرنے ہی میں قابلیت نہیں دکھلائی بلکہ اس ملک کا انتظام بھی نہایت خوبی اور عمدگی سے کیا۔ اُس نے اپنی رعایا کو مکمل مذہبی آزادی دی۔ برہمنوں کی عزت کی۔ اور اُن کو بڑے بڑے عہدے عطا کیے۔ لگان وصول کرنے والے افسروں کو حکم دیا کہ وصولیابی میں ظلم اور سختی نہ کریں۔ غیر مسلموں سے اس کا سلوک بہت اچھا تھا اور یہی وجہ تھی کہ لوگ خود اُس کے پاس آکر اُس کی اطاعت قبول کر لیتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اُس کی حکومت میں وہ امن اور آزادی کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

محمد بن قاسم کے بعد عربوں کی فتوحات کا سلسلہ بند ہو گیا لیکن اس فتح کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے عرب ہندوستان آگئے اور یہاں شادیاں کر کے یہیں اور رہنے لگے۔ علاوہ ازیں سندھ کے تعلقات دوسرے اسلامی ممالک سے رفتہ رفتہ بڑھنے لگے۔ عربوں نے ہندی علوم اور فنون کو سیکھا اور اُن سے فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے فلسفہ۔ نجوم۔ ریاضی اور طب کی متعدد کتابوں کا ترجمہ کیا اور عہدِ عباسیہ میں یہاں کے عالموں کو بغداد بلایا گیا۔

اسی طرح تجارتی تعلقات بھی بہت بڑھ گئے۔ عرب دنیا کے ہر حصہ میں آتے جاتے تھے اور اُن کے ذریعہ سے ہندوستان کی چیزیں اور یہاں کے علوم دوسرے ملکوں تک پہنچنے لگے۔ یہی وجہ تھی کہ اسلامی حکومت کے ابتدائی دَور میں ملتان ایک بہت بڑا تجارتی اور علمی مرکز بن گیا تھا۔

باب ۲۰

سلطان محمود غزنوی سنہ ۹۹۷-۱۰۳۰ء

سلطنت غزنی

سندھ کا ملک زیادہ زرخیز نہ تھا اس لئے خلفاء نے اس کی زیادہ پرواہ نہ کی اور وہاں ایک چھوٹی سی خود مختار ریاست قائم ہو کر رہ گئی ادھر خلافت بھی بنو اُمیہ سے نکلکر بنو عباس کے خاندان میں آگئی تھی اور اسلامی سلطنت میں اب ایرانیوں اور ترکوں کا اثر بہت بڑھ گیا تھا۔ نویں صدی عیسوی میں خلافت کمزور ہو گئی تھی اور اُس کے مختلف حصّوں میں خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں۔ سلطنت غزنی کا بانی ملک الپتگین ان ہی خود مختار رئیسوں میں سے ایک کا غلام تھا۔ وہ اپنے مالک شاہ منصور سامانی سے ڈر کر بھاگا اور غزنی پہنچکر وہاں کے والی کو شکست دی اور خود اُس پر قبضہ کر لیا۔ سنہ ۹۶۳ء میں اس کی وفات پر اس کا بیٹا اسحاق تخت پر بیٹھا۔ اسحاق کے بعد الپتگین کے دو غلام

یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے اور پھر سبکتگین کو امیر منتخب کیا گیا۔ امیر سبکتگین ایک بہادر اور بلند حوصلہ شخص تھا۔ اس نے ہندوستان پر حملہ کر کے ہندو شاہی خاندان کے راجہ جے پال کو شکست دی۔ جے پال نے بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخر کار اُس کو صلح کرنی پڑی اور اُس نے وعدہ کیا کہ وہ امیر غزنی کو سالانہ خراج بھیجا کرے گا۔ سبکتگین ۹۷۶ء میں امیر منتخب ہوا تھا اور ۹۹۷ء میں اُس کا انتقال ہوگیا۔

سلطان محمود ۹۹۷ء۔۱۰۳۰ء

غزنی کی چھوٹی سی ریاست سبکتگین کے زمانہ میں ہی ترقی کرنے لگی تھی۔ لیکن اُس کے بیٹے اور جانشین کے زمانہ میں یہ ریاست ایک عظیم الشان سلطنت بن گئی۔ محمود کی فتوحات یہاں تفصیل کے ساتھ نہیں لکھی جا سکتیں۔ اس کی تمام زندگی اپنی سلطنت کی وسعت بڑھانے میں صرف ہوئی۔ اُس نے اپنے زمانہ حکومت میں ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور اُن کے علاوہ ایران افغانستان اور ماوراء النہر کا اکثر حصّہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا جب ہم اُس کی ان شاندار فتوحات کا حال پڑھتے ہیں تو ہم کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ محمود دنیا کے مشہور ترین فاتحین میں شمار کئے جانے کا مستحق ہے۔

ہندوستان پر ابتدائی حملے

محمود کو سب سے پہلے اپنے باپ کے دشمن جے پال ہی سے لڑنا پڑا۔ جے پال کو شکست ہوئی جس سے اُس کو اسقدر شرم آئی کہ اُس نے آگ میں جل کر جان دیدی۔ جے پال کے بعد اُس کا بیٹا انند پال گدی پر بیٹھا۔ وہ نوجوان تھا اور سمجھتا تھا کہ محمود کا مقابلہ بخوبی کر سکتا ہے۔ ادھر محمود نے بھی ایک زبردست حملے کی تیاری کی اور ۱۰۰۸ء میں غزنی سے

روانہ ہوکر پنجاب میں داخل ہوا۔ انند پال نے شمالی ہند کے راجاؤں کو دشمن کے مقابلہ کے لئے دعوت دی اور گوالیار۔ کالنجر۔ قنوج۔ دہلی۔ اجمیر اور دوسری ریاستوں کے رئیس انند پال کی مدد کے لئے آئے۔ یہی نہیں بلکہ عام لوگوں نے بھی ہر طرح سے مدد کی۔ کہا جاتا ہے کہ عورتوں نے اپنے سونے اور چاندی کے زیورات پیش کئے اور غریب سے غریب آدمی نے بھی اس میں حصہ لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ محمود کو کسی ایک راجہ سے نہیں بلکہ ہندو قوم سے مقابلہ کرنا پڑا کیونکہ عام لوگوں میں اس کا احساس ہو چکا تھا کہ محمود کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنا ضروری ہے۔ پنجاب کی جنگجو قوم کھوکھر بھی انند پال کے ساتھ تھی۔ لڑائی شروع ہوتے ہی محمود کے بہت سے سپاہی کھوکھروں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ آخر میں ہندوؤں کو شکست ہوئی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ انند پال کا ہاتھی میدان جنگ میں بے قابو ہو کر بھاگ نکلا۔ تمام فوج اس پر نا اُمید ہو گئی اور محمود کے سپاہیوں کے دل بڑھ گئے انہوں نے دور تک انندپال کی فوج کا پیچھا کیا اور بہت سے ہاتھی اور سامان جنگ ان کے ہاتھ لگا۔ اب محمود نے نگر کوٹ پر حملہ کیا اور وہاں کے مندروں سے بے شمار دولت لے کر غزنی کو واپس ہوا۔ یہ حملہ نہایت اہم ہے۔ ایک طرف تو محمود کا دل بہت بڑھ گیا اور اس کے حوصلے بلند ہو گئے دوسری طرف اس کی شہرت تمام اسلامی ممالک میں پھیل گئی اور ہر طرف سے لوگ آ آ کر اُس کی فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کے خلاف لڑنے میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ محمود کو بھی اب معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی دولت کا اکثر حصہ

بیشتر حصہ مشہور مشہور مندروں میں موجود ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے
مالدار لوگ اور راجہ مہاراجہ قیمتی قیمتی چیزیں مندروں میں چڑھاتے تھے
اور رفتہ رفتہ بہت سی دولت مندروں میں جمع ہو گئی تھی۔ چنانچہ
اُس نے یہ طے کر لیا کہ ہندوستان میں صرف اُن شہروں پر حملہ کرنا چاہیئے
جو مذہبی حیثیت سے مشہور تھے اور جن کے مندروں میں بیحد دولت
جمع تھی۔

سومناتھ ۱۰۲۵ء

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سلطان محمود ہندوستان پر حملے
کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ وہ ساتھ ہی ساتھ
غزنی کی سلطنت کو بڑھا رہا تھا اور قرب وجوار کی ریاستیں
فتح کر رہا تھا۔ ہندوستان میں وہ موسم سرما میں آتا تھا اور گرمی کے مہینے
وسط ایشیا اور ایران میں گذارتا تھا۔ چنانچہ جیسی اُس کی شہرت ہندوستان
پر حملے کرنے سے بڑھ رہی تھی اسی طرح اس کی سلطنت کی حدود بھی برابر
وسیع ہو رہی تھیں۔ انندپال کی شکست سے سومناتھ کے حملہ تک جو
پندرہ سولہ برس کا زمانہ گذرا ہے اس میں محمود تقریباً نو یا دس مرتبہ
ہندوستان آیا اور شمالی ہندوستان کے مشہور مشہور شہروں پر حملہ کیا
اور تھانیسر۔ متھرا۔ بندرابن۔ قنوج۔ کالنجر وغیرہ سے کثیر دولت اور لاتعداد
غلام لے گیا۔ اُس کی شہرت تمام عالم میں پھیل گئی لیکن جسقدر یہ شہرت
اور قوت بڑھتی جاتی تھی اسی قدر نئی فتوحات کی خواہش بھی تیز ہوتی
جاتی تھی۔ چنانچہ اب اُس نے سومناتھ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ مندر
کاٹھیاواڑ میں سمندر کے کنارے پر واقع تھا۔ ہندوستان کے
لوگوں کا خیال تھا کہ محمود کو اُس کی موت سومناتھ کی طرف کھینچ کر لا رہی

ہے اور اس بت شکن کی سب سے بڑی سزا یہی ہے کہ اپنی بربادی کے سامان خود ہی مہیا کرے۔ اس مندر میں ہزاروں پجاری رہتے تھے اور چاند گرہن کے موقع پر بیشمار آدمی مختلف مقامات سے یاترا کے لئے آتے تھے۔ مندر کے خرچ کے لئے دس ہزار گاؤں وقف تھے اور ہر روز گنگا کا پانی آتا تھا جس سے بت کو دھوتے تھے۔ سمندر کی لہریں مندر سے ٹکراتی تھیں اور سیدھے سادے پجاری سمجھتے تھے کہ یہ لہریں روزانہ پوجا کے لئے آتی ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ غزنی کا یہ بت شکن سلطان سومناتھ کو کبھی فتح نہیں کر سکتا۔ اسی طرح محمود بھی جانتا تھا کہ اُس کی شہرت اور قوت اُس وقت تک مکمل نہ ہوگی جب تک کہ وہ سومناتھ کو فتح نہ کرے گا۔

جس وقت محمود نے اس حملہ کا اعلان کیا تو ہزار ہا رضا کار جہاد کے شوق میں غزنی آگئے اور اُس کے ساتھ ہو لئے۔ محمود اپنی فوج اور ان مجاہدین کی جماعت کو لے کر ملتان - اجمیر اور انہلواڑہ کے راستہ سے سومناتھ آیا۔ ادھر بھی بہت سے راجپوت راجا اپنی اپنی فوجیں لیکر سومناتھ کو بچانے کے لئے جمع ہوئے۔ ہندو سپاہیوں کی تعداد اسقدر زیادہ تھی کہ وہ ترکوں کی بے وقوفی پر ہنستے تھے۔ پہلی مرتبہ جب لڑائی ہوئی تو راجپوتوں نے ترکوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ دوسرے دن ترکوں نے دیواروں پر چڑھنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی ناکامیاب رہے اور جب گجرات کی ایک اور فوج کمک کے لئے آئی تو محمود پریشان ہو گیا مگر اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ گھوڑے سے اُتر کر خدا کی درگاہ میں دعا مانگنے لگا۔ اُس کی اس آہ وزاری کا اُس کے ساتھیوں

پر بہت اثر ہوا اور جوش میں آکر انہوں نے ایک آخری کوشش کی اور کامیاب ہوئے۔ ہندو شکست کھا کر بھاگ نکلے اور بڑی تعداد میں مارے بھی گئے۔ محمود مندر کے اندر گھس گیا بت کو توڑ ڈالا اور ہیرے۔ جواہرات۔ سونا۔ چاندی اور ہر قسم کی بیش قیمت چیزیں اپنے قبضہ میں کرلیں۔ فارسی مورخوں نے ان چیزوں کی تعداد اسقدر زیادہ بتلائی ہے کہ یقین بھی مشکل سے آتا ہے۔ اُس کو خیال تھا کہ کہیں واپسی میں راجپوت اُس کو پریشان نہ کریں۔ اس لئے وہ سندھ کے راستہ سے واپس ہوا۔ لیکن راستہ بتلانے والوں نے اُس کو دھوکا دیا جس سے اس کو بہت پریشانی اُٹھانی پڑی اور اُس کے بہت سے آدمی اور جانور ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ ایک سال بعد وہ ان ہی لوگوں کو سزا دینے کے لئے آیا۔ اُس نے ایک زبردست بیڑا کشتیوں کا تیار کرایا۔ جاٹوں نے مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی اور بہت سے قتل ہوئے اُن کو سزا دینے کے بعد محمود واپس چلا گیا۔ یہ محمود کا آخری حملہ تھا۔

سلطان محمود کی شخصیت اور اُس کے کارنامے

سلطان محمود کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ قرون وسطیٰ کے اکثر مسلمان مورخوں کے نزدیک اُس کی زندگی مسلمان بادشاہوں کے لئے ایک عمدہ نمونہ تھی۔ آجکل کے بعض مورخوں نے اُس کو ایک لٹیرا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ محمود کو لٹیرا کہنا صرف اُسی پر نہیں بلکہ فن تاریخ پر ظلم کرنا ہے۔ اُس کی زندگی کے مفصل حالات پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑی اور عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے

یہ اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا کہ ایسی سلطنت قائم کرنے کے لئے وسط ایشیا اور ایران کے خطے ہندوستان سے کہیں زیادہ موزوں ہیں۔ سلطنت کے بانی کو عزت۔ شہرت۔ روپیہ اور ہر دلعزیزی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ چیزیں ہندوستان پر حملہ کرنے سے حاصل ہوسکتی تھیں۔ چنانچہ ان کامیاب حملوں کی بدولت وہ ہمعصر مسلمانوں کی نظروں میں ایک بہت بڑا ہیرو بن گیا تھا اور جو ملک بھی وہ فتح کرتا تھا وہاں کے لوگ اُس کی حکومت تسلیم کر لیتے تھے۔ ہندوستان کی دولت محمود اپنی سلطنت کی ترقی اور اپنے وطن کی زیب و زینت میں دل کھول کر خرچ کرتا تھا۔ اُس کا بنایا ہوا غزنی دنیا کے سب سے بڑے اور خوبصورت شہروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس میں متعدد کالج۔ کتب خانے باغات۔ مسجدیں۔ حمام اور خوبصورت محلات تھے۔ صرف عمارتوں کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ اربابِ علم وفن کی وجہ سے بھی غزنی کی رونق دوبالا ہو گئی تھی۔ محمود علم و ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وہ شخص جو علم کی کسی شاخ میں کمال رکھتا ہے اُس کے دربار میں موجود ہو اور اُس کی فیاضی سے فائدہ اُٹھائے۔ اُس کی اس قدردانی ہی کا نتیجہ تھا بڑے بڑے اہلِ کمال اپنے وطن کو چھوڑ کر غزنی آ گئے اور وہ نمایاں کام کئے جن کی وجہ سے اُن کا اور محمود کا نام آج تک زندہ ہے۔

سلطان محمود نے اپنی وسیع سلطنت کے لئے ایسا نظامِ حکومت نہیں چھوڑا جو مستقل اور پائدار ہوتا اور اُس کے بعد ہی اس کی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ ہندوستان میں سے سلطان محمود نے صرف پنجاب اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا۔ رعایا کے ساتھ اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔

ہندو رعایا کو پنجاب میں ہی نہیں بلکہ غزنی میں بھی مذہبی آزادی حاصل تھی اور بہت سے ہندو اچھی جگہوں پر ملازم تھے۔ وہ بہت منصف مزاج تھا اور اکثر مورخوں نے اس کے انصاف کے قصے لکھے ہیں۔

سلطنت غزنی کا زوال سلطان محمود کے جانشین ایسے قابل نہ تھے کہ اسقدر بڑی سلطنت کو سنبھال لیتے۔ محمود کا بیٹا مسعود بہادر بھی تھا اور علم دوست بھی لیکن سنہ ۱۰۴۰ء میں سلجوقیوں نے اُس کو مرو کے قریب بڑی بھاری شکست دی۔ مسعود غزنی واپس آیا اور وہاں سے پنجاب کو روانہ ہوا۔ مگر اُس کی فوج میں بغاوت شروع ہو گئی اور آخر کار اُس کے افسروں نے اُسکو قتل کر ڈالا اور اُس کے بھائی محمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ غزنی کی سلطنت سوا سو برس سے زیادہ قائم رہی لیکن برابر کمزور ہوتی گئی اور بالآخر غوریوں نے اُس کو ختم کر دیا۔

باب ۱۲

سلطان شہاب الدین غوری

غوری خاندان کا عروج غور کی ریاست پر سلطان محمود اور مسعود نے متعدد حملے کئے اور غوری سردار غزنی کو عرصہ تک خراج دیتے رہے لیکن بارھویں صدی میں غوریوں نے غزنی پر قبضہ

کرلیا۔ غور کے رئیس اعزالدین حسن کے سات لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک کو غزنی کے سلطان نے قتل کروادیا۔ دوسرے بھائی نے غزنی پر حملہ کرکے اُس کو فتح کرلیا لیکن کچھ عرصہ کے بعد غزنی کے امیروں نے اُس کو بھی قتل کردیا۔ اب تیسرا بھائی علاءالدین حسن بدلہ لینے کے لئے چلا۔ اُس نے غزنی پر قبضہ کرکے حکم دیا کہ شہر کو جلادیا جائے اور مال و دولت لوٹ لیا جائے۔ سات دن تک شہر جلتا رہا۔ بے شمار آدمیوں کا خون بہایا گیا۔ محمود اور اُس کے دو جانشینوں کے علاوہ سب کی قبریں کھدوادی گئیں۔ تمام شہر جلکر خاک ہوگیا اور ستر ہزار آدمی ہلاک ہوئے۔ علاءالدین کو اسی وجہ سے جہاں سوز کہتے ہیں۔ علاءالدین کے دو بھتیجے غیاث الدین اور شہاب الدین تھے۔ اُن کو اُس نے قید کردیا تھا۔ لیکن اُس کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے سیف الدین نے اُن کو آزاد کیا اور جب وہ مارا گیا تو غیاث الدین تخت پر بیٹھا۔ اُس کے چھوٹے بھائی شہاب الدین نے ۱۱۷۳ء میں غزنی پھر فتح کیا اور وہیں کا گورنر مقرر ہوا۔ ان دونوں بھائیوں کے سیاسی تعلقات عجیب قسم کے تھے۔ دونوں بادشاہ تھے اور سلطان کا لقب رکھتے تھے۔ لیکن شہاب الدین ہمیشہ بڑے بھائی کا مطیع اور فرماں بردار رہا۔ غزنی کا انتظام درست کرنے کے بعد شہاب الدین نے ہندوستان فتح کرنے کا قصد کیا اور تیس برس کی کوشش اور حملوں کے بعد شمالی ہندوستان میں اسلامی سلطنت قائم کی۔

ابتدائی حملے شہاب الدین نے سب سے پہلا حملہ ۱۱۷۵ء میں کیا اور ملتان اور اُچھ فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ دو تین سال بعد وہ پھر ہندوستان آیا اور سندھ کے راستہ سے

شہاب الدین غوری

گجرات پہنچا۔ انہلواڑہ کے قریب راجہ بھیم دیو نے محمد غوری کا مقابلہ کیا۔ ترک بڑی بہادری سے لڑے لیکن اُن کو شکست ہوئی اور ناکام واپس ہونا پڑا۔ اس کے بعد محمد غوری نے پشاور اور سندھ کا باقی ماندہ حصہ فتح کرلیا۔ ۱۱۸۱ء میں اُس نے لاہور پر حملہ کیا اور غزنوی سلطان خسرو ملک کے لڑکے کو گرفتار کرلیا۔ لاہور پر دو تین حملے اور کئے اور آخرکار ۱۱۸۶ء میں خسرو ملک بھی گرفتار ہوگیا۔ اب غزنی کی سلطنت ختم ہوگئی اور پنجاب کا اکثر حصہ محمد غوری کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔

شہاب الدین غوری اور پرتھوی راج

اُس وقت تک محمد غوری نے جو ملک فتح کیا تھا وہ مسلمانوں کے قبضہ میں تھا۔ لیکن اب اُس کو راجپوت ریاستوں سے مقابلہ کرنا تھا۔ سب سے پہلے اُس کو چوہان راجہ پرتھوی راج سے لڑنا پڑا۔ وہ اجمیر اور دہلی پر حکومت کرتا تھا۔ گرد و نواح کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں نے اُسکو اپنا سردار مان لیا تھا لیکن قنوج کے راجہ جے چند سے اُس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ کیونکہ پرتھوی راج اُس کی بیٹی سنجوگتا کو بھگا لایا تھا اور اُس کی سخت توہین کی تھی۔ چنانچہ جب اُس نے محمد غوری کو روکنے کی غرض سے تیاری

شروع کی تو سب راجہ اُس کی مدد کو آئے۔ لیکن جے چند نہیں آیا۔ تھانیسر کے قریب ترائن کے میدان میں دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ راجپوت تعداد میں بہت زیادہ تھے۔ لہٰذا ترکوں کو شکست ہوئی۔ سلطان بھی پرتھوی راج کے بھائی گووند رائے کے ہاتھ سے زخمی ہوا اور اگر وقت پر ایک خلجی سپاہی اُس کو میدان سے بچا نہ لے جاتا تو اُس کی جان خطرہ میں پڑ جاتی۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ محمد غوری کو راجپوتوں نے شکست دی اور وہ بیحد شرمندہ تھا۔ اُس نے طے کر لیا تھا کہ جو کچھ بھی ہو وہ راجپوتوں سے بدلہ ضرور لے گا۔ چنانچہ غزنی پہنچکر اُس نے دوسرے حملہ کی تیاری شروع کر دی۔ ایک سال بعد یعنی ۱۱۹۲ء میں محمد غوری ایک لاکھ بیس ہزار سوار لے کر پھر ہندوستان آیا اور پہلے کی طرح ترائن کے میدان میں پہنچگیا۔ پرتھوی راج بھی ایک بہت بڑی فوج لے کر مقابلہ کے لئے آیا۔ فارسی مورخوں نے لکھا ہے کہ پرتھوی راج کی فوج تین لاکھ سے کم نہ تھی اور ڈیڑھ سو راجہ اُس کی مدد کے لئے آئے تھے۔ دونوں فریق بڑی بہادری سے لڑے۔ لیکن آخر میں راجپوتوں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ نکلے۔ پرتھوی راج اور اُس کا بھائی دونوں مارے گئے۔ محمد غوری کے لئے یہ فتح ایک زبردست کامیابی تھی۔ اجمیر اور اس کے قریب کا علاقہ اُس کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔ اُس نے اپنے غلام قطب الدین ایبک کو کہرام میں چھوڑا اور خود غزنی واپس چلا گیا۔ قطب الدین نے بہت جلد میرٹھ کول اور دہلی کو فتح کر لیا اور دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔

جے چند کی شکست ۱۱۹۴ء

قنوج کا راجہ جے چند شمالی ہند کے بڑے راجاؤں میں شمار کیا جاتا تھا۔

ترائن کی جنگ کے موقع پر اُس نے پرتھوی راج کی مدد نہیں کی۔ اب اُس کی باری آئی۔ شہاب الدین ۱۱۹۴ء میں ایک بڑی فوج لیکر قنوج آپہنچا اور اٹاوہ کے قریب چندواڑہ کے میدان میں جے چند سے لڑا۔ اس لڑائی میں بھی راجپوتوں کو شکست ہوئی۔ جے چند مارا گیا اور اُس کی وسیع سلطنت جو دوآبہ سے نے کر بنارس تک پھیلی ہوئی تھی ترکوں کے قبضہ میں آئی اور دہلی کے والی یعنی قطب الدین کے سپرد کردی گئی۔ شہاب الدین غزنی واپس چلا گیا اور وہاں اُس کو اسقدر مصروفیت رہی کہ کئی سال تک یہاں نہیں آسکا۔ اس زمانہ میں اُس کے غلاموں نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ قطب الدین نے انہلواڑہ کے راجہ پر چڑھائی کی اور اُس کو شکست دے کر بہت مال و دولت لایا۔ گوالیار بھی فتح ہوگیا اور محمد بن بختیار خلجی نے بہار و بنگال پر کامیاب حملے کئے۔

محمد بن بختیار خلجی بہار و بنگال کی فتح۔ اختیار الدین محمد بن بختیار خلجی اودھ کے گورنر ملک حسام الدین کی فوج میں ملازم تھا اور اُسی نے اُس کو مرزاپور کے قریب ایک جاگیر بھی عطا کی تھی۔ یہاں سے محمد بن بختیار نے بہار پر حملہ کیا۔ بہار کی حالت اس قدر ابتر تھی کہ بختیار نے صرف دو سو سواروں سے اُس کو فتح کر لیا۔ اس کامیابی سے بختیار کا دل بہت بڑھ گیا اور اُس نے بنگال پر بھی حملہ کیا۔ بنگال میں اس وقت سین خاندان کا راجہ لکشمن سین حکومت کرتا تھا اور ندیا اُس کا دارالسلطنت تھا۔ بختیار کی فوج پیچھے رہ گئی تھی اور وہ صرف اٹھارہ سوار لے کر شہر میں داخل ہوا۔ لوگوں کو گمان ہوا کہ شاید یہ کوئی گھوڑوں کا سوداگر ہے۔ چنانچہ وہ بغیر کسی روک ٹوک کے شاہی محل میں پہنچ گیا۔ لکشمن سین

اُسی وقت کھانا کھانے کو بیٹھا تھا وہ ان سپاہیوں کے آنے سے اتنا گھبرا گیا کہ محل چھوڑ کر دوسرے دروازہ سے بھاگ گیا۔ بختیار نے محل پر قبضہ کر لیا۔ بنگال کا باقی حصہ بھی فتح ہوگیا اور لکھنوتی (گور) بنگال کا نیا دارالسلطنت بنایا گیا۔ بختیار بلند حوصلہ اور بہادر آدمی تھا۔ بنگال فتح کرنے کے بعد اُس نے تبت پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور دس ہزار سپاہی لے کر روانہ ہوگیا۔ پہاڑی قبیلوں سے لڑائی میں وہ فتحیاب تو ہوا لیکن بہت سے سپاہی ہلاک ہوگئے اور اُس کو واپس ہونا پڑا۔ راستہ میں ہزاروں آدمی مر گئے اور جس وقت بختیار اپنی سرحد میں دیوکوٹ کے مقام پر واپس پہنچا ہے تو اُس کے ساتھیوں میں سے دسواں حصہ بھی باقی نہ تھا۔ اسی مقام پر کچھ دنوں بیمار رہ کر وہ مر گیا۔ اُس کے بعد خلجی قبیلہ کے سردار بنگال میں مدت تک حکومت کرتے رہے۔

سلطان شہاب الدین کا قتل ۱۲۰۶ء

سلطان شہاب الدین اپنی عمر کے آخری سالوں میں ہندوستان میں زیادہ قیام نہیں کر سکا۔ لیکن اُس کے سرداروں نے اُس کے پیچھے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا۔ قطب الدین ایبک نے جو ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوگیا تھا ۱۲۰۲ء میں کالنجر اور کالپی کے مشہور قلعوں پر قبضہ کیا اور اُن کو سلطنت دہلی میں شامل کر لیا۔ ۱۲۰۳ء میں غیاث الدین کا انتقال ہوگیا اور شہاب الدین پوری سلطنت کا مالک ہوا لیکن اُس نے اپنا دارالسلطنت غزنی ہی کو رکھا اور غور کے تخت پر اپنے ایک بھتیجے کو بٹھلا دیا۔ غوریوں کا سب سے بڑا دشمن اسوقت خوارزم شاہ تھا۔ شہاب الدین نے خوارزمیوں کے مقابلہ کے لئے کافی تیاری کی تھی

لیکن پھر بھی اُس کو شکست ہوئی۔ اس شکست کا اثر اس کی سلطنت پر بہت بُرا ہوا اور بہت سے مقامات پر بغاوتیں ہوئیں لیکن سلطان نے ان بغاوتوں کو رفع کرنے میں بڑے استقلال سے کام لیا۔ ہندوستان میں بھی کھوکھروں کی جنگجو قوم نے بغاوت کی اور اُس کو دبانے کے لئے شہاب الدین کو خود یہاں آنا پڑا۔ کھوکھروں کو شکست دے کر جب وہ غزنی واپس جا رہا تھا تو راستہ میں ایک جماعت باطنی فدائیوں کی اُس کے خیمہ میں گھس گئی اور اُس کو سوتے میں قتل کر دیا۔ بعض مورخین نے یہ غلط بیان کیا ہے کہ سلطان کو کھوکھروں نے قتل کیا تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ اُس زمانہ کے ملحدوں کو سلطان شہاب الدین سے بہت نقصان پہنچا تھا اور اُس نے اُن کی تنظیم کو توڑنے کی بڑی کوشش کی تھی۔ لہذا وہ اُس کے جانی دشمن ہو گئے تھے اور اُن لوگوں کا طریقۂ کار بھی یہی تھا کہ کسی نہ کسی طرح دشمن کو قتل کروا دیتے تھے۔ یہی طریقہ اُنہوں نے شہاب الدین کے لئے استعمال کیا۔

سلطان شہاب الدین جس کا نام معزالدین بھی تھا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک بڑی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس نے سلطان محمود کی طرح ہندوستان پر کئی حملے کئے۔ لیکن اس کے حملوں کا مقصد یہ نہ تھا کہ یہاں سے مال و دولت لے کر غزنی واپس چلا جائے اور یہ روپیہ غزنی اور دوسرے شہروں کو خوبصورت بنانے میں صرف کرے بلکہ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو فتح کر کے یہاں اسلامی سلطنت قائم کرے اور اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوا۔ ہر فتح کے بعد جس قدر ملک بھی اُس کے قبضے میں آجاتا تھا وہ اُس کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیتا تھا اور اس کا انتظام اپنے سرداروں کے سپرد کر دیتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اُس کو سب سے پہلے لاہور اور ملتان کی مسلمان ریاستوں کو

فتح کرنا پڑا۔ شمالی ہند میں راجپوتوں کی کئی ریاستیں نہایت طاقتور تھیں اور محمد غوری کے مقابلہ کے لئے اُنہوں نے متفق اور متحد ہو کر کوشش کی لیکن وہ اُن کے متحد کوششوں کے خلاف بھی کامیاب ہوا۔ یہ معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ بالخصوص جب کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے علاوہ اُس کو اپنے وطن کے قریب بھی خوارزمیوں سے لڑنا پڑتا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ فنِ جنگ میں وہ اتنا قابل نہ ہو جیسا کہ سلطان محمود تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اُس کی برابر وہ علم و فن کی سرپرستی نہیں کر سکا لیکن اسلامی سلطنت قائم کر کے اُس نے ایک ایسا کام کیا جس کی وجہ سے ہندوستان کی تاریخ میں اس کا نام بڑے فاتحین میں گِنا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ محمود کے زمانہ میں حالات وہ نہ تھے جو اس وقت تھے۔ اب پنجاب میں مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئے بہت عرصہ گذر گیا تھا اور کافی تعداد میں یہاں مسلمان موجود تھے۔ ایک مسلمان فاتح راجپوتوں سے لڑتے وقت اور اسلامی سلطنت کی بنیاد قائم کرتے وقت ان مسلمانوں پر بھروسہ کر سکتا تھا۔ محمود کو یہ بات حاصل نہ تھی۔ اس لئے سلطنت کا قیام اُس وقت اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ غوریوں کے زمانہ میں تھا۔

باب ۲۲

'غلام' خاندان ۱۲۰۶ء سے ۱۲۹۰ء تک

قطب الدین ایبک ۱۲۰۶-۱۲۱۰ء

شہاب الدین سے ایک مرتبہ اُس کے درباریوں نے دریافت کیا کہ آپ کے بعد اتنی بڑی سلطنت کا مالک کون ہوگا تو اُس نے جواب دیا کہ دوسرے بادشاہوں کے تو دو ایک ہی بیٹے ہوں گے میرے ہزاروں بیٹے ہیں یعنی میرے ترکی غلام جو میرے بعد سلطنت کے وارث ہونگے میرے نام کو زندہ رکھیں گے۔ سلطان کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔ اُس کے مرنے کے بعد اُسکی سلطنت کے کئی ٹکڑے ہو گئے اور اُن میں سے ہر ایک پر اُس کا ایک غلام حکمراں ہوا۔ غزنی میں تاج الدین یلدز تھا۔ سندھ اور ملتان میں ناصر الدین قباچہ اور ہندوستان میں قطب الدین ایبک۔

قطب الدین ایبک کو پہلے نیشاپور کے قاضی نے خریدا تھا اُس کے بعد وہ سلطان شہاب الدین کے غلاموں میں داخل ہوا۔ یہاں اُس نے اسقدر بہادری اور قابلیت دکھلائی کہ بہت جلد ترقی کر گیا اور اپنی خوبیوں کی بدولت ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہوا۔ سلطان کے غزنی واپس جانے کے بعد قطب الدین نے ہانسی۔ میرٹھ۔ دہلی اور کول کے قلعوں پر قبضہ کیا اور بنارس تک سارا ملک اپنے آقا کی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سنہ ۱۱۹۷ء میں اُس نے گجرات پر حملہ کیا اور وہاں سے بہت سامان و دولت لایا۔ پانچ چھ سال

بعد پھر وہ اپنی فوج لیکر روانہ ہوا اور کالنجر۔ کالپی اور مہوبہ وغیرہ کے مضبوط قلعے فتح کئے۔ اس طرح شمالی ہندوستان کا بیشتر حصہ سلطنت دہلی میں شامل ہوگیا۔ اس وسیع سلطنت پر جو لاہور سے لکھنوتی تک پھیلی ہوئی تھی قطب الدین حکمراں تھا لیکن وہ خود مختار نہ تھا بلکہ ابھی تک باقاعدہ آزاد بھی نہ ہوا تھا۔ شہاب الدین کی وفات کے بعد اُس کے بھتیجے نے قطب الدین کو خطِ آزادی اور خطاب سلطانی عطا کئے اب وہ ملک قطب الدین کی بجائے سلطان قطب الدین ہوگیا اور لاہور میں تخت نشینی کی رسم ادا کی ۱۲۱۰ء میں چوگان یعنی پولو کھیلتے ہوئے وہ گھوڑے پر سے گر کر مرگیا۔

قطب الدین ایبک کے ذاتی اوصاف

قطب الدین دہلی کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا چونکہ وہ خود بھی غلام تھا اور اُس کے بعد چند اور بادشاہ جو تخت دہلی پر بیٹھے شروع میں غلام تھے اس لئے اس خاندان کو غلام خاندان کہتے ہیں۔ اپنے مالک کی زندگی میں قطب الدین نے بہت سی لڑائیاں بھی لڑیں اور فتح کئے ہوئے ملک کا بڑی خوبی سے انتظام کیا وہ نہایت منصف مزاج اور فیاض بادشاہ تھا مشہور ہے کہ اُس کے زمانہ میں شیر اور بکری ایک ہی گھاٹ پر پانی پیتے تھے یعنی زبردست لوگ کمزوروں پر ظلم نہیں کرسکتے تھے۔ وہ اسقدر فیاض تھا کہ لوگ اُس کو لاکھ بخش کہتے تھے۔ قطب الدین نہایت پکا مسلمان تھا اور ہندو رعایا کے ساتھ اس کا سلوک بہت اچھا تھا۔ قطب الدین نے دو بڑی مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ایک اجمیر میں اور دوسری دہلی میں۔ اُس کی خوبیوں اور نیک برتاؤ کی وجہ سے اُس کی تمام رعایا نہایت خوش تھی۔

سلطان شمس الدین التمش ۱۲۱۰-۱۲۳۶ء

قطب الدین ایبک کی وفات پر اُس کے جانشینوں

کا سوال پیدا ہوا۔ ہمعصر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ لیکن چونکہ بعض کتابوں اور سکوں میں آرام شاہ کو ابن قطب الدین لکھا ہے اس لئے گمان ہوتا ہے کہ قطب الدین نے اُس کو بیٹا بنا لیا تھا۔ بہرحال اُمرا نے آرام شاہ کو بادشاہ منتخب کرلیا۔ مگر افسوس ہے کہ اُس میں حکومت کرنے کی قابلیت نہ تھی۔ چنانچہ ناصرالدین قباچہ نے اُچھ پر قبضہ کرلیا اور بنگال میں خلجی ملک خود مختار ہوگئے۔ اب بااثر امیروں نے ایلتمش کو جو اُس وقت بدایوں کا گورنر تھا بُلا کر تخت پر بٹھایا اور آرام شاہ کو معزول کردیا۔ تاریخ ہم کو بتلاتی ہے کہ لوگوں نے جو امیدیں ایلتمش سے لگائی تھیں وہ پوری ہوئیں۔ اور اُس نے صرف کھوئے ہوئے ملک کو ہی واپس نہیں لیا بلکہ اس میں اضافہ بھی کیا اور دشمنوں کو شکست دے کر سلطنت کو مستحکم اور مضبوط بنا دیا۔

شمس الدین ایک ترک امیرزادہ تھا۔ اُس کے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے اُس کو بیچ دیا، بخارا کے ایک سوداگر نے اُس کو خرید لیا اور بعد میں قطب الدین ایبک نے خریدا۔ اپنی خوبیوں اور کمالات کی بدولت وہ بہت جلد قطب الدین کے عزیز ترین غلاموں میں سے ہوگیا اور بدایوں کا گورنر مقرر ہوا۔ تخت نشینی کے وقت شمس الدین کے سامنے بہت سی مشکلات تھیں۔ شہاب الدین کے دو غلام تاج الدین یلدوز اور ناصرالدین قباچہ ملک دبانے کی فکر میں تھے۔ بنگال میں خود مختار سلطنت قائم ہوچکی تھی اور ہندو زمیندار اور راجہ بھی بغاوت کے لئے تیار تھے۔ شمس الدین نے ان سب مشکلوں کا بڑی خوبی اور کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

یلدوز اور قباچہ ۱۲۱۵ء-۱۲۲۷ء | تاج الدین یلدوز سلطان شہاب الدین

کا غلام تھا۔ سلطان کی وفات پر غزنی کی حکومت اُس کے حصے میں آئی۔ قطب الدین ایبک نے اُس کو غزنی سے نکال دیا تھا۔ لیکن وہاں کے لوگوں نے دوبارہ بُلا کر اُس کو اپنا حاکم بنا لیا۔ یلدوز نہایت قابل شخص تھا۔ اُس نے اب قباچہ کو شکست دے کر پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا۔ التمش نے دیکھا کہ یلدوز کا پنجاب پر قبضہ کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ چنانچہ وہ فوج لے کر پنجاب کی طرف روانہ ہوا اور ترائن کے میدان میں یلدوز کو شکست دی۔ اس کے بعد وہ قباچہ کے خلاف لڑنے کو چلا۔ لیکن شکست کھانے سے پہلے قباچہ نے اُس کی اطاعت قبول کر لی۔ دس سال تک التمش دوسری لڑائیوں میں مصروف رہا۔ اس زمانہ میں قباچہ نے اپنی طاقت اور ملک کی حدود بہت زیادہ بڑھا لیں۔ ۱۲۲۷ء میں التمش پھر اپنی فوج لے کر پنجاب پہنچا اور اُچھ کے قلعہ کا جس پر قباچہ نے قبضہ کر لیا تھا محاصرہ کیا۔ کچھ دنوں کے بعد قباچہ دریائے سندھ کو عبور کر رہا تھا کہ اُس کی کشتی ڈوب گئی اور وہ مر گیا۔

چنگیز خاں کا حملہ ۱۲۲۱ء

چنگیز خاں منگولوں (مغلوں) کا سردار تھا۔ یہ لوگ نہایت جنگجو اور خوفناک تھے۔ چنگیز خاں نے ان کو متحد کر کے ایک زبردست فوج تیار کر لی اور اس کے ذریعہ سے ایشیا کی اسلامی سلطنتوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ سب سے پہلی اسلامی سلطنت جس کو اُس نے تباہ کیا خوارزمیوں کی تھی۔ جلال الدین خوارزم شاہ وہاں سے بھاگ کر غزنی ہوتا ہوا ہندوستان آیا اور دریائے سندھ کے کنارے پر مقیم ہوا۔ چنگیز خاں بھی اُس کا پیچھا کرتا ہوا یہاں آن پہنچا۔ جلال الدین کے پاس بہت تھوڑے آدمی تھے اور اُس کے سرداروں نے یہی مشورہ دیا کہ یہاں سے بھی بھاگ چلیں لیکن جلال الدین کی غیرت نے

یہ گوارا نہ کیا اور وہ منگولیوں سے لڑنے پر آمادہ ہوگیا۔ ایسی لڑائی کا نتیجہ ظاہر تھا۔ اُس کو شکست ہوئی اور وہ جان بچاکر بھاگا اور دریا کے پار اُتر گیا۔ وہاں سے جلال الدین ایران کی طرف چلا گیا۔ اور ہندوستان کی خوش قسمتی سے منگول بھی واپس چلے گئے ورنہ اس ملک کا بھی وہی حال ہوتا جو سمرقند بخارا اور دوسرے مشہور شہروں کا ہوا۔

ایلتتمش کی فتوحات

منگولوں کے واپس چلے جانے کے بعد ایلتتمش نے فتوحات کا سلسلہ شروع کردیا۔ اُس کے سرداروں نے خلجی امیروں سے بنگال واپس لے کر سلطنت دہلی میں شامل کرلیا۔ سنہ ۱۲۲۶ء میں رنتھمبور بھی فتح ہوگیا۔ قباچہ کو شکست دینے کے بعد ایلتتمش نے گوالیار کا رُخ کیا، کیونکہ آرام شاہ کے زمانے میں یہاں کا راجہ خودمختار ہوگیا تھا۔ ایلتتمش نے اب گوالیار کا محاصرہ کیا۔ راجہ منگل دیو بھاگ گیا اور گوالیار پر بھی اُس کا قبضہ ہوگیا۔ بھیلسہ اور اُجین بھی اُس نے فتح کرلئے۔ سنہ ۱۲۳۵ء میں وہ ایک اور حملے کی تیاری کررہا تھا کہ بیمار پڑا اور انتقال ہوگیا۔

ایلتتمش کی شخصیت اور ذاتی اوصاف

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ غلام خاندان میں ایلتتمش سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اُس کی تخت نشینی کے وقت دہلی کی سلطنت بڑے خطرہ میں تھی۔ چاروں طرف دشمن ہی دشمن تھے۔ اگر ایلتتمش کے بجائے کوئی کمزور اور نالائق شخص بادشاہ ہوجاتا تو شاید شہاب الدین غوری اور اُس کے سرداروں کا کیا ہوا سارا کام برباد ہوجاتا لیکن اُس نے ایک ایک کرکے سب دشمنوں کو شکست دی اور ملک کو محفوظ کرلیا۔

علاوہ اس کے اُس نے اپنی سلطنت کو وسیع کیا۔ اُس کے مرتے وقت تقریباً تمام شمالی ہند سلطنت دہلی میں شامل تھا۔ یہی نہیں کہ اُس نے یہ فتوحات حاصل کیں بلکہ فتح کئے ہوئے ملک کا انتظام بھی خوبی کے ساتھ کیا۔ ۱۲۲۹ء میں بغداد کے خلیفہ نے التمش کو دہلی کا سلطان تسلیم کیا اور اُس کے لئے خلعت اور فرمان بھی۔ سلطان نے اس کی بڑی عزت کی اور خلیفہ کا نام بھی سکوں میں شامل کر لیا۔ خلیفہ کی قوت اب بہت کم ہو گئی تھی لیکن پھر بھی یہ ایک بڑی عزت تھی کہ خلیفہ کسی بادشاہ کا حق تسلیم کرے اور دہلی کے سلطان کو پہلی مرتبہ یہ عزت التمش کے عہد میں ملی۔ التمش اپنے مذہبی عقائد میں بہت پکا تھا اور علماء اور مشائخ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ وہ عمارتیں بنوانے کا بہت شوقین تھا۔ قطب مینار اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ یہ مشہور مینار جو اُس نے اپنے پیر حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار کے قریب اُن کی یادگار کے طور پر بنوایا تھا۔ فن عمارت کا حیرت انگیز نمونہ ہے۔ وہ اُس وقت ۲۷۲ فٹ اونچا تھا۔ لیکن اوپر کا حصہ

بجلی سے گر گیا ہے۔ اُس کے چاروں طرف قرآن شریف کی آیتیں کندہ ہیں۔ اس کے علاوہ اُس نے اور بھی عمارتیں تعمیر کرائیں۔

سلطان رضیہ ۱۲۳۶-۱۲۴۰ء

سلطان شمس الدین کا سب سے قابل بیٹا ناصر الدین محمود جس نے بنگال فتح کیا تھا اپنے باپ کی زندگی ہی میں مر چکا تھا۔ اُس کو اپنے باقی بیٹوں پر اعتبار نہ تھا اور اسی لیئے وہ چاہتا تھا کہ اُس کی لڑکی رضیہ اُس کے بعد تخت پر بیٹھے۔ لیکن امیروں نے رکن الدین فیروز کو منتخب کیا۔ یہ نوجوان عیاش اور نااہل تھا۔ اُس کی ماں شاہ ترکان سلطنت کا کام کرتی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد اُمرا اُس کی حکومت سے تنگ آ گئے اور اُنھوں نے اُس کو قید کر دیا اور رضیہ کو تخت پر بٹھلایا۔

سلطان رضیہ میں وہ سب صفتیں موجود تھیں جو ایک بادشاہ میں ہونی چاہئیں۔ وہ بہادر بھی تھی اور ہوشیار بھی۔ سلطنت کے کام میں دلچسپی لیتی تھی اور رعایا کو خوش کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ خود دربار کرتی تھی۔ گھوڑے پر سواری کرتی۔ شکار کھیلتی اور میدان جنگ میں مردوں کی طرح لڑتی تھی۔ لیکن باوجود ان مردانہ اوصاف کے لوگ اُس کو اس لیئے پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ عورت تھی۔ آخرکار بہانے تلاش کر کے اُنھوں نے اُسکی مخالفت شروع کر دی اور اُس کے بھائی کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اُمرا کے ناراض ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُس نے یاقوت حبشی کو داروغہ اصطبل مقرر کر دیا تھا۔ ترک سرداروں کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی۔ اُنھوں نے رضیہ کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور سرہند کے گورنر التونیہ نے بغاوت کی۔ رضیہ اُس کے خلاف لڑی لیکن گرفتار ہو گئی۔ التونیہ نے

اُس سے شادی کر لی۔ اس پر بہت سے سردار اِن دونوں کے خلاف ہو گئے اور اُنہوں نے رضیہ کے بھائی بہرام شاہ کو تخت پر بٹھلایا۔ التونیہ اور رضیہ بہرام سے لڑنے کے لئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن اُن کو شکست ہوئی اور اُن کے ساتھی اُن کو چھوڑ گئے۔ رضیہ جان بچا کر بھاگی اور کسی کھیت کے کنارے سو رہی تھی کہ گاؤں کے ہندوؤں نے اُس کو قتل کر ڈالا۔ سلطان رضیہ کی ساڑھے تین سال کی حکومت نے یہ بات ثابت کر دی کہ ہندوستان کے آدمی یہ نہیں چاہتے تھے کہ تخت دہلی پر ایک عورت بیٹھے ورنہ ذاتی خوبیوں کے لحاظ سے رضیہ اپنے سب بھائیوں سے بہتر تھی۔

بہرام اور علاء الدین مسعود

اُمرا نے بہرام شاہ کو تخت پر بٹھا تو دیا تھا لیکن اُن کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اُس میں حکومت کرنے کی قابلیت نہیں۔ چنانچہ لشکر نے شہر کا محاصرہ کیا اور سلطان کو گرفتار کر لیا۔ کچھ عرصہ بعد قید کی حالت ہی میں وہ قتل کر دیا گیا۔ اب اُنہوں نے رُکن الدین فیروز کے بیٹے علاء الدین مسعود کو اپنا بادشاہ منتخب کیا۔ شروع شروع میں مسعود نے کوئی غلطی نہیں کی، لیکن بعد میں اُس کا طرز زندگی بدل گیا۔ عیش پرستی کے علاوہ اُس نے اُمرا کے ساتھ بدسلوکی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمراء نے اتفاق کر کے اُس کو قید کر دیا اور تخت پر شمس الدین التمش کے ایک اور لڑکے کو بٹھلایا جس کا نام ناصر الدین تھا۔ بہرام اور مسعود کے زمانہ میں مغلوں نے دو مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا۔ یہ حملے ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ اس کے بعد یہ سلسلہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک جاری رہا۔ مغلوں کے حملوں اور اُن کی عادتوں

بنجو کا مفصل ذکر آگے کیا جائے گا۔

سلطان ناصرالدین محمود ۱۲۴۶-۱۲۶۶ء

ناصرالدین نہایت سادہ مزاج اور پرہیزگار شخص تھا لیکن تیرھویں صدی میں سلطنت دہلی کے لیئے پرہیزگار بادشاہ کی اتنی ضرورت نہ تھی جتنی کہ ایک مدبر اور منتظم حکمراں کی۔ خوش قسمتی سے ناصرالدین کو ایک ایسا قابل وزیر مل گیا جس نے سلطنت کے کام کو بخوبی سنبھال لیا۔ ناصرالدین درویشوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ خزانہ کا روپیہ اپنے اوپر خرچ نہیں کرتا تھا بلکہ قرآن شریف نقل کرکے اپنا خرچ نکالتا تھا۔ یہ بادشاہ نہ مغلوں کے حملوں کو روک سکتا تھا اور نہ ہندو زمینداروں اور راجاؤں کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ مگر اُس کے وزیر بلبن نے سلطنت کو دشمنوں سے بچالیا۔

بلبن ایلبری ترک تھا۔ بچپن ہی میں منگولوں نے اُس کو گرفتار کرکے فروخت کردیا۔ خواجہ جمال الدین نے اُس کو خریدا اور دہلی لاکر ایلتمش کے ہاتھ فروخت کیا۔ رفتہ رفتہ اُس نے ترقی کی اور سلطان رضیہ کے زمانہ میں امیر شکار مقرر ہوا۔ بہرام شاہ نے اُس کو ریواڑی کی جاگیر عطا کی اور مسعود کے عہد میں منگولوں کے مقابلہ کے لیئے فوج تیار کرنے کا کام بلبن ہی کے سپرد کیا گیا۔ ناصرالدین کی تخت نشینی کے وقت اُس کا کافی اثر تھا اور لوگ اُس کی قابلیت سے بخوبی واقف ہوچکے تھے۔ اسی لیئے سلطان نے اُس کو اپنا وزیر مقرر کیا اور سلطنت کا سارا کام اس پر چھوڑ دیا۔

بلبن کا عہد وزارت ۱۲۴۶-۱۲۶۶ء

ایلتمش کے کمزور جانشینوں کی وجہ سے ملک میں فتنہ وفساد پھیل رہا تھا اور چاروں طرف لوگوں نے بغاوت شروع کردی تھی۔ بلبن نے سب سے پہلا

کام یہی کیا کہ ان باغیوں کو شکست دے دے کر مجبور کیا کہ سلطان دہلی کی اطاعت قبول کریں۔ پہلے وہ پنجاب کی پہاڑیوں میں باغی سرداروں سے لڑتا رہا اور پھر دوآبہ میں کئی ہندو راجاؤں کو مطیع بنایا۔ گوالیار چندیری اور مالوہ کی ریاستوں کو از سر نو سلطنت میں شامل کرنا پڑا کیونکہ انہوں نے سلطان دہلی سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ ۱۲۵۳ء میں بلبن ملتان کی طرف گیا ہوا تھا کہ حاسد درباریوں نے اُس کے خلاف سازش کی اور سلطان کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ بلبن کو دربار سے نکال کر اُس کی جاگیر پر واپس بھیج دے اور عماد الدین ریحان کو وکیل در کا عہدہ عطا کیا گیا لیکن ایک ہی سال میں سلطان اور درباریوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ انتظام سلطنت کے لئے بلبن ہی جیسے بہادر اور ہوشیار آدمی کی ضرورت ہے چنانچہ سلطان نے اُس کو پھر دربار میں بُلایا اور اُس کی پہلی جگہ اُس کو دی۔ اُس کی واپسی کے ایک سال بعد گورنر اودھ اور سندھ نے متفق ہو کر بغاوت کی لیکن بلبن کے مقابلہ میں اُن کو کامیابی نہ ہو سکی۔

۱۲۵۷ء میں منگولوں نے سندھ پر حملہ کیا لیکن شاہی فوج کے پہنچنے پر وہ واپس چلے گئے۔ اب بلبن نے میواتیوں کی طرف رُخ کیا۔ ان لوگوں نے لوٹ مار شروع کر دی تھی اور اپنے قرب وجوار کے رہنے والوں کا ناک میں دم کر دیا تھا بلبن نے اُن کو شکست دی اور ملک کو اُن کے ظلم وستم سے بچا لیا۔ بلبن کے کارناموں کا یہ مختصر بیان پڑھ کر تم سمجھ سکتے ہو کہ اُس نے بیس سال تک دہلی کی سلطنت کو نہایت عمدگی اور کامیابی کے ساتھ دشمنوں کے ہاتھ سے محفوظ رکھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن
۱۲۶۶ – ۱۲۸۷ء

بلبن کا اتنا اثر قائم ہو گیا تھا کہ ناصر الدین کی وفات کے بعد اُس کو تخت پر بیٹھنے میں کوئی خاص دقت نہ ہوئی۔ بادشاہ ہونے

کے بعد بلبن نے آرام و چین کو خیر باد کہا اور ہمہ تن سلطنت کے کام میں مصروف ہوگیا۔ باوجود اُس کی کوششوں کے اب بھی بلبن کے سامنے مغلوں کو روکنے اور ملک کو ڈاکوؤں اور رہزنوں سے پاک کرنے کا مسئلہ پیش تھا جس قابلیت اور خوبی سے اُس نے ان مشکلات کا سامنا کیا ہے اُس کے لحاظ سے ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ غلام خاندان میں اُس کو سب سے بڑا بادشاہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ سزا دینے میں بہت سختی کرتا تھا اور باغیوں کے ساتھ اُس کا سلوک بہت بُرا ہوتا تھا لیکن اُس کے ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی کا قول ہے کہ لوگوں کے دلوں سے بادشاہ کا خوف اور رعب جاتے رہے تھے اور اُن کو دوبارہ قائم کرنے کے لئے اس سختی کی ضرورت تھی۔ بلبن اس میں پورے طور پر کامیاب ہوا۔

منگولوں کے حملے سلطان دہلی کا سب سے بڑا فرض اس وقت یہی تھا کہ منگولوں کے حملوں سے اپنی رعایا کے جان و مال کی حفاظت کرے۔ بلبن نے شیر خاں کو جو اُس کا چچا زاد بھائی تھا سلطنت کے شمالی و مغربی حصوں کا گورنر مقرر کیا اور اپنی نگرانی میں شکستہ قلعوں کی مرمت کرائی اور اُن میں سپاہی مقرر کئے تاکہ جب کبھی بھی منگول حملہ کریں اُن کے مقابلہ کے لئے وہ تیار رہیں۔ لیکن یہ انتظام بھی اُس کے نزدیک کافی نہ تھا اور بعد میں اُس نے اپنے دونوں بڑے بیٹوں کو ملتان اور سامانہ کے صوبوں میں مقرر کیا۔ منگول یا تو غزنی ہوکر سندھ کے راستہ سے آتے تھے یا پنجاب کے راستے سے۔ اب دونوں راستوں کا انتظام مضبوط طریقہ پر کردیا گیا۔ بلبن کا سب سے بڑا بیٹا سلطان محمد جو ملتان کا گورنر تھا نہایت بہادر اور علم دوست نوجوان تھا۔ اُس کے دربار میں بہت سے عالم اور شاعر تھے۔ وہ اُن کی قدردانی کرتا تھا اور اُن کی صحبت سے فائدہ اُٹھاتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ میدان جنگ میں لڑنے کے لئے بھی تیار

رہتا تھا۔ افسوس کہ یہ نوجوان اور لائق شہزادہ اپنے باپ کی زندگی ہی میں منگولوں کے ہاتھ سے مارا گیا۔ بلبن پر اس کا بہت صدمہ ہوا اور اس واقعہ کے تین سال بعد وہ بھی مرگیا۔ سلطان محمد کو اس لڑائی میں مارے جانے کی وجہ سے اکثر خان شہید بھی کہتے ہیں۔ جن عالموں اور شاعروں کی وہ سرپرستی کرتا تھا اُن میں میر حسن سنجری اور حضرت امیر خسرو بھی تھے۔ چنانچہ امیر خسرو اس لڑائی میں بھی شریک ہوئے اور منگولوں نے اُن کو گرفتار بھی کر لیا تھا لیکن بعد میں وہ چھوٹ گئے۔

بلبن ملک میں امن و امان قائم کرتا ہے

دوسرا مسئلہ جو بلبن کی توجہ کا محتاج تھا ملک میں امن قائم کرنا تھا۔ میواتیوں کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے یہ اس قدر زور پکڑ گئے تھے کہ دہلی کے دروازہ تک آکر چھاپے مارتے تھے اور اس وجہ سے شہر کا مغربی دروازہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی بند کر دیا جاتا تھا۔ علاوہ اس کے دہلی سے لیکر اودھ تک بڑے بڑے گھنے جنگل تھے۔ ان میں ڈاکو اور رہزن رہتے تھے اور دوآبہ کے تمام علاقے میں مسافروں وغیرہ کو لوٹ لیتے تھے۔ بلبن نے ان میں سے بہت سا جنگل کٹوا کر صاف کرا دیا اور ڈاکوؤں کے پناہ لینے کے مقاموں کو تباہ و برباد کر دیا۔ اسی طرح سے اُس نے میواتیوں کو بھی ختم کیا۔ بلبن اس کام کی ضرورت اور اہمیت کو خوب اچھی طرح سمجھتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے سلطنت کے حدود بڑھانے کا خیال نہیں کیا بلکہ یہی کوشش کی کہ جسقدر ملک اُس کے پاس ہے اُس کا انتظام اچھا ہونا چاہیے تاکہ رعایا کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ یہ اُس کی ہوشیاری اور سیاست دانی کا سب سے بڑا اور صاف ثبوت ہے۔

طغرل بیگ کی بغاوت

سنہ ۱۲۷۹ء میں طغرل بیگ گورنر بنگال نے بغاوت کی۔ اُس کو خیال تھا کہ سلطان ضعیف ہے اور اُس کے بیٹے منگولوں کے روکنے میں مصروف ہیں۔ جا جنگر

وغیرہ پر حملہ کر کے اُس نے اپنی قوت بھی بہت بڑھا لی تھی۔ چنانچہ اُس نے سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کر کے اپنے آپ کو بنگال کا خود مختار بادشاہ بنا لیا اور اُس کا اعلان بھی کر دیا۔ بلبن نے دو فوجیں اُس کے خلاف بھیجیں لیکن دونوں کو ناکامیابی ہوئی۔ اس پر اُس کو بہت غصہ آیا اور اُس نے خود بنگال پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی باوجود اس کے کہ برسات کا موسم اس کام کے لئے نہایت ناموزوں تھا۔ بلبن ایک زبردست فوج لے کر روانہ ہو گیا۔ طغرل کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ لکھنوتی سے جاجنگر کی طرف بھاگ گیا۔ بلبن نے لکھنوتی میں داخل ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو وہ طغرل کا خاتمہ کئے بغیر واپس نہ جائیگا۔ چنانچہ وہ بھی اُس کے پیچھے اُسکی تلاش میں چل دیا۔ کچھ دنوں کی تلاش کے بعد بلبن کے سپاہیوں کو چند غلّے لے جانے والے سوداگروں سے طغرل کے کیمپ کا پتہ معلوم ہو گیا۔ اگرچہ یہ سپاہی تعداد میں بہت کم تھے لیکن اُنہوں نے فوراً ہی طغرل پر حملہ کیا۔ طغرل اور اُس کے سپاہی اس ناگہانی حملہ سے پریشان ہو گئے۔ طغرل جان بچا کر بھاگا لیکن وہ بچ نہ سکا۔ اُس کا سر کاٹ لیا گیا اور جسم ندی میں پھینک دیا گیا۔ اب بلبن لکھنوتی واپس آیا اور وہاں طغرل کے ساتھیوں کو ہزاروں کی تعداد میں پھانسی دیکر بازاروں میں لٹکوا دیا۔ اس میں اُس نے اسقدر سختی کی کہ جس کے متعلق بھی اُس کو معلوم ہوا کہ اُس کو طغرل سے ہمدردی تھی اُس کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنے بیٹے بغرا خاں کو بنگال کا حاکم مقرر کیا اور اُس کو بُلا کر دریافت کیا۔ "تم نے دیکھا؟" وہ خاموش رہا۔ بلبن نے پھر دریافت کیا "تم نے دیکھا؟" وہ پھر بھی خاموش رہا۔ تیسری بار سلطان نے صاف طور سے اپنا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا کہ تم نے بازاروں میں دیکھا کہ میں نے کیسی سزا دی ہے؟

شہزادے نے سر جھکا لیا۔ بلبن نے کہا کہ "یاد رکھو اگر کسی کے بہکانے سے تم نے سلطان دہلی کی اطاعت سے منہ موڑنے کا ارادہ کیا تو یہی سزا ملیگی"۔ اس کے بعد اُس نے بغراخاں کو بہت سی نصیحتیں کیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت اور بادشاہی کے متعلق اُس کا کیا خیال تھا۔

بلبن کے ذاتی اوصاف اور سیاست بلبنی کی چند خصوصیات

بلبن نے بحیثیت وزیر اور بادشاہ کے تقریباً چالیس سال حکومت کی۔ اُس نے بڑی مشکلات کا سامنا کیا اور اس لئے بڑے بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بلبن کا دربار بہت شاندار تھا اُس کا خیال تھا کہ بادشاہ کا رعب اسی وقت قائم ہوسکتا ہے جبکہ وہ شان وشوکت سے رہے۔ وہ دربار میں بہترین لباس پہن کر بیٹھتا تھا اور کبھی نہیں ہنستا تھا۔ نہ وہ درباریوں کے ساتھ بے تکلف ہوتا۔ چنانچہ وہ لوگ بھی اُس کے سامنے ہمیشہ ادب سے رہتے۔ ہمعصر مورخ نے اُس کے دربار کی شان وشوکت کا مفصل حال لکھا ہے وہ کہتا ہے کہ اکثر ایسا ہوتا کہ جو لوگ سفارت وغیرہ کے سلسلہ میں پہلی مرتبہ اُس کے دربار میں حاضر ہوتے تو اُن پر ایسا رعب غالب ہوتا کہ وہ بیہوش ہوجاتے تھے۔ وہ ملازم رکھتے وقت بھی صرف اچھے خاندان کے لوگوں کا انتخاب کرتا اور معمولی خاندان کے آدمیوں کو ملازم نہیں رکھتا تھا۔ یہ تمام باتیں کسی ذاتی غرور یا گھمنڈ کی وجہ سے نہیں تھیں بلکہ اُس کے نزدیک ایک کامیاب بادشاہ کے لئے یہ شان وشوکت اور یہ جاہ وجلال نہایت ضروری تھے۔ چنانچہ وہ اکثر اس کا اظہار بھی کرتا تھا۔ اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ بلبن کے عہد میں غریب لوگوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں تھا کیونکہ وہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھا اور غریبوں کے مقابلہ میں بڑے لوگوں کو سخت سزا دیتا تھا۔ ایک مرتبہ بدایوں کے گورنر نے ایک فراش کو اتنا پٹوایا کہ وہ مرگیا۔

اُس کی بیوہ نے بادشاہ کے پاس شکایت کی۔ بلبن نے حکم دیا کہ اُس کے سامنے گورنر کے اتنے درّے لگائے جائیں کہ وہ مرجائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور اُس افسرِ ڈاک کو بھی سولی پر چڑھا دیا گیا جس نے اس واقعہ کی بادشاہ کو اطلاع نہیں دی تھی۔ حالانکہ یہ اُس کا فرض تھا۔ بلبن کا دل بہت نرم تھا۔ لاچاروں اور بیکسوں کے ساتھ اُس کو بہت زیادہ ہمدردی تھی اور اُن کی فریاد ہر وقت سُننے کو تیار رہتا تھا۔ جوانی میں بلبن شراب پیتا تھا لیکن تخت پر بیٹھنے کے بعد اُس نے صرف شراب ہی نہیں چھوڑی بلکہ نہایت متقی اور پرہیزگار ہو گیا تھا۔ اُس کے زمانہ میں بڑے بڑے علمار اور مشائخ موجود تھے۔ وہ اُن کی بہت عزت کرتا تھا اور اُن کے وعظ سننے کو جاتا تھا۔ برنی نے لکھا ہے کہ جب کبھی اُس کو معلوم ہوتا کہ مسجد میں کوئی نیک اور پرہیزگار عالم یا شیخ وعظ کہہ رہا ہے تو وہ فوراً جاتا اور معمولی آدمیوں کے ساتھ بیٹھکر وعظ سنتا تھا اور ان لوگوں کو دربار میں بلاکر اُن کی صحبت اور نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ یہ تمام باتیں ہم کو اور بادشاہوں میں نظر نہیں آتیں۔ اُس کی ان ذاتی خوبیوں اور سلطنت کو منگول اور دوسرے دشمنوں سے بچانے کی وجہ سے بعض مورخوں نے اُس کو غلام خاندان کے بادشاہوں میں سب سے بڑا مانا ہے لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ التمش تھا۔ بہرحال اسقدر یقینی ہے کہ بلبن نے سلطنت دہلی کو نہایت نازک وقت میں سنبھالا اور اُس کے نظام کو مضبوط اور پائدار بنا دیا۔ جب منگولوں نے ایشیا کی مسلمان ریاستوں کو تباہ و برباد کر دیا تو بہت سے اہلِ فن اور حکمرانوں نے یہاں آکر پناہ لی۔ بلبن کے دربار میں کئی بادشاہ ایسے موجود تھے۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دہلی ایشیا میں سب سے زیادہ محفوظ اور پُرامن مقام سمجھا جاتا تھا اور یہ درحقیقت کوئی معمولی

کارنامہ نہیں تھا۔

معز الدین کیقباد سنہ ۱۲۸۶-۱۲۹۰ء

بلبن نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ خان شہید کے بیٹے کیخسرو کو اُس کا جانشین بنایا جائے لیکن اُمرا نے اس وصیت پر عمل نہیں کیا اور بغرا خاں کے لڑکے کیقباد کو بادشاہ بنایا۔ کیقباد اسوقت سترہ سال کا تھا۔ اب تک وہ دنیا کی کسی چیز سے واقف نہ تھا۔ یکایک اُس کو حکومت مل گئی۔ چنانچہ اُس نے تخت پر بیٹھتے ہی شراب نوشی اور عیاشی شروع کر دی اور سلطنت کا سارا کام اپنے وزیر ملک نظام الدین کے اوپر چھوڑ دیا۔ اس بات سے دوسرے امیر اور سردار ناراض ہوئے نظام الدین بھی یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے سلطان کو قتل کر کے خود تخت پر بیٹھ جائے۔ ان حالات کی خبر پاکر بغرا خاں نے بنگال سے آکر اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا لیکن اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر کار جب امیروں نے دیکھا کہ سلطان کے سنبھلنے کی کوئی صورت نہیں تو اُنہوں نے اُس کے خلاف سازش کی۔ اس جماعت کا سردار جلال الدین خلجی تھا۔ یہ سازش کامیاب ہوئی۔ کیقباد جو شراب کی وجہ سے مفلوج ہوگیا تھا اور حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ قلعے کے اندر قتل کر دیا گیا اور جلال الدین خلجی نے تخت پر قبضہ کر لیا۔

مسلمانوں کی کامیابی کے اسباب

سو برس کے اندر مسلمانوں نے تمام شمالی ہندوستان فتح کر کے اُس میں اپنی سلطنت قائم کر لی۔ اس زمانہ کی تاریخی اور دوسری کتابوں کے مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں اسلامی تہذیب اور تمدن کا ملک پر کافی اثر ہو چکا تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلجیوں کے عہد میں دکن کی ریاستوں کو فتح کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ہم کو غور کرنا چاہئے کہ مسلمانوں کی کامیابی

کے کیا اسباب ہیں؟ یہ لوگ تعداد میں ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہوتے تھے اور دور دور کے ملکوں سے فوجیں لے کر یہاں آتے تھے لیکن پھر بھی تقریباً ہر جنگ میں وہ کامیاب ہوتے تھے۔ سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو گئی تھیں اور دشمن کے مقابلہ میں متفق نہیں ہوتی تھیں اور اگر متحد بھی ہوتی تھیں تو وہ اتحاد چند روزہ ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں ذات پات کا فرق بہت زیادہ تھا۔ اس چیز نے ہندوستان کی قومی زندگی کو بالکل تباہ اور برباد کر دیا تھا۔ اُس کے خلاف مسلمان سب ایک دوسرے کو بھائی سمجھتے تھے اور اس اخوت کے جذبہ نے اُن کے جوش اور قوت کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔ ہندوؤں میں صرف ایک ذات کے آدمی لڑائی کا پیشہ اختیار کر سکتے تھے اور مسلمانوں میں ہر شخص سپاہی تھا اور مذہبی جوش سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں لڑ کر جان دے دینا ایک نیک کام ہے۔ سلاطین غزنی و غور کی فوجوں میں بہت سے والنٹیر اسی جذبہ کے ساتھ بھرتی ہوئے تھے۔ مسلمانوں کی فوجوں کے سپاہی ٹھنڈے ملکوں سے آتے تھے اور ہندوستان کی گرم آب و ہوا میں رہنے والوں کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور اور جفاکش ہوتے تھے۔ ایک بہت بڑا سبب ہندوؤں کی شکست کا یہ تھا کہ ان کا لڑنے کا طریقہ پُرانا تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر ہاتھیوں پر بھروسہ کرتے تھے اور ہاتھی اکثر دھوکا دے جاتے تھے اور اگر دھوکا نہیں بھی دیتے تھے تو پیدل فوج کے مقابلہ میں تو مفید تھے لیکن سواروں کے مقابلہ میں کچھ زیادہ مفید نہ تھے۔ آخر میں یہ امر بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ مسلمان بادشاہوں میں غلاموں کی تربیت کا دستور نہایت عمدہ اور مفید ثابت ہوا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے قابل اور بہادر بادشاہوں کی اولاد نالائق ہوتی ہے کیونکہ دولت اُس کو خراب کر دیتی ہے لیکن جہاں حکومت موروثی ہوتی ہے تو بادشاہ کا لڑکا چاہے کسی قدر

نالایق ہو تخت پر ضرور بیٹھتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سلطنت کا کام دن بدن خراب ہوتا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے غلام یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی ترقی صرف اُس کی ذاتی قابلیت اور بہادری پر منحصر ہے۔ مسلمان لوگ غلاموں کے ساتھ وہ سلوک نہیں کرتے تھے جو اور ملکوں میں کیا جاتا تھا۔ یہ اپنے غلاموں کو عزیزوں کی طرح رکھتے تھے اور تعلیم و تربیت دیتے تھے جیسا کہ سلطنت دہلی کی سو سال کی تاریخ بتلا رہی ہے۔ سلطان شہاب الدین کا یہ جملہ "کہ میری سلطنت کے مالک میرے ترکی غلام ہوں گے" درحقیقت بالکل صحیح ہے اور ہم لوگوں کو یہ پڑھکر تعجب ہوتا ہے کہ ہندوستان کا پہلا مسلمان بادشاہ یعنی قطب الدین ایبک اپنے مالک کے جیتے جی غلام ہی رہا اور آزاد نہ ہوا تھا۔ یہ آزادی اُس کو شہاب الدین کے بھتیجے اور جانشین نے سلطان کے مرنے کے بعد عطا کی۔

باب ۲۳

سلاطین خلجی ۱۲۹۰-۱۳۲۰ء

جلال الدین خلجی ۱۲۹۰-۱۲۹۴ء

خلجیوں کے نسب کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ وہ ترک ہیں بعض کہتے ہیں کہ ترک نہیں تھے۔ جلال الدین کی مخالفت سب سے زیادہ ترکی اُمرا نے ہی کی تھی اور اُس کو اپنی جان کا اسقدر خطرہ تھا کہ ابتدا میں وہ دہلی شہر میں نہیں رہ سکتا تھا۔ بلکہ کلوکھڑی میں قیام پذیر تھا۔ دن کے وقت دہلی میں

آجاتا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں خلجی ترکی النسل نہیں سمجھے جاتے تھے اور اسی وجہ سے ترک اُن کے مخالف تھے۔

جلال الدین نہایت رحمدل اور شریف النفس تھا اور انھیں اوصاف کی وجہ سے وہ سلطنت کا کام اچھی طرح سے انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اُس کے امرا میں سے اکثر اُس کی پالیسی کے خلاف تھا اور نہایت صفائی سے اپنی رائے کا اظہار کردیتا تھا۔ لیکن سلطان اُس کے مشورہ پر عمل نہیں کرتا تھا۔ خلجیوں کو خود یہ شکایت تھی کہ سلطان اپنی کمزوری کی وجہ سے دشمنوں کو سزا تک نہیں دے سکتا۔ اُس کی تخت نشینی کے دوسرے سال میں ملک چھجو گورنر کڑا نے بغاوت کی۔ ملک چھجو سلطان بلبن کا بھتیجا تھا اور اپنے آپ کو تخت کا وارث سمجھتا تھا۔ ایک بڑی فوج لے کر وہ دہلی کی طرف روانہ ہوا لیکن بدایوں کے قریب شاہی لشکر نے اُس کو شکست دی اور گرفتار کر لیا۔ جلال الدین نے ان باغیوں کو معاف کردیا اور کڑے کی گورنری پر اپنے بھتیجے اور داماد علاء الدین کو مقرر کیا۔ ایک دوسرے موقع پر ٹھگوں کا ایک گروہ گرفتار کیا گیا۔ سلطان نے اُن کو صرف یہ سزا دی کہ وہ بنگال بھیجدئے گئے اور وہاں اُن کو آزاد کردیا گیا۔ اپنے زمانہ حکومت میں صرف ایک مرتبہ جلال الدین نے سختی کی اور وہ سیدی مولا کے معاملہ میں تھی۔ سیدی ایک درویش تھا جو دہلی کے قریب رہتا تھا۔ وہ ہندوستان میں باہر سے آیا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں لوگ اُس کے پاس کثرت سے جانے لگے اور فقرا وغیرہ کو کھلانے اور خیرات میں وہ بہت روپیہ خرچ کرتا تھا۔ ظاہرا اُس کی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ اُس کا اثر بہت زیادہ ہوگیا سلطان کو اُس کی طرف سے شک پیدا ہوگیا اور اُس کو بلا کر مروا ڈالا جس روز وہ قتل کیا گیا ہے اُسی روز بارش اور ہوا کا ایک طوفان اُٹھا اور اُس کے عقیدت مند

سمجھتے تھے کہ یہ اُس کی موت ہی کی وجہ ہے کہ قہرِ خدا نازل ہوا ہے۔
جلال الدین نے راجپوتانہ کے مشہور قلعہ رنتھمبور کا محاصرہ کیا۔ لیکن فتح کرنے سے پہلے ہی چھوڑ دیا۔ اُس کی دورانِ حکومت میں جو بڑی کامیابی اُس کو نصیب ہوئی وہ مغلوں کے خلاف تھی۔ مغلوں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ جلال الدین نے اُس سے صلح کرلی اور اُن کو یہاں رہنے کی اجازت دیدی۔

جلال الدین کا قتل

علاء الدین ایک بہادر سپاہی اور بلند حوصلہ نوجوان تھا۔ اُس نے دکن کے راجاؤں کی دولت و ثروت کے بہت قصے سُنے تھے اور اب اُس کی خواہش تھی کہ دکن کو فتح کرے۔ چنانچہ آٹھ ہزار سپاہی ہمراہ لیکر وہ دکن کی طرف روانہ ہوا۔ دکن کے شمالی حصّہ میں دیوگری کی ریاست تھی جہاں یادو خاندان کے راجہ حکومت کرتے تھے۔ رام چندر اسی خاندان کا ساتواں راجہ تھا۔ علاء الدین دیوگری کی حدود میں داخل ہوا اور یہ مشہور کردیا کہ دہلی کا بادشاہ اپنی پوری فوج کے ساتھ اُس کے پیچھے آرہا ہے۔ رامچندر کی فوج کا بیشتر حصّہ اُس کے بیٹے شنکر کے ساتھ تیرتھ پر گیا ہوا تھا۔ چنانچہ خوف کی وجہ سے وہ قلعہ کے اندر گھس گیا اور علاء الدین سے صلح کی درخواست کی۔ علاء الدین اس پر راضی ہوگیا تھا کہ بہت سامان اسباب لے کر واپس چلا جائے۔ لیکن اسی عرصہ میں شنکر واپس آگیا اور اُس نے اپنے باپ کو لڑنے پر مجبور کیا۔ لیکن آخر میں علاء الدین کو فتح حاصل ہوئی اور بہت سامانِ غنیمت لے کر واپس گیا۔ کڑا پہنچکر اُس نے جلال الدین کے پاس پیغام بھیجا کہ وہ اُس کے غصّہ سے ڈرتا ہے اور یہ خوف اسی وقت دور ہوسکتا ہے جب سلطان خود اُس کے پاس آکر اُس کو معاف کرے۔ جلال الدین اس پر راضی

ہوگیا اور اپنے اُمرا کے مشورہ کے خلاف علاء الدین کے پاس گیا۔ دریائے گنگا کے کنارے پر دونوں کی ملاقات ہوئی اور علاء الدین کے اشارے سے اُس کے دو سپاہیوں نے جلال الدین کو قتل کیا۔ فوراً ہی علاء الدین نے اپنی بادشاہت کا اعلان کرا دیا اور ایک بڑی فوج لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ راستہ میں اُس نے ہزارہا اشرفیاں لوگوں کو تقسیم کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر لوگ یہ بھول گئے کہ علاء الدین ایک احسان فراموش اور خودغرض خونی ہے جس نے اپنے رحمدل چچا کو قتل کرکے سلطنت کا دعویٰ کیا ہے۔

علاء الدین خلجی کی تخت نشینی

جب علاء الدین دہلی پہنچا تو جلال الدین کی بیوی ملکہ جہاں مع اپنے چھوٹے لڑکے ابراہیم کے جس کو اُس نے تخت پر بٹھا دیا تھا بھاگ کر ملتان پہنچ گئی۔ یہاں ابراہیم اور اس کا بڑا بھائی ارکلی خاں گرفتار ہوئے اور اندھے کردئے گئے۔ ملکہ جہاں کو بھی قید کرلیا گیا۔

اب علاء الدین شہر میں داخل ہوا اور اکتوبر ۱۲۹۶ء میں نہایت شان و شوکت کے ساتھ تخت پر بیٹھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے ہندوستان کی تمام خودمختار ریاستوں کو فتح کرلیا اور تقریباً سارا ملک اُس کی سلطنت میں شامل ہوگیا۔ صرف جنوبی ہند کا تھوڑا سا علاقہ اُس کے زیر حکومت نہ تھا۔ ہندوستان میں کسی کی سلطنت اُسوقت تک اس قدر وسیع نہیں ہوئی تھی۔ علاوہ اس کے علاء الدین نے حکومت کا انتظام بھی نہایت ہوشیاری اور قابلیت سے کیا۔

مُغلوں کے حملے

علاء الدین کی فتوحات بیان کرنے سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مغلوں کے اُن حملوں کا مختصر طور پر ذکر کیا جائے جو علاء الدین کے زمانہ میں ہوئے۔ علاء الدین کی تخت نشینی کے دوسرے

ہی سال مغلوں نے پنجاب پر حملہ کیا لیکن الغ خاں نے نہایت بہادری سے
اُن کا مقابلہ کیا اور اُن کو بھگا دیا۔ دوسرا حملہ مغل سردار سلدی نے کیا۔ اس
مرتبہ بھی علاء الدین کے ایک سردار ظفر خاں نے سلدی اور اُس کے بہت سے
سپاہیوں کو گرفتار کر لیا۔ ۱۲۹۹ء میں قتلغ خواجہ ایک زبردست لشکر لے کر چڑھ آیا
لیکن پھر بھی مغلوں ہی کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ گئے۔ اس جنگ میں
علاء الدین کا مشہور اور بہادر سپہ سالار ظفر خاں مارا گیا۔ کچھ عرصہ بعد مغل پھر آئے
اس مرتبہ اُن کا سردار طرغی تھا۔ یہ حملہ نہایت خطرناک تھا کیونکہ مغل فوج دہلی
کے قریب تک پہنچ گئی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ دہلی پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں
لیکن یکایک مغلوں کا لشکر ایک رات کو واپس چلا گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے
کہ حضرت نظام الدین اولیا کی دعا کا اثر تھا کہ مغل اس طرح سے بھاگ
گئے۔ لیکن اس حملہ نے علاء الدین کو ہوشیار کر دیا اور وہ پوری طور پر سمجھ گیا کہ
یہ نہایت اہم معاملہ ہے۔ چنانچہ اُس نے دہلی سے لے کر سرحد تک تمام قلعوں کی
مرمت کرائی اور اُن کی حفاظت کے لئے سپاہی مقرر کئے۔ فوج کی تعداد
زیادہ کی۔ اس سلسلہ میں جو دوسری اصلاحات ہوئی ہیں اُن کا مفصل
ذکر آگے کیا جائیگا۔ باوجود ان تدابیر کے ۱۳۰۴ء میں مغلوں نے پھر حملہ کیا اور
امروہہ تک پہنچ گئے لیکن ملک غازی تغلق نے اُن کو شکست فاش دی اور
بھگا دیا۔ اُس کے بعد اور بھی حملے ہوئے مگر تغلق نے ہر موقعہ پر اُن کا کامیابی کے
ساتھ مقابلہ کیا۔ اُن کے بہت سے سپاہی اور سردار گرفتار ہوئے۔ آخر میں مغلوں
پر اس قدر رعب بیٹھ گیا تھا کہ اُنھوں نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا خیال ہی
چھوڑ دیا۔ علاء الدین کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اُس نے ہندوستان
کے آدمیوں کو ان نیم وحشی لٹیروں کے حملہ سے بچایا۔ ورنہ یہاں کے رہنے

والوں کی جان مال اور عزت ہر وقت خطرے میں تھی۔

علاء الدین کی فتوحات اور جنگی کارنامے
گجرات سنہ ۱۲۹۷ء

سب سے پہلی ریاست جو علاء الدین نے فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کی، گجرات تھی۔ یہاں کا راجہ اُس وقت راجہ کرن گھیلا تھا۔ علاء الدین نے اپنے بھائی الغ خاں اور وزیر نصرت خاں کو ایک بڑی فوج کے ہمراہ گجرات بھیجا۔ کرن مقابلہ نہیں کرسکا اور دیوگری کی طرف بھاگ گیا۔ مسلمانوں نے گجرات پر قبضہ کرلیا اور کرن کی رانی اور بہت سا مال غنیمت علاء الدین کے ہاتھ آیا۔ واپسی میں کچھ سپاہیوں نے بغاوت کی لیکن اُن کو ناکامیابی ہوئی اور اُن میں سے اکثر رنتھمبور کی طرف بھاگ گئے۔

علاء الدین اسوقت تک ہر کوشش میں کامیاب ہوا اور غالباً اسی کامیابی کا نتیجہ تھا کہ اُس کے دماغ میں ایسی تدبیریں آنے لگیں جو ناممکنات میں سے تھیں۔ دولت اور کامرانی کے نشے میں اُس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ وہ ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالے تاکہ اُس کا نام ہمیشہ دنیا میں قائم رہے۔ وہ کہتا تھا کہ رسولؐ عربی کی طرح اُس کے بھی چار یار ہیں جن کی کوشش سے اُس کا نیا مذہب کامیاب ہوگا اور یہ کہ سکندر اعظم کی طرح وہ بھی دنیا کو فتح کرسکتا ہے۔ علاء الملک جو دہلی کا کوتوال اور سلطان کا ایک خیرخواہ دوست تھا، ایک روز بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس کی ان تدابیر کے متعلق صحیح صحیح مشورہ دیا۔ علاء الملک نے کہا کہ نئے مذہب جاری کرنا بادشاہوں کا کام نہیں۔ یہ کام صرف پیغمبر ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اور بادشاہ کو یہ خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیئے۔ دنیا کو سکندر کی طرح فتح کرنے کے متعلق اُس نے کہا کہ پہلے ہندوستان کی خود مختار ریاستوں کا فتح کرنا ضروری ہے اور اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ مغلوں کے حملوں کو روکا جائے۔ علاء الدین

نے اس مشورہ کو بہت پسند کیا اور علاء الملک کو بہت کچھ انعام دیا لیکن پھر بھی سکوں پر اپنے نام کے ساتھ وہ سکندر ثانی کندہ کراتا تھا۔

راجپوتانہ

راجپوتانہ میں سب سے پہلی ریاست جو علاء الدین نے فتح کی رنتھمبور تھی۔ یہاں کے راجہ ہمیر سنگھ نے علاء الدین کے باغی سپاہیوں کو پناہ دی تھی۔ چنانچہ علاء الدین نے الغ خاں اور نصرت خاں کو ایک زبردست لشکر کے ساتھ بھیجا۔ نصرت خاں دوران جنگ میں مارا گیا اور الغ خاں کو واپس ہونا پڑا۔ یہ سنکر علاء الدین خود دہلی سے روانہ ہوا۔ راستہ میں اُس کے ایک بھتیجے اکت خاں نے اُس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ لیکن سلطان زندہ بچ گیا اور اکت خاں کو قتل کر دیا گیا۔ ایک سال کے محاصرہ کے بعد رنتھمبور فتح ہو گیا۔ ہمیر سنگھ قتل ہوا اور قلعہ ایک مسلمان حاکم کے سپرد کر دیا گیا۔ رنتھمبور کے بعد علاء الدین نے چتوڑ پر حملہ کیا۔ یہ قلعہ پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے نہایت مضبوط اور محفوظ خیال کیا جاتا تھا لیکن خلجی سلطان پر ان چیزوں کا کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ ۱۳۰۳ء میں اُس کی فوجیں میواڑ کی طرف روانہ ہوئیں اور چتوڑ کے مشہور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ راجپوت سپاہیوں نے دلیری سے مقابلہ کیا لیکن علاء الدین کے مقابلہ میں اُن کو کامیابی کی کوئی اُمید نہ تھی۔ عورتوں نے جوہر کی رسم ادا کی اور سپاہی یکایک حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑے۔ قلعہ فتح ہونے کے بعد چتوڑ کا نام شہزادہ خضر خاں کے نام پر خضر آباد رکھا گیا اور یہی شہزادہ وہاں کا گورنر مقرر ہوا۔ بعد کے چند مورخوں نے پدمنی کے متعلق ایک غلط روایت بیان کی ہے کہ علاء الدین نے چتوڑ اُسی کی وجہ سے فتح کیا تھا۔ یہ الزام بالکل بے بنیاد ہے اور ہمعصر تاریخوں میں اُس کا ذکر نہیں ملتا۔ ملک محمد جائسی نے اپنی ہندی نظم پدماوت میں اس قصہ کو بیان کیا ہے اور اسی بنا پر کچھ لوگوں نے اپنی تاریخی کتابوں میں اس کو شامل کر لیا ہے۔ چتوڑ کی فتح کے بعد

علاء الدین نے راجپوتانہ کی دوسری خودمختار ریاستوں پر بھی قبضہ کر لیا۔ دھار مانڈو۔ اجین۔ چندیری اور چاندرسب کی سب سلطنت دہلی میں شامل کر لی گئیں اور ۱۳۰۵ء تک علاء الدین تمام شمالی ہند کا بادشاہ تسلیم کر لیا گیا۔ کسی بادشاہ کو اسقدر قلیل مدت میں ایسی وسیع فتوحات نصیب نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن علاء الدین کے حوصلے اس سے بھی زیادہ بلند تھے اور اب تم پڑھوگے کہ دکن کا بھی بیشتر حصہ اس کی افواج نے فتح کر کے سلطنت دہلی کی حدود جنوبی ہند تک پہنچا دیں۔ اس زمانہ میں دو مرتبہ مغلوں نے پھر حملہ کیا لیکن جیسا اوپر بیان ہو چکا ہے ملک تغلق نے دونوں موقعوں پر اُن کو شکست دی۔ اب نہ بیرونی حملہ کا کوئی خوف تھا اور نہ شمالی ہندوستان میں کوئی خودمختار ریاست تھی۔ لہذا علاء الدین نے دکن کی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا۔

دکن دکن میں اسوقت تین ہندو ریاستیں تھیں۔ دیوگر مغرب کی طرف، ورنگل مشرقی جانب اور دوارسمدر جنوب میں۔ دیوگر کے راجہ رامچندر نے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ چنانچہ علاء الدین نے ملک کافور کو ایک زبردست فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ ایک مقصد اس حملہ کا یہ بھی تھا کہ راجہ کرن کی بیوی جو اب علاء الدین کے پاس تھی اپنی بیٹی کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اس لڑکی کی شادی دیوگر کے شہزادہ شنکر کے ساتھ ہوئی تھی اور اب وہ دیوگر ہی جا رہی تھی کہ راستہ میں الغ خاں کے سپاہیوں نے اُس کو گرفتار کر کے دہلی بھیجدیا۔ بعد میں اُس کی شادی خضر خاں کے ساتھ کر دی گئی۔ خضر خاں اور دیول دیوی میں بہت محبت تھی اور حضرت امیر خسرو نے اپنی مشہور مثنوی خضر خاں دولرانی میں اسی واقعہ کو نظم کیا ہے۔ ملک کافور کے پہنچنے پر رامچندر نے اُس کی اطاعت قبول کر لی اور تمام بقایا روپیہ ادا کر دیا۔ وہ خود سلطان کے دربار میں بھی حاضر ہوا۔ علاء الدین اُس کے

ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آیا اور رائے رایان کا خطاب دے کر دیوگر میں اپنی طرف سے گورنر مقرر کیا۔ ملک کافور ورنگل کی دولت کے بہت سے قصے سُنکر آیا تھا اور سنہ ۱۳۰۹ء میں سلطان نے اُس کو پھر دکن کی طرف روانہ کیا۔ اس مرتبہ رامچندر نے شاہی فوج کو ہر قسم کی مدد پہنچائی۔ کافور دیوگر ہوتا ہوا ورنگل پہنچ گیا۔ ورنگل کا قلعہ دکن کے مستحکم ترین قلعوں میں سے تھا۔ اُس کے چاروں طرف تین مضبوط دیواریں تھیں۔ باہر کی دیوار مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ جب کافور کے سپاہیوں نے بہت کوشش کے بعد اس بیرونی دیوار پر قبضہ کر لیا تو راجہ پرتاپ رُدر دیو (مسلمان مورخین اس کا نام لدر دیو لکھتے ہیں) نے صلح کا پیغام بھیجا اور سلطان دہلی کی اطاعت قبول کر لی۔ ملک نائب بہت سا مال غنیمت لے کر نہایت سرخروئی کے ساتھ مارچ سنہ ۱۳۱۰ء میں دہلی واپس پہنچا۔ اُسی سال ماہ نومبر میں تیسری مرتبہ وہ پھر دکن کی طرف روانہ ہوا۔ ویر بلال دیو سویم نے جو اسوقت دوارسمدر کی ہوئسل ریاست کا راجہ تھا مسلمانوں کا مقابلہ تو کیا لیکن شکست کھائی اور مجبور ہو کر شاہ دہلی کی اطاعت قبول کی۔ یہاں بھی بہت سا مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔ ملک نائب یہاں سے جنوب کی طرف بڑھا اور جنوبی ہند میں کیرالا اور پانڈیہ علاقوں کو تاراج کرتا ہوا مدورا پہنچ گیا۔ پانڈیا راجہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور بھاگ گیا۔ ملک نائب نے رامیشورم میں ایک مسجد اپنے مالک کے نام سے بنوائی اور بے حد مال و اسباب کے ساتھ دہلی کو واپس ہوا جب اپریل سنہ ۱۳۱۱ء میں وہ دہلی پہنچا تو بادشاہ نے اُس کا بہت عزت اور شان سے استقبال کیا۔ اس دوران میں رامچندر مر چکا تھا اور اُس کے بیٹے شنکر نے خراج بھیجنا بند کر دیا تھا۔ علاء الدین کو اس پر بہت غصہ آیا اور سنہ ۱۳۱۲ء میں چوتھی مرتبہ اُس نے ملک نائب کو دکن بھیجا۔ شنکر گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ شاہی افواج نے مہاراشٹر کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔ علاء الدین کی سلطنت اسوقت انتہائی عروج پر

پہنچ چکی تھی۔ شمالی ہند کی طرح دکن کی سب ریاستیں بھی فتح ہو چکی تھیں۔ ملک کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ تھا جہاں اُس کا حکم نہ مانا جاتا ہو۔ لیکن اس کے بعد ہی اُس کی زندگی کا آخری دور شروع ہو گیا جس میں اُس کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اصلاحات

علاء الدین صرف سپاہی ہی نہ تھا بلکہ انتظامی معاملات میں بھی اُس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ مسلمان بادشاہوں میں وہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے تمام ہندوستان کو فتح کر کے ملک کا باقاعدہ انتظام کیا۔

تم اوپر پڑھ آئے ہو کہ جس وقت علاء الدین کی فوجیں راجپوتانہ کی ریاستیں فتح کرنے کے لئے گئی ہوئی تھیں، تو کئی بغاوتیں ہوئیں اور ایک مرتبہ تو سلطان کی جان ہی خطرے میں آ گئی تھی۔ اُس کے بھتیجے اکت خاں نے یہ کوشش کی تھی کہ اُس کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کرے۔ بدایوں اور اودھ میں اُس کے دو بھانجوں نے بغاوت کی لیکن وہ بھی گرفتار ہو گئے۔ سب سے خطرناک بغاوت حاجی مولا کی تھی۔ اُس نے دہلی کے کوتوال کو قتل کر کے شہر پر قبضہ کر لیا اور ایک سید کو تخت پر بٹھلایا۔ ایک ہفتہ کے بعد شاہی افسروں نے اُس کو شکست دے کر گرفتار کیا اور تخت چھین لیا۔ ان متواتر بغاوتوں سے سلطان کے کان کھڑے ہوئے اور اُس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُس کی عدم موجودگی خطرے سے خالی نہیں۔ اگرچہ یہ سب بغاوتیں ناکامیاب رہیں لیکن اب اس میں ذرا شک نہیں تھا اگر اُن کے روکنے کا خاص انتظام نہیں کیا گیا تو یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ علاء الدین نے اپنے اُمرا اور وزراء سے مشورہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ان بغاوتوں اور سازشوں کے چار سبب ہو سکتے ہیں۔

(۱) دولت اور ثروت کی زیادتی۔

(۲) اُمراء اور وزراء کے تعلقات اور رشتہ داریاں۔

(۳) شراب نوشی

(۴) ملک کے حالات سے سلطان کی لاعلمی۔

اب علاءالدین نے ان اسباب کو دور کرنے کی غرض سے اصلاحات اور قوانین جاری کئے اور نتائج کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت کامیاب ثابت ہوئے۔ سب سے پہلے اُس نے تمام جائدادیں جو لوگوں کو ملک یا انعام کے طور پر ملی ہوئی تھی ضبط کر لیں۔ یہاں تک کہ اوقاف بھی ضبط ہو گئے۔ علاءالدین زمینداروں پر خاص طور سے سختی کرتا تھا۔ دوآب کے زمینداروں پر مالگزاری کا محصول بہت زیادہ کر دیا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کو معاش کی فکر اس قدر ہو گئی کہ سلطنت کے خلاف سازش یا بغاوت کا خیال بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اُس نے حکم دیدیا کہ اُمرا کے خاندانوں میں کوئی رشتہ بغیر سلطان کی اجازت کے نہ کیا جائے۔ اسی طرح سے شراب کی ممانعت کر دی گئی۔ سلطان نے خود اپنے تمام شراب کے برتن توڑ ڈالے اور شراب کا استعمال ترک کر دیا۔ بعد میں تنہا پینے کی اجازت تھی لیکن مجلس میں کوئی نہیں پی سکتا تھا۔ ملک کے حالات سے باخبر رہنے کے لئے اُس نے کثرت سے جاسوس مقرر کئے اور اس محکمہ کو بہت وسعت دی۔ ہمعصر مورخوں کا قول ہے کہ لوگ آپس میں بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور اپنے خیالات کا اظہار اشاروں سے کرنے لگے تھے۔ علاءالدین کی ان اصلاحات ہی کا نتیجہ تھا کہ اُس کے زمانہ میں پھر کسی نے بغاوت کا نام تک نہیں لیا۔

اپنے ابتدائی زمانہ میں علاءالدین کو کئی بار مغلوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ ان نیم وحشی مغلوں نے یہ دستور بنا لیا تھا کہ ہندوستان پر حملہ کرتے تھے اور یہاں کے لوگوں کو لوٹ مار کر چلے جاتے تھے۔ علاءالدین نے بہت غور کیا تو اس نتیجہ

پر پہنچا کہ مغلوں سے ملک کو بچانے اور نئی فتوحات کے لئے اُس کو ایک زبردست فوج کی ضرورت ہے۔ اس مستقل اور زبردست فوج کے لیے کثیر روپیہ چاہیئے اور اُس کی تمام دولت بھی اس کام کے لئے کفایت نہ کر سکیگی، لیکن اُس نے خیال کیا کہ اگر سپاہی کی تنخواہ اور دیگر اخراجات میں کمی کر دی جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ چنانچہ اُس نے تمام اشیاء کی قیمت مقرر کر دی اور یہ قیمت اس قدر کم تھی کہ بہت تھوڑا روپیہ خرچ کرنے سے فوج اور سامان جنگ فراہم ہو سکتے تھے۔ قابل تعریف بات یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو اُس نے اسقدر انتظام اور خوبی کے ساتھ کیا کہ وہ اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب ہوا۔ ایک نیا محکمہ علیحدہ قائم کیا گیا اور بازار کا انتظام ایک نئے افسر کے سپرد کیا جو شحنہ منڈی کہلاتا تھا۔ غلہ کی دکانیں حکومت کی طرف سے کھولی گئیں تاکہ مقرر کردہ نرخ پر ہر شخص خرید سکے۔ اسی طرح سے کپڑا۔ مویشی۔ گھوڑے۔ باربرداری کے جانور اور دوسری قسم کا سامان نہایت ارزاں قیمت پر فروخت کیا جاتا تھا۔ علاءالدین نہایت سنگدل اور سخت مزاج بادشاہ تھا۔ جو شخص اُس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا اُسکو نہایت سخت سزا ملتی مثلاً اگر کوئی دکاندار کم تولتا تو اُس کا اُسی قدر گوشت کاٹ لیا جاتا جس قدر وہ کم تولتا تھا۔ اس سختی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے بے ایمانی اور دغابازی چھوڑ دی اور نہایت قلیل آمدنی میں اچھی طرح سے گذر ہونے لگی تب اُس نے سپاہیوں کی تنخواہ بہت کم مقرر کی لیکن ارزانی کی وجہ سے بہت خوشی سے سپاہی اُس کی فوج میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ سپاہی کی تنخواہ اُس نے ۲۳۴ ٹنکہ سالانہ مقرر کی اور دو گھوڑے رکھنے والے کو ۷۸ ٹنکے اور زیادہ ملتے تھے۔ سلطان کی یہ اصلاحات نہایت کامیاب ثابت ہوئیں۔ بہت تھوڑے روپیہ میں ایک بڑی فوج مرتب ہو گئی جس کے نتائج ہم اوپر پڑھ چکے ہیں۔

مغلوں کی یورشیں بند ہو گئیں ۔ سرداروں اور راجاؤں کی بغاوتوں کا خاتمہ ہو گیا اور شاہی افواج نے نئی فتوحات حاصل کر کے سلطنت کی حدود بہت وسیع کر لیں ۔ یہ ظاہر ہے کہ علاء الدین کے انتظامات کی کامیابی کا راز ایک حد تک اُسکی سختی پر تھا اور یہ چیز دیرپا نہیں ہو سکتی ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ چند سال گذرنے پر اُس کے نقائص نظر آنے لگے ۔ لیکن اُس کے تفصیلی حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی اصلاحیں اسقدر مفید اور عمدہ تھیں کہ وہ ملک میں مستقل طور پر قائم اور جاری ہو گئیں اور بعد میں آنے والے سلاطین نے اُن میں کوئی بہتر تبدیلی نہیں کی ۔

علاء الدین کی وفات سنہ ۱۳۱۶ء

علاء الدین کے آخری دن بہت مصیبت میں کٹے ۔ سنہ ۱۳۱۲ء میں اُس نے خضر خاں کو ولیعہد مقرر کر دیا تھا ۔ ملک کافور کو یہ بات ناگوار گذری کیونکہ وہ خضر خاں کے خلاف تھا اور وہ دکن کی گورنری پر چلا گیا ۔ شنکر کو اُس نے شکست دی اور کرشنا اور تنگ بھدرا کے دوآبہ کو سلطنت میں شامل کر لیا ۔ اس عرصہ میں علاء الدین بیمار پڑ گیا اور اسقدر کمزور ہو گیا کہ نقل و حرکت سے بھی مجبور تھا دوسری پریشانی یہ تھی کہ اُس کی بیوی اور اولاد اُس کی کچھ پرواہ نہیں کرتی تھی ۔ چنانچہ اُس نے پھر ملک نائب کو دکن سے واپس بلایا اور اُسی کے کہنے پر خضر خاں ۔ شادی خاں اور اُن کی ماں کو قید کر لیا ۔ ملک نائب کی اس پالیسی سے بہت لوگ بددل ہو گئے ۔ گجرات اور دکن میں پھر بغاوتیں شروع ہو گئیں دیوگریں راجہ رامچندر کے داماد ہر پال نے خود مختاری کا اعلان کر دیا ۔ انہیں پریشانیوں میں ۲ جنوری سنہ ۱۳۱۶ء کو علاء الدین نے انتقال کیا ۔ ملک کافور نے ایک مصنوعی وصیت نامہ دکھلایا کہ علاء الدین نے اپنے چوتھے بیٹے شہاب الدین عمر کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے ۔ شہاب الدین پانچ سال کا بچہ تھا چنانچہ سلطنت کے

تمام انتظامات ملک نائب کے ہاتھ میں آ گئے۔ خضر خاں اور شادی خاں کو اندھا کر دیا گیا اور تیسرے بھائی مبارک کو اندھا کرنے کے لئے بھی آدمی بھیجے گئے تھے لیکن مبارک نے اُن کو لالچ دے کر اپنے ساتھ کر لیا۔ انہیں لوگوں نے ملک نائب کا کام تمام کیا۔ اب کافور کی جگہ مبارک سلطنت کا مالک ہو گیا۔ دو ماہ تک وہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرف سے انتظام کرتا رہا۔ اس کے بعد اس کو اور اپنے دونوں بڑے بھائیوں کو قتل کرا دیا اور خود تخت پر بیٹھا۔

قطب الدین مبارک شاہ ۱۳۱۶ء سے ۱۳۲۰ء

مبارک نے تخت پر بیٹھتے ہی علاء الدین کی اصلاحات کا خاتمہ کر دیا۔ جائدادیں واپس کر دی گئیں۔ اشیاء کی قیمت بڑھ گئی اور سخت سزائیں بند ہو گئیں۔ مبارک شاہ کی اس فیاضی نے بہت جلد اس کو ہر دلعزیز بنا دیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اُس کے اطوار خراب ہو گئے۔ عیاشی اور شراب نوشی کے علاوہ وہ کسی چیز کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ ۱۳۱۶ء میں عین الملک گجرات کا گورنر مقرر ہوا۔ اُس نے وہاں پہنچکر باغیوں کی سرکوبی کی اور مبارک شاہ خود دکن کی طرف گیا۔ ہرپال جو باغی ہو گیا تھا گرفتار ہوا اور قتل کر دیا گیا۔ بادشاہ کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر دہلی واپس آیا اور ۱۳۱۸ء میں خسرو خاں کو مدورا فتح کرنے کی غرض سے جنوب کی طرف روانہ کیا۔ قطب الدین کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ خسرو خاں پر بہت مہربان تھا اُس کو تمام امرا اور وزرا سے افضل سمجھتا اور سب سے زیادہ اس پر اعتبار کرتا تھا۔ خسرو خاں ایک نیچی ذات کا کمینہ شخص تھا جو برائے نام مسلمان ہو گیا تھا۔ اُس کا نام حسن تھا لیکن مبارک نے اُس کو خسرو خاں کا خطاب دیکر امرائے کبار میں داخل کیا۔ خسرو خاں کا یہ اقتدار راکین سلطنت کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہ بادشاہ کے خلاف سازش کر رہا ہے لیکن مبارک

اُس کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اپنی قوم کے بہت سے افراد دہلی میں بلا لئے اور موقع پا کر ۱۴ اپریل ۱۳۲۰ء کی شب میں بادشاہ پر حملہ کیا اور قتل کر کے رات ہی رات میں تخت پر بیٹھ گیا۔ علی الصباح جب امرا دربار میں پہنچے تو سلطان ناصر الدین خسرو تخت و تاج کا مالک تھا۔ اُس نے شاہی خزانہ نہایت دریادلی سے تقسیم کیا۔ لیکن بہت جلد اس نے اسلام کی توہین اور مسلمانوں کی مخالفت شروع کر دی۔ قرآن کریم اور مساجد کی سخت توہین کی جاتی تھی۔ قدرتی طور پر مسلمان اُس کے خلاف ہو گئے اور اُس سے رہائی پانے کی تدبیریں کرنے لگے۔

خسرو خاں کے امرا میں فخر الدین جونا خاں بھی تھا۔ اُس کا باپ غازی ملک تغلق اس وقت دیپال پور کا حاکم تھا۔ جونا خاں دہلی سے بھاگ کر اپنے باپ کے پاس پہنچا اور مسلمانوں کی ابتری کے حالات اُس کو سنائے۔ چنانچہ ملک تغلق اپنی فوج ہمراہ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ خسرو خاں کو لڑائی میں شکست ہوئی اور وہ بھاگ کر ایک باغ میں چھپ گیا۔ بعد میں گرفتار ہو کر تغلق کے سامنے آیا اور قتل کر دیا گیا۔ تغلق چاہتا تھا کہ خلجی خاندان کے کسی شہزادے کو تخت پر بٹھائے لیکن مبارک کی بیدردی اور خسرو خاں کی غداری اور سفاکی نے اس خاندان کو بالکل تباہ کر دیا تھا اور کوئی فرد باقی نہ تھا کہ سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے۔ امرا کی درخواست اور اصرار پر تغلق خود تخت پر بیٹھا اور انتظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا۔

باب ۲۴

تغلق خاندان کا عروج

سلطان غیاث الدین اور محمد بن تغلق

غیاث الدین تغلق
سنہ ۱۳۲۰-۱۳۲۵ء

غیاث الدین تغلق نے جس خاندان کی بنیاد ڈالی وہ اُس کے نام پر تغلق خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ تخت نشینی کے وقت غیاث الدین کی عمر کافی تھی لیکن ہمت اور شجاعت میں وہ بہت سے جوانوں سے بہتر تھا۔ وہ اسلام کا سچا پیرو تھا اور نہایت منصف مزاج اور عالی دماغ بادشاہ تھا۔ اُس نے صرف چار سال اور چند مہینے حکومت کی لیکن اس قلیل مدت میں ملک کی تمام خرابیوں کو دور کرکے امن وامان قائم کیا اور بہت سی اصلاحات جاری کیں۔ اُس کے زمانہ میں رعایا خوش حال تھی۔ معصر مورخ ضیاالدین برنی نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ بالخصوص اُس کی میانہ روی کی۔ جس وقت وہ تخت پر بیٹھا تو خزانہ بالکل خالی تھا اور فوج تتر بتر تھی۔ مگر اُس نے نہایت ہوشیاری سے انتظام کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کے مرنے کے وقت دہلی کی سلطنت میں صرف امن وامان ہی نہیں تھا بلکہ ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی نظر آتی تھی۔ اُس کو کاشتکاروں کا بہت خیال تھا چنانچہ اُس نے لگان وصول کرنے والے افسروں کو حکم دیدیا تھا کہ کسانوں پر کسی صورت میں بیجا سختی نہ کی جائے۔ اس کی

ان اصلاحات کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے۔

دکن اور بنگال کے حملے خلجیوں نے دکن فتح تو کر لیا تھا لیکن وہاں مستحکم حکومت قائم نہیں ہوئی تھی اور وہاں کے راجاؤں کو جب موقع ملتا تھا وہ خود مختار ہو جاتے تھے۔ علاء الدین کے بعد قطب الدین مبارک شاہ کو دکن پر حملہ کرنا پڑا تھا۔ خسرو خاں کے زمانہ میں یہ ریاستیں پھر خود مختار ہو گئی تھیں اور غیاث الدین کو حملہ کرنے کی ضرورت ہوئی۔ سلطان نے اپنے لڑکے جونا خاں کی سرکردگی میں دکن کو ایک فوج روانہ کی۔ شہزادہ نے وارنگل تک سارا ملک فتح کر لیا لیکن وہاں پہنچکر اُس کے چند فوجی سرداروں نے شرارت سے یہ افواہ اُڑا دی کہ غیاث الدین کا انتقال ہو گیا۔ اس خبر سے فوج میں ابتری پھیل گئی اور جونا خاں کو واپس آنا پڑا کچھ عرصہ کے بعد اُس نے دوبارہ حملہ کیا اور کامیاب ہوا۔

۱۳۲۴ء میں غیاث الدین نے بنگال پر حملہ کیا اس لئے کہ یہاں بغرا خاں کی اولاد میں خانہ جنگی شروع ہو گئی تھی۔ غیاث الدین نے اپنے ولی عہد یعنی جونا خاں کو دہلی میں نائب مقرر کیا اور خود بنگال کو روانہ ہوا بنگال میں اُس کو لڑائی کی ضرورت نہیں پڑی اور ناصر الدین کو بنگال کا حاکم مقرر کر کے وہ واپس آگیا۔ دہلی کے قریب افغان پور میں وہ ٹھہرا ہوا تھا کہ مکان کی چھت گر گئی اور وہ دب کر مر گیا۔ بعض مورخوں نے جونا خاں پر یہ الزام لگایا ہے کہ اُس نے مکان اس طریقہ سے بنوایا تھا کہ وہ سلطان پر گر پڑے لیکن یہ الزام سراسر غلط ہے۔ مکان جلدی میں تیار ہوا تھا اور اُس کی بنیادیں گیلی تھیں۔ غیاث الدین نے وہاں ہاتھی دوڑانے کا حکم دیا۔ اُن کی دھمک سے بنیادیں ہل گئیں اور چھت گر پڑی۔

غیاث الدین تغلق نے تھوڑے دنوں کی حکومت میں بہت کچھ کیا۔ دکن کی ریاستوں کو فتح کر کے دوبارہ دہلی کی سلطنت میں شامل کیا۔ بنگال بھی دوبارہ فتح کیا۔ خزانہ۔ فوج

اور ملک کے انتظام کو باقاعدہ کیا۔ اُس کی ساری عمر لڑنے میں گذری تھی اور بحیثیت سپاہی کے ہی اُس نے شہرت بھی حاصل کی تھی۔ لیکن تخت پر بیٹھنے کے بعد اُس نے ثابت کر دیا کہ وہ انتظامی قابلیت بھی رکھتا تھا۔ خلجی بادشاہوں کے زمانہ میں اُس نے منگولوں کے خلاف بہت سی لڑائیاں لڑی تھیں اور اُن کو اکثر موقعوں پر شکستیں دی تھیں اسوجہ سے وہ غازی ملک کے نام سے مشہور تھا۔

محمد بن تغلق ۱۳۲۵-۱۳۵۱ء

غیاث الدین نے اپنے بڑے بیٹے فخر الدین جوناخاں کو اپنی زندگی ہی میں ولی عہد بنا دیا تھا چنانچہ اُس کے بعد وہ تخت پر بیٹھا۔ محمد بن تغلق میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ بہت بڑا عالم تھا۔ علم ریاضی اور علم ہیئت سے اُس کو خاص طور پر دلچسپی تھی۔ طب میں اُس نے خوب مہارت حاصل کی تھی اور بعض اوقات نسخے بھی تجویز کرتا تھا۔ وہ اسقدر خوش بیان تھا کہ سننے والوں کا اُس کی تقریر سے کبھی دل نہ گھبراتا تھا۔ وہ نہ شراب پیتا تھا اور نہ اس قسم کا کوئی اور عیب اس میں تھا۔ وہ مذہب (اسلام) کا بہت پابند تھا۔ لیکن تعصب سے پاک تھا۔ وہ نہایت منصف مزاج تھا اور ہر طرح سے کوشش کرتا تھا کہ رعایا کے ساتھ انصاف کرے۔ سلطنت کے کام کو بہت محنت سے کرتا تھا۔ لیکن اُس کی سب سے بڑی خوبی جو بعض لوگوں کی نظر میں ایک عیب کی حد تک پہنچ گئی تھی اُس کی فیاضی تھی۔ اُس کے انعامات اور بخششوں کے جو واقعات مورخوں نے بیان کئے ہیں اُن کو دیکھ کر یہ مشکل سے یقین ہوتا ہے کہ یہ تاریخی واقعات ہیں۔ شہزادگی کے زمانہ ہی میں وہ اسقدر بخشش کرتا تھا کہ اُس کا باپ اُس سے ناراض ہو گیا تھا اور تخت پر بیٹھنے کے بعد تو اُن میں بہت اضافہ ہو گیا۔ وہ لڑائی اور حکومت کے کام سے ناآشنا نہیں تھا۔ اپنے باپ کے عہد میں اور اُس سے پہلے بھی اُس کو فوجی انتظام اور لڑائیاں لڑنے کا کافی موقع ملا تھا۔ اسی طرح امورِ سلطنت

کا بھی اُس کو ذاتی تجربہ تھا کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے بنگال کے حملہ پر جاتے وقت غیاث الدین نے اسی کو اپنا نائب مقرر کیا تھا لیکن اتنی خوبیوں اور قابلیت کے باوجود بھی محمد بن تغلق ایک کامیاب بادشاہ نہ تھا۔ بعض مورخوں نے اُس کو ظالم بلکہ پاگل لکھا ہے، یہ بالکل غلط ہے اور ان مورخوں کی تنگ نظری کی دلیل ہے۔ بیشک یہ صحیح ہے کہ وہ سزائیں غیر معمولی طور پر سخت دیتا تھا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کو رعایا کے ساتھ بہت ہمدردی تھی اور اُس کی بہتری کے خیال سے اصلاحات جاری کرتا تھا لیکن اُس کی رعایا ان کی خوبیوں کو نہیں سمجھتی تھی۔ اور اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ سلطان کو اس پر غصہ آتا تھا اور پھر بہت سختی سے پیش آتا تھا۔ ان خرابیوں کا ایک حد تک سلطان بھی ذمہ دار ہے لیکن سارا الزام اُسی پر رکھ دینا مناسب نہیں۔

ابن بطوطہ سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں افریقہ کا مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا اور آٹھ سال تک اس ملک میں مقیم رہا۔ ابن بطوطہ قرون وسطی کا سب سے بڑا سیاح ہے۔ اُس نے اسلامی دنیا کے قریب قریب ہر مشہور ملک کی سیر کی اور وہاں کے واقعات لکھے ہیں۔ ہندوستان میں محمد بن تغلق نے اُس کی بہت خاطر کی۔ اُس کو روپیہ بھی دیا اور دہلی کا قاضی بھی مقرر کر دیا لیکن آخر میں سلطان اُس کی فضول خرچی اور قرض سے ناراض ہو گیا تھا اس لئے ابن بطوطہ یہاں سے کچھ خوش نہیں گیا اور اُس نے اپنی کتاب میں سلطان پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں مگر اُس کی بعض بعض خوبیوں کا بھی ذکر کرتا ہے ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ "یہ بادشاہ خونریزی اور جا بیجا سخاوت میں مشہور ہے کوئی دن خالی نہیں جاتا کہ کوئی فقیر امیر نہیں بن جاتا اور کوئی زندہ آدمی قتل نہیں کیا جاتا اس کی سخاوت اور شجاعت سختی اور خونریزی کی حکایت عوام الناس

کی زباں زد ہیں، اس کے باوجود میں نے کوئی شخص اس سے زیادہ متواضع اور منصف نہیں دیکھا۔ شریعت کا پابند ہے اور نماز کی بابت بڑی تاکید کرتا ہے اور منجملہ ان بادشاہوں کے ہے جن کی نیک بختی اور مبارک نفسی حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے۔" یہ الفاظ اُس شخص کے ہیں جو سلطان سے خوش نہ تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنا سفرنامہ وطن پہنچکر مرتب کیا تھا اور اُس کو اعتراض کرتے وقت کسی کا خوف نہیں تھا۔

دوآبہ میں لگان پر اضافہ

سب سے پہلا کام جو محمد بن تغلق نے کیا اور جس میں اُس کو ناکامیابی ہوئی وہ دوآبہ کے کاشتکاروں پر لگان کا بڑھانا تھا۔ سلطان علاء الدین نے بھی کاشتکاروں پر لگان زیادہ کر دیا تھا۔ لیکن اس کے بعد وہ کم ہو گیا تھا۔ محمد بن تغلق نے پھر بڑھا دیا۔ جس وقت لگان بڑھایا گیا تھا اُس وقت ملک کے اس حصہ میں قحط تھا کسانوں کو یہ بہت بُرا معلوم ہوا۔ یہ اتفاق کی بات تھی کہ خشک سالی کئی سال تک برابر رہی اور کسانوں کی حالت بہت خراب ہو گئی۔ سلطان کو جب یہ معلوم ہوا کہ خشک سالی کی وجہ سے کسانوں کی حالت بہت خراب ہے تو اُس نے اُن کو روپیہ بھی دیا اور کنوئیں کھدوائے لیکن لگان کے اضافے، قحط سالی اور سلطان کی سخت سزاؤں کی وجہ سے کسانوں کو بہت مصیبت اٹھانی پڑی۔

پائے تخت میں تبدیلی

دوسری اصلاح جو ناکامیاب رہی، پائے تخت کی تبدیلی تھی۔ اس کی مورخوں نے مختلف وجوہات بتلائی ہیں۔ ابن بطوطہ نے تو یہ لکھا ہے کہ دہلی کے باشندے گمنام خطوں میں گالیاں لکھکر سلطان کے محل میں ڈالدیتے تھے۔ وہ اس بات سے ناراض ہو گیا اور سزا کے طور پر دہلی کے لوگوں کو دکن جانے کا حکم دیا۔ یہ نہایت حماقت آمیز بات ہے

ابن بطوطہ خود تو یہاں موجود تھا نہیں۔ اُس نے سُنی سُنائی بات لکھدی ہے۔
ہمعصر تاریخوں کو غور سے پڑھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق دکن پر اپنی
حکومت اتنی ہی مضبوط کرنا چاہتا تھا جیسی کہ شمالی ہند میں تھی۔ اس کے علاوہ
اُس کی خواہش تھی کہ اسلام کا پیغام اور مسلمانوں کا تمدن ملک کے ہر حصّہ میں
پہنچ جائے اور اس غرض سے اُس نے بہت سے امرا، علما اور مشائخ کو دہلی سے
دیوگیر (دولت آباد) بھیجا اور خود بھی جاکر کچھ عرصہ کے لئے رہا۔ پایۂ تخت دہلی ہی تھا
لیکن بہت سے بااثر لوگ اور کاریگر وغیرہ دولت آباد بھیجدیے گئے تاکہ وہ جنوبی
ہند میں دولت آباد کو اُسی قدر شاندار اور عمدہ شہر بنادیں جیسے کہ شمالی ہند
میں دہلی تھا۔ دوسرے یہ کہ سلطان جانتا تھا کہ دکن میں اسلامی سلطنت کی
پائداری کے لئے یہ بہت ضروری تھا کہ وہاں کافی تعداد میں مسلمان ہوں جو دہلی
کی سلطنت سے ہمدردی رکھتے ہوں۔ یہی سبب تھا کہ محمد بن تغلق نے بڑی تعداد
میں دہلی کے بڑے بڑے علما اور مشائخ کو دکن مجبور کرکے بھیجا تھا اور دہلی میں چھوٹے
چھوٹے شہروں سے علماء کو بلایا تھا تاکہ وہ دارالسلطنت میں سکونت اختیار کریں۔

تانبے کا سکہ محمد بن تغلق نے سکوں میں بہت کچھ ردوبدل کیا اور اس
فن کے ماہروں کا خیال ہے کہ قرونِ وسطیٰ کے سکوں میں
اس کے سکے نہایت عمدہ ہیں۔ اُس کی مشہور اصلاحات میں سے ایک یہ تھی کہ
اُس نے تانبے کے سکے چلائے جن کی قیمت چاندی کے سکوں کی برابر تھی۔ یہ سکے
درحقیقت اُسی اصول پر چلائے گئے تھے جس اُصول پر آجکل نوٹ چلائے جاتے
ہیں۔ لیکن اُس زمانہ میں سکے ڈھالنے کی عمدہ مشینیں نہیں تھیں۔ چنانچہ جب لوگوں نے
دیکھا کہ تانبے کا سکہ چاندی کے سکے کی قیمت پر چلتا ہے تو اُنھوں نے بکثرت تانبے
کے سکے ڈھالنے شروع کردیے۔ ان جعلی سکوں میں اور سرکاری سکوں میں فرق

نہیں کیا جا سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد ملک میں اسقدر زیادہ ہوگئی کہ باہر کے سوداگروں نے تانبے کے سکے لینے سے انکار کر دیا۔ چونکہ سلطان کے دل میں کسی قسم کی بے ایمانی نہ تھی اس لئے اُس نے حکم دیا کہ اُس کے تانبے کے سکے واپس کر کے لوگ چاندی کے سکے لے جائیں۔ اس حکم کا نتیجہ ظاہر ہے کیا ہوا ہوگا۔ یہ سکے اتنی تعداد میں لوگ بدلنے کے لئے لائے کہ خزانہ کے سامنے سکوں کے پہاڑ لگ گئے اور بدلنا ناممکن ہو گیا۔ ان لالچی اور بے ایمان لوگوں کو سکوں کے لانے اور لے جانے کی مصیبت کے علاوہ اور کچھ ہاتھ نہیں آیا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ اپنی اس پریشانی کی ساری ذمہ داری سلطان پر ہی رکھتے تھے۔

خراسان اور تبت پر حملے محمد بن تغلق کی تخت نشینی کے وقت خراسان کی حالت نہایت خراب تھی۔ وہاں کا بادشاہ کم عمر تھا اور اُمرا نے اُس کی مخالفت شروع کر دی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ محمد بن تغلق کے دل میں خراسان فتح کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ اُس نے تین لاکھ ستر ہزار فوج جمع کی لیکن ایک سال کے اندر ہی حالات بدل گئے اور اُس کو یہ ارادہ چھوڑنا پڑا۔ اتنی بڑی فوج پر جو کچھ روپیہ خرچ ہوا تھا وہ سب بیکار ضائع ہوا۔

اکثر مورخوں نے لکھا ہے کہ محمد بن تغلق نے چین فتح کرنے کے لئے ایک فوج بھیجی اور وہ ناکامیاب ہوئی۔ یہ اُس کی غلطی تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُس نے چین پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ کسی سرکش پہاڑی سردار کے خلاف یہ فوج بھیجی تھی۔ شروع شروع میں یہ فوج فتوحات حاصل کرتی چلی گئی لیکن واپسی میں بارش کی وجہ سے تمام پہاڑی راستے بند ہو گئے اور پہاڑی لوگوں نے اوپر سے پتھر برسانے شروع کئے۔ تمام فوج اسی طرح ہلاک ہو گئی اور کہا جاتا ہے کہ صرف دس بارہ آدمی واپس آئے۔ سلطان کو اسقدر غصہ آیا کہ اُس نے اُن سب کو مروا ڈالا۔ مفصل حالات

پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد بن تغلق کی غلطی اتنی زیادہ نہیں تھی جتنی کہ آجکل کے مورخ بتلاتے ہیں خراسان کی فتح کا خیال وہاں کی خرابیوں کی وجہ سے آیا تھا اور جب وہ حالات دور ہوگئے تو اُس نے وہ خیال بھی چھوڑ دیا۔ لڑائی میں اکثر بہت فضول خرچی ہوتی ہے۔ محمد بن تغلق کی یہ تجویز کوئی غیر معمولی بات نہ تھی اور اس سلسلہ میں اس پر زیادہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ تبت کے حملے کے متعلق یہ غلط خیال ہے کہ چین فتح کرنے کی غرض سے کیا تھا۔ درحقیقت جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس حملہ کا مقصد کسی سرحدی سردار کو سزا دینا تھا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس مقصد میں وہ کامیاب ہوگیا تھا۔ لیکن واپسی میں فوجی افسروں کی بے احتیاطی اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے ساری فوج ہلاک ہوگئی۔

بغاوتیں اوپر جو حالات لکھے گئے ہیں اُن کو پڑھ کر تم کو یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ سلطان محمد بن تغلق کی نیت چاہے کتنی ہی اچھی ہو لیکن اُس کی اصلاحات کے نتائج اچھے نہ تھے اور رعایا کو اُن سے تکلیف ہی پہنچی۔ چنانچہ اُس کے آخر زمانہ میں ملک میں بغاوتیں شروع ہوگئیں اور ان بغاوتوں کا سلسلہ اُس کے مرتے وقت تک جاری رہا۔ سنہ ۱۳۳۵ء میں معبر کے گورنر نے بغاوت کی اور خود مختار ہو گیا۔ سنہ ۱۳۳۷ء میں اودھ اور سندھ میں بغاوتیں ہوئیں لیکن وہ فرو ہوگئیں۔ اسی زمانہ میں جنوبی دکن میں وجیانگر کی سلطنت قائم ہوئی۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ میں بھی سلطان کو باغیوں کے خلاف کئی سال تک لڑنا پڑا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم بغاوت دکن میں ہوئی جہاں باغی امیروں نے ایک نئی سلطنت قائم کی اور حسن بہمنی کو اپنا سلطان منتخب کیا اور اُس کے نام پر وہ سلطنت بھی بہمنی سلطنت کے نام سے مشہور ہے۔ محمد بن تغلق ان بغاوتوں کو فرو کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ٹھٹھہ میں بیمار ہو کر سنہ ۱۳۵۱ء میں اس جہاں سے رخصت ہوا۔

محمد بن تغلق اُن بدقسمت بادشاہوں میں سے ہے جن کے متعلق متعصب اور تنگ نظر مورخوں نے بہت سی غلط فہمیاں پھیلا دی ہیں۔ اُس کو ظالم، جابر اور پاگل لکھا ہے۔ حالانکہ وہ نہایت منصف مزاج۔ عالم اور جفاکش سلطان تھا۔ وہ رعایا کی بہبودی کے لئے تدبیریں سوچتا تھا اور قدرتی طور پر جب رعایا اس کی مخالفت کرتی تھی تو اُس کو غصہ آتا تھا اور سخت سزائیں دیتا تھا۔ اُس کے عہد کے حالات کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس بدقسمت سلطان میں بہت سی خوبیاں بھی تھیں اور اُس کی ناکامیابی کی ذمہ داری ایک حد تک دوسروں پر بھی ہے۔

باب ۲۵

سلطان فیروز شاہ تغلق اور اُس کے جانشین ۱۳۵۱ء-۱۴۱۴ء

فیروز تغلق کی تخت نشینی ۱۳۵۱ء-۱۳۸۸ء

سلطان محمد بن تغلق کی وفات پر اُس کا چچازاد بھائی فیروز تغلق تخت پر بیٹھا۔[۱] برنی نے لکھا ہے کہ فیروز کو سلطان نے اپنا ولی عہد خود مقرر کر دیا تھا۔ فیروز سلطان غیاث الدین کے چھوٹے بھائی رجب کا لڑکا تھا۔ اُس کی ماں ایک راجپوت سردار کی بیٹی تھی۔ وہ دہلی کا پہلا بادشاہ تھا جس کی رگوں میں ترکی اور راجپوت

[۱] محمد بن تغلق کا انتقال ۱۳۵۱ء میں ہوا تھا۔ فیروز اس وقت وہیں موجود تھا۔ دہلی میں وزیر سلطنت نے ایک لڑکے کو تخت پر بٹھا کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ محمد بن تغلق کا لڑکا ہے لیکن جب فیروز شاہ دہلی پہنچا تو بہ آسانی اُس نے تخت پر قبضہ کر لیا۔

خون کیا موجود تھا لیکن یہ تعجب معلوم ہوتا ہے کہ اُس میں ترکوں اور راجپوتوں کی بہت کم خصوصیات تھیں۔ وہ جنگ و جدل سے گھبراتا تھا اور امن و صلح پسند کرتا تھا۔ فیروز شاہ خود بھی عالم تھا اور علماء کی بہت عزت کرتا تھا۔ سلطنت کے معاملات میں وہ کوئی کام ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا جو شریعت کے خلاف ہو۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ رعایا کو ہر طرح کا آرام پہنچے اور اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے اُس نے بہت سے اچھے کام کئے۔

بنگال اور سندھ پر حملے

اگرچہ فیروز شاہ کو لڑائی کا شوق نہیں تھا، پھر بھی اُس کو کچھ لڑائیاں مجبوراً لڑنی پڑیں۔ محمد بن تغلق کے زمانہ میں دکن اور بنگال سلطنت دہلی سے علیحدہ ہوگئے تھے۔ فیروز نے دکن کے فتح کرنے کی کوشش ہی نہیں کی اور بہمنی سلطنت کی خود مختاری کو تسلیم کرلیا۔ بنگال پر اُس نے دو مرتبہ حملہ کیا۔ دونوں مرتبہ اگر وہ چاہتا تو بنگال کو اپنی سلطنت میں شامل کر سکتا تھا۔ لیکن اُس نے یہ نہیں کیا اور اس طرح سے بنگال میں بھی خود مختار سلطنت قائم ہوگئی۔ بنگال سے واپسی میں وہ جونپور ٹھہرا اور وہاں سے جاجنگر کی طرف روانہ ہوا۔ راجہ یہ خبر سُن کر کہ سلطان کی فوج قریب آگئی ہے بھاگ گیا۔ بعد میں آکر راجہ نے اطاعت قبول کرلی اور خراج دینے کا وعدہ کیا۔ نگر کوٹ کا قلعہ محمد بن تغلق کے عہد میں فتح ہوچکا تھا لیکن اب وہاں کا راجہ باغی ہوگیا تھا۔ فیروز تغلق نے اس قلعہ کا پھر محاصرہ کیا اور فتح کرلیا۔

سنہ ۱۳۷۱ء میں فیروز تغلق نے ایک بڑی فوج جمع کرکے سندھ پر حملہ کیا۔ جام نے بھی مقابلہ کے لئے تیاری کی۔ چنانچہ سلطان کو گجرات کی طرف جانا پڑا۔ وہاں اُس نے اپنی فوج وغیرہ درست کی اور پھر ٹھٹھہ کو روانہ ہوا۔ سندھیوں نے شاہ دہلی کی اطاعت قبول کرلی۔ جام کو فیروز شاہ اپنے ساتھ دہلی لے گیا اور

پنشن مقرر کردی اور اُس کے بھائی کو جام بنا دیا۔

فیروز شاہ کی اصلاحات اور ذاتی خوبیاں

سلطان فیروز شاہ نے ۱۳۸۸ء میں وفات پائی۔ اُس نے اپنے زمانہ حکومت میں بہت سی اصلاحات کیں جو قابل تعریف ہیں اور جن سے اُس کی رعایا کو بہت آرام ملا لیکن بعض کام اُس کے ایسے بھی تھے جو قیام سلطنت کے لئے مضر ثابت ہوئے۔ اُس نے غلاموں کی تعداد بہت بڑھالی تھی۔ آخر میں اُس کے پاس ایک لاکھ اسی ہزار غلام تھے۔ ان میں سے بہت سے کارخانوں میں مختلف کام سیکھتے تھے اور جو ذہین اور قابل تھے اُن کو تعلیم دی جاتی تھی بعض بعض تعلیم پاکر بہت ترقی کر گئے۔ سلطان نے ان کے انتظام اور دیکھ بھال کے لئے ایک نیا محکمہ کھول دیا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ لوگ سلطنت کے لیے بہت زیادہ مفید ثابت نہیں ہوئے اور مرکزی حکومت کے کمزور ہوجانے پر سلطنت دہلی کو اُن کی ذات سے بہت نقصان پہنچا۔

جاگیریں دینے کا رواج سلطان علاء الدین خلجی کے زمانہ میں بند ہو گیا تھا۔ فیروز شاہ نے اُس کو پھر جاری کیا۔ یہ جاگیردار جو اُس کے بنائے ہوئے تھے اس کے عہد حکومت میں تو مطیع اور فرماں بردار رہے۔ لیکن اُس کے کمزور جانشینوں کے زمانہ میں اُنھوں نے خود مختار ریاستیں قائم کرنا شروع کر دیں۔ اسی بنا پر مورخوں کا خیال ہے کہ سلطان فیروز شاہ بھی ایک حد تک سلطنت دہلی کے زوال کا ذمہ دار ہے۔

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ سلطان نے رفاہ عام کے لئے بہت سے کام کئے۔ اُس نے خود فتوحاتِ فیروز شاہی میں ان کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم نہریں تھیں۔ مورخوں نے اُس کی بنوائی ہوئی چار بڑی نہروں کے نام لکھے ہیں۔ اُسکو

غریب اور مفلس رعایا کا بہت زیادہ خیال تھا چنانچہ نادار لوگوں کی امداد کے لیے دیوان خیرات قائم کیا گیا تھا۔ مسافروں کی دیکھ بھال اور اُن کو آرام پہنچانے کا انتظام بھی حکومت کی طرف سے تھا۔ محمد بن تغلق کی طرح فیروز کو بھی طب سے بہت دلچسپی تھی اور دہلی میں اُس نے دارالشفا قائم کیا تھا جہاں غریبوں کو دوا مفت دی جاتی تھی۔

سلطان کو عمارتیں بنوانے اور باغ لگوانے کا بہت شوق تھا۔ غالباً مغلوں سے پہلے دہلی کے کسی بادشاہ کو فن تعمیر سے اسقدر دلچسپی نہیں تھی جیسی کہ فیروز کو تھی۔ اُس نے کئی شہروں کی بنیاد ڈالی جن میں فیروز آباد۔ فتح آباد اور جونپور اسوقت تک موجود ہیں۔ جون پور کا نام محمد بن تغلق کے نام پر رکھا گیا تھا۔ دہلی کے قرب وجوار میں اُس نے بارہ سو نئے باغ لگوائے اور بہت سے پُرانے باغوں کی مرمّت کرائی۔ اُس کی بنوائی ہوئی کئی عمارتیں موجود ہیں۔ فیروز شاہ کے کوٹلہ کے کھنڈرات اور اشوک کی لاٹ خاص طور پر قابل دید ہیں۔ یہ لاٹ بہت دور سے اور بڑے اہتمام کے ساتھ لائی گئی تھی۔

فیروز شاہ نہایت رحمدل اور منصف مزاج بادشاہ تھا۔ وہ پکا مسلمان تھا اور اسی بنا پر بعض لوگوں نے اُس کو تنگ نظر اور متعصب کہا ہے وہ علم کی سرپرستی کرتا تھا اور علما اور مشائخ پر بہت مہربان تھا۔ علم کو ترقی دینے کے لیے اُس نے بہت سے کالج اور مدرسے کھلوائے تھے۔ ان حالات کو پڑھ کر جو اختصار کے ساتھ اوپر بیان کیے گئے ہیں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سلطان فیروز شاہ کی اصلاحات سے رعایا کو آرام بھی پہنچا اور ملک نے ترقی بھی کی اور اس لحاظ سے وہ تعریف کا مستحق ہے۔

فیروز شاہ کے جانشین | فیروز شاہ کے بعد اُس کا پوتا غیاث الدین

تغلق ثانی تخت پر بیٹھا لیکن اس میں حکومت کرنے کی قابلیت نہ تھی اور چار پانچ مہینہ بعد وہ قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد فیروز شاہ کی اولاد میں تخت کے لئے کئی سال تک لڑائی رہی اور کئی بادشاہ تخت پر بیٹھے اور مارے گئے۔ آخر میں اس کا پوتا سلطان محمود تخت پر بیٹھا اور باوجود اپنی کمزوریوں اور ناقابلیت کے وہ ایک عرصہ تک سلطنت کرتا رہا۔ اس زمانہ میں سلطنت برابر کمزور ہوتی گئی۔ دوآبہ کے زمینداروں اور میواتیوں نے دہلی کے قریب ہی بغاوتیں شروع کر دیں۔ جونپور، مالوہ، گجرات اور خاندیس میں خود مختار سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ دہلی میں خانہ جنگی کا سلسلہ جاری تھا کہ سنہ ۱۳۹۷ء کے آخر میں خبر آئی کہ تیمور نے سندھ ندی کو پار کر کے اُچہ کا محاصرہ کر لیا ہے۔

تیمور کا حملہ

تیمور سنہ ۱۳۳۶ء میں سمرقند کے قریب ایک چھوٹے سے قصبہ میں پیدا ہوا تھا۔ وہ ایک ترک امیر کا لڑکا تھا اور ۳۳ سال کی عمر میں چغتائی نسل کے ترکوں کا سردار ہو گیا اور بہت جلد اپنی فوجی طاقت بڑھائی۔ سب سے پہلے اُس نے ایران اور اُس کے قرب و جوار کے ممالک فتح کئے۔ پھر ہندوستان کی طرف رُخ کیا اور شمال و مغرب کے پہاڑی راستوں سے گذر کر اس ملک میں داخل ہوا۔ چنگیز خاں کی طرح تیمور بھی ایشیا کا بہت بڑا فاتح گذرا ہے اور اُس کی برابر تو نہیں لیکن اُس کی طرح جنگجو اور سخت مزاج تھا۔ یہ لوگ اب مسلمان ہو گئے تھے مگر پھر بھی اُن میں نسلی خصوصیات بہت حد تک باقی تھیں۔ تیمور نے راستہ میں بہت سے شہروں پر قبضہ کیا اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ یہاں تک کہ جس وقت وہ دہلی کے قریب پہنچا ہے تو اُس کے پاس ایک لاکھ قیدی تھے۔ لڑائی سے پہلے ان بدقسمت قیدیوں کو قتل کر دیا گیا۔ لڑائی میں دہلی کی فوج کو شکست ہوئی اور سلطان محمود تغلق

گجرات کی طرف بھاگ گیا۔ تیمور نے شہر پر قبضہ کرلیا اور سربرآوردہ لوگوں کی درخواست پر شہر والوں کو معاف بھی کر دیا لیکن اُس کے سپاہیوں اور شہر کے باشندوں میں کچھ جھگڑا ہوا جس میں اُس کے سپاہی مارے گئے۔ اس پر اُس نے شہر کے لوٹنے کا حکم دیدیا۔ چنانچہ اُس کے سپاہیوں نے کئی روز تک ہزاروں آدمیوں کو قتل کیا اور شہر کو خوب لوٹا۔ تیمور یہاں زیادہ عرصہ نہ ٹھہرا واپسی پر وہ اپنے ہمراہ بہت سے معماروں اور دوسرے کاریگروں کو لے گیا کیونکہ وہ سمرقند میں ایک مسجد تعمیر کرانا چاہتا تھا۔

دہلی سے تیمور میرٹھ آیا اور اُس کو فتح کرکے آگے چلا گیا۔ راستہ میں جموں کے راجہ کو مطیع کیا اور کھوکھروں کے ملک کو تباہ کرتا ہوا سمرقند لوٹ گیا۔ جاتے وقت خضر خاں کو جو اس زمانہ میں ایک معزز امیر تھا لاہور، ملتان اور دیپال پور شیر دکر دئے۔ تیمور کے واپس جانے کے بعد دہلی والوں کو اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کھیتی سب برباد ہو گئی تھی اور قحط پڑنے لگا تھا۔ وبا سے بھی بہت لوگ مر گئے اور ڈاکوؤں اور چوروں کی کثرت ہو گئی۔ نصرت خاں نے تخت پر قبضہ کرلیا تھا لیکن کچھ دنوں کے بعد سلطان محمود تغلق واپس آیا اور تخت چھین لیا۔ سنہ ۱۴۱۲ء میں وہ بھی مر گیا اور امیروں نے دولت خاں کو تخت پر بٹھایا لیکن تیمور کے نائب خضر خاں نے سنہ ۱۴۱۴ء میں دہلی کا محاصرہ کرکے فتح کرلیا اور ایک نئے خاندان کی بنیاد ڈالی۔

باب ۲۶

سید اور لودی خاندان

سید خاندان ۱۴۱۴ - ۱۴۵۱ء خضر خاں سید تھا اس لئے اس خاندان کو سید خاندان کہتے ہیں وہ تخت کا مالک ضرور تھا لیکن اُس کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ علانیہ طور پر سلطان کا لقب اختیار کرتا بلکہ اپنے تئیں تیمور کا نائب ہی کہتا تھا خطبہ میں بھی تیمور اور اُس کے بعد اُس کے جانشین شاہ رُخ کا نام پڑھا جاتا تھا۔ خراج بھی اکثر سمر قند بھیجا جاتا تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کم از کم خضر خاں کے زمانہ تک دہلی کی سلطنت دربار سمرقند کی ماتحت تھی۔ اُس کے زمانہ میں ملک میں بغاوتیں ہوئیں اور اُس کی حکومت کا کافی حصہ ان بغاوتوں کے فرو کرنے میں ختم ہو گیا اور وہ کوئی اور بڑا کام نہیں کر سکا۔ ہمعصر موٴرخوں نے خضر خاں کی بہت تعریف کی ہے۔

سنہ ۱۴۲۱ء میں اُس کے مرنے پر اُس کا بیٹا مبارک شاہ تخت پر بیٹھا۔ اُس کے زمانہ میں بھی بغاوتوں کا سلسلہ جاری رہا اور اُس کا سارا وقت بھی ان کے فرو کرنے میں ضائع ہوا۔ اُس نے یہ کوشش کی تھی کہ انتظام کو بہتر بنایا جائے اور کچھ اصلاحات کی جائیں لیکن اُمرا اُس کے مخالف ہو گئے اور سنہ ۱۴۳۴ء میں اُسکو قتل کر دیا۔ مبارک شاہ کے جانشین محمد شاہ کے عہد میں گوالیار کے راجہ نے خراج دینا بند کر دیا اور مالوہ کے بادشاہ محمود خلجی نے بھی حملہ کیا لیکن اُس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ بہلول خاں لودی نے جو لاہور اور سرہند کا گورنر تھا مبارک شاہ کی

بہت مدد کی تھی چنانچہ مبارک شاہ نے اُس کو اپنا بیٹا بنایا اور خانخاناں کا خطاب بھی دیا۔ مبارک شاہ کے جانشین علاء الدین عالم شاہ کے زمانہ میں بہلول لودی نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ عالم خاں نہایت کمزور نا قابل بادشاہ تھا۔ اُس نے دہلی کی بجائے بدایوں میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ اس لئے بہلول لودی کا کام اور بھی آسان ہو گیا۔ علاء الدین ۱۴۷۶ء تک زندہ رہا لیکن بہلول لودی نے ۱۴۵۱ء ہی میں اپنی بادشاہی کا اعلان کر دیا تھا۔

بہلول لودی ۱۴۵۱ - ۱۴۸۵ء

لودی افغانوں کے ایک قبیلے کا نام ہے اور اُن کی قائم کی ہوئی سلطنت دہلی میں پہلی افغان سلطنت[1] تھی۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد بہلول نے حمید خاں وزیر کو جس کی مدد سے اس نے دہلی پر قبضہ کیا تھا گرفتار کر لیا۔ اسوقت بہلول کی حکومت بہت مختصر علاقے پر تھی کیونکہ سلطنت کے اکثر حصے خود مختار ہو گئے تھے۔ لیکن اُس کا سب سے زبردست دشمن شاہ جون پور تھا کیونکہ اُس کی خواہش تھی کہ دہلی کو بھی فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لے۔ بہلول پنجاب کی طرف گیا ہوا تھا کہ محمود شاہ شرقی نے حملہ کیا اس پر وہ فوراً واپس آیا اور اُس کو شکست دی۔ اس سے بہلول کا اثر بہت بڑھ گیا اور قریب قریب کی کئی چھوٹی ریاستوں کو اُس نے آسانی سے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مگر جون پور سے لڑائی کا سلسلہ جاری رہا۔ جون پور کا سلطان حسین شاہ نہایت قابل تھا۔ اُس نے فوج اکٹھا کر کے دہلی پر حملہ کیا لیکن فریقین میں صلح ہو گئی۔ جب حسین شاہ واپس ہو رہا تھا تو پیچھے سے بہلول نے حملہ کر دیا۔ آخر کار یہ طے پایا کہ دریائے گنگا کے شرق کی جانب

---

[1] سیدوں سے پہلے دہلی کے بادشاہ ترک تھے بعض مورخوں نے غلطی سے دہلی کے سب شاہی خاندانوں کو افغان سمجھ کر سلطنت دہلی کو افغان سلطنت لکھا ہے۔

ملک جونپور کے سلطان کا ہوگا اور دوسری طرف کا حصہ سلطان دہلی کے قبضہ میں رہیگا۔ لیکن پھر دونوں میں لڑائی شروع ہوگئی۔ حسین شاہ کو شکست ہوئی اور بہلول نے جون پور پر بھی قبضہ کرلیا۔ جون پور کی فتح سے بہلول کو بہت فائدہ ہوا اور اُس کی سلطنت بہت وسیع ہوگئی۔ اب اُس نے کالپی اور دھولپور وغیرہ کے سرداروں کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اسی زمانہ میں جب کہ وہ گوالیار کے راجہ کو سزا دیکر واپس ہو رہا تھا تو راستہ میں بیمار پڑا اور مر گیا۔

سلطان بہلول لودی میں بہت سی ذاتی خوبیاں تھیں۔ وہ نہایت رحم دل، بہادر اور فیاض تھا۔ وہ اپنے سرداروں کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرتا تھا اور اُن کی بہت عزت کرتا تھا۔ اُس میں تصنع بالکل نہیں تھا اور وہ شان وشوکت کو پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ خود تو عالم نہیں تھا لیکن عالموں کی عزت اور قدر کرتا تھا جس وقت وہ تخت دہلی پر بیٹھا تھا تو ملک کی حالت بہت خراب تھی۔ چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں اور دہلی کے بادشاہ کی سلطنت اور وقار میں بہت کمی آگئی تھی۔ بہلول نے بہت سی ریاستوں کو دوبارہ اپنی سلطنت میں شامل کرلیا اُس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے جون پور کی خودمختار سلطنت کو فتح کرکے سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہلول نے دہلی کی سلطنت کو بربادی سے بچا لیا۔

سکندر لودی
۱۴۸۹-۱۵۱۷ء

بہلول لودی کے بعد اُس کا لڑکا سکندر لودی تخت پر بیٹھا سلطان حسین شرقی اس وقت تک زندہ تھا اور اپنی سلطنت کے مشرقی حصوں پر قابض تھا۔ اب وہ ایک بڑی فوج لے کر روانہ ہوا۔ بنارس کے قریب سکندر سے لڑائی ہوئی جس میں

حسین شاہ نے شکست کھائی اور بھاگ گیا۔ اس فتح کے بعد جون پور کی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ اب سکندر نے افغان امیروں اور سرداروں کی طرف توجہ کی۔ اُن لوگوں کے حسابات دیکھے گئے تو معلوم ہوا کہ بہت غلطیاں ہیں۔ سلطان نے اس معاملہ میں بہت سختی کی اور امیروں نے سلطان کے خلاف سازش کی لیکن اُن کو کامیابی نہیں ہوئی۔ ۱۵۰۴ء میں سکندر نے آگرہ کی بنیاد ڈالی اور اُسی کو پایۂ تخت بنایا تاکہ اٹاوہ دھولپور وغیرہ کے سرکش جاگیرداروں کی خوبی نگرانی ہو سکے۔ دوسرے ہی سال آگرہ میں اسقدر زبردست زلزلہ آیا کہ لوگوں کو خیال ہوا کہ قیامت آگئی۔ اس میں بہت سی عمارتیں گر گئیں اور آدمی ہلاک ہو گئے۔ سلطان سکندر کو راجپوتوں سے بھی لڑنا پڑا۔ اُس نے رنتھمبور کا محاصرہ کر کے اُس کو فتح کیا اور گوالیار پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا کہ بیمار پڑا اور مر گیا۔

سکندر لودی خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ اُس نے افغان سرداروں کو پورے طور سے اپنے قابو میں کر لیا تھا اور اُن پر اُس کا بہت اثر تھا۔ وہ اپنے مذہب میں بہت پکا تھا اور ہندوؤں کے ساتھ سختی کرتا تھا۔ وہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھا اور رعایا کی شکایتوں کو خود سُنتا اور اُن کو دور کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ خود بھی پڑھا لکھا تھا اور عالموں کی صحبت پسند کرتا تھا۔ بیہودہ اور نالایق لوگوں کو اپنے پاس تک نہیں آنے دیتا تھا۔ سکندر اپنی قابلیت اور ہوشیاری کی وجہ سے افغان سرداروں کو قابو میں رکھتا تھا لیکن جب اُس کے بعد ایک کمزور سلطان تخت پر بیٹھا تو جھگڑے شروع ہو گئے جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکندر کی وفات کے دس سال کے اندر ہی سلطنت دہلی افغانوں کے ہاتھ سے نکل کر مغلوں کے ہاتھ میں آگئی۔

ابراہیم لودی ۱۵۱۷-۱۵۲۶ء

سکندر کا بیٹا اور جانشین ابراہیم لودی اپنے باپ اور دادا کی طرح قابل اور ہوشیار نہ تھا۔ وہ کم عمر ناتجربہ کار اور مغرور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ دربار میں افغان اُمرا ہاتھ باندھ کر سلطان کے سامنے کھڑے ہوں، لیکن ان امیروں کو بادشاہ سے برابری کے برتاؤ کی عادت تھی، لہٰذا یہ بات اُن کو ناگوار ہوئی۔ سلطان نے نافرمان امیروں کو قید کر لیا۔ انہوں نے بھی بغاوتیں اور سازشیں کرنا شروع کر دیں پہلے اُس کے بھائی جلال خاں نے بغاوت کی۔ اس کے بعد پنجاب کے گورنر دولت خاں لودی نے بابر کو لکھا کہ ہندوستان پر حملہ کرے۔ بابر اس وقت کابل کا بادشاہ تھا۔ اُس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور ہندوستان پر حملے شروع کر دئے یہاں تک کہ ۱۵۲۶ء میں پانی پت کی لڑائی میں ابراہیم قتل ہو گیا اور سلطنت مغلوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

سلطنت دہلی کے زوال کے اسباب

دہلی کی سلطنت ڈیڑھ سو برس تک برابر ترقی کرتی رہی اور محمد بن تغلق کے زمانہ میں عروج پر پہنچی لیکن اُس کی حکومت کے آخری دنوں میں سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔ اُس کی ذمہ داری کسی حد تک محمد بن تغلق پر ہے۔ اُس کی تجویزیں ناکامیاب ثابت ہوئیں۔ رعایا کو اُن کی وجہ سے سخت تکلیف ہوئی اور ملک میں بغاوت ہونے لگی۔ چنانچہ اُس کے مرنے سے پہلے دکن بنگال اور سندھ میں خودمختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اُس کا جانشین سلطان فیروز شاہ دکن اور بنگال کی نئی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں دوبارہ شامل نہ کر سکا اور اُن کی خودمختاری تسلیم کر لی گئی۔ اس کے علاوہ فیروز شاہ نے دو کام ایسے کئے جن کا اثر سلطنت پر بہت بُرا ہوا۔ ایک تو یہ کہ اُس نے جاگیریں دینے کی رسم کو دوبارہ جاری کیا اور دوسرے یہ کہ غلاموں کی

تعداد بہت بڑھالی ۔ بڑے بڑے جاگیردار اکثر بغاوت کرکے خود مختار ہو جایا کرتے تھے ۔ اسی بنا پر علاء الدین خلجی نے اس سلسلہ کو بند کر دیا تھا۔ مگر فیروز شاہ نے اُس کو پھر جاری کر دیا اور غلاموں کی تعداد بھی بہت زیادہ بڑھالی اُس کے دربار میں ایک لاکھ اسّی ہزار غلام تھے اُن میں سے بعض نہایت قابل تھے اور فیروز شاہ کو اُن پر بہت اعتبار تھا۔ اُس کے زمانہ میں تو یہ لوگ بہت وفادار اور مطیع رہے لیکن اس کے بعد وہ مختار ہو گئے۔ محمد بن تغلق اور فیروز شاہ کی ان اصطلاحات کے علاوہ اور چند باتیں بھی یاد رکھنے کے قابل ہیں سب سے زیادہ یہ کہ فیروز شاہ کے جانشین بہت نالایق اور کمزور تھے وہ سلطنت کے معاملات کو نہیں سنبھال سکے اور رفتہ رفتہ وہ کمزور ہوتی گئی ۔ اسی زمانہ میں تیمور نے حملہ کیا قتل و غارت ۔ لوٹ مار اور وبائی بیماریوں سے تمام ملک کی حالت ابتر ہوگئی اور لوگوں کے دلوں سے حکومت کا رعب بالکل جاتا رہا۔ تغلق خاندان کے بعد سید خاندان کے بادشاہ بھی اتنے قابل نہ تھے کہ سلطنت کی بگڑی ہوئی حالت کو بہتر کر سکتے۔ بہلول اور سکندر لودی نے بیشک بہت کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب سے لے کر بہار تک سارا ملک دوبارہ دہلی کی سلطنت میں شامل ہو گیا مگر ابراہیم لودی کے غرور اور سختی کو اُمرا برداشت نہ کر سکے اور اُن میں سے ایک نے بابر کو بلا لیا ۔ ترکوں پر ہندوستان کی دولت اور آب و ہوا کا کافی اثر ہو چکا تھا اور اب اُن میں وہ ہمت اور بہادری باقی نہ تھی جو اُن کی پہلی نسلوں میں تھی اور جس کی وجہ سے اُنھوں نے راجپوت جیسی بہادر قوم کے مقابلہ میں شاندار فتوحات حاصل کی تھیں۔

باب ۲۷

نئی خود مختار ریاستیں

بنگال بنگال سلطنت دہلی کے بڑے صوبوں میں سے ایک تھا۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں یہاں بغاوت ہوئی اور ایک نئی حکومت قائم ہوگئی۔ اُس کے بعد فیروز تغلق نے اپنے عہد میں بنگال پر دو مرتبہ حملہ کیا لیکن آخرکار صوبہ خود مختار ہو ہی گیا۔ یہاں کے بادشاہوں نے دہلی کو خراج دینا ہی بند نہیں کردیا بلکہ خطبے اور سکے میں بھی اپنا نام رکھوایا۔ سلاطین بنگال میں حسین شاہ اور اُس کا بیٹا نصرت شاہ بہت مشہور بادشاہ ہوئے ہیں۔ حسین شاہ نے ۱۴۹۳ء سے ۱۵۱۹ء تک حکومت کی۔ جون پور کے حاکم حسین شاہ شرقی نے لودیوں سے شکست کھانے کے بعد بنگال میں اسی بادشاہ کے پاس پناہ لی تھی۔ حسین شاہ نے اپنے ہمنام اور مصیبت زدہ مہمان کی بہت خاطر کی اور اُس کی پنشن مقرر کردی۔ حسین شاہ کے عہد میں سلطنت بنگال کا انتظام بہت معقول تھا۔ اُڑیسہ کے راجہ اُس کو خراج دیتے تھے۔ حسین شاہ کو اپنی رعایا کی خوش حالی اور آرام کی بہت فکر تھی۔ اس نے بہت سی مسجدیں اور شفاخانے وغیرہ تعمیر کرائے۔ حسین شاہ کے اٹھارہ بیٹے تھے اُن میں سب سے زیادہ قابل نصرت شاہ تھا جو اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ نصرت شاہ کے تعلقات سلطان ابراہیم لودی کے ساتھ اچھے نہ تھے۔ بابر نے جب ہندوستان فتح کرلیا تو نصرت شاہ نے اُس کو بہت سے تحفے بھیجے۔ بنگال

کی خود مختار حکومت کا خاتمہ شیر شاہ کے عہد میں ہوا اور ۱۵۷۶ء تک جبکہ اکبر نے اُس کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ بنگال میں افغانوں ہی کی حکومت رہی۔ اس زمانہ میں تاریخ بنگال کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بہت سے ہندو اور مسلمان مذہبی پیشوا ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے دونوں مذہبوں کا فرق دور کرنے اور اُن کو ملانے کی کوشش کی۔

جون پور یہ شہر فیروز تغلق نے اپنے چچازاد بھائی فخر الدین جوناخاں یعنی سلطان محمد بن تغلق کے نام پر بسایا تھا۔ فیروز تغلق کے بعد خواجہ جہاں جون پور کا حاکم مقرر ہوا۔ ۱۳۹۴ء میں سلطان محمود تغلق نے اُس کو ملک الشرق کا خطاب عطا کیا۔ چنانچہ اسوقت سے سلطنت جونپور شرقی سلطنت کے نام سے مشہور ہو گئی۔ تیمور کے حملہ کے بعد خواجہ جہاں خود مختار ہو گیا۔ شاہان جون پور میں سلطان ابراہیم کا نام بہت مشہور ہے۔ اس کے عہد میں جون پور علم کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ تیمور کے حملے کے بعد دہلی کی حالت ابتر ہو گئی تھی اور بہت سے اہل علم اور اہل کمال وہاں سے بھاگ کر جون پور آ گئے تھے۔ انہیں لوگوں کی بدولت یہ شہر علوم و فنون کے لحاظ سے ہندوستان کے بہترین شہروں میں شمار کیا جانے لگا۔ جون پور کی اٹالہ مسجد آج تک اُس زمانہ کی یادگار موجود ہے۔ جون پور کے بادشاہوں کو سلاطین دہلی کا ایک عرصہ تک مقابلہ کرنا پڑا اور بالآخر اُن کا ملک فتح ہوا اور لودیوں کی سلطنت میں شامل ہو گیا۔

مالوہ تغلقوں کے آخر زمانہ میں جب اُن کی سلطنت کا زوال شروع ہوا اور ملک کے نظام میں ابتری پھیل گئی تو فیروز تغلق کے جاگیردار دلاور خاں نے مالوہ میں ۱۴۰۱ء میں ایک خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی اور دھار کو اپنا پایۂ تخت بنایا۔ دلاور خاں کے بعد ہوشنگ تخت پر بیٹھا اُس نے بجائے دھار

کے مانڈو کو پایۂ تخت قرار دیا۔ سلاطین مالوہ کو دہلی، جون پور اور گجرات کے
بادشاہوں سے لڑنا پڑا اور اُن میں اتنی قوت نہ تھی کہ ان کا مقابلہ کامیابی کے
ساتھ کر سکتے۔ ہوشنگ نے گجراتیوں کے مقابلہ پر شکست کھائی اور گرفتار ہو گیا لیکن
بعد میں رہا کر دیا گیا۔ ہوشنگ کا لڑکا غزنی خاں آرام طلب اور عیش پرست تھا چنانچہ
اُس کے وزیر محمود خلجی نے اُس کو مروا ڈالا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔ اُس کے عہد میں
سلطنت مالوہ نے بہت ترقی کی۔ محمود ایک بہادر سپاہی کی زندگی بسر کرتا
تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی ساری عمر کیمپ میں گذری۔ فرشتہ کا قول ہے کہ
سلطان محمود ایک مہذب بہادر منصف مزاج اور عالم آدمی تھا اور اُس کے
عہد میں ہندو اور مسلمان دونوں خوش حال تھے اور اُن کے آپس کے تعلقات خوشگوار
تھے۔ اُس نے اپنی سلطنت کو بہت بڑھا لیا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۴۴۰ء میں دہلی پر حملہ
کرنے کی بھی تیاری کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ چیتوڑ کے رانا سے بھی اُس کی لڑائی
ہوئی اس لڑائی میں دونوں فریق کہتے تھے کہ اُن کو کامیابی ہوئی ہے۔ چنانچہ رانا
کنبھ نے اپنی فتح کی یادگار ایک مینار کی شکل میں قائم کی اور سلطان محمود خلجی نے بھی
مانڈو میں ایک ہفت منزلہ مینار بنوایا۔ ۱۴۶۹ء میں محمود نے وفات پائی۔ محمود
کا بیٹا اور جانشین غیاث الدین تھا جس کو اُس کے بیٹے ناصر الدین نے زہر
دلوا دیا۔ ناصر الدین کے بعد محمود دوئم بادشاہ ہوا۔ اُس کے زمانہ میں راجپوتوں
کا اثر مالوہ میں بہت زیادہ بڑھ گیا۔ ۱۵۳۱ء میں گجرات کے بادشاہ سلطان بہادر
شاہ نے سلطان مالوہ اور اُس کے خاندان کے لوگوں کو قتل کروا دیا اور سلطنت
مالوہ کو گجرات میں شامل کر لیا۔ چار سال بعد ہمایوں نے بہادر شاہ کو مانڈسور پہ
شکست دی اور مالوہ فتح کر لیا۔ جب سلطنت دہلی پر شیر شاہ کا قبضہ ہوا
تو اُس نے شجاعت خاں کو مالوہ کا حاکم مقرر کیا۔ شجاعت خاں کے بیٹے باز بہادر

کے عہد میں اکبر کے سرداروں نے مالوہ پر حملہ کیا اور اُس کو سلطنت مغلیہ میں شامل کر لیا۔

گجرات

گجرات بڑا زرخیز ملک ہے اور یہاں اچھے اچھے بندرگاہ ہیں جن کے ذریعہ سے دوسرے ملکوں سے تجارت ہوتی ہے۔ جس طرح تیمور کے حملے کے بعد مالوہ کے حاکم نے خودمختار سلطنت قائم کر لی تھی اسی طرح گجرات میں بھی فیروز شاہ کے بعد اُس کے جاگیردار ظفر خاں نے ۱۴۰۱ء میں خودمختار حکومت کی بنیاد رکھی۔ گجرات کے بادشاہوں میں احمد شاہ بہت مشہور ہے۔ وہ ایک بہادر اور جنگجو سپاہی ہونے کے علاوہ ایک ہوشیار اور منصف مزاج حاکم تھا۔ اُس نے اپنے زمانہ میں سلطنت گجرات کو بہت وسیع کر لیا۔ وہ نہایت خوش اعتقاد اور جوشیلا مسلمان تھا اس کی منصف مزاجی کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کو جب معلوم ہوا کہ اُس کے ایک بہت قریبی عزیز نے ایک بے گناہ کو مروا ڈالا ہے تو اُس نے فوراً حکم دیا کہ اس بے رحم شخص کو بر سر بازار سزائے موت دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُس کی زندگی میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کو غریب اور بیکسوں پر ظلم کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ گجرات کا مشہور شہر احمد آباد اسی بادشاہ کا بسایا ہوا ہے۔

گجرات کے بادشاہوں میں محمود بیگڑہ سب سے بڑا بادشاہ خیال کیا جاتا ہے اُس نے باون برس ۱۴۵۸ء-۱۵۱۱ء تک بڑی شان اور کامیابی کے ساتھ حکومت کی وہ بہادر، منصف مزاج، رحمدل اور فیاض تھا۔ وہ اسلام کا سچا پیرو تھا اور اپنی خوبیوں کے لئے مشہور تھا۔ اُس کی خوراک بہت زیادہ تھی۔ دن بھر میں وہ ایک گجراتی من کھانا کھا لیتا تھا جو آجکل کے حساب سے ۱۸ یا ۱۹ سیر ہوگا۔ اس کے علاوہ سوتے وقت پانچ سیر اُبلے ہوئے چاول اپنے پلنگ کے دونوں طرف رکھوا لیتا تھا

تاکہ جس وقت بھی آنکھ کھلے تو فوراً کھالے اور سو جائے۔ صبح کو ناشتہ میں بعد نماز وہ ایک پیالہ شہد، ایک پیالہ مکھن اور سو یا ڈیڑھ سو کیلے کھاتا تھا۔ وہ خود کہا کرتا تھا کہ اگر خداوند کریم مجھ کو بادشاہ نہ بناتا تو میری خوراک کا کیسے انتظام ہوتا؟ محمود کے آخر عہد میں پرتگیزوں سے لڑائی شروع ہو گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرتگیزوں نے اپنی سلطنت ہندوستان کے ساحل کے بعض شہروں پر قائم کر لی۔ شاہان گجرات میں بہادر شاہ بھی قابل ذکر ہے۔ اُس نے مانڈو اور چندیری کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور چتوڑ پر بھی حملہ کیا لیکن ہمایوں نے اُس کو شکست دے کر گجرات سے باہر نکال دیا۔ بہادر شاہ بہت دلیر بادشاہ تھا۔ اُس نے مغلوں سے اپنا ملک واپس لے لیا اور پرتگیزوں کو بھی وہاں سے نکالنے کی تدبیر کی۔ اس پر پرتگیز اُس کے مخالف ہو گئے اور دھوکا دیکر اس کو اپنے جہاز پر بلایا اور سمندر میں ڈبو دیا۔ بہادر شاہ کے بعد گجرات کی حالت خراب ہوتی گئی یہاں تک کہ ۱۵۷۲ء میں اکبر نے اُس پر حملہ کیا اور فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

خاندیش خاندیش میں بھی فیروز تغلق کی وفات کے بعد اُس کے ایک سردار نے خود مختار حکومت قائم کی۔ اس سردار کا نام ملک راجہ تھا۔ وہ ایک قابل، تجربہ کار اور بلند حوصلہ حاکم تھا۔ ۱۳۹۹ء میں اُس کی وفات پر اُس کا بیٹا ملک ناصر تخت پر بیٹھا۔ اس نے اسیر گڈھ کے قلعہ پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کو خوب مضبوط کر لیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اسیر گڈھ کے حاکم نہایت ناقابل اور کمزور ہوئے اور اُن کے زمانہ میں ملک کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ۱۶۰۱ء میں اکبر نے اسیر گڈھ کا قلعہ فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

راجپوتانہ شمالی ہندوستان میں ان مسلمان ریاستوں کے علاوہ راجپوت ریاستیں بھی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور میواڑ کی ریاست

تھی جس کا پایۂ تخت چتوڑ تھا۔ تم کو یاد ہوگا کہ سلطان علاء الدین خلجی نے چتوڑ فتح کیا تھا۔ اُس کے بعد یہ ریاست پھر خود مختار ہوگئی۔ چتوڑ کے رانا کنبھ اور مالوہ کے بادشاہ محمود خلجی کی لڑائی کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ میواڑ کا سب سے مشہور راجہ رانا سانگا ہوا ہے جس نے اپنی سلطنت بہت بڑھالی تھی لیکن اُس نے بابر سے شکست کھائی۔ اس لڑائی کا حال تم مغلوں کے بیان میں پڑھو گے۔ راجپوتانہ میں میواڑ کے علاوہ اور بھی ریاستیں تھیں جو اکبر نے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیں۔

سلطنت بہمنی

شمالی ہندوستان کے علاوہ دکن میں بھی دو سلطنتیں اتنی اہم ہیں کہ اُن کا مختصر حال لکھنا ضروری ہے بہمنی سلطنت مسلمانوں کی تھی۔ بعد میں اسکی بجائے پانچ مختلف ریاستیں قائم ہوگئیں۔ دوسری سلطنت ہندوؤں کی تھی جو وجے نگر کے نام سے مشہور ہے۔

بہمنی سلطنت کی بنیاد سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں پڑی۔ تم نے اوپر پڑھا ہے کہ اس بادشاہ کو اپنی حکومت کے آخری دنوں میں بہت سی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ ۱۳۴۷ء میں دکن میں بھی بغاوت ہوئی اور حسن گنگو نے ایک خود مختار ریاست کی بنیاد رکھی حسن کا دعویٰ تھا کہ وہ ایران کے قدیم بادشاہ بہمن کی اولاد میں سے ہے اور اسی وجہ سے اُس کا خاندان بہمنی خاندان کہلاتا ہے۔ اکثر تاریخی کتابوں میں یہ بھی روایت ملتی ہے کہ حسن ابتدا میں ایک برہمن کے پاس ملازم تھا اور جب وہ بادشاہ ہوگیا تو بہمنی کہلانے لگا۔ لیکن یہ روایت بالکل غلط ہے۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد حسن نے علاء الدین کا لقب اختیار کیا اور پرانی تاریخوں میں اُس کا نام سلطان علاء الدین حسن بہمنی ملتا ہے۔ حسن نے گلبرگہ کو اپنا دارالسلطنت قرار دیکر اپنی سلطنت کو بڑھانا شروع کیا ۱۳۵۱ء میں سلطان محمد بن تغلق نے انتقال کیا

اس کے بعد بہمنی سلطان کے راستہ میں کوئی چیز نہ تھی۔ اُس نے اپنی فتوحات جاری رکھیں اور اپنی وفات سے پہلے دریائے کرشنا تک سارا ملک قبضے میں کر لیا۔ ۱۳۵۹ء میں حسن نے وفات پائی۔ اُس کے جانشین محمد شاہ نے تلنگانہ کے راجہ سے گولکنڈہ کا مشہور قلعہ حاصل کیا۔ اُس نے وجے نگر کی ہندو سلطنت سے لڑائیاں لڑیں اور ایک گھمسان لڑائی میں وجے نگر کے راجہ کو شکست دی لیکن اُس کے پایۂ تخت پر قبضہ نہیں کر سکا۔ وجے نگر کی سلطنت نے بھی اپنی طاقت بہت بڑھالی تھی۔ وہ برابر بہمنی سلطنت کا مقابلہ کرتی رہی اور بعض اوقات اس پر فتح بھی پائی لیکن سلطان فیروز بہمنی نے وجے نگر کو کئی لڑائیوں میں شکست دی۔ راجہ نے اپنی بیٹی کی شادی بڑی دھوم دھام سے اس کے ساتھ کی اور خراج دینے کا بھی وعدہ کیا۔ احمد شاہ بہمنی نے شہر بیدر بسایا جو گلبرگہ کی بجائے بہمنی سلطنت کا پایۂ تخت ہو گیا۔ احمد شاہ کے زمانہ میں بھی وجے نگر سے لڑائی ہوئی۔ سلطان نے بہت سے آدمیوں کو قتل کرایا اور دشمن کو مغلوب کر کے مجبور کیا کہ وہ سارا خراج ادا کرے۔ چنانچہ اُس نے اپنے بیٹے کو تیس ہاتھی اور زر و جواہر دے کر سلطان کے کیمپ میں بھیجا۔ ۱۴۲۴ء میں احمد شاہ نے ورنگل کے راجہ کو شکست دی اور اُس کا بہت سا ملک اپنی سلطنت میں شامل کر لیا احمد شاہ نے اپنی زندگی ہی میں سلطنت اپنے بیٹے ظفر خاں کو دیدی تھی۔ ۱۴۳۵ء میں احمد شاہ کا انتقال ہو گیا۔ ظفر خاں نے تخت نشینی کے بعد علاء الدین ثانی کا لقب اختیار کیا اُس کو بھی وجے نگر سے لڑنا پڑا لیکن یہ بادشاہ اپنے نیک کاموں کے لئے مشہور ہے۔ اُس کے عہد میں بہت سی مسجدیں اور مدرسے قائم ہوئے۔ وہ سلطنت کے کام میں حتی الامکان اسلامی شریعت کی پابندی کرتا تھا۔ ۱۴۵۷ء میں علاء الدین کا بیٹا ہمایوں تخت پر بیٹھا۔ یہ ہوشیار اور پڑھا لکھا ضرور تھا لیکن ظلم بہت کرتا تھا اُس نے صرف چار سال سلطنت کی۔ اُس کی سب سے زیادہ

خوش قسمتی یہ تھی کہ اُس کو محمود گواں جیسا قابل اور وفادار وزیر مل گیا۔ ہمایوں کی وفات پر محمود گواں نے نظام شاہ کو تخت پر بٹھلایا۔ اسی زمانہ میں مالوہ کے حاکم محمود خلجی نے بیدر پر قبضہ کر لیا۔ لیکن گجرات کے بادشاہ نے اسوقت بہمنی سلطنت کی مدد کی اور محمود خلجی کو واپس جانا پڑا۔ تخت نشینی کے دو سال بعد نظام شاہ کا دفعۃً انتقال ہو گیا اور اُمرا نے اُس کے بھائی محمد شاہ سویم کو تخت پر بٹھایا۔ محمد شاہ کے زمانہ میں محمود گواں کا اثر بہت بڑھ گیا اور سلطنت کا سارا انتظام اُس کے ہاتھ میں آ گیا۔

محمود گواں

محمود گواں تاریخ ہند کے بہترین مدبّروں اور منتظموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُس نے سلطنت کے کام کو بہت سنبھالا۔ بادشاہ آرام طلب اور ناکارہ تھا اور حکومت کا سب کام محمود گواں کے ہی ہاتھ میں تھا۔ اُس نے سب سے پہلے امیروں کو اپنے قابو میں کیا۔ اُس کے بعد دوسرے محکموں کی اصلاح کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسقدر محنت کا عادی تھا کہ ایک لمحہ ضائع نہیں کرتا تھا بلکہ اپنا سارا وقت رعایا کی بہبودی کے کاموں میں صرف کرتا تھا۔ اسکی اصلاحات کی وجہ سے بہمنی سلطنت کی حالت بہت بہتر ہو گئی۔ محمود گواں بہت سخی تھا اور غریبوں کا خاص طور پر خیال کرتا تھا۔ اُس نے اپنی ضرورتوں کو بہت محدود کر لیا تھا اور نہایت سادہ اور پاک زندگی بسر کرتا تھا۔ چٹائی پر سوتا تھا اور مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتا تھا۔ اُس کے ذاتی کتب خانہ میں تین ہزار کتابیں تھیں۔ اُس نے بیدر میں ایک مدرسہ قائم کیا اور اپنی ساری کتابیں وہاں بھجوا دیں۔ اکثر جب اُس کو فرصت ملتی تو وہ اس مدرسہ میں جاکر عالموں کی صحبت میں وقت گزارتا تھا۔ اس مدرسہ کی شاندار عمارت اس وقت تک موجود ہے لیکن بوسیدہ حالت میں ہے۔ محمود شعر بھی کہتا تھا اور ریاضی، طب اور ادب سے بھی اُس کو دلچسپی تھی۔ اُس کی

قوت اور اثر کی وجہ سے بہت سے امیر اس سے جلنے لگے اُنھوں نے رشوت کے ذریعہ سے اُس کی مُہر حاصل کر لی اور ایک جعلی خط وجے نگر کے راجہ رائے نرسنگھ کے نام لکھ کر بادشاہ کو دکھلا دیا اور کہا کہ وزیر دغا باز ہے۔ بادشاہ امیروں کی اس چال میں آگیا اور ۱۴۸۱ء میں اپنے وفادار، خیر خواہ اور قابل وزیر کو قتل کروا دیا۔ جب اُس کو بعد میں معلوم ہوا کہ اُس نے کسقدر بڑی غلطی کی تو اُس کو بیحد صدمہ ہوا اور اسی صدمہ کے اثر سے وہ خود بھی ایک سال کے اندر مر گیا۔

بہمنی سلطنت کا خاتمہ

۱۵۲۶ء میں بہمنی خاندان کے آخری بادشاہ کی وفات پر اس سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور اُس کے بجائے پانچ نئی خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں اور نئے خاندان حکومت کرنے لگے۔ اُن کے نام یہ ہیں۔

(۱) برار کا عماد شاہی خاندان۔
(۲) احمد نگر کا نظام شاہی خاندان۔
(۳) بیجاپور کا عادل شاہی خاندان۔
(۴) گولکنڈہ کا قطب شاہی خاندان۔
(۵) بیدر کا برید شاہی خاندان۔

یہ حکومتیں مغلوں کے زمانہ تک قایم رہیں اور حتی الامکان اُن کا مقابلہ کرتی رہیں یہاں تک کہ اورنگ زیب کے عہد میں دکن کا سارا ملک سلطنت مغلیہ میں شامل ہوگیا۔ بہمنی سلطنت اور اُس کے بعد ان پانچوں خاندانوں نے نہایت شاندار یادگاریں چھوڑی ہیں۔ چنانچہ گلبرگہ بیدر اور بیجاپور کی عمارتیں اس وقت بھی ہندوستان کی مشہور تاریخی عمارتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ ان کے مضبوط قلعوں سے ہم اُن کی فوجی طاقت کا بھی کافی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مغلوں سے پہلے سلطنت

دہلی کے زوال کے بعد بہمنی سلطنت نے پرانی روایات کو قایم رکھا شمالی ہندوستان اور وسط ایشیا سے بھاگ بھاگ کر جو لوگ آتے تھے وہ یہیں پناہ لیتے تھے چنانچہ بہمنی سلطنت اسلامی تہذیب کا مرکز بن گئی تھی۔

وجے نگر کی سلطنت وجے نگر کی ہندو ریاست کی بنیاد بھی محمد بن تغلق کے عہد میں ۱۳۳۶ء میں پڑی تھی۔ اُس کے بانی ہری ہر اور بکا دو بھائی تھے جو ورنگل کے راجہ پرتاپ رُدر دیو کے پاس ملازم تھے۔ دونوں بھائیوں نے دریائے تنگ بھدرا کے کنارے پر وجے نگر کا شہر آباد کیا اور ہری ہر اس نئی ریاست کا پہلا راجہ ہوا۔ ۱۳۴۶ء میں ہوئسل خاندان کا آخری حکمراں لڑائی میں مارا گیا اور اُس کا سارا ملک وجے نگر میں شامل ہو گیا۔ اب اُن کی حکومت شمال میں دریائے کرشنا سے لے کر جنوب میں دریائے کاویری تک پھیل گئی لیکن شمال میں بہمنی سلطنت کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکی۔ وجے نگر اور بہمنی سلطنت میں اسقدر دشمنی تھی کہ دو سو برس تک لڑائی کا سلسلہ جاری رہا اور بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ ۱۳۵۳ء میں ہری ہر کے مرنے کے بعد اُس کا بھائی بکا تخت پر بیٹھا۔ اُس نے ۱۳۷۹ء تک حکومت کی اور بہت سا ملک فتح کیا۔ اس خاندان کے راجہ دیو رائے کے زمانہ میں فیروز شاہ بہمنی نے وجے نگر پر حملہ کیا تھا۔

عبدالرزاق اسی راجہ کے عہد میں یورپ کا اطالوی سیاح نکولو کانتی ۱۴۲۱ء میں اور ایران کا ایلچی عبدالرزاق ۱۴۴۲ء میں وجے نگر آئے۔ ان دونوں نے وجے نگر کے حالات لکھے ہیں جو تاریخ کے طلبہ کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اطالوی سیاح نے لکھا ہے کہ اس شہر میں نوے ہزار آدمی ایسے ہیں جو لڑ سکتے ہیں۔ یہاں کا رواج ہے کہ ہر شخص جتنی چاہے شادیاں کر سکتا ہے۔ موجودہ راجہ کی بارہ ہزار بیویاں ہیں۔ اُس نے ستی کا بھی ذکر کیا ہے کہ بہاں کا

دستور ہے کہ شوہر کی وفات پر اُس کی بیویاں اُس کی لاش کے ساتھ جل جاتی ہیں نکولو کانتی سے تقریباً بیس سال بعد عبدالرزاق یہاں آیا۔ راجہ نے بڑی دھوم سے اُس کا استقبال کیا اور اُس کو بہت سے تحفے دئے۔ عبدالرزاق لکھتا ہے کہ راجہ کا دربار بہت شاندار ہے اور اُس کے محل میں چالیس ستون ہیں۔ ملک بہت زرخیز ہے اور زراعت خوب ہوتی ہے۔ برہمنوں کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ وجے نگر جیسا شہر دنیا میں نہ کسی نے دیکھا ہے اور نہ سُنا۔ شہر کے چاروں طرف یکے بعد دیگرے سات فصیلیں ہیں اور سب سے باہر والی دیوار سے پچاس گز تک بڑے بڑے پتھر نصب ہیں جو آدمی کے برابر اونچے ہیں اور اتنے ہی زمین کے اندر ہیں۔ ان کی وجہ سے سوار یا پیادہ فوج فصیل تک آسانی سے نہیں پہونچ سکتی۔ بیچ والی فصیل کے اندر راجہ کا محل ہے۔ اس سے ملحق چار بازار ہیں۔ ان ساتوں فصیلوں کے درمیان کھیت باغات اور مکانات ہیں۔ تیسری اور ساتویں فصیل کے درمیان بھی بازار ہیں جہاں پھولوں اور جواہرات کی دکانیں ہیں جس جگہ راجہ کا محل ہے وہاں چھوٹے چھوٹے چشمے بہت خوش نما معلوم ہوتے ہیں۔

راجہ کرشن دیو رائے
۱۵۰۹ء-۱۵۲۹ء

وجے نگر کا سب سے مشہور راجہ کرشن دیو رائے ہوا ہے اس کے زمانہ میں یہ سلطنت اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ راجہ نے بہمنی سلطنت کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور اپنے خاندان کا بدلہ لیا۔ کرشن دیو خود تو وشنو تھا مگر دوسرے مذہب والوں کو اُس نے پوری آزادی دے رکھی تھی۔ وہ سنسکرت اور تیلگو زبان کا سرپرست تھا اور ان زبانوں میں شعر بھی کہتا تھا۔ عالموں کی بہت قدر کرتا تھا۔ اُس کے دربار میں آٹھ مشہور شاعر تھے۔ یہ راجہ بہادر بھی تھا اور منتظم بھی چنانچہ اُس نے بہت سا نیا ملک فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا۔ وہ گولکنڈہ اور بیجاپور کے خلاف

لڑا اور بیجا پور کے خلاف اُس کو کامیابی بھی ہوئی۔ اُس کے زمانہ میں پرتگیزوں کی تجارت کو بہت فروغ ہوا۔

وجے نگر کا زوال

کرشن دیو کے بعد وجے نگر کا زوال شروع ہوتا ہے ۱۵۴۲ء میں سدا شیو رائے تخت پر بیٹھا لیکن بالکل ناکارہ ثابت ہوا سلطنت کا کاروبار اُس کے وزیر رام راجہ کے ہاتھ میں آ گیا۔ مسلمان سلطنتوں کی سازشوں میں رام راجہ نے بھی حصّہ لینا شروع کیا لیکن ۱۵۶۵ء میں احمد نگر، بیجا پور، گولکنڈہ اور بیدر کے سلطانوں نے اتفاق کر کے وجے نگر پر چڑھائی کی۔ فریقین نے اس جنگ کے لئے وسیع پیمانہ پر تیاریاں کیں اور تالی کوٹ کے میدان میں بڑی زبردست لڑائی ہوئی۔ رام راجہ مارا گیا۔ وجے نگر کو مسلمانوں نے خوب لوٹا۔ وجے نگر کی سلطنت کا تو خاتمہ ہو گیا لیکن مسلمان بادشاہوں کو آپس کے اختلافات کی وجہ سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا بلکہ وجے نگر کے ٹکڑے ہو گئے اور کئی خود مختار حکومتیں قائم ہو گئیں۔

وجے نگر کا نظام حکومت

وجے نگر کا نظام حکومت مشہور ہے لیکن یہاں تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ راجہ ایک مجلس کی مدد اور مشورے سے سلطنت کا کام کرتا تھا۔ وزیر اعظم اُس کا خاص مشیر تھا۔ وجے نگر کے راجاؤں کا دربار بہت عالی شان ہوتا تھا۔ سلطنت دو صوبوں میں منقسم تھی ہر گاؤں میں ایک پنچایت کے ذریعہ سے انتظام ہوتا تھا۔

عورتوں میں ستی کا رواج عام تھا لیکن عورتیں تعلیم یافتہ ہوتی تھیں اور محکمۂ مال اور دوسرے محکموں میں ملازم رکھی جاتی تھیں۔ علم موسیقی اور نجوم سے واقف تھیں ہر قسم کے جانوروں اور پرندوں کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ برہمنوں کی بہت عزت ہوتی تھی اور یگیہ کا رواج بھی تھا۔

باب ۲۸

ہندوستانی تہذیب و تمدّن مسلمانوں کے عہد میں

سنہ ۱۲۰۰-۱۵۲۶ء

مسلمان اور ہندوستان

اسوقت ہندوستان میں آٹھ کروڑ سے زیادہ مسلمان آباد ہیں جو اس ملک کو اپنا وطن سمجھتے ہیں۔ علاوہ اس کے ہندوستانی تمدن میں اسلامی تہذیب کے نمایاں اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس باب میں تم کو یہ بتایا جائیگا کہ مسلمان کب اور کیسے اس ملک میں آئے اور کس حد تک اُنھوں نے اس ملک کے تمدن پر اپنا اثر قایم کیا۔ ابتدا میں جو مسلمان یہاں آئے وہ عرب تجار تھے۔ یہ لوگ گھوڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ درحقیقت عرب اور ہند کے تجارتی تعلقات اسلام سے پہلے ہی قایم ہو چکے تھے۔ لیکن سیاسی تعلق آٹھویں صدی عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ تم نے اوپر پڑھا ہے کہ ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم نے سندھ پر حملہ کیا اور ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ تقریباً تین سو برس تک سندھ کی اسلامی حکومت مقامی اور بیرونی مخالفتوں کے باوجود قایم رہی۔ گیارھویں صدی میں اسلامی دنیا میں ترکوں نے عربوں اور ایرانیوں کی جگہ لے لی اور اکثر ممالک میں اپنی حکومتیں قایم کیں۔ غزنی کی سلطنت مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ سلطنت دہلی کی بنیاد بھی ترکوں ہی کے ہاتھ سے رکھی گئی۔

ہندوستانی مسلمان

مسلمان جب یہاں آئے تو پردیسی تھے لیکن قیام سلطنت کے بعد انہوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مسلمانوں نے شروع ہی سے اس ملک کو اپنا وطن سمجھ کر حکومت کی اور اُن کا نقطۂ نظر انگریزوں سے بالکل مختلف تھا۔ مسلمانوں نے یہیں شادیاں کرنی شروع کر دیں اور مرنے کے بعد یہیں دفن ہونے لگے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں میں تعلقات بہت گہرے اور خوشگوار تھے۔ ابھی سلطنت دہلی کو قائم ہوئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ نیم وحشی منگولوں نے ایشیا کی اسلامی سلطنتوں اور اُن کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب و تمدن کو برباد کرنا شروع کر دیا۔ خوش قسمتی سے دہلی کی سلطنت منگولوں کے حملوں سے ایک عرصہ تک محفوظ رہی۔ یہی وجہ تھی کہ مسلم سوسائٹی کے بہترین افراد مثلاً بزرگانِ دین، شعرا، علماء اور تاجروں کو منگولوں کے سیلاب نے بہا کر ہندوستان کی سرزمین میں لا ڈالا۔ تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کے رہنے والے منگولوں کے خوف سے پریشان رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو اور مسلمانوں میں ان عام دشمنوں کے ڈر سے بہت میل جول پیدا ہو گیا۔

مسلمان صوفی اور اُن کے کارنامے

ایک طرف تو مسلمان بادشاہوں نے ملک فتح کر کے ہندوستان کو ایک کر دیا۔ دوسری طرف صوفیوں نے اپنی سادہ اور پاک زندگی سے ہندوستانی قوموں کے تمدن میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ لوگ دنیاوی معاملات میں دخل نہیں دیتے تھے۔ اکثر شہروں کے باہر اپنی خانقاہیں بناتے تھے اور عبادتِ خدا میں مصروف رہتے تھے لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے۔ اسلام ہندوستان میں انھیں بزرگوں کی ان تھک کوششوں سے

پھیلا اور ملک میں کافی آبادی مسلمان ہوگئی۔ ان بزرگوں کا اخلاق اسقدر وسیع تھا اور ان کی تعلیم اس قدر با اثر ہوتی تھی کہ ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لوگ ان کے مرید ہوتے تھے۔ اب بھی بہت سے مزارات ہیں جہاں ہندو اور مسلمان دونوں زیارت کے لئے جاتے ہیں۔ ان بزرگوں میں سب سے زیادہ مشہور حضرت خواجہ معین الدین چشتی ہیں جن کا مزار اجمیر میں ہے
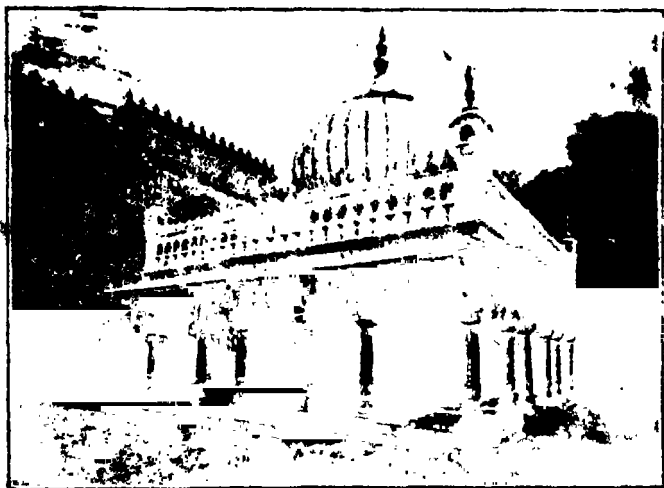
(روضہ حضرت نظام الدین اولیا دہلی)

یہ پرتھوی راج کے زمانہ میں ہندوستان آئے اور اجمیر میں ایک جھونپڑا بناکر رہنے لگے۔ بہت جلد ان کی بزرگی کی شہرت ملک میں پھیل گئی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگ اُن سے فیضیاب ہونے لگے۔ اُن کے مریدوں میں سب سے زیادہ مشہور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی تھے جن کا مزار قدیم دہلی میں ہے۔ ان کے

مرید بابا شیخ فرید الدین تھے۔ یہ بھی بہت مشہور بزرگ ہوئے ہیں اور ان کا مزار پنجاب میں پاک پٹن کے مقام پر ہے۔ بابا صاحب کے مرید خواجہ نظام الدین اولیا ہیں جو دہلی کے قریب ہی اپنی خانقاہ میں رہتے تھے۔ تاریخ کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہزارہا آدمی اُن کی صحبت سے فائدہ اُٹھاتے تھے اور ایک بڑی تعداد میں لوگوں نے اُن کے اثر سے اسلام قبول کیا۔

تمام ملک میں یہ صوفی لوگ پھیل گئے۔ ان میں سے ہر ایک اپنا خلیفہ بنا کر دور دور بھیجتا تھا تاکہ لوگوں میں تبلیغ اسلام کریں اور جو مسلمان ہیں اُن کو صحیح اسلامی تعلیم دیں۔ ملک کا کوئی حصہ ایسا باقی نہ تھا جہاں کسی نہ کسی سلسلے کے صوفی درویش نہ پہنچے ہوں اور تبلیغ اسلام کا کام نہ کیا ہو۔ سلطان محمد بن تغلق کے عہد میں بہت سے بزرگ دکن بھی پہنچ گئے۔ یہاں مسلمان پہلے سے موجود تھے لیکن اب اُن کی تعداد بڑھنے لگی اور ایک معقول آبادی مسلمانوں کی ہو گئی۔ دکن میں حضرت خواجہ گیسو دراز بہت مشہور ہیں جن کا مزار ریاست حیدرآباد میں گلبرگہ کے مقام پر ہے۔ ان بزرگوں نے اپنے ذاتی اخلاق اور تعلیم سے ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعصب اور مخالفت کو بڑی حد تک دور کیا اور اُن کی کوششوں سے جو مسلمانوں کی آبادی پیدا ہوئی اُس سے اسلامی سلطنت بھی مستحکم ہو گئی اور مسلمان مستقل طور پر اس ملک میں رہنے لگے۔

مسلمانوں کا برتاؤ غیر مسلموں کے ساتھ

اوپر تم نے پڑھا ہے کہ مسلمان فقرا ہندوؤں سے نہایت اچھی طرح ملتے تھے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کا کیا رویّہ تھا۔ مسلمان بادشاہوں کو اپنی و نیز ملک کی حفاظت کے لئے فوجی انتظام اور لڑائی کی سخت ضرورت رہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سپاہ گری کا پیشہ بہت عام تھا اور عزت کی نگاہ سے

دیکھا جاتا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سلطنت دہلی کی ابتدائی تاریخ سیاسی انقلابوں، لڑائیوں اور بغاوتوں سے بھری ہوئی ہے۔ ایسی صورت میں بادشاہوں کو مجبوراً لڑائیاں لڑنی پڑتی تھیں۔ لیکن عام طور پر ان بادشاہوں کا برتاؤ غیر مسلموں کے ساتھ بہت اچھا تھا۔ ہندوؤں میں دو طبقے تھے۔ اعلیٰ طبقے میں زمیندار، سردار، مقدم اور چودھری تھے۔ ان لوگوں نے مسلمانوں کی اطاعت تو قبول کر لی تھی لیکن جب موقع ملتا تھا وہ ملک میں فتنہ و فساد کرتے تھے اور بغاوت سے کبھی نہ چوکتے تھے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ سلطنت کو سختی کا برتاؤ کرنا پڑتا تھا۔ لیکن دوسرے طبقے کے لوگ جن میں کسان، کاری گر اور تاجر وغیرہ تھے نہایت امن کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں نے ان کو پوری مذہبی آزادی دے رکھی تھی اور اُن کے سوشل اور مذہبی معاملات میں کبھی دخل نہیں دیتے تھے۔ انصاف کے وقت ہندو اور مسلمان میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی تھی۔

مسلمانوں کا طرزِ حکومت

اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی مطلق العنان تھے اُن کا حکم ہر شخص کو ماننا پڑتا تھا اور اُن کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا تھا۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکال لینا صحیح نہ ہوگا کہ اُن پر کسی قسم کا کوئی دباؤ کسی صورت میں نہ ہوتا تھا۔ سلطنت کا کام اسقدر مشکل اور پیچیدہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص بغیر دوسروں کے مشورے اور مدد کے اُس کو انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے علاوہ اسلامی سلطنتوں میں مطلق العنانی کو روکنے کے لئے قانونِ شریعت موجود تھا۔ مثال کے طور پر علاء الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی گفتگو پیش کی جاسکتی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ سلاطین دہلی میں علاء الدین خلجی سب سے زیادہ مطلق العنان بادشاہ گذرا ہے اور اُس نے بہت سے کام خلاف شرع کئے ہیں۔ لیکن جب قاضی مغیث الدین نے اُس کو بتلایا کہ اُس کے اکثر احکام خلاف شرع ہیں تو علاء الدین خلجی

نے یہی کہا کہ میں شریعت کے قانون سے واقف نہیں لیکن جو کچھ بھی میں کرتا ہوں وہ لوگوں کی بھلائی کے لئے کرتا ہوں۔ اس واقعہ سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگرچہ بادشاہ کو لوگ ظل الہی کہتے تھے لیکن اس کی مطلق العنانی محدود تھی۔ بادشاہ کے وزیر اور مشیر کار اُس کو اہم معاملات میں مشورہ دیتے تھے لیکن بادشاہ کو اختیار ہوتا تھا کہ اُن کی بات مانے یا رد کردے۔ بادشاہ کا دربار خاص ایک علیحدہ کمرے میں ہوتا تھا اور اُس میں سوائے وزیروں کے اور کوئی شامل نہیں ہوتا تھا۔ تمام اہم ملکی معاملات دربار خاص میں پیش ہوتے تھے اور وزرا اپنی رائے دیتے تھے دربار عام میں ہر شخص کی رسائی ہوسکتی تھی۔ وزیر اور تمام درباری کھڑے رہتے تھے۔ نقیب اور دوسرے سپاہی ہتیار بند مستعد رہتے تھے۔ بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا اور فریادیوں کی فریاد سُنتا تھا۔ صوبہ داروں کو حکم لکھوا کر بھیجتا تھا جس شخص کو پھانسی کا حکم ہوتا تھا وہ سولی پر لٹکا دیا جاتا تھا اور کئی دن تک اُس کی لاش لٹکی رہتی تھی تاکہ اُس کو دیکھ کر دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ذکر کیا ہے کہ اُس نے شاہی دربار کے دروازے پر لاشیں خود دیکھی ہیں۔ عام طور پر بادشاہ کے چار بڑے وزیر ہوتے تھے۔ ہر ایک کے سپرد ایک محکمہ ہوتا تھا جو دیوان کہلاتا تھا۔ ان سب کا عہدہ برابر تھا لیکن جس کے سپرد دیوان وزارت ہوتا تھا اُس کو کچھ فوقیت ہوتی تھی کیونکہ اُس کے ذمہ مالی معاملات اور حساب کتاب کا کام تھا۔ زراعت کا حاکم امیر کوہ کہلاتا تھا کشتیوں اور ناؤوں کا نگراں اور گھاٹوں کا دیکھ بھال کرنے والا امیر البحر کہلاتا تھا۔ بادشاہ جب پایۂ تخت سے باہر کسی کام سے جاتا تھا تو اپنا نائب مقرر کر دیتا تھا جسے نائب ملک کہتے تھے۔ بادشاہ کے بعد اس کا مرتبہ سب سے افضل ہوتا تھا۔ سلطان غیاث الدین تغلق جب بنگال پر چڑھائی کرنے گیا تھا تو اپنے ولی عہد جوناخاں کو نائب ملک مقرر کر کے گیا تھا۔

اسلام کا اثر ہندو مذہب پر اوپر بتلایا گیا ہے کہ قدیم ویدک دھرم میں خدا کی وحدانیت کی تعلیم بھی دی جاتی تھی لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہندو مذہب میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں اور رفتہ رفتہ وہ باتیں داخل ہوگئیں جو پہلے نہ تھیں۔ برہمنوں کا اثر بہت بڑھ گیا اور ذاتوں کی تقسیم بہت سخت ہوگئی۔ عورتوں کا رتبہ کم ہوگیا ستی کا رواج عام ہوگیا اور بیواؤں کی شادی معیوب خیال کی جانے لگی۔ اسلام میں یہ باتیں نہیں ہیں۔ یہ مذہب سادہ ہے اور ہر شخص اس کے اصولوں کی آسانی سے پابندی کرسکتا ہے پیغمبر اسلام نے بتلایا کہ خدا ایک ہے۔ اُس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے زندگی کے اور بہت سے عمدہ اصول بتلائے۔ ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ مسلمان صوفیوں کے ذریعہ سے ہوئی۔ ان کے اخلاق، عادات اور تقوے کا اثر لوگوں پر ایسا ہوا کہ لاکھوں آدمی مسلمان ہوگئے۔

بھگتی مت ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا اثر یہ ہوا کہ ہندو مذہب میں بہت سے پیشوا ہوئے جنہوں نے مذہب کی اصلاح کی۔ وہ ذات پات کے فرق کو بیکار سمجھتے تھے۔ ان پیشواؤں میں رامانج، رامانند، کبیر داس، گورونانک، بھٹا چاریہ اور چیتنیہ بہت مشہور ہیں۔ ان لوگوں نے جس مذہب کی تلقین کی وہ بھگتی مت کہلاتا ہے۔ یہ لوگ ذاتوں کی تفریق اور بتوں کی پرستش کے بہت سخت خلاف تھے اور اسلام کی طرح خدا کی وحدانیت پر بہت زور دیتے تھے۔ ان میں سب سے پہلے رامانج دکن میں بارہویں صدی میں پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے وشنو کے نام سے ایک خدا کی پرستش سکھلائی اور بتلایا کہ ایشور کی بھگتی ہی سے نجات حاصل ہوسکتی ہے۔ رامانند چودھویں صدی میں شمالی ہند میں پیدا ہوئے۔ بنارس میں رہتے تھے۔ اُنہوں نے بھی وہی تعلیم دی جو رامانج نے دی تھی اور ذاتوں

کی تفریق کی شدید مخالفت کی۔ وہ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنا چیلا بناتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کے بارہ چیلے تھے جن میں ایک راجپوت، ایک حجام، ایک چمار اور ایک مسلمان جولاہا تھا۔ اس جولاہے کا نام کبیر تھا۔

کبیر کبیرداس رامانج کے سب سے مشہور چیلے ہیں۔ اپنے گُرو کے بعد اُنہوں نے بہار اور بنگال میں تعلیم شروع کردی۔ یہ اپنے گرو سے بھی زیادہ بُت پرستی کے خلاف تھے۔ مساوات پر بہت زور دیتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کے سامنے ہر شخص برابر ہے۔ خواہ وہ اونچی ذات کا ہو یا نیچی ذات کا۔ برہمن ہو یا مسلمان۔ ان کی تعلیم کا مقصد تھا کہ مذہبوں کی تفریق دور ہو جائے۔ اُن کا نام بھی آدھا ہندو ہے اور آدھا مسلمان۔ اُن کا خیال تھا کہ سب مذہب ایک ہی ہیں، صرف نام کا فرق ہے۔ ہندو اپنے مقدس مقام کو کاشی کہتے ہیں اور مسلمان مکّہ کہہ کر پکارتے ہیں۔ رام اور رحیم۔ قرآن اور پُران۔ وید اور کتاب درحقیقت ایک ہی چیز ہیں۔ کبیرداس کے پیرو کبیر پنتھی کہلاتے ہیں جو اب تک وسط ہند گجرات اور دکن میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

چیتنیہ سلطنت بنگال کے سلسلہ میں حسین شاہ اور نصرت شاہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ دونوں بہت بے تعصب تھے اور ان کے عہد میں ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ اسی فضا میں ندیہ کے مقام پر ۱۴۸۶ء میں چیتنیہ سوامی پیدا ہوئے۔ اُنہوں نے بہار اور اُڑیسہ میں وشنو کے نام سے ایک خدائے واحد کی پرستش کی تعلیم دی اور بہت سے چیلے بنائے۔ اس وقت بھی بنگال کی طرف چیتنیہ سوامی کے ماننے والے بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔

اسی صدی میں سکھ مذہب کے بانی گرو نانک پنجاب میں تلونڈی کے مقام پر پیدا ہوئے گرو نانک بھی ہندو مسلمانوں کو ایک کرنا چاہتے تھے

اور اُنہوں نے دونوں مذہبوں کے ماننے والوں کو اپنا چیلا بنایا۔

علم و ادب مسلمانوں کے عہد میں علم و ادب کو بہت ترقی ہوئی۔ یہ مذہبی پیشوا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ملک کی عام زبانوں میں تعلیم دیتے تھے اور اُنہیں زبانوں میں گیت بھجن اور اشعار کہتے تھے۔ چنانچہ ان زبانوں میں ایک ادب کا ذخیرہ جمع ہوگیا۔ جنوبی ہند میں تامل۔ مہاراشٹر میں مرہٹی۔ شمالی ہند میں ہندی اور بنگال میں بنگالی زبان کو ترقی ہوئی۔ علاوہ اس کے ہندو اور مسلمانوں کے ملاپ سے ایک عام زبان پیدا ہوگئی۔ ہندوؤں نے فارسی اور مسلمانوں نے ہندی زبان سیکھنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو زبان کا رواج بڑھتا گیا اور ملک کے عام لوگ اسی زبان کو استعمال کرنے لگے۔ مسلمان بادشاہ اکثر علم دوست اور ادب نواز تھے۔ چنانچہ اُن کے دربایوں میں بڑے بڑے شاعر اور فاضل ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں سب سے زیادہ مشہور حضرت امیر خسروؔ ہیں۔ یہ شاعر بھی تھے اور مورخ بھی۔ ان کا فارسی کلام نہایت شیریں اور بلند مرتبہ ہے اور اُن کے گیت، ورد وہے اب تک لوگوں کو یاد ہیں۔ اُن کے ساتھی امیر حسن سنجری فارسی کے بہت عمدہ شاعر تھے۔

فنِ تعمیر مسلمانوں نے فنِ تعمیر میں بہت ترقی کی تھی۔ چنانچہ ان کی بنائی

ہوئی عمارتیں اسوقت تک لوگوں کو حیرت میں ڈالتی ہیں مسلمانوں کے ابتدائی
زمانہ کی سب سے مشہور اور قابل تعریف عمارت قطب مینار ہے جو شمس الدین
التمش نے اپنے پیر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے نام پر جوایا ہے۔
علاء الدین خلجی کا علائی دروازہ بھی قابل دید ہے اور قطب مینار کے قریب
ہی واقع ہے۔ تغلق بادشاہوں کے زمانہ کی بعض عمارتیں بھی اب تک موجود ہیں۔
شاہان دہلی کے علاوہ دوسرے خودمختار بادشاہوں نے بھی بہت سی عمدہ عمارتیں
چھوڑی ہیں۔ شمالی ہند میں جون پور کے شاہان شرقی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔
جون پور کی اٹالہ مسجد نہایت عالی شان ہے۔ گجرات کے بادشاہوں نے احمد آباد میں
بہت سی عمارتیں بنائیں۔ دکن کی سلطنتوں میں بڑی تعداد میں شاندار عمارتیں
تیار ہوئیں ان میں سے بہت سی اس وقت تک موجود ہیں۔ لوگ ان کو دیکھنے
کے واسطے اسوقت بھی جاتے ہیں۔ وجے نگر کے راجاؤں نے بھی مندر اور محل
تیار کرائے جن میں سے کچھ اسوقت موجود ہیں۔

باب ۲۹

بابر بادشاہ

۱۴۸۳-۱۵۳۰ء

بابر کے حملہ کے وقت ہندوستان کی حالت

اس سے پہلے کہ بابر کی زندگی کے حالات بیان کئے جائیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ بتلایا جائے کہ اُس کے حملے کے وقت ہندوستان کی سیاسی فضا کیا تھی۔ تم پڑھ چکے ہو کہ ابراہیم لودی کے عہد میں دہلی کی سلطنت نہایت مختصر ہو گئی تھی۔ پنجاب پر دولت خاں لودی نے قبضہ جما لیا تھا۔ سندھ اور ملتان مغرب میں اور جون پور، بنگال اور اُڑیسہ مشرق کی طرف خود مختار ریاستیں ہو چکی تھیں۔ اسی طرح راجپوتانہ، خاندیس اور مالوہ پر دہلی کے بادشاہ کو کچھ اختیار نہ تھا۔ علاوہ ازیں سلطان ابراہیم لودی کے تعلقات درباریوں سے ایسے خوشگوار نہ تھے جیسے کہ اُس کے باپ اور دادا کے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح ملک اور رعایا کو اُس کی حکومت سے نجات دلائیں۔ چنانچہ دولت خاں لودی نے بابر بادشاہ کو ہندوستان فتح کرنے کی دعوت دی۔ اسی طرح سے میواڑ کے راجہ سنگرام سنگھ نے بھی جو رانا سانگا کے نام سے مشہور ہے بابر کو ہندوستان آنے کے لئے مدعو کیا۔ اس پر بابر نے ہندوستان پر حملہ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

ظہیر الدین محمد بابر ۲۴ فروری ۱۴۸۳ء کو پیدا ہوا۔ اُس کا باپ عمر شیخ مرزا فرغانہ کا مالک تھا۔ ۱۴۹۴ء میں جبکہ

بابر کی عمر بارہ سال کی بھی نہ تھی عمر شیخ مرزا کا یکایک انتقال ہوگیا۔ بابر اپنے باپ کے تخت پر بیٹھا اور سلطنت کا کام سنبھالنا شروع کیا۔ ناتجربہ کاری اور کم عمری کے علاوہ بابر کی بڑی مشکل یہ تھی کہ چاروں طرف اُس کے دشمن تھے۔ چنانچہ تخت نشینی کے وقت بھی فرغانہ میں اُس کے ایک چچا اور ایک ماموں کی متحدہ فوجیں موجود تھیں۔ لیکن خوش قسمتی سے عمر شیخ مرزا کے مرنے پر یہ فوجیں واپس ہوگئیں۔ بابر کی ابتدائی زندگی کے حالات کا ہندوستان سے تعلق نہیں۔ لہذا وہ تفصیل سے بیان نہیں کئے جا سکتے۔ مگر یہ بتلانا ضروری ہے کہ تخت نشینی کے دو سال بعد ہی بابر نے اپنے جد امجد امیر تیمور کے دار السلطنت سمرقند کو فتح کر لیا۔ لیکن یہ کامیابی عارضی تھی اور جلد ہی اُس کو سمرقند چھوڑنا پڑا۔ واپسی پر اُس کو معلوم ہوا کہ اُس کا چھوٹا بھائی جہانگیر مرزا تخت پر قابض ہوگیا ہے۔ دو سال تک وہ اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخرکار فرغانہ اُس کے قبضہ میں آگیا اور ۱۵۰۰ء میں اُس نے دوبارہ سمرقند فتح کیا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد ازبکوں کے سردار شیبانی خاں نے اُس کو شکست دے کر بھگا دیا اور چونکہ فرغانہ میں پھر بغاوت ہوگئی تھی اسلئے پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی

اُس کو خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنی پڑی۔ لیکن آخر میں جیسا کہ وہ خود لکھتا ہے "بغیر کسی لڑائی اور کوشش کے خدا کے فضل و کرم سے میں کابل، غزنی اور قرب و جوار کے اضلاع پر قابض ہو گیا۔"

ہندوستان پر ابتدائی حملے

اگرچہ بابر کابل کے تخت کا مالک تھا لیکن اُس کے دل میں سمرقند کی خواہش ابھی موجود تھی اور ۱۵۱۱ء میں اُس کو یہ خوبصورت شہر تیسری مرتبہ فتح کرنے کا موقع مل گیا۔ مگر سمرقند کی حکومت اس کی قسمت میں نہ تھی اور آٹھ ہی مہینہ بعد اُزبکوں نے پھر حملہ کیا۔ بابر کو شکست ہوئی اور کابل کی طرف بھاگنا پڑا۔ اب اُس کو یقین ہو گیا کہ سمرقند پر حکومت کرنے کی کوشش بیکار ہے۔ اسلئے اُس نے ہندوستان کی جانب رُخ کیا۔ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کابل میں بیٹھکر بھی بابر کو سمرقند ہی کا خیال آتا تھا اور وہ ہندوستان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تھا۔ مگر ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اُس زمانہ میں وسطی ایشیا کی ریاستیں بہت زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ تھیں۔ یہی سبب ہے کہ ہندوستان فتح کرنے اور یہاں چند سال رہنے کے بعد بھی بابر کو یہ ملک پسند نہیں آیا۔ بہرحال اب اُسے یہ طے کرنا پڑا کہ ہندوستان کو فتح کرلے۔ چنانچہ ۱۵۱۹ء میں وہ پہلی مرتبہ اس ملک میں داخل ہوا اور بھیرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ۱۵۲۰ء میں اُس نے بدخشاں فتح کیا اور اپنے بڑے بیٹے ہمایوں کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ دنوں بعد قندھار پر بھی قبضہ کر کے کامراں کو گورنر بنایا۔ اب وہ ہندوستان کی طرف پھر متوجہ ہوا اُس کو معلوم ہو چکا تھا کہ سلطان ابراہیم لودی کی حکومت سے اُس کی رعایا تنگ آگئی ہے کیونکہ دولت خاں لودی نے جو پنجاب کا گورنر تھا بابر کو ہندوستان فتح کرنے کی دعوت دی تھی۔ لہذا ۱۵۲۴ء میں وہ

ایک فوج لے کر پنجاب پر چڑھ آیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا مگر دولت خاں لودی نے اس موقع پر غداری کا ثبوت دیا۔ بابر نے عالم خاں کو جو سلطان کا چچا تھا دیپال پور کا حاکم مقرر کیا اور خود کابل واپس چلا گیا۔

پانی پت کی پہلی لڑائی ۱۵۲۶ء

بابر کے جاتے ہی دولت خاں نے عالم خاں کو دیپال پور سے بھگا دیا۔ مگر اب بابر اپنے آخری حملے کا ارادہ کر چکا تھا اور نومبر ۱۵۲۵ء میں وہ پنجاب میں داخل ہوا۔ اس کے کل ساتھیوں کی تعداد بارہ ہزار سے کم تھی اور مقابلہ میں سلطنت دہلی کی زبردست قوت کے علاوہ دولت خاں کے بھی چالیس ہزار سپاہی موجود تھے لیکن دولت خاں کو اس سے لڑنے کی ہمت نہ پڑی اور اس نے معافی مانگ لی۔ بابر دہلی کی طرف بڑھا ادھر سے سلطان ابراہیم بھی ایک زبردست فوج لے کر روانہ ہوا۔ دونوں فوجیں پانی پت کے میدان میں پہنچ گئیں اور چند روز کے پڑاؤ کے بعد ۲۱ اپریل کو جنگ ہوئی پانی پت کی لڑائی صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کی مشہور لڑائیوں میں شمار کی جاتی ہے اور اس موقع پر بابر نے وہ کمالات دکھلائے جن سے اس کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا وہ جانتا تھا کہ دشمن کی فوج ایک لاکھ سے کم نہیں اور اسلئے اس کو نہایت ہوشیاری اور احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔ اس نے توپیں اور سامان لے جانے والی گاڑیوں کو تھوڑی تھوڑی دور پر ترتیب دے کر چمڑے کی رسیوں سے باندھ دیا اور ان کے پیچھے بندوقچیوں کو کھڑا کیا اس کی فوج کے داہنی طرف پانی پت کا شہر تھا اور بائیں جانب ایک گہری کھائی تھی اور بہت سے درخت اکھڑوا کر ڈال دئے گئے تھے۔ اس طرح اس نے فوج کو ہر طرف سے محفوظ کر لیا تھا۔

لڑائی صبح سورج نکلنے کے بعد شروع ہوئی تھی اور جیسا کہ بابر خود لکھتا ہے

دوپہر تک دشمن کی فوج شکست کھاکر تتر بتر ہوگئی۔ سلطان ابراہیم خود بھی مارا گیا اور اُس کے تقریباً پندرہ ہزار سپاہی کام آئے۔ بابر کہتا ہے کہ آگرہ جاکر وہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ اس لڑائی میں چالیس پچاس ہزار آدمی مارے گئے۔ لڑائی ختم ہونے پر بابر نے فوراً فوج کے دستے بھیج کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کرلیا اور ۲۷ اپریل کو دہلی کی جامع مسجد میں جمعہ کے خطبہ میں بابر کا نام پڑھا گیا۔

پانی پت کی لڑائی کے نتائج اور اُس کی اہمیت

تاریخ ہند میں یہ لڑائی بہت اہمیت رکھتی ہے دہلی کی سلطنت افغانوں سے نکل کر مغلوں کے ہاتھ میں آگئی۔ شاہان مغلیہ کا دورِ حکومت ہندوستان کی تاریخ کا سب سے بہتر اور اچھا زمانہ ہے۔ یہی نہیں کہ مغل بادشاہ نہایت قابل اور کامیاب حکمراں تھے اور اُنھوں نے سلطنت کو بہت وسیع کرلیا تھا، بلکہ اس زمانہ میں ہمارے ملک نے زندگی کے ہر شعبہ میں انتہائی ترقی کی اور دنیا کے سب سے زیادہ تہذیب اور ترقی یافتہ ملکوں میں شمار ہونے لگا۔ علوم و فنون کی حیرت انگیز ترقی کے علاوہ انتظام حکومت کی پائداری اور رعایا کے باہمی تعلقات کی خوشگواری ان بادشاہوں کی قابلیت اور کارگزاری کا بہترین ثبوت ہیں، غرضکہ ہندوستان کی کلچر اور تہذیب نے اسی عہد میں اور اسی حکومت کی سرپرستی میں نشو و نما پائی ہے اور اس شاندار سلطنت کا سنگ بنیاد پانی پت کے میدان میں رکھا گیا تھا۔ اب ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ پانی پت کی لڑائی اپنے نتائج کے لحاظ سے ہندوستان

کیا دنیا کی اہم لڑائیوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔

بابر کی مشکلات

بابر اپنی اس فتح پر اسقدر نازاں اور خوش تھا کہ اُس نے نہایت فراخ دلی سے لوگوں کو انعامات تقسیم کئے۔ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ضرور ملا۔ کابل میں ہر ایک کو خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت اُس نے اپنی شاندار کامیابی کی یادگار کے طور پر کم از کم ایک چاندی کا سکّہ ضرور بھیجا۔ ہمایوں کو بھی اسی موقع پر کوہ نور عطا ہوا تھا۔ لیکن اس اظہار خوشی سے یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ پانی پت کی لڑائی کے بعد بابر کا کام ختم ہو گیا۔ یہ فتح اُس کی کامیابی کے راستہ میں پہلی منزل تھی لیکن اُس کی دقتوں اور ذمہ داریوں کی ابتدا بھی یہیں سے ہوتی ہے۔ ہر طرف اُس کے دشمن موجود تھے جو اُس کو نکالنے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ خود اُس کے اپنے سپاہی اب یہاں ٹھہرنے کو تیار نہ تھے اور چاہتے تھے کہ کابل کو واپس چلے جائیں۔ اُن کا خیال تھا کہ دہلی و آگرہ فتح کرنے کے بعد لوٹ مار کر کے بابر کابل واپس آجائیگا۔ راجپوت اور ہندوستان کی دوسری قومیں بھی اسی خیال میں تھیں کہ بابر کا مقصد ہندوستان کی دولت کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اسی بنا پر راناسانگا نے اُس کو ہندوستان کے لئے مدعو کیا تھا لیکن ان لوگوں نے بابر کی شخصیت کو نہیں پہچانا تھا۔ بابر نے یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان میں اپنی سلطنت ضرور قائم کرے گا اور اُس کے اس ارادہ کو اب کوئی چیز نہیں

ع ہندوستان کے اکثر مورخوں نے بابر اور اُس کی اولاد کو "مغل" لکھا ہے اور اسی وجہ سے اُس سلطنت کو سلطنت مغلیہ کہتے ہیں۔ مغل لفظ منگول کی عربی شکل ہے ہم جانتے ہیں کہ تیمور ترک تھا نہ کہ مغل اور بابر بھی صرف ماں کی طرف سے مغل تھا۔ ایسی صورت میں بابر یا اُس کی اولاد کو مغل کہنا ایک زبردست تاریخی غلطی ہے لیکن یہ غلطی اب اس قدر عام ہو گئی ہے کہ اس کا دور ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ مگر کم از کم تاریخ کے طالب علموں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کے مغل بادشاہ درحقیقت 'مغل' نہ تھے بلکہ ترک تھے۔

بدل سکتی تھی۔ سب سے پہلی دقت اُس کے لئے اپنے ساتھیوں کی مخالفت تھی۔ اُس کو حل کرنے کی غرض سے اُس نے سرداروں کو جمع کیا اور اُن کو سمجھایا کہ کسقدر پریشانی اور مصیبت اُٹھا کر وہ اس ملک میں آئے ہیں اور اب خدا کے فضل سے اُن کا مقصد حاصل ہو گیا ہے۔ اس وقت واپس چلا جانا سخت غلطی ہے۔ اُس نے کہا "کوئی شخص جو میرا دوست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اب یہ بات زبان سے نہ نکالے اور جو یہاں ٹھہرنے سے ڈرتا ہے وہ واپس جا سکتا ہے" اس تقریر کا وہی اثر ہوا جو وہ چاہتا تھا۔ بابر نے اس موقع پر انتہائی ہمت اور دلیری سے کام لیا اور وہ کامیاب ہوا۔ اسی دوران میں ہمایوں نے جون پور اور غازی پور پر قبضہ کر لیا اور کالپی کے راستے سے آگرہ واپس آیا۔

بابر کی فتح راجپوتوں پر ۱۵۲۷ء

رانا سانگا میواڑ کا راجہ تھا۔ اُس نے قرب و جوار کی ریاستوں کو فتح کر کے میواڑ کو بہت وسیع کر لیا تھا۔ اُس کی بہادری کی شہرت تمام ملک میں پھیل چکی تھی اور بہت سے راجپوت سردار اُس کے مطیع تھے۔ اُس کا خیال تھا کہ دہلی اور آگرہ کو غارت کر کے بابر واپس چلا جائے گا۔ اس صورت میں اُسکو موقع مل جائیگا کہ شمالی ہندوستان میں ہندو سلطنت کی بنیاد ڈالے۔ اسی اُمید پر اُس نے بابر کو یہاں بلایا تھا لیکن اب بابر کا ارادہ صاف طور پر ظاہر ہو گیا۔ رانا سانگا نے مختلف راجپوت راجاؤں کو دعوت دی کہ وہ اپنی فوجیں ایک جگہ جمع کر کے دشمن کو ملک سے نکالدیں۔ اُس کی اس دعوت پر مارواڑ۔ گوالیار۔ اجمیر چندیری کے راجپوت راجہ اور میواتیوں کا سردار حسن خاں اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ آگئے۔ ادھر بابر بھی آگرہ سے روانہ ہو کر کنواہا کے قریب ایک بڑے میدان میں پہنچ گیا۔ راجپوتوں کی تعداد سلطان ابراہیم کی فوج سے بھی زیادہ

تھی ۔ بابر کا اندازہ دو لاکھ ہے، لیکن دوسرے مورخ ایک لاکھ بیس ہزار بتلاتے ہیں۔
کثرت تعداد اور راجپوتوں کی بہادری کے قصے سُن کر بابر کے سپاہیوں پر مُردنی
سی چھا گئی تھی۔ ان لوگوں کو اپنی عمر میں راجپوت سپاہیوں سے لڑنے کا یہ پہلا
موقع تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک شریر نجومی نے خطرناک پیشین گوئیاں کرکے سپاہیوں
کے دلوں کو اور بھی کمزور کردیا، لیکن بابر حسب معمول اپنے ارادے پر قایم رہا۔
اُس نے اپنے سرداروں کو جمع کیا اور اُن کو سمجھایا کہ ہر شخص کو آخر مرنا ہے۔
صرف خدا کی ذات ہمیشہ رہنے والی ہے۔ پھر بزدلی کے ساتھ جان بچا کر بھاگنے سے
کیا فائدہ؟ بہادر سپاہی کی طرح میدان جنگ میں کیوں نہ مریں۔ اُس نے اُن کو
بتلایا کہ اس وقت مقابلہ کفار سے ہے۔ اگر اس جنگ میں مارے گئے تو شہادت
کا درجہ ملیگا اور اگر کامیاب ہوئے تو غازی کہلائیں گے۔ اس تقریر کا اُن پر ایسا
اثر ہوا کہ سب نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا کہ وہ ہرگز میدان جنگ سے منہ
نہ موڑیں گے۔ بابر نے بھی عہد کیا کہ وہ اب شراب کبھی نہ پئے گا اور اپنے تمام برتن
جن میں شراب تھی سب کے سامنے توڑ ڈالے۔ اس عہد و پیمان کے بعد وہ راجپوتوں
سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار رہا۔ ۱۶ مارچ ۱۵۲۷ء کو دونوں فوجیں ایک دوسرے
کے مقابلے میں آئیں۔ راجپوت بہت بہادری سے لڑے لیکن بابر کے جنگ آزمودہ اور
جوش سے بھرے ہوئے سپاہیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ ہزاروں کی تعداد میں
مارے گئے اور باقی بھاگ گئے۔ رانا سانگا زندہ بچ گیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ
بعد وہ مر گیا۔ بابر نے اس فتح کے بعد غازی کا لقب اختیار کیا اور اس کی یادگار
میں مردہ سپاہیوں کی کھوپڑیوں سے ایک مینار تیار کرایا۔ بابر کے لئے یہ کامیابی
بہت مفید ثابت ہوئی جس عمارت کی بنیاد پانی پت میں رکھی گئی تھی وہ اب قریب
قریب تیار ہو گئی۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ اب اُس کے بعد اسکو لڑائی لڑنا نہیں

پڑی یا اب اُس کا کوئی دشمن باقی نہ تھا۔ اُس کے دشمن بھی موجود تھے اور لڑائیاں بھی لڑنی پڑیں۔ لیکن دہلی کی سلطنت پر اب وہ پورے طور پر قابض ہو گیا اور بحیثیت بادشاہ کے اُس کو اپنا ملک باغیوں اور دشمنوں سے پاک کرنا تھا۔ ایک سال کے اندر اُس نے افغان اور راجپوت سلطنتوں کو خاک میں ملا کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھدی۔ اسوقت تک اُس کی ساری عمر خانہ بدوشی اور مصیبت میں گذری تھی۔ لیکن اب وہ دور ختم ہو گیا۔ اس کی زندگی کا یہ نیا دَور نہایت مختصر لیکن نہایت شان دار ہے۔

بابر کی آخری فتوحات

اس لڑائی کے بعد بابر نے چندیری کا رُخ کیا۔ یہاں کا راجپوت سردار مدنی رائے بہت طاقتور اور با اثر تھا۔ راجپوت سپاہیوں نے جوہر کی رسم ادا کی یعنی عورتوں کو جلا کر دشمن کے مقابلہ کے لئے آگئے۔ بابر نے چندیری کے قلعہ پر قبضہ کر لیا اور راجپوتوں کو پھر شکست ہوئی۔ یہاں اُس کو خبر ملی کہ افغانوں کی فوج نے جونپور پر قبضہ کر لیا ہے چنانچہ وہ اُن کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ افغانوں کو پھر شکست ہوئی اور وہ بھاگ گئے۔ بابر آگرہ واپس آگیا اور کچھ عرصہ دم لے کر بہار کی جانب روانہ ہوا۔ یہاں ابراہیم کا بھائی محمود لودی جنگ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ اور بنگال کے بادشاہ نصرت شاہ کی مدد سے اُس نے ایک لاکھ سپاہی جمع کر لئے تھے اور بہار اور اودھ کا مالک بن بیٹھا تھا۔ اسوقت وہ مغلوں کی ایک فوج کو چنار کے قلعہ میں گھیرے ہوئے تھا۔ اس لئے بابر بھی چنار کی طرف روانہ ہوا۔ ۱۵۲۹ء میں افغان اور مغل فوجوں کا مقابلہ دریائے گنگا و گھاگرہ کے سنگم پر ہوا۔ افغانوں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ گئے۔ بنگال کے بادشاہ نصرت شاہ کے ساتھ بابر نے صلح کر لی۔ بابر کی یہ آخری جنگ اور فتح تھی اور اس میں

شک نہیں کہ اب وہ دہلی کی سلطنت کا مالک تھا۔

بابر کا انتظام سلطنت اور وفات ۱۵۳۰ء

اس لڑائی کے بعد بابر تقریباً ڈیڑھ سال زندہ رہا اور اس زمانہ میں جہاں تک ممکن ہو سکا اُس نے اپنی نئی سلطنت کے نظام حکومت کو سنبھالا۔ یہ ظاہر ہے کہ اس قدر کم مدت میں بابر کوئی نیا نظام جاری نہیں کر سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ اگر وہ زیادہ دنوں تک زندہ رہتا تو اس کوشش میں کامیاب ہو جاتا۔ اُس نے وہی نظام جاری رکھا جو لودیوں کے زمانہ میں تھا۔ سلطنت کے مختلف حصوں میں بڑے بڑے جاگیردار بھیجدیے گئے۔ ان میں سے اکثر بابر کے ساتھی تھے مگر کافی تعداد اُن لوگوں کی بھی تھی جو پہلے سے یہاں موجود تھے لیکن بابر کے عہد میں ان جاگیرداروں کے اختیارات اسقدر وسیع نہ تھے جیسے کہ لودیوں کے زمانہ میں تھے۔ متواتر لڑائیوں اور فراخدلی کے ساتھ انعامات تقسیم کرنے کی وجہ سے بابر کا خزانہ خالی ہو گیا تھا اور یہ بالکل صحیح ہے کہ ہمایوں کی تخت نشینی کے وقت مغلیہ سلطنت کی مالی اور سیاسی حالت نہایت کمزور تھی۔

بابر کی موت کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے۔ مورخوں کا بیان ہے کہ ۱۵۳۰ء میں اُس کا بڑا بیٹا ہمایوں بیمار پڑا اور بیماری اسقدر بڑھ گئی کہ اُس کی زندگی کی کوئی اُمید باقی نہ رہی۔ بابر اُس کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اُس نے درگاہ ایزدی میں دعا مانگی کہ اگر ہمایوں بچ جائے تو وہ اپنی جان دینے کو تیار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ دعا قبول ہوئی اور اُسی روز سے ہمایوں کی حالت بہتر ہوتی گئی اور بابر بیمار ہو گیا۔ بہرحال ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو بابر اس جہان سے کوچ کر گیا۔ اسوقت اُس کی لاش کو آرام باغ میں رکھا گیا لیکن کچھ عرصہ بعد اُس کے وصیت کے موافق اُس کو کابل لے گئے اور وہاں دفن کر دیا گیا۔ یہ خوشگوار مقام شہر کے نزدیک ہی ایک

پہاڑی کے دامن میں واقع ہے۔ شاہ جہاں نے وہاں ایک خوبصورت سنگ مرمر کی مسجد تعمیر کرکے اُس کی رونق کو دوبالا کر دیا ہے۔

بابر کی شخصیت اور اُس کے کارنامے

بابر کا نام دنیا کے بڑے بادشاہوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ اُس کا باپ ایک چھوٹی سی ریاست پر حکومت کرتا تھا۔ اُس کی عمر بارہ سال کی بھی نہ تھی کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر بابر نے ہمت، دلیری، استقلال اور کمال قابلیت سے دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ اُس کو اپنے بزرگوں کے ملک میں کامیابی نہ ہوئی لیکن کابل اور ہندوستان میں اُس نے ایک عظیم الشان سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اُس کا یہی ایک کارنامہ اُس کے نام کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے لیکن اس میں اور بہت خوبیاں تھیں جو مختصراً بیان کی جا سکتی ہیں۔

بابر کو شروع عمر سے میدان جنگ میں لڑائیاں لڑنی پڑیں اور یہ سلسلہ آخری دم تک جاری رہا۔ اس زمانہ میں مغل، ترک، اُزبک، افغان، راجپوت سبھی جنگجو قوموں سے مقابلہ ہوا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بابر ایک بہادر سپاہی ہونے کے علاوہ ایک قابل اور تجربہ کار افسر بھی تھا۔ لڑائی کے فن میں اُس نے بہت کمال حاصل کر لیا تھا۔ پانی پت اور کنواہا کی لڑائیوں میں جو نقشہ اُس نے جمایا تھا اُس کی تعریف تمام مورخوں نے کی ہے۔

اُس کے تعلقات سرداروں اور سپاہیوں سے نہایت اچھے تھے۔ وہ اُن کے ساتھ نیک سلوک کرتا تھا اور خود بھی سپاہیانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ وہ لوگ بھی اُس پر جان فدا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ بابر کو شروع زندگی میں بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وہ کبھی ہمت نہ ہارا اور آخر میں کامیاب ہوا۔ وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی بہت شرافت سے پیش آتا تھا۔ اُس کے بھائی جہانگیر مرزا نے دو مرتبہ اُس کے

ساتھ غداری کی لیکن جب اُس کے ایک سردار نے مشورہ دیا کہ جہانگیر مرزا کا کام تمام کر دینا چاہیئے تو اُس نے اس مشورہ کو نہیں مانا۔ وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں پر ہمیشہ مہربانی کرتا تھا اور اُن کے قصوروں کو معاف کر دیتا تھا۔ وہ نہایت خوش مزاج اور تیز طبع تھا۔ شراب کا عادی تھا لیکن اس حد تک نہیں کہ وہ اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ پیدا کرے۔ کنوا ہا کی لڑائی سے قبل شراب چھوڑنے کی قسم کھائی اور پھر کبھی چھوئی تک نہیں۔ وہ قدرتی مناظر سے بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ غالباً ہندوستان میں اُس کو سب سے زیادہ تکلیف اسی سے ہوتی تھی کہ کابل کے سے خوشنما اور خوشگوار مناظر قدرت یہاں نہ تھے۔ چنانچہ اُس نے وصیت کی تھی کہ مرنے کے بعد اُس کی لاش کو کابل ہی میں دفن کیا جائے۔

لیکن وہ چیز جس نے اُس کی شخصیت کو اسقدر ممتاز بنا دیا ہے اُس کی اپنی لکھی ہوئی سوانح عمری ہے۔ بابر شاعر بھی تھا اور نثار بھی۔ اُس کی مادری زبان تو ترکی تھی مگر وہ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ تزک بابری ترکی زبان میں لکھی گئی تھی۔ اکبر کے زمانہ میں عبدالرحیم خان خانخاناں نے اس کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اکثر بادشاہوں نے اپنی سوانح عمریاں لکھی ہیں یا لکھوائی ہیں، لیکن تزک بابری ان میں سب سے بہتر ہے۔ اُس کی بڑی خصوصیت تو یہ ہے کہ اُس میں بابر نے سب باتیں سچائی کے ساتھ بیان کی ہیں اور اپنی کمزوریوں اور غلطیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ہندوستان اُس کو کچھ زیادہ پسند نہ تھا کیونکہ وہ اپنی تزک میں یہاں کے آدمیوں کی زیادہ تعریف نہیں کرتا بلکہ بہت سی باتوں کی شکایت ہی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ نہ یہاں عمدہ قسم کے باغ ہیں اور نہ پھل۔ آدمی بھی اچھی شکل کے نہیں ہوتے۔ نیچے طبقے کے لوگوں کے مکانات اور لباس وغیرہ بھی کچھ قابل تعریف نہیں۔

اوپر بیان کئے ہوئے حالات اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطنت مغلیہ کا بانی بہت سی حیثیتوں سے ایک ممتاز شخص تھا۔ وسعت سلطنت اور نظام حکومت کے لحاظ سے اُس کے خاندان کے دوسرے بادشاہ بہت بڑھ گئے لیکن جو ذاتی اوصاف اور خوبیاں بابر میں تھیں اور جن کی وجہ سے وہ اپنے سرداروں اور ساتھیوں میں نہایت ہر دلعزیز تھا وہ ہندوستان کے کسی دوسرے بادشاہ میں نہیں پائی جاتیں۔ علوم و فنون میں جو ذوق سلیم اُس کو قدرت نے عطا کیا تھا اُس کو دیکھکر یہ ہرگز نہیں معلوم ہوتا کہ یہ وہی شخص ہے جس کو ہوش سنبھالنے سے پہلے دشمنوں سے مقابلہ کرنے اور انتظام سلطنت کو درست کرنے کی ذمہ داری کا بوجھ اُٹھانا پڑا تھا اور جس کا سلسلہ جنگ فتوحات اُس کی عمر کے آخری سال میں بھی جاری رہا۔ اُس کی ذاتی خوبیوں کا اعتراف ہر مورخ کو کرنا پڑتا ہے۔

باب ۳۰

ہمایوں اور شیر شاہ

نصیرالدین محمد ہمایوں ۱۵۰۸-۱۵۵۶ء

بابر کا سب سے بڑا بیٹا ہمایوں اُس کے بعد تخت پر بیٹھا۔ اسوقت ہمایوں کی عمر ۲۳ سال کی تھی اور بابر کے زمانہ میں وہ مختلف لڑائیوں میں لڑ چکا تھا اور سلطنت کے انتظام کا بھی اُس کو کافی تجربہ تھا۔ وہ بہادر بھی

تھا اور تعلیم یافتہ بھی۔ اُس میں وہ سب صفتیں موجود تھیں جو ایک عمدہ بادشاہ میں ہونی چاہئیں لیکن باوجود ان اوصاف کے وہ ناکامیاب رہا۔ اس ناکامیابی کی ذمہ داری ایک حد تک اُس پر خود بھی ہے لیکن ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ ایک طرف تو اُس کے دشمن نہایت ہوشیار اور چالاک تھے اور دوسری طرف اُس کے تینوں بھائیوں نے اُس کے ساتھ ہمیشہ بدسلوکی اور غداری کی۔ بابر نے ہمایوں کو وصیت کی تھی کہ وہ اپنے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ ہمایوں نے اس پر برابر عمل کیا اگرچہ اس سے اُس کو بہت نقصان پہنچا۔ تخت نشینی کے بعد اُس نے پہلا کام یہی کیا کہ اپنے بھائیوں کو بڑی بڑی جاگیریں اور عہدے دئے۔ مرزا کامران کو کابل اور قندھار عطا ہوئے۔ عسکری کے حصے میں سنبھل آیا اور الور مرزا ہندال کو ملا۔

ہمایوں کو ترکے میں سلطنت کے ساتھ بہت سی مصیبتیں بھی ملی تھیں۔ بابر نے افغانوں کو کئی لڑائیوں میں شکست دی۔ لیکن وہ کبھی اُن کی قوت بالکل تباہ نہیں کر سکا۔ چنانچہ ہمایوں کے زمانہ میں مغلوں سے سلطنت واپس لینے کی اُنھوں نے پھر کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب ہو گئے۔ ہمایوں کا دوسرا دشمن گجرات کا بادشاہ بہادر شاہ تھا۔ اُس نے اپنی سلطنت بہت وسیع کر لی تھی اور چاہتا تھا کہ راجپوتانہ بھی فتح کرے۔ اس کے علاوہ بابر نے ہمایوں کے لئے ایک خالی خزانہ چھوڑا تھا اور ایک ایسی فوج جس کے سپاہیوں کو ہندوستان کی سلطنت سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔

ہمایوں اور بہادر شاہ تخت نشینی کے بعد ہمایوں کو جونپور کے قریب چند افغان سرداروں کی بغاوت فرو کرنی پڑی۔ اُن کو شکست دے کر ہمایوں نے کالنجر فتح کیا اور اُس کے بعد بہار کی طرف روانہ ہوا۔ شیر خاں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے بیٹے کی سرکردگی میں پانچسو

سواروں کا ایک دستہ اُس کے ہمراہ بھیجدیا۔ لیکن یہ لوگ راستے ہی میں سے واپس لوٹ آئے۔

اس عرصہ میں سلطان بہادر شاہ گجراتی نے اپنی طاقت اور سلطنت میں بہت کچھ اضافہ کر لیا تھا۔ مالوہ فتح ہو چکا تھا۔ پرتگیزوں اور چتوڑ کے راجہ نے اُس کی اطاعت قبول کر لی تھی اور اب اُس کے ارادے بہت بلند تھے۔ سلطان ابراہیم لودی کے چچا عالم خاں اور اُس کے بیٹے تتار خاں نے گجرات کی سلطنت میں پناہ لی تھی اور ہمایوں کے دربار سے چند مغل امرا بھی بھاگ کر یہیں آ گئے تھے۔ ان لوگوں نے بہادر شاہ کو یہ سمجھا دیا تھا کہ اگر کوشش کی جائے تو سلطنت مغلوں سے واپس لی جا سکتی ہے۔ چنانچہ جب ہمایوں نے بہادر شاہ کو لکھا کہ ان باغیوں کو پناہ نہ دی جائے تو اُس نے کچھ پروا نہ کی۔

بہرحال ہمایوں بہار میں شیر خاں سے صلح کر کے واپس آیا اور گجرات کی طرف روانہ ہو گیا۔ بہادر شاہ بھی چتوڑ فتح کرنے کے بعد مندسور آیا کہ ہمایوں کا مقابلہ کرے لڑائی میں مغلوں کی فتح ہوئی اور بہادر بھاگ کر مانڈو پہنچا۔ ہمایوں نے اُس کا پیچھا کیا یہاں تک کہ اُس کو اپنی سلطنت چھوڑ کر پرتگیزوں کے پاس ڈیو میں جانا پڑا۔ مغلوں نے گجرات پر قبضہ کر لیا اور مرزا عسکری وہاں کا حاکم مقرر ہوا۔ اس حملہ میں ہمایوں نے چمپانیر کا قلعہ لیتے وقت بڑی بہادری کا ثبوت دیا۔ قلعہ بہت مضبوط تھا اور فتح نہیں ہوتا تھا۔ آخر کار مغلوں نے قلعہ کی اونچی دیوار میں میخیں ٹھوک کر چڑھنا شروع کیا۔ یہ طریقہ بیحد خطرناک تھا لیکن باوجود اس کے تقریباً تین سو سپاہی مغلوں کے چڑھ گئے اور اوپر پہنچنے والوں میں ہمایوں اکتالیسواں شخص تھا۔

ہمایوں اب گجرات سے واپس ہو کر مانڈو آیا اور کئی مہینے تک وہیں مقیم رہا۔ اُس کی عدم موجودگی میں گجراتیوں کو موقع مل گیا اور انہوں نے یکے بعد دیگرے

سب مقامات واپس لے لیے۔ کیونکہ ہمایوں کو مانڈو سے آگرہ آنا پڑا اور مرزا عسکری بھی گجرات سے چلا آیا تھا۔ لیکن گجراتیوں کی ان فتوحات سے بہادر شاہ کچھ فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ اس لیے کہ ۱۵۳۷ء میں وہ پرتگیزوں کے وائسرائے سے ملنے گیا اور وہیں سمندر میں گر گیا اور ڈوب کر مر گیا۔

شیر شاہ شیر شاہ سوری ہندوستان کے بہترین بادشاہوں میں شمار کیے جانے کا مستحق ہے۔ وہ ایک معمولی جاگیردار کا لڑکا تھا لیکن اپنی قابلیت کی وجہ سے اُس نے اسقدر ترقی کی کہ تخت دہلی کا مالک ہو کر مرا۔ اُس کے نظام سلطنت، منصف مزاجی اور بہادری کی ہر مورّخ نے تعریف کی ہے۔

فرید جس نے آخر میں شیر شاہ کا لقب اختیار کیا میاں حسن جاگیردار سہسرام کا سب سے بڑا لڑکا تھا۔ سوتیلی ماں کی وجہ سے وہ اسقدر پریشان تھا کہ ۱۴۹۴ء میں گھر چھوڑ کر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے جون پور چلا گیا۔ یہاں اُس نے بہت جلد عربی، فارسی تاریخ اور فقہ میں مہارت حاصل کر لی۔ تاریخ سے اُس کو خاص دلچسپی تھی اور پرانے زمانے کے لوگوں کی بہادری کے واقعات اور قصے بہت شوق سے پڑھتا تھا۔ اسی زمانہ میں جب حسین خاں جون پور آیا تو لوگوں نے سمجھایا کہ یہ بڑی غلطی ہے کہ ایسے ہونہار لڑکے کو اُس نے گھر سے نکال دیا ہے۔ آخر کار باپ اور بیٹے میں ملاپ ہو گیا اور سہسرام کی جاگیر کا انتظام فرید کو سپرد کیا گیا۔ اس کام کو اُس نے نہایت خوبی اور قابلیت سے انجام دیا لیکن پھر بھی اُس کا باپ اس سے ناراض ہی رہا اور فرید کو دوبارہ گھر چھوڑنا پڑا۔ اب وہ سلطان ابراہیم لودی کے دربار میں پہنچا اور کچھ دنوں کے بعد بہار خاں کی ملازمت اختیار کی۔ اسی ملازمت کے زمانہ میں اُسکو بہار خاں نے ایک شیر کے مارنے پر شیر خاں کا خطاب عطا کیا۔ اب افغانوں کی سلطنت ختم ہو چکی تھی اور بابر دہلی کے تخت کا مالک تھا۔ شیر خاں نے بھی کوشش کر کے

بابر کے دربار تک رسائی حاصل کی اور ایک سال سے زائد اُس کی ملازمت میں
رہا۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ نہ مغل اُس پر اعتبار کر سکتے ہیں اور نہ وہ مغلوں پر۔ لہذا
موقع پا کر وہ پھر بہار پہنچا اور سلطان محمد شاہ (بہار خاں) کے مرنے پر اُس کے
نابالغ لڑکے جلال خاں کا اتالیق مقرر ہوا۔

ہمایوں اور شیر خاں قنوج کی لڑائی

سنہ ۱۵۳۰ء میں شیر خاں نے چنار کے قلعہ پر قبضہ
کر لیا۔ اب ہمایوں نے اُس کے فتح کرنے کی
کوشش کی لیکن شیر خاں نے اس سے صلح
کر لی اور ہمایوں گجرات کی طرف چلا گیا۔ اس عرصہ میں شیر خاں نے بہار کی
سلطنت پر قبضہ کیا اور بعد میں بنگال کا کچھ حصہ بھی اس میں شامل کر لیا۔ ہمایوں
اسوقت آگرہ لوٹ آیا تھا۔ لیکن وہ یہ آسانی سے طے نہ کر سکا کہ پہلے شیر خاں کی بڑھتی ہوئی
قوت کو روکے یا مالوہ واپس لے۔ اس سوچ وچار میں کافی وقت ضائع کرنے
کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ پہلے شیر خاں کی روک تھام کی جائے اور سنہ ۱۵۳۷ء میں
اپنی پوری فوج لے کر اس طرف روانہ ہوا اور چنار کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ شیر خاں
اُسوقت بنگال میں لڑ رہا تھا۔ چنار کا قلعہ نکل جانے کی خبر سُن کر اُس نے اپنے
خاندان کے لوگوں کو رہتاس کے قلعہ میں بھیجدیا اور خود وہاں سے چل دیا۔ ہمایوں
چنار سے روانہ ہو کر غور پہنچا اور اُس کو فتح کر لیا لیکن اس کامیابی پر خوشی
منانے میں اُس نے بہت قیمتی وقت ضائع کر دیا چنانچہ شیر خاں کی فوجوں نے چنار
اور جونپور کا محاصرہ کر لیا اور جب ہمایوں واپس ہوا تھا تو افغانوں نے گنگا کے
قریب اُس کو روکا۔ چونسہ کے میدان میں لڑائی ہوئی مغلوں نے شکست کھائی اور
ہمایوں کو اپنی جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ اب وہ اسقدر پریشان تھا کہ اگر نظام سقہ
اُس کو اپنی مشک نہ دیتا تو شاید وہ دریا میں ڈوب کر مر جاتا۔ نظام کو اس خدمت

کے انعام میں بادشاہ نے کچھ گھنٹوں کے لئے اپنی گدی پر بیٹھنے اور حکومت کرنے کی اجازت دی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں احسان فراموش نہ تھا۔

ہمایوں کی آخری شکست

چونسہ کی لڑائی کے بعد شیرخاں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اُس نے شیرشاہ کا لقب اختیار کیا اور سکہ اور خطبہ اپنے نام پر جاری کیا ہمایوں نے بہت کوشش کی کہ اپنے بھائیوں کو ساتھ ملاکر پٹھانوں کا مقابلہ کرے لیکن اُسکو کامیابی نہ ہوئی اور تنہا ہی اپنی فوج لے کر جانا پڑا۔ مغلوں اور پٹھانوں کی یہ اہم لڑائی قنوج کے میدان میں ہوئی۔ دونوں فریق بڑی بہادری سے لڑے مغلوں کو شکست ہوئی اور وہ بھاگ نکلے۔ اب ہمایوں کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ تھا کہ اپنے دارالسلطنت کو چھوڑ کر کہیں اور پناہ لے۔

شیرشاہ کی سلطنت سنہ ۱۵۴۰-۱۵۴۵ء

شیرشاہ ہمایوں کا پیچھا کرتا ہوا پنجاب پہنچ گیا اور بمشکل تمام گکھڑوں سے لڑ کر شمالی پنجاب اور سرحدی ضلعوں پر قبضہ کیا۔ اس کے بعد اُس نے مالوہ اور سندھ رائے سین کو اپنی سلطنت میں شامل کیا اور جودھپور کے راجہ کے خلاف لڑائی شروع کی۔ راجپوت بہت بہادری سے لڑے لیکن آخر میں اُن کو شکست ہوئی اور راجپوتانہ کا اکثر حصہ سوری سلطنت میں شامل ہو گیا۔ شیرشاہ کی زندگی کا آخری فوجی کارنامہ کالنجر کے قلعہ کا محاصرہ تھا۔ یہ محاصرہ کئی مہینہ تک جاری رہا اور راجپوتوں نے پٹھانوں کو بہت پریشان کیا۔ مگر جس وقت قلعہ فتح ہونے کے قریب تھا تو بارود کے خزانہ میں آگ لگ گئی اور شیرشاہ زخمی ہو گیا قلعہ تو فتح ہو گیا لیکن ۲۲ مئی سنہ ۱۵۴۵ء کو یہ لائق بادشاہ پانچ سال کی مختصر حکومت کے بعد مر گیا۔ اسوقت اُس کی سلطنت تمام شمالی ہندوستان

پر قایم ہو چکی تھی۔ یہ کوئی معمولی کام نہ تھا کیونکہ اس ملک کی تاریخ میں بہت کم بادشاہ ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے اسقدر کم مدت میں اتنا زیادہ ملک فتح کیا ہو۔ لیکن شیرشاہ کا سب سے بڑا کارنامہ اُس کا وہ نظام حکومت تھا جس پر مغلوں نے اپنی مضبوط اور پائدار سلطنت قایم کی۔ مورخوں کا خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ اگر شیرشاہ زیادہ عرصہ تک زندہ رہتا تو ہمارے ملک کی تاریخ بالکل بدلی ہوئی ہوتی۔

شیرشاہ کا نظام حکومت

شیرشاہ نے اپنی سلطنت کو ۴۷ حصّوں میں تقسیم کیا تھا جو سرکار کہلاتے تھے اور ہر سرکار میں بہت سے پرگنے تھے۔ ہر پرگنہ میں ایک شقدار۔ ایک امین۔ ایک منصف۔ ایک خزانہ دار اور دوسرے چھوٹے سرکاری ملازم رکھے جاتے تھے۔ ان کے علاوہ پٹواری، مقدم اور چودھری ہوتے تھے جو مالگزاری وصول کرنے میں بہت مدد دیتے تھے۔ اسی طرح سرکار کے لیے شقدارِ شقداران اور منصفِ منصفان کا تقرر کیا جاتا تھا۔ شقدار فوجی افسر تھا۔ امین مالگزاری جمع کرتا تھا اور منصف مقدمات وغیرہ طے کرتا تھا۔ شیرشاہ نے تمام زمین کی باقاعدہ اور صحیح پیمائش کرائی اور اُس کے بعد پیداوار کا ایک چوتھائی حصّہ گورنمنٹ وصول کر لیتی تھی۔ سرکاری مالگزاری نقد بھی دیجا سکتی تھی اور جنس کی شکل میں بھی۔ وہ رعیت کو ہر طرح کی آسانی بہم پہنچانے کی کوشش کرتا تھا کیونکہ اسی میں اس کا فائدہ تھا۔ چنانچہ خشک سالی وغیرہ کے موقع پر اُن کی مدد کرتا تھا۔ اسی طرح فوجی انتظام میں بھی اُس نے بہت اصلاحیں کیں۔ اُس کو علاءالدین کا فوجی انتظام بہت پسند تھا اس نے بہت سی چیزیں جو علاءالدین کے زمانہ میں تھیں پھر رواج پا گئیں۔ مثلاً گھوڑوں پر داغ لگانے کا دستور۔ شیرشاہ کی فوج میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ سوار

اور پچپن ہزار پیادے تھے۔ وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ مہربانی سے پیش آتا تھا۔ اُن کو رعایا پر ظلم نہیں کرنے دیتا اور اس بات کا خاص طور سے خیال رکھتا تھا کہ فوجی سپاہی کسانوں کی فصلوں کو برباد نہ کریں اور جو ایسا کرتے تھے اُن کو سخت سزا دیتا تھا۔ شیر شاہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھا اور کوشش کرتا تھا کہ رعایا کے معاملات میں انصاف کیا جائے۔ پولیس کا انتظام بھی اُس کے زمانہ میں بہت عمدہ تھا اور مجرموں کو بہت سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ شیر شاہ کا ایک زبردست کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے اپنے ملک میں سڑکیں تیار کرائیں۔ سب سے بڑی سڑک بنگال سے پنجاب تک جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک سڑک آگرہ سے راجپوتانہ کو اور دوسری برہان پور کو جاتی تھی۔ ایک اور سڑک لاہور سے ملتان تک بنوائی۔ ان سڑکوں کے دونوں طرف سایہ دار درخت تھے اور تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر سرائیں تھیں جہاں ہندو اور مسلمان دونوں کے قیام اور کھانے کا انتظام بادشاہ کی طرف سے تھا۔ یہ سرائیں۔ ڈاک چوکی کا بھی کام دیتی تھیں اور ان کے ذریعہ سے بادشاہ کو ملک کے ہر حصہ کی خبریں پہنچتی تھیں۔

شیر شاہ کے انتظام حکومت کے اس مختصر بیان سے ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ شخص کس قدر محنتی اور قابل تھا اور رعایا کے آرام اور خوشی کی اُس کو کس قدر فکر تھی۔ اُس کا مشہور قول ہے کہ جو شخص بڑا ہوتا ہے وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کام کرتا رہتا ہے۔ وہ خود بھی اسی اصول پر کاربند تھا اور پانچ سال کے اندر اُس نے وہ کام کیا جو دوسرے اس سے زیادہ مدت میں بھی نہ کر سکے۔ وہ سلطنت کے ہر معاملہ کو خود دیکھتا اور اس کا انتظام کرتا تھا۔ صبح کو بہت سویرے اُٹھتا تھا اور نماز وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنا کام شروع کر دیتا۔ کھانا کھا کر کچھ دیر آرام لیتا تھا اور پھر کام شروع کر دیتا۔ اس کا سلوک رعایا کے ساتھ بہت اچھا تھا اور غریبوں اور مفلسوں کا

خاص طور پر خیال رکھتا تھا۔ وہ ایک پکا مسلمان تھا اور اسلام کے احکام کی پورے طور سے پابندی کرتا تھا۔ باوجود اس کے غیر مسلموں سے اس خوبی اور مہربانی سے پیش آتا تھا کہ وہ سب اُس کی حکومت پسند کرتے تھے اور اُس سے خوش تھے۔ اُس نے یہ ثابت کر دکھلایا کہ ایک مسلمان بادشاہ اپنے مذہب پر قایم رہ کر بھی اپنی غیر مسلم رعایا کو اسقدر خوش رکھ سکتا ہے جیسا کہ اکبر نے مذہب میں تبدیلی کر کے کیا۔ مختصر یہ کہ شیر شاہ کی ہستی اس ملک کی تاریخ میں ایک مایۂ ناز ہستی ہے۔ اُس نے ایک ایسے نظام حکومت کی بنیاد ڈالی جس کو مغلوں نے مکمل کیا اور جس قدر پائدار اور اچھا ثابت ہوا کہ مغلوں کے بعد بھی تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ جاری رہا اور بہت حد تک اس وقت بھی موجود ہے۔

ہمایوں کی واپسی اور وفات
سنہ ۱۵۵۵-۱۵۵۶ء

قنوج کی لڑائی کے بعد ہمایوں بھاگ کر آگرہ آیا اور وہاں سے دہلی ہوتا ہوا لاہور پہنچا۔ کامراں نے اُس کی مدد نہیں کی اور وہ سندھ اور راجپوتانہ کے ریگستان میں کچھ دنوں تک مارا مارا پھرا۔ اسی زمانہ میں امرکوٹ کے قلعہ میں ۱۵۴۲ء میں اس کا لڑکا اکبر پیدا ہوا۔ ہمایوں کی اس زمانہ کی مصیبتوں اور پریشانیوں کا حال ہم کو اُس کے ملازم جوہر کی مشہور تاریخ تذکرۃ الواقعات میں ملتا ہے۔ اپنے باپ کی طرح ہمایوں نے بھی اس خانہ بدوشی کی زندگی میں سب تکلیفوں کا مقابلہ بڑی بہادری اور صبر کے ساتھ کیا۔ جب اُس نے دیکھا کہ یہاں کوئی صورت بہتری کی نظر نہیں آتی تو وہ قندھار کی طرف چلا گیا۔ یہاں اُس کا بھائی عسکری حکومت کرتا تھا لیکن کامراں کی طرح اُس نے بھی اپنے بڑے بھائی کی مدد نہیں کی اور مجبوراً ہمایوں کو ایران جانا پڑا۔ ایران کا بادشاہ اس وقت شاہ طہماسپ اوّل تھا۔ اُس کی مدد سے ہمایوں

نے ۱۵۴۵ء میں عسکری سے قندھار چھین لیا۔ لیکن اُس کے سب قصوروں کو معاف کر دیا۔ اسی طرح دو مہینہ بعد کامراں کو شکست دے کر کابل پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب اُس کی حالت تقریباً وہی تھی جو چالیس سال پہلے اُس کے باپ کی تھی، چند سال کے بعد اُس کو موقع مل گیا اور اُس نے اپنی سلطنت افغانوں سے واپس لے لی۔

شیر شاہ کی وفات کے بعد اُس کا دوسرا لڑکا اسلام شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا۔ یہ سلطنت کے کاروبار کو نہیں سنبھال سکا اور اُس کی سات سالہ حکومت میں مالوہ، بنگال اور ملک کے دوسرے حصوں میں بہت سی بغاوتیں ہوئیں اور سلطنت بیحد کمزور ہو گئی۔ جب ۱۵۵۳ء میں وہ مر گیا تو اُس کی بیوی کے بھائی نے اُس کے بارہ سال کے لڑکے کو قتل کر ڈالا اور خود تخت پر بیٹھا اور محمد عادل شاہ کا لقب اختیار کیا۔ محمد عادل شاہ چونکہ عیاش اور آرام طلب تھا اس لئے سلطنت کا سب کام ہیموں بقال کے سپرد کر رکھا تھا اور خود اکثر بہار میں رہتا تھا اور اُس کے دو رشتہ کے بھائی ابراہیم اور سکندر سوری نے اُس کے خلاف بغاوت کر کے دہلی اور پنجاب پر قبضہ کر لیا تھا۔ ہمایوں کو اس سے بہتر کیا موقع مل سکتا تھا چنانچہ نومبر ۱۵۵۴ء میں پندرہ ہزار سوار لے کر وہ کابل سے روانہ ہوا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ کچھ عرصے کے بعد اُس کی فوج نے سرہند کے نزدیک ماچھیواڑہ میں سکندر سوری کو شکست دی اور جولائی ۱۵۵۵ء میں ہمایوں ایک فاتح کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوا۔ اُس نے شہزادہ اکبر اور بیرم خاں کو سکندر کا پیچھا کرنے کے لئے پنجاب ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ لیکن ہمایوں ایک بدقسمت آدمی تھا اور اپنی اس کامیابی کے چھ مہینہ بعد ہی وہ اپنے محل کی سیڑھیوں پر سے پھسل کر گر گیا۔ اُس کے سر میں سخت چوٹ آئی اور تین دن بیہوش رہنے کے بعد مر گیا۔ اُس کی

موت کی خبر فوراً بیرم خاں کو بھیجی گئی۔ بیرم خاں بہت سمجھدار آدمی تھا۔ چنانچہ اُس نے بہت جلد انتظام کر کے شہزادہ اکبر کی تخت نشینی کا اعلان اور تاجپوشی کی رسم کلانور ضلع گورداس پور میں ادا کرادی۔ اس وقت اکبر کی عمر چودہ سال سے کم تھی۔

ہمایوں کی تقریباً تمام زندگی مصیبتوں اور تکلیفوں ہی میں گذری شہزادگی کے زمانہ میں بھی اُس کو زیادہ چین اور آرام نہ ملا تھا اور بادشاہت کا زمانہ تو اُس کے لئے ایک مستقل مصیبت تھا۔ بابر اپنی حکومت اچھی طرح قایم نہیں کر سکا تھا کہ وہ مرگیا ہمایوں کو بہت سے دشمنوں سے مقابلہ کرنا پڑا اور آخر کار پٹھانوں نے اُس کی سلطنت چھین لی۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ ہمایوں بزدل اور نالایق تھا۔ اس نے بہت سے موقعوں پر بڑی بہادری دکھلائی اور نہایت دلیری کے ساتھ لڑا۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ بعض اوقات وہ بہت کاہل اور سست ہو جاتا تھا۔ گجرات اور بہار دونوں جگہ تھوڑی سی کامیابی کے بعد اُس نے اپنا وقت ضائع کیا اور دشمن کو قوت بڑھالینے کا موقع دیا۔ وہ اپنے باپ کی طرح مستقل مزاج بھی نہ تھا اور بہت جلد اپنی رائے تبدیل کر دیتا تھا۔ لیکن اُس کی پریشانی کا سب سے بڑا سبب اُس کے اپنے بھائی تھے۔ اُس کے باپ کی وصیت تھی کہ اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ ہمایوں نے اس پر عمل کیا لیکن انھوں نے اس کا جواب ہمیشہ غداری اور مخالفت ہی سے دیا اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ بڑی حد تک اُس کی ناکامیابی کی ذمہ داری اُس کے بھائیوں پر ہے۔ ہمایوں قدرتاً نرم دل اور فیاض تھا۔ بابر کی طرح شاعری سے اُس کو بھی دلچسپی تھی اور کبھی کبھی خود بھی شعر کہتا تھا۔ علم دوست تھا اور عالموں کی قدر کرتا تھا۔ ایک بڑی خوبی اس میں یہ تھی کہ جو شخص اُس کے ساتھ کوئی احسان کرتا تھا تو اُس کو وہ کبھی نہیں بھولتا تھا۔

باب ۳۱

جلال الدین اکبر بادشاہ

۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ء

اکبر کے ابتدائی حالات اور تخت نشینی ۱۵۴۲-۱۵۵۶ء تم کو یاد ہوگا کہ جس وقت اکبر پیدا ہوا تھا ہمایوں خانہ بدوشوں کی طرح راجپوتانہ میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ ابھی اکبر بچہ ہی تھا کہ اُس کو اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ ہمایوں کے بھائیوں نے اُس کے ساتھ بُرا سلوک کیا اور اُس کو مجبوراً شاہ ایران سے مدد مانگنی پڑی۔ لیکن مرزا عسکری کی بیوی نے اپنے بھتیجے کو قندھار میں اپنے پاس رکھ لیا۔ ایران سے واپس آکر ہمایوں نے قندھار اور کابل فتح کر لئے۔ اکبر بھی اُس کے پاس آگیا۔ لیکن باوجود ہمایوں کی انتہائی کوشش اور اتنی انتہائی ذہانت کے اکبر نے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا۔ اُس کو کھیل کود۔ شکار۔ گھوڑے کی سواری۔ تیر اندازی اور اسی قسم کی اور چیزوں کا شوق تھا۔ بعد میں علم و ادب۔ شعر۔ شاعری اور فلسفہ و مذہب سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا مفصل حال دوسری جگہ پر لکھا جائیگا۔ ۱۵۵۶ء میں ہمایوں کی وفات کے وقت اکبر کی عمر چودہ سال سے کم تھی۔ اسوقت وہ اپنے باپ کے وفادار دوست اور سردار بیرم خاں کے ساتھ پنجاب میں پٹھانوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ یہ خبر پاتے ہی یہ مناسب خیال کیا گیا کہ اکبر کی تخت نشینی کا

اعلان کر دیا جائے تاکہ مخالفین کو سازش وغیرہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ چنانچہ اس عظیم الشان بادشاہ کی تخت نشینی کی رسم کلانور کے ایک باغ میں ادا کی گئی۔ اس وقت یہ کوئی خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ نوعمر لڑکا ہندوستان ہی نہیں بلکہ دنیا کے بڑے بادشاہوں میں شمار کیا جائیگا۔ اکبر کے سامنے بہت سی مشکلات تھیں۔ ہمایوں نے صرف دہلی اور آگرہ پر قبضہ کیا تھا۔ باقی ملک دوسروں کے ہاتھوں میں تھا۔ تین سوری بادشاہ مختلف علاقوں میں حکومت کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک یعنی عادل شاہ سوری نے ریواڑی کے ایک بنئے ہیمو کو اپنا سپہ سالار بنا کر ہمایوں کے خلاف بھیجا تھا۔ اُس کے پہنچنے سے پہلے ہی ہمایوں کا انتقال ہو گیا۔ ہیمو نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور آگرہ د دہلی کی طرف بڑھا۔ تردی بیگ جو دہلی کا گورنر تھا ہیمو کا مقابلہ نہ کر سکا اور دوسرے سرداروں کو ساتھ لے کر دہلی سے روانہ ہو گیا ہیمو نے فوراً دہلی پر بھی قبضہ کر لیا۔ تردی بیگ بھاگ کر بادشاہ کے پاس سرہند پہنچا لیکن بیرم خاں نے اُس کو فوراً قتل کرا دیا۔ کیونکہ اُس نے بہت بزدلی کا اظہار کیا تھا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی ۱۵۵۶ء

اب ہیمو کی طاقت بہت بڑھ گئی تھی۔ اُس نے راجہ بکرماجیت کا لقب اختیار کر لیا تھا اور ہندوستان کی حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ادھر مغلوں کے کیمپ میں یہ سوال پیش تھا کہ ہیمو کا مقابلہ کیا جائے یا کابل واپس جائیں۔ آخر میں بیرم خاں کی رائے مانی گئی اور مقابلہ کے لیے فوج روانہ ہوئی۔ دونوں فوجیں پانی پت کے تاریخی میدان میں مقابل ہوئیں۔ ہیمو کے پاس ایک لاکھ سپاہی تھے اور مغل فوج کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ہیمو کو اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اور اسی وجہ سے اُس میں غرور بھی

پیدا ہو گیا تھا۔ لڑائی شروع ہونے پر مغلوں کی فوج کے دونوں بازوؤں کو شکست
ہوئی اور ہیمو اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر دشمن کی فوج کے قلب یعنی مرکزی حصہ پر حملہ
کر رہا تھا کہ اُس کی آنکھ میں ایک ایسا تیر لگا کہ وہ بیہوش ہو گیا۔ اُس کا ہاتھی بھاگ
گیا اور تمام فوج تتر بتر ہو گئی۔ ہیمو گرفتار ہوا اور نوجوان بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔
بیرم خاں کے اشارے پر اکبر نے اُس کا کام تمام کیا۔ لیکن ایک دوسری روایت
کے مطابق نوجوان اور بہادر شاہ نے ایک بے بس دشمن پر تلوار اُٹھانے سے انکار کر دیا
اور بیرم خاں نے خود اپنے ہاتھ سے ہیمو کو قتل کیا۔ ہیمو کا سر کابل بھیجدیا گیا اور نعش دہلی
کے ایک دروازہ پر لٹکا دی گئی۔

بیرم خاں کی بغاوت ۱۵۵۶-۱۵۶۰ء

لڑائی کے دوسرے ہی دن اکبر دہلی میں داخل ہوا۔
لیکن ابھی ملک کا بہت تھوڑا حصہ اُس کے قبضہ
میں تھا۔ ایک مہینہ بعد اُس نے پنجاب کی طرف جاکر
سکندر سوری کا پیچھا کیا۔ ۱۵۵۷ء میں سکندر سوری نے مغلوں کی اطاعت
قبول کر لی۔ اکبر نے اُس کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا اور بہار میں اُس کو جاگیر
عطا کی۔ پنجاب فتح کرنے کے بعد اکبر آگرہ واپس آیا اور سیر و شکار میں مشغول ہو گیا۔
اس کے سرداروں نے اسی زمانہ میں جونپور اور گوالیار پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب اکبر
کے دشمنوں میں سے کوئی ایسا باقی نہ تھا جو اُس کے مقابلے کے لئے تیار ہوتا۔

تخت نشینی کے وقت اکبر کی عمر ۱۳ سال کی تھی اور سلطنت کی باگ اُس کے
اتالیق بیرم خاں کے ہاتھ میں تھی۔ بیرم خاں ہی نے مغلیہ سلطنت کو پٹھانوں سے
بچایا اور اُسی نے امن و امان قائم کر کے حکومت میں استقلال اور استحکام پیدا کیا۔
لیکن افسوس ہے کہ دربار میں بہت سے سردار اور امرا بیرم خاں کے خلاف تھے
بیرم خاں شیعہ تھا اور اپنے فرقہ کے لوگوں کے ساتھ جا اور بیجا رعایت کرتا تھا۔

اُس میں کچھ غرور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ چار سال کے عرصہ میں اُس نے بہت سے ایسے کام کئے جو دوسرے امیروں کو ناگوار معلوم ہوئے اور اُنہوں نے اپنے نوجوان بادشاہ کے کان بھرنے شروع کر دئے۔ اکبر بھی اب اٹھارہ برس کا ہو گیا تھا اور اُس کے دل میں خواہش تھی کہ حکومت کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے۔ ۱۵۶۰ء میں وہ آگرہ سے شکار کے لئے روانہ ہوا اور وہیں سے سیدھا اپنی والدہ سے ملنے کے لئے دہلی چلا گیا۔ دہلی پہنچکر اُس نے بیرم خاں کے نام فرمان بھیجدیا کہ اب وہ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے اور اُس کے (یعنی بیرم خاں) کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ حج کے واسطے مکہ معظمہ چلا جائے۔ بیرم خاں کے ساتھیوں نے اُس کو بغاوت کا مشورہ دیا لیکن اُس نے اس پر عمل نہ کیا اور اپنے آقا کے حکم کے مطابق حج کی تیاری شروع کر دی۔ اکبر نے ایک اپنے ملازم پیر محمد خاں کو بھیجا کہ بیرم خاں کو بندرگاہ تک پہنچا دے۔ بیرم خاں یہ ذلت برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ کیونکہ پیر محمد خاں ایک زمانہ میں اُس کا خود ملازم تھا جس کو اُس نے ناراض ہو کر نکال دیا تھا۔ چنانچہ اُس نے بغاوت کی اور پنجاب کی طرف چلا گیا۔ جالندھر کے قریب شاہی فوج نے اُس کو شکست دی اور گرفتار کر لیا گیا۔ اکبر نے اُس کا قصور معاف کر دیا اور پھر حج کی اجازت دیدی۔ راستہ میں پٹن کے مقام پر ایک سپاہی نے جس کا باپ اُس کے ہاتھ سے مارا گیا تھا بیرم خاں کو قتل کر دیا۔ بیرم خاں کے لڑکے عبدالرحیم نے اکبر کی سرپرستی میں تعلیم و تربیت پائی اور اپنے باپ سے بھی زیادہ عزت اور شہرت حاصل کی۔

اکبر کی ذاتی حکومت کا ابتدائی دور ۱۵۶۰-۱۵۶۴ء

اکبر کی عمر ابھی اٹھارہ ہی سال کی تھی اور بیرم خاں کے بعد اُس پر ایک دوسری جماعت نے

جس میں اُس کی رضاعی ماں ماہم انگہ بھی شامل تھی اپنا اثر قایم کرلیا۔ بہرحال اکبر کی فتوحات اور نظام حکومت کا اصلاح کا سلسلہ اسی وقت سے شروع ہوتا ہے۔

۱۵۶۱ء میں اُس نے مالوہ فتح کرنے کے لئے ماہم انگہ کے لڑکے ادہم خاں اور پیر محمد خاں کو بھیجا۔ وہاں کے بادشاہ باز بہادر کو شکست ہوئی اور شاہی فوج نے مالوہ پر قبضہ کرلیا۔ اکبر کو خبر ملی کہ ادھم خاں بہت ظلم کر رہا ہے وہ فوراً مالوہ گیا اور ادہم خاں کی بجائے پیر محمد خاں کو وہاں کا گورنر مقرر کیا۔ پیر محمد خاں بھی ظالم تھا لیکن وہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہا اور باز بہادر کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے نربدا میں ڈوب کر مرگیا۔ باز بہادر کئی سال تک اِدھر اُدھر مارا مارا پھرا۔ آخرکار اُس نے اکبر کی اطاعت قبول کرلی اور اُس کے اُمرا میں شامل ہوگیا۔ مالوہ کے بعد گونڈوانہ کی ہندو ریاست بھی سلطنت میں شامل کرلی گئی۔ اسی زمانہ میں ادہم خاں نے اکبر کے وزیر شمس الدین خاں کو شاہی محل کے اندر قتل کرڈالا۔ اکبر فوراً اپنے کمرہ سے نکل کر وہاں پہنچا اور ادہم خاں کو محل کی چھت پر سے نیچے پھنکوا دیا۔ اس کے بعد اُس کی ماں کے پاس گیا اور سارا واقعہ اُس کو سُنایا۔ ماہم انگہ نے کہا کہ حضور نے بہت اچھا کیا۔ مگر اُس کو ایسا صدمہ ہوا کہ چالیس دن کے اندر وہ خود بھی مرگئی۔ ماہم انگہ کے مرنے سے عورتوں کا جو اثر اکبر پر تھا جاتا رہا۔ اب وہ تقریباً بالکل آزاد ہوگیا اور سلطنت کے کُل معاملات اُس نے اپنے ہاتھ میں لے لیے۔

اُزبک سرداروں کی بغاوت

اکبر کے دادا بابر کو اُزبکوں ہی نے سمرقند سے نکالا تھا۔ اسی قبیلے کے بعض سردار مغلوں کی ملازمت کرکے بہت قوت اور اثر حاصل کرچکے تھے۔

ان میں سب سے پہلے عبداللہ خاں اُزبک نے جو مالوہ کا گورنر تھا بغاوت کی۔ اکبر فوراً مانڈو گیا اور اُس کو شکست دے کر گجرات کی طرف بھگا دیا۔ عبداللہ خاں وہاں سے بھاگ کر جون پور پہنچا اور خاں زماں سے مل گیا۔ خان زماں جونپور کا گورنر تھا اور عبداللہ خاں کی طرح باغی ہو گیا تھا۔ لیکن اکبر نے دونوں کی متحدہ فوج کو بھی شکست دے کر بھگا دیا اور جون پور پر قبضہ کر لیا۔ ان سب بغاوتوں سے زیادہ خطرناک اُس کے بھائی مرزا حکیم کا حملہ تھا۔ کیونکہ اسوقت بنگال میں خان زماں نے پھر بغاوت کا اعلان کر دیا تھا لیکن اکبر ذرا بھی نہ گھبرایا اور مقابلہ کے لئے فوراً پنجاب کی طرف روانہ ہوا۔ حکیم میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اکبر کا مقابلہ کرتا۔ وہ اُس کے پہنچنے سے پیشتر ہی کابل کی طرف بھاگ گیا۔ اکبر آگرہ واپس آیا۔ اور خان زماں کی سرکوبی کے لئے پھر شرق کی جانب گیا۔ خان زماں لڑائی میں مارا گیا۔ اُس کے ساتھیوں میں سے کچھ بھاگ گئے اور باقی گرفتار ہوئے جن کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اکبر کے لئے یہ تین چار سال بہت سخت تھے لیکن اُس نے بڑی بہادری اور قابلیت سے باغیوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوا۔

اکبر اور راجپوت اکبر بڑا ہوشیار ذہین اور ذکی الفہم تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان میں حکومت کی جڑ مضبوط کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہاں کے رہنے والوں کی خوشنودی حاصل کی جائے اس مقصد کے حاصل کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہی تھا کہ ہندوؤں سے تعلقات پیدا کئے جائیں اور سلطنت کے کاموں میں اُن کو حصہ دار بنایا جائے۔ چنانچہ اُس نے ہندوؤں کو اور خاص طور پر راجپوتوں کو بڑے بڑے عہدے اور منصب دئے اور راجپوت لڑکیوں سے شادیاں بھی کیں۔ اُس کا یہ طریقہ عمل

نہایت کامیاب ثابت ہوا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُس کے اور اُس کے
جانشینوں کے زمانہ میں
راجپوتوں نے مغلوں کی
بہت مدد کی اور سلطنت
قایم کرنے اور مضبوط بنانے
میں بہت بڑا حصّہ لیا۔ اکبر
کو ایک بڑا فائدہ راجپوتوں
کی دوستی سے یہ بھی ہوا
کہ افغانوں اور اُزبک
سرداروں کا غرور گھٹ
گیا۔ پہلا راجپوت جس نے
اپنی بیٹی کی شادی اکبر کے
ساتھ کی امیر (جے پور) کا
راجہ بہارمل تھا۔ ۱۵۶۲ء

(اکبر)

میں جبکہ اکبر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار پر حاضری کی غرض سے
اجمیر جارہا تھا تو بہارمل اُس کے پاس آیا اور سرکاری ملازمت کی خواہش کی۔
اکبر نے اُس کی اس درخواست کو منظور کر لیا اور اجمیر سے واپسی میں اُس
کی بیٹی سے شادی کی اور اُس کے بیٹے اور پوتے کو جن کا نام بھگوان داس
اور مان سنگھ تھا اپنے درباریوں میں شامل کر لیا۔ پہلے مسلمان بادشاہوں
نے بھی ہندو شہزادیوں سے شادیاں کی تھیں لیکن یہ شادی ہمارے ملک کی
تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۵۷۰ء میں اکبر نے بیکانیر اور

جیسلمیر کی راجکماریوں سے شادی کی اور اُس کے بیٹے سلیم کی شادی بھی بھگوان داس کی بیٹی سے ہوئی۔

چتوڑ کی فتح ۱۵۶۷ء

اب بھی کئی راجپوت ریاستیں ایسی تھیں جنہوں نے اکبر کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ ان میں سب سے پہلی ریاست جس پر اکبر نے حملہ کیا چتوڑ تھی۔ وہاں کا راجہ اودے سنگھ بڑا بزدل تھا۔ وہ مغلوں سے ڈر کر بھاگا اور پہاڑوں میں چلا گیا۔ اکبر نے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ مشہور راجپوت سپہ سالار جے مل اور پتہ نے قلعہ کی حفاظت کی۔ چتوڑ کا قلعہ ایک اونچی چٹان پر واقع ہے اور اس اونچائی کی وجہ سے محاصرہ نے طول کھینچا۔ آخر کار اکبر نے یہ طے کیا کہ اُس کا ایک حصّہ سُرنگ لگا کر اُڑا دیا جائے۔ پہلی دفعہ کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن دوسری دفعہ فصیل کا کچھ حصّہ اُڑ گیا۔ جے مل رات کے وقت اسی دیوار کی مرمّت کرا رہا تھا کہ اکبر نے اُس پر نشانہ لگایا۔ جے مل زخمی ہو کر گر پڑا اور مر گیا۔ اب راجپوت بالکل نا اُمید ہو گئے۔ اُنہوں نے جوہر کی خوفناک رسم ادا کی اور لڑنے کے لئے نکل پڑے۔ یہ سب مارے گئے اور قلعہ فتح ہو گیا۔ اکبر شہر کے اندر داخل ہوا اور بیس ہزار آدمیوں کو قتل کرا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ راجپوت سرداروں کی بہادری سے اکبر اسقدر متاثر ہوا کہ اُس نے آگرہ کے قلعہ کے صدر دروازہ پر اُن کی مورتیں بنوا کر کھڑی کرا دی تھیں۔ اُودے سنگھ چتوڑ سے بھاگ کر اُس مقام پر چلا گیا تھا جہاں اب اُودے پور کا شہر واقع ہے۔ اسی جگہ اُس نے ۱۵۷۲ء میں وفات پائی۔ لیکن اُس کے بیٹے رانا پرتاپ نے مغلوں کے خلاف لڑائی جاری رکھی۔ یہ نوجوان بہادر راجپوت پچیس سال تک مغلوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ سب سے مشہور لڑائی ہلدی گھاٹ پر ہوئی۔ پرتاپ نے بہت دلیری سے مقابلہ کیا مگر آخر میں اُس کو شکست ہوئی

اور ۲۲ ہزار راجپوتوں میں سے صرف آٹھ ہزار زندہ بچے لیکن بعد میں
پرتاپ سنگھ نے کچھ مقامات واپس لے لئے۔ ۱۵۹۷ء میں رانا پرتاپ نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا امر سنگھ اُس کا جانشین ہوا۔

رانا پرتاپ

چتوڑ فتح ہونے کے بعد اکبر نے دوسری خودمختار راجپوت ریاستوں کی طرف توجہ کی۔ اور دو سال کے اندر رنتھمبور۔ بوندی اور کالنجر کو فتح کر لیا۔ ریاست بوندی کے راجہ نے چند شرائط پیش کی تھیں۔ مثلاً یہ کہ وہ اپنے خاندان کی لڑکی شاہی خاندان میں نہ دیں گے اور دربار میں مسلح حاضر ہوسکیں گے۔ بادشاہ نے یہ سب شرائط مان لیں اور راجہ نے اطاعت قبول کر لی۔

جہانگیر کی پیدائش اور فتحپور سیکری کی تعمیر

اب بنگال کو چھوڑ کر شمالی ہندوستان کا بیشتر حصہ

اکبر کے قبضہ میں تھا لیکن اُس کی کوئی اولاد زندہ نہ تھی۔ وہ اکثر اجمیر شریف میں اولاد کے لیئے دعا مانگتا تھا اور شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں بھی حاضر ہوتا۔ انہوں نے اُس کو تسلی دی کہ اُس کی دعا ضرور قبول ہوگی۔ چنانچہ ۱۵۶۹ء میں جب اُس کو معلوم ہوا کہ راجہ بہارمل کی بیٹی حاملہ ہے تو اُس نے اُس کو شیخ کے پاس ہی بھیجدیا اور جب اُس کا لڑکا پیدا ہوا تو اُس کا نام بھی شیخ ہی کے نام پر سلیم رکھا۔ اسی سال اُس کے ایک اور لڑکا پیدا ہوا جس کا نام مراد رکھا گیا۔ دو سال بعد ایک اور بیوی سے اُس کے لڑکا پیدا ہوا اور چونکہ پیدایش کے وقت لڑکے کی ماں اجمیر میں شیخ دانیال کے مکان پر مقیم تھی اس لئے اس لڑکے کا نام دانیال رکھا گیا۔ ۱۵۷۰ء میں وہ اجمیر شریف زیارت کی غرض سے حاضر ہوا اور وہاں سے واپسی پر شیخ سلیم چشتی کے پاس آیا۔ اب اس کا اعتقاد اسقدر زیادہ بڑھ گیا تھا کہ اُس نے یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور شاہی محلات اور دوسری عمارتیں بنوانی شروع کیں اور پندرہ سال تک فتحپور سیکری مغلیہ سلطنت کا پایۂ تخت رہا۔ فتحپور سیکری کی اکثر عمارتیں اب تک موجود ہیں۔ اُن کو دیکھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہندوستانیوں نے فن تعمیر میں کسقدر ترقی کر لی تھی کیونکہ یہ عمارتیں دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

گجرات اور بنگال ۱۵۷۲-۱۵۷۶ء

تغلقوں کے عہد میں جو خود مختار ریاستیں قایم ہوگئی تھیں۔ ان میں سے بعض اب تک سلطنت دہلی میں شامل نہیں ہوئی تھیں۔ اکبر نے اب اُن کی طرف توجہ کی اور پہلے گجرات پر حملہ کیا۔ گجرات کا بادشاہ مظفر شاہ سوم بہت کمزور اور بزدل تھا۔ اُس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن گرفتار ہوا اور اُس کا ملک آسانی سے فتح ہوگیا۔ اکبر عزیز کوکہ کو گجرات کا گورنر مقرر کر کے فتحپور سیکری واپس

آگیا۔ لیکن اُس کی واپسی کے تھوڑے ہی دن بعد گجرات کے امیروں نے میں اسیرگڈھ طور پر مرزاؤں نے بغاوت کی۔ اکبر فوراً ہی ایک چھوٹی سی فوج کا بڑا حصہ کو روانہ ہوا اور پچاس میل روزانہ سفر کر کے گیارہ دن کے اندر گجرات تک میں گجراتیوں کو یہ گمان بھی نہ تھا کہ اکبر اسقدر جلد آسکتا ہے۔ چنانچہ گجرات نئے فتح ہوا۔ اکبر ۲۳ اگست ۱۵۷۳ء کو فتحپور سے روانہ ہوا تھا اور ۵ اکتو۔ آگیا۔ اکبر کا یہ کارنامہ حیرت انگیز اور قابل تعریف ہے۔

گجرات کے بعد اکبر نے بنگال کی ریاست فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کی۔ بنگال کا بادشاہ داؤد ایک نوجوان اور مغرور افغان تھا۔ وہ اکبر سے اپنے تعلقات ایسے خوشگوار نہ رکھ سکا جیسے کہ اُس کے باپ کے تھے۔ چنانچہ ۱۵۷۴ء میں اکبر نے بنگال پر حملہ کیا اور پٹنہ پر قبضہ کر لیا۔ داؤد بھاگ گیا۔ اکبر بھی سیکری واپس آگیا اور بنگال فتح کرنے کا کام منعم خاں اور ٹوڈر مل کو سپرد کیا گیا۔ منعم خاں کا انتقال ہو گیا اور داؤد نے اپنے کھوئے ہوئے ملک پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اکبر کو جیسے ہی یہ خبر ملی اُس نے خانِ جہاں کو داؤد کے خلاف بنگال کی طرف روانہ کیا۔ داؤد کو شکست ہوئی اور خان جہاں نے اُس کا سر کاٹ کر اکبر کے پاس بھیجدیا اور بنگال بھی گجرات کی طرح مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ ہو گیا۔

آخری فتوحات

بنگال فتح کرنے کے بعد اکبر نے بہت سی اصلاحات کیں۔ جن کا ذکر آگے آئے گا۔ ان میں سے بعض ایسی تھیں کہ بنگال میں اُن کی وجہ سے بغاوت ہوئی۔ اکبر نے ٹوڈر مل کو بغاوت رفع کرنے کے لئے بھیجا لیکن اُس کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس پر عزیز کوکہ کو خان اعظم کا خطاب دے کر بنگال کا گورنر مقرر کیا۔ اس کے ایک سردار نے باغیوں کو شکست دی۔

اکبر کے قبضہ ختم نہیں ہوئی تھی کہ مرزا حکیم نے حملہ کر دیا۔ اکبر فوراً اُس کو روکنے اور لاہور پنجاب کی طرف بڑھا۔ مرزا حکیم کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ کابل بھاگ گیا۔ اُس کو بھی اُس کا پیچھا کیا۔ حکیم کابل بھی چھوڑ کر چلا گیا۔ اکبر نے کابل پر بھی قبضہ معلوم لیکن اُس نے حکیم کا قصور معاف کر کے اُس کو دوبارہ کابل کا حاکم مقرر کیا اور واپس آ گیا۔ ۱۵۸۵ء میں اکبر نے لاہور کو اپنا جائے قیام بنایا اور تیرہ برس تک اُس کو وہیں رہنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سرحدی لوگوں نے مغلیہ حکومت کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا اور عبداللہ خاں اُزبک کی طرف سے بھی خطرہ تھا کیونکہ اُس نے بدخشاں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اکبر نے آخر کار ان لوگوں کے خلاف کامیابی حاصل کی۔ لیکن اُس کا مشہور درباری راجہ بیربل اس لڑائی میں مارا گیا۔ اسی زمانہ میں راجہ بھگوان داس نے کشمیر پر حملہ کیا اور یہ ریاست بھی ۱۵۸۶ء میں سلطنت مغلیہ میں شامل کر لی گئی۔ اس کے پانچ سال بعد سندھ بھی فتح ہو گیا اور وہاں کا حاکم مرزا جانی بیگ اکبر کے منصب داروں میں داخل ہو گیا۔ ۱۵۹۵ء میں قندھار کے گورنر نے اکبر کی اطاعت قبول کر لی اور قندھار پر بھی مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ یہ اکبر کی خوش قسمتی تھی کہ اُس کو قندھار اسقدر آسانی سے مل گیا۔

دکن ۱۵۹۰ء-۱۶۰۴ء

اکبر جیسے بلند حوصلہ اور فاتح بادشاہ کے لئے شمالی ہندوستان کی فتوحات کافی نہ تھیں۔ پہلے اُس نے کوشش کی کہ دکنی سلطان بغیر لڑائی کے اُس کی اطاعت قبول کر لیں۔ لیکن اس میں وہ کامیاب نہیں ہوا اور اُس نے دکن پر حملے شروع کر دئے۔ پہلا حملہ احمد نگر پر ہوا۔ مغلوں نے احمد نگر کا محاصرہ شروع کر دیا لیکن چاند بی بی نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا اور برار کا صوبہ دیکر صلح کر لی۔ یہ صلح زیادہ دنوں تک قائم نہ رہی اور لڑائی پھر چھڑ گئی۔ چند غداروں نے چاند بی بی کے خلاف سازش کی اور

اُس کو قتل کر دیا۔ اُس کے بعد احمد نگر مغلوں کے ہاتھ میں آگیا۔ سنہ ۱۶۰۱ء میں اسیرگڈھ کا مضبوط قلعہ فتح ہوتے پر خاندیس پر بھی مغلوں کا قبضہ ہو گیا۔ احمد نگر کا بڑا حصّہ ابھی مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس ہی تھا لیکن پھر بھی اتنا ملک مغلوں کے ہاتھ میں تھا کہ ایک نیا صوبہ بنایا جا سکے۔ چنانچہ دکن میں مغلیہ سلطنت کے تین نئے صوبے بن گئے یعنی احمد نگر، برار اور خاندیس۔

اکبر کی وفات ۱۶۰۵ء

اکبر دکن ہی میں تھا کہ اُس کو خبر ملی کہ شہزادہ سلیم نے الٰہ آباد میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے۔ اکبر فوراً آگرہ واپس آیا اور ابوالفضل کو بھی بلایا لیکن راستہ میں سلیم نے اُس کو قتل کروا دیا۔ ابوالفضل کے قتل سے اکبر کو جو صدمہ ہوا اُس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس خبر کو سُن کر وہ بیحد پریشان ہوا اور یہ الفاظ کہے "اگر سلیم بادشاہت چاہتا تھا تو مجھے قتل کر دیتا لیکن ابوالفضل کو چھوڑ دیتا" مگر اس کے باوجود بھی اکبر نے سلیم کو معاف کر دیا۔ وہ الٰہ آباد واپس چلا گیا اور وہاں پہنچکر اُس نے اپنی خود مختاری کا پھر اعلان کر دیا۔ اسی زمانہ میں راجہ مان سنگھ نے دوسرے امیروں کے ساتھ سازش کی کہ اکبر کے بعد سلیم کی بجائے اُس کا بڑا بیٹا خسرو تخت پر بیٹھے۔ لیکن یہ سازش کامیاب نہیں ہوئی اور اکبر نے دوبارہ سلیم کی خطا معاف کر کے اُس کو اپنا ولیعہد مقرر کر دیا جب اکبر بیمار ہوا تو سلیم آگرہ آیا۔ اسوقت اکبر کی حالت اسقدر خراب تھی کہ وہ بول نہیں سکتا تھا لیکن اُس کے ہوش وحواس ٹھیک تھے۔ چنانچہ مرنے سے پہلے اُس نے ہمایوں کی تلوار جو اُس کے پاس رکھی تھی سلیم کو دی اور شاہی پوشاک پہننے کا اشارہ کیا۔ اِس سے یہ مطلب تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ سلیم کو اُس کا جانشین مان لیا جائے۔

دین الٰہی

مذہب کے اعتبار سے اکبر کا عہد دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔
پہلے دور میں وہ ایک خوش اعتقاد باعمل اور بے تعصب مسلمان
تھا۔ اپنی زندگی احکام شریعت کے مطابق بسر کرتا تھا۔ صوم وصلوٰۃ کا پابند تھا
اور بزرگان دین کے مزاروں پر حاضر ہوتا تھا۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا
خاص طور پر معتقد تھا۔ چشتیہ خاندان کے بزرگوں سے اُس کو اسقدر اعتقاد تھا کہ
شیخ سلیم چشتیؒ کی وجہ سے اُس نے فتح پور سیکری کو اپنا پایہ تخت بنایا۔ لیکن
۱۵۷۹ء کے بعد سے اُس کے مذہبی خیالات میں تبدیلی شروع ہو گئی۔ اکبر شروع
ہی سے مذہبی اور علمی معاملات میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ وہ خود تو جاہل تھا لیکن
مشہور کتابیں دوسروں سے پڑھوا کر سنتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ اُس کا حافظہ
اسقدر عمدہ تھا کہ بہت سے اقوال اور اشعار اُس کو یاد تھے جو اکثر وہ اپنی
گفتگو میں سُناتا تھا۔ راجپوت عورتوں سے شادی کرنے کی وجہ سے اُسکو
ہندو مذہب سے بھی کچھ واقفیت ہو گئی تھی۔ ۱۵۷۵ء میں اُس نے فتحپور سیکری
میں ایک عمارت تیار کرائی جس کا نام عبادت خانہ رکھا گیا۔ اس عمارت میں علمائے
اسلام مذہبی مسائل پر بحث کرتے تھے۔ اُن کے آپس کے اختلافات اور ابوالفضل
فیضی اور اُن کے باپ شیخ مبارک کی آزاد خیالی نے اکبر کے دل میں کچھ شکوک
ڈال دئیے۔ چنانچہ اُس نے جینی، برہمن، پارسی اور عیسائی عالموں کو بلا کر اجازت
دی کہ وہ بھی عبادت خانہ کے مباحثوں میں شریک ہوں۔ رفتہ رفتہ اُس کو یہ
یقین ہو گیا کہ ہر مذہب میں کچھ نہ کچھ باتیں اچھی ہیں اور مذہبی اختلافات دور
کرنے اور لوگوں میں اتفاق پیدا کرنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ ایک ایسا
دین جاری کیا جائے جس میں ہر مذہب کی اچھی باتیں ایک جگہ پائی جاتی ہوں
اس دین کو ہر قوم اور ہر مذہب کے لوگ قبول کریں گے اور آپس کے جھگڑے

ختم ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام اُس نے یہ کیا کہ سب علماء سے
ایک تحریری وعدہ لیا کہ مذہبی معاملات میں امام عادل کا مرتبہ مجتہدوں سے زیادہ
ہے اور جب علما میں اختلاف رائے ہو تو امام عادل یعنی بادشاہ کا فیصلہ مانا جائیگا۔
۱۵۸۲ء میں اس نئے مذہب کا جس کا نام "دین الٰہی" رکھا گیا تھا باقاعدہ
اعلان کیا گیا۔ دین الٰہی میں مختلف مذاہب کے اصول لے لئے گئے تھے۔
مثلاً سورج اور آگ کی عزت، گوشت، پیاز اور لہسن سے نفرت، قصابوں،
چڑیماروں اور مچھیروں کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز۔ دین الٰہی کے پیروؤں
کا سلام اللہ اکبر اور جل جلالہٗ تھا۔ اس لئے کہ بادشاہ کا نام جلال الدین اکبر تھا۔
اس دین کے ماننے والوں کے چار درجے تھے۔ وہ لوگ جو اکبر کی خاطر مال،
جان، عزت اور مذہب قربان کر دیتے تھے سب سے اعلیٰ سمجھے جاتے تھے،
جو صرف ایک چیز یعنی مال قربان کرنے کو تیار تھے وہ سب سے کمتر سمجھے جاتے
تھے۔ اس میں شک نہیں کہ دین الٰہی کو قبول کرنا اکبر کی خوشنودی اور عزت اور
مرتبہ حاصل کرنے کا یقینی اور سب سے آسان طریقہ تھا لیکن اس کے باوجود بھی
بہت ہی کم لوگوں نے اس دین کو قبول کیا۔ آئین اکبری میں صرف ۱۸ نام
دئے ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی ہوں گے لیکن ان کی تعداد زیادہ کبھی
نہیں ہوئی۔ اکبر کی یہ بات قابل تعریف ہے کہ اُس نے کسی کو دین الٰہی قبول
کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ کے ساتھ نئے مذہب کا جوش بھی
کم ہوتا گیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بستر مرگ پر اکبر نے قرآن شریف پڑھوا کر
سُنا اور مرتے وقت کلمہ شہادت اُس کی زبان پر تھا۔

دین الٰہی کے متعلق لوگوں نے مختلف خیالات کا اظہار کیا ہے۔ بعض مورّخ
کہتے ہیں کہ یہ اکبر کی سب سے بڑی حماقت تھی، وہ چاہتا تھا کہ اُس کا مرتبہ اور

اُس کے اختیارات دینی معاملات میں بھی اسی قدر وسیع ہوں جیسے دنیوی معاملات میں تھے۔ برخلاف اس کے کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ ہندوستان میں ایک متحدہ قوم بنانا چاہتا تھا اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیئے یہ ضروری سمجھتا تھا کہ مذہبی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو دور کیا جائے اور اسی غرض سے اُس نے ایک ایسا دین جاری کیا جس میں سب مذہبوں کی کچھ نہ کچھ باتیں موجود تھیں۔ لیکن یہ طریقہ غلط ثابت ہوا۔ ہر شخص اپنے مذہب کو سچا سمجھتا تھا اور اُس کو آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ دین الٰہی کے اعلان کے وقت راجہ بھگوان داس نے ہندوستان کے لوگوں کے خیالات کی صحیح طور پر ترجمانی کی اور بادشاہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ میرے نزدیک صرف دو ہی مذہب ہیں۔ ایک ہندو مذہب اور دوسرا اسلام۔ میں ہندو ہوں اگر آپ حکم دیں تو میں مسلمان ہو سکتا ہوں لیکن تیسرا مذہب میں نہیں جانتا۔

ہندوستان میں ایک متحدہ قوم بنانے کے لیئے یہ ضروری نہ تھا کہ ایک نیا مذہب قایم کیا جائے۔ بلکہ لوگوں کو اس بات کا احساس دلانا ہی کافی تھا کہ باوجود مذہبی اختلافات کے وہ اس ملک میں امن و امان کے ساتھ زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ شیر شاہ کی مثال اُس کے سامنے موجود تھی کہ اُس نے کوئی نیا مذہب جاری نہیں کیا اور خود اسلام کے احکام کا بہت پابند رہا لیکن ساتھ ہی ملک کے انتظام میں کسی کے ساتھ تعصب نہیں برتا۔ دین الٰہی کے جاری کرنے سے پہلے خود اکبر ہی نے ہندوؤں کو اور خاص طور پر راجپوتوں کو بڑے بڑے عہدے دیئے تھے اور اُن کے ساتھ اور رعایتیں بھی کی تھیں۔ مثلاً یہ کہ جزیہ معاف کر دیا تھا اور ہندو یاتریوں سے جو ٹیکس لیا جاتا تھا وہ بھی بند کر دیا تھا۔ یہ برتاؤ اُن کو خوش کرنے کا بہت عمدہ ذریعہ تھا۔ غالباً اکبر کو خود بھی اس بات کا احساس

ہوگیا تھا کہ جو لوگ اُس کی بادشاہت کے لئے اپنی جان و مال قربان کرنے کو تیار ہیں وہ بھی اُس کے نئے مذہب کی پیروی کرنے کے لئے راضی نہیں اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے دین الٰہی منوانے کے لئے کسی قسم کا دباؤ یا زور نہیں ڈالا۔

اکبر کا نظام حکومت

اوپر بتلایا گیا ہے کہ اکبر نے ہندوؤں کو اعلےٰ عہدوں پر مقرر کیا۔ دفتر مال میں کثیر تعداد ہندو اہلکاروں کی تھی۔ گاؤں کے انتظام میں بھی اکبر نے زیادہ دخل نہیں دیا۔ اکبر کی حکومت کو ہم شخصی حکومت کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ کا مرتبہ سب سے اعلیٰ تھا۔ اُس کی حکم عدولی نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہیں نکالنا چاہئے کہ وہ سلطنت کے تمام کام تنہا کرتا تھا۔ یہ کسی صورت میں ممکن ہی نہیں اسلئے شخصی حکومت میں بھی وزیروں اور بڑے امیروں سے مشورہ کرنا ضروری تھا۔ کوئی اس قسم کا قانون تو نہیں تھا جس سے بادشاہ مشورہ لینے یا اس پر عمل کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن انتظام حکومت کے لئے یہ باتیں ضروری تھیں، بادشاہ کا وزیر اعظم "وکیل" کہلاتا تھا۔ اس کا مرتبہ بادشاہ کے بعد تھا اور ہر اہم معاملہ میں اس کا مشورہ ضروری تھا۔ محکمہ مال کا سب سے اعلیٰ افسر "دیوان" کہلاتا تھا۔ اُس کے اختیارات بھی بہت وسیع تھے۔ مالگزاری وغیرہ جمع کرنا اور روپیہ خرچ کرنے کے متعلق سب معاملات اُسی کے تحت میں تھے۔ فوج کا اعلیٰ افسر "بخشی" اور محل کا داروغہ "خانساماں" کہلاتا تھا۔ خانساماں کا عہدہ بھی بہت اہم تھا۔ کیونکہ وہ سب معاملات جو بادشاہ کی ذات اور اُس کے محل سے تعلق رکھتے تھے، خانساماں ہی کے تحت میں ہوتے تھے، لوگوں کے مقدمات فیصل کرنے کے لئے بہت سی عدالتیں تھیں۔ اس محکمہ کا اعلیٰ افسر "قاضی القضاۃ" کہلاتا تھا۔ اُس کے ماتحت بہت سے قاضی ہوتے تھے۔ امور مذہبی کی نگہداشت کے لئے "صدر الصدور" تھا۔ بعد میں اکبر نے "صدر الصدور"

کا عہدہ توڑ دیا تھا اور اُس کی بجائے چھ "صدر" مختلف صوبوں میں مقرر کر دیئے تھے۔ ان اعلیٰ افسروں کے علاوہ جن کی حیثیت وہی تھی جو آجکل وزیروں کی ہے اور بہت سے محکمے تھے اور ہر محکمے کے لئے ایک علیحدہ افسر ہوتا تھا جیسے محتسب، مشرف، میر بحر اور واقعہ نویس وغیرہ۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر محکمہ اور ہر افسر کے لئے ایک علیحدہ دفتر تھا جس میں بہت سے آدمی کام کرتے تھے۔

فوج مغلوں کے نظام حکومت کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ہر عہدہ دار خواہ کسی محکمہ میں ملازم ہو فوج میں ایک عہدہ یا منصب رکھتا تھا اور منصب دار کہلاتا تھا۔ منصب داروں کے عہدے اور درجے اُس فوج کی تعداد کے لحاظ سے ہوتے تھے جو اُن کو رکھنی پڑتی تھی۔ اسی حساب سے اُن کو تنخواہیں ملتی تھیں۔ اکبر کے زمانہ میں بیس سے لے کر دس ہزار تک کے منصب تھے۔ سات ہزار سے اوپر کا منصب صرف شاہزادوں کو دیا جاتا تھا۔ لڑائی کے وقت منصب دار اپنی فوج بادشاہ کے پاس لاتے تھے۔ اس کے علاوہ سال بھر میں ایک دفعہ تمام منصب دار اپنی اپنی فوجیں ملاحظہ کے لئے لاتے تھے۔ اکبر سپاہیوں اور گھوڑوں کی خود جانچ پڑتال کرتا تھا اور گھوڑوں پر داغ لگواتا تھا تاکہ کوئی دھوکا نہ دے سکے۔ منصب دار کے مرنے کے بعد عام طور پر اُس کی تمام جائداد حکومت اپنے قبضہ میں لے لیتی تھی اور اکثر ایسا ہوتا تھا کہ اُس کی اولاد کی تعلیم و تربیت کا انتظام حکومت ہی کی طرف سے ہوتا تھا۔ منصب دار اپنے بچوں کی شادیاں بادشاہ کی منظوری کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ اس طرح سے اکبر اپنے سرداروں کو قابو میں رکھتا تھا۔ منصب داروں کی فوج کے علاوہ دوسرے سپاہی بھی ہوتے تھے جو داخلی اور احدی کہلاتے تھے۔ منصب داروں اور سپاہیوں کو تنخواہ ملتی تھی۔ فوج کے چار حصے تھے۔ پیادہ، سوار، توپخانہ اور بحری فوج یعنی کشتیوں کا

بیڑہ - ہاتھیوں کا بھی ایک دستہ اکبر کی فوج میں تھا۔ اکبر کی فوج کی کل تعداد تین لاکھ سے کم نہ تھی۔

محکمہ مال شیر شاہ نے جو طریقہ لگان وصول کرنے کا رائج کیا تھا اُس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ابتدا میں اکبر نے بھی اُسی پر عمل کیا لیکن کچھ دنوں کے بعد اُس نے اصلاحات شروع کر دیں۔ گجرات فتح ہونے کے بعد راجہ ٹوڈرمل نے وہاں کی زمین کی پیمایش کرائی اور زمین کا رقبہ اور پیداوار دیکھکر محصول لگایا۔ یہ طریقہ گجرات میں کامیاب ثابت ہوا اور شمالی ہند کے دوسرے صوبوں میں بھی رائج کیا گیا۔ ٹوڈرمل نے دس سال کے لگان کا اوسط لگا کر آیندہ کے لئے لگان مقرر کیا۔ پیداوار کے لحاظ سے زمین کی چار قسمیں کی گئی تھیں۔ پولج، پروتی، چاچر اور بنجر۔ ایک اور اصلاح یہ کی گئی کہ بجائے رسّی کے پیمایش کے لئے بانس اور لوہے کی جریب کا استعمال جاری کیا گیا۔ پیداوار کا ایک تہائی حصہ بطور لگان کے لیا جاتا تھا۔ لگان کی وصولیابی کے لئے بہت سے قاعدے اور قانون بنائے گئے تھے لیکن رعایا پر سختی نہیں کی جاتی تھی، کیونکہ اکبر کا خیال تھا کہ رعایا کی خوش حالی بادشاہ کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ رشوت لینے والے ملازموں کو بہت سخت سزا دی جاتی تھی۔ کسانوں کی آسانی کے لئے قحط کے زمانہ میں لگان معاف کر دیا جاتا اور اُن کو زرتقاوی بھی دیا جاتا تھا۔ لگان وصول کرنے کے یہ قاعدے اور طریقے اس قدر کامیاب ثابت ہوئے کہ ان میں سے بعض اسوقت تک جاری ہیں۔

اکبر کی شخصیت اکبر صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کے مشہور بادشاہوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ بہت تندرست اور توانا تھا۔ اُس کا قد میانہ، آنکھیں سیاہ اور چمکدار اور رنگ گندمی تھا۔

سینہ چوڑا اور ہاتھ اور بازو لانبے تھے۔ ناک کے بائیں جانب ایک تل تھا۔ پیشانی کشادہ اور آواز بلند تھی۔ جب زور سے بولتا تھا تو معلوم ہوتا تھا کہ شیر گرج رہا ہے۔ ڈاڑھی منڈواتا تھا اور مونچھیں رکھتا تھا۔ اُس کے چہرے سے شان ٹپکتی تھی۔ جسمانی خوبیوں کے علاوہ اکبر میں اور بہت سی صفتیں تھیں۔ وہ خوش مزاج تھا لیکن غصہ کے وقت بہت سخت ہو جاتا تھا۔ اپنے امیروں اور سرداروں کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آتا تھا لیکن اُن کی بیجا حرکتوں پر اُن کو سزا بھی دیتا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ نہ تھا مگر اُس کو علم و ادب سے اسقدر دلچسپی تھی اور اُس کا حافظہ اسقدر اچھا تھا کہ اُس کی گفتگو سے کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ پڑھا لکھا نہیں ہے۔ دوسروں سے کتابیں پڑھوا کر سنتا تھا اور اکثر اقوال اور اشعار یاد کر لیتا تھا، یہاں تک کہ مختلف علوم سے اُسے کچھ نہ کچھ واقفیت ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی فارسی میں شعر بھی کہتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ دن رات میں صرف ایک مرتبہ کھانا کھاتا تھا اور جب تھوڑی بھوک رہ جاتی تو دسترخوان سے اُٹھ جاتا تھا۔ اپنی ہندو بیویوں اور دوستوں کی خاطر اُس نے گائے کا گوشت ترک کر دیا تھا آخر عمر میں شراب بھی کم کر دی تھی۔ وہ کام کرنے کا بہت عادی تھا۔ رات کو چند گھنٹے سوتا تھا اور باقی وقت میں کچھ نہ کچھ کرتا رہتا تھا۔ رات کا کافی حصہ عالموں سے بحث کرنے اور مورخوں سے تاریخ سننے میں گزارتا تھا۔ اُس کی رعایا اُس سے بہت خوش تھی۔ چنانچہ لوگ اُس کے درشن کے لئے علی الصباح محل کے نیچے جمع ہو جاتے تھے۔ اکبر درشن دینے کے لئے جھروکہ میں بیٹھتا تھا۔ بعض ہندو برہمنوں کا یہ معمول تھا کہ بغیر شہنشاہ کے درشن کئے کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اکبر بھی درشن دینے کے بعد سلطنت کا کام شروع کرتا۔ اُس کو اپنے کام سے اسقدر دلچسپی تھی کہ ہر چیز کا معائنہ خود کرتا تھا۔

اُس کو شکار اور پولو کا بہت شوق تھا۔ اُس نے ایک ایسی گیند ایجاد کی تھی جس سے رات کے اندھیرے میں بھی پولو کھیل سکتا تھا۔ اکبر نے اپنے دربار میں بہت سے ہنرمند اور قابل آدمی جمع کئے تھے جو نو رتن کہلاتے ہیں۔ اُن میں ابوالفضل۔ فیضی، راجہ ٹوڈر مل، بیربل اور مان سنگھ بہت مشہور ہیں۔

ہم اکبر کے کمالات اور اُس کے کارناموں پر غور کرتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ باوجود علم کی کمی کے وہ ایک بہت بڑا شخص تھا۔ اُس نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد اس مضبوطی کے ساتھ رکھی کہ اُس کے جانشینوں کے عہد میں وہ دنیا کی سب سے زیادہ شاندار سلطنتوں میں سے ہو گئی اور ملک کا نظام اُن اُصولوں پر قایم کیا جن میں سے بہت سے اسوقت تک موجود ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کی مسلمان رعایا بعض اصلاحوں کی وجہ سے اُس سے خوش نہ تھی اُس کی "صلح کل" پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک کے رہنے والے آپس میں اتفاق اور امن و امان کی زندگی بسر کریں اور اس مقصد میں اُس کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔ اُس کے انتقال کے وقت مغلیہ سلطنت کی قوت اور عظمت کا سکہ تمام عالم پر بیٹھ چکا تھا۔

باب ۳۲

جہانگیر

سنہ ۱۵۶۹-۱۶۰۵-۱۶۲۷ء

جہانگیر کی تخت نشینی سنہ ۱۶۰۵ء

سلیم کا نام نورالدین محمد تھا اور بادشاہ ہونے کے بعد اُس نے جہانگیر کا لقب اختیار کیا اور اپنے باپ کی پالیسی کو جاری رکھا، لیکن ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ میں اسلام کا پیرو ہوں اور اُس کی حفاظت اور حمایت میرا فرض ہے اس طرح مسلمان امیر بھی اُس کے ساتھ ہو گئے عہد جہانگیری کی تاریخ کے لئے ہمارے پاس فارسی تاریخوں کے علاوہ خود اُس کی ترک اور انگریز سفیروں کے بیان

جہاں گیر

کئے ہوئے حالات ہیں۔ ان لوگوں نے جس طرح جہانگیر کو پیش کیا ہے اُس سے

معلوم ہوتا ہے کہ اُس کو شراب اور عیش و عشرت کے علاوہ اور کوئی شغل نہ تھا۔ یہ غلط ہے۔ اُس کا شراب پینا اور افیون کھانا تو یقینی صحیح ہے۔ اُس نے خود اس کا ذکر کیا ہے لیکن اُس کو اپنے فرائض کا پورا احساس تھا اور اپنی ذمہ داری کو خوب سمجھتا تھا جب کبھی میدان جنگ میں اُس کی ضرورت ہوتی تھی تو وہ وہاں جانے اور لڑنے میں پس و پیش نہیں کرتا تھا۔

شاہزادہ خسرو کی بغاوت ۱۶۰۶ء

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ اکبر کی زندگی میں جہانگیر کے خلاف سازش کی گئی تھی مگر وہ کامیاب نہیں ہوئی اور مرنے سے پہلے اکبر نے سلیم ہی کو اپنا ولیعہد مقرر کیا اور وہی تخت پر بھی بیٹھا۔ لیکن ابھی شاہزادہ خسرو پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اور وہ قلعہ کے اندر مثل قیدی کے رہتا تھا۔ یہ حالت وہ زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکا اور اپریل ۱۶۰۶ء میں قلعہ سے نکلکر پنجاب کی طرف چلا گیا۔ راستہ میں اُس کے ساتھیوں کی تعداد برابر بڑھتی گئی۔ جہانگیر نے بھی اُس کا پیچھا کیا دونوں کی فوجوں میں لڑائی ہوئی خسرو نے شکست کھائی اور بھاگنے کی کوشش کی لیکن اپنے بہت سے ساتھیوں کے ساتھ پکڑا گیا۔ جہانگیر نے باغیوں کو بہت سخت سزائیں دیں۔ خسرو کے ساتھی شہر کے باہر سولی پر لٹکا دیئے گئے اور اُس کو حکم دیا گیا کہ جا کر اُن کی سلامی قبول کرے۔ اس کے بعد جہانگیر کابل چلا گیا۔ واپسی پر اُس کو ایک اور سازش کی اطلاع ملی جو خسرو کے علم میں تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ بادشاہ کو قتل کیا جائے۔ جہانگیر نے مجرموں کو مروا ڈالا اور خسرو کو اندھا کرنے کا حکم دیا گیا لیکن آگرہ پہنچکر جہانگیر کو اس پر رحم آیا اور اُس کی آنکھوں کا علاج ہوا جس سے ایک آنکھ میں کچھ روشنی آگئی۔ بہرحال مدت تک وہ قید رہا۔ آخر میں جہانگیر

نے اُس کو شہزادہ خرمؔ کی حراست میں دیدیا۔ ۱۶۲۲ء میں اُس نے وفات پائی۔ خسرو نہایت خوبصورت اور خوش اخلاق جوان تھا۔ لوگوں کو اُس سے بہت ہمدردی تھی جو اُس کی مصیبتوں کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خسرو کا مقبرہ الہ آباد میں ایک باغ کے اندر موجود ہے جو خسرو باغ کے نام سے مشہور ہے۔

گروارجن خسرو کی بغاوت کے وقت سکھوں کے پیشوا گرو ارجن نے باغیوں کی مدد کی تھی اور پانچ ہزار روپیہ خسرو کو دے گئے اس جرم کی سزا میں جہانگیر نے گرو ارجن پر جرمانہ کیا انھوں نے ادا کرنے سے انکار کیا اور بادشاہ کی حکم عدولی کی۔ اس پر اُن کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ بعض لوگوں نے جہانگیر پر تعصب اور تنگ نظری کا الزام رکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ گرو ارجن سے مغلوں اور سکھوں کی لڑائی شروع ہوتی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے گرو ارجن کو بغاوت کے سلسلہ میں سزا دی گئی اور اس کے علاوہ جہانگیر نے سکھوں کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی۔ اگر اُس کا یہ کام مذہبی تعصب کی بناء پر ہوتا تو اور کچھ بھی کرتا لیکن ایسا نہیں کیا۔ اور جیسا کہ ڈاکٹر بینی پرشاد نے اپنی کتاب "ہسٹری آف جہانگیر" میں لکھا ہے "گرو ارجن بھی اپنی آخری عمر تک نہایت امن کی زندگی بسر کرتے اگر وہ ایک باغی کی ہمدردی نہ کرتے"۔

نورجہاں جہانگیر اور نورجہاں کی شادی کے متعلق بہت غلط اور مختلف قصے مشہور ہیں۔ نورجہاں کا اصلی نام مہرالنساء تھا۔ اُس کا باپ مرزا غیاث بیگ مفلسی کی وجہ سے اپنے وطن (ایران) سے روانہ ہو کر اکبر کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور ملازم ہو گیا۔ مہرالنساء دوران سفر میں پیدا ہوئی تھی۔ غیاث بیگ نے اپنی قابلیت کی وجہ سے

بہت ترقی کی اور اپنی لڑکی کی شادی ایک بہادر سردار علی قلی خاں استاجلو کے ساتھ کر دی جو تاریخ میں شیر افگن کے نام سے مشہور ہے۔ شیر افگن کچھ زمانہ تک ولیعہد (یعنی جہانگیر) کے پاس رہا اور اُس کی تخت نشینی کے بعد بردوان) کا جاگیردار بنا دیا گیا۔ لیکن

نور جہاں

تھوڑے ہی عرصہ کے بعد بادشاہ کو اُس کی طرف سے شکوک پیدا ہوئے اور قطب الدین کو جو اُس وقت وہاں کا حاکم تھا حکم دیا گیا کہ شیر افگن کو گرفتار کرے۔ قطب الدین اور شیر افگن میں لڑائی ہوئی اور دونوں مارے گئے۔ شیر افگن کے مرنے پر مہرالنسا مع اپنی چھوٹی بچی کے آگرہ واپس چلی آئی۔ مہرالنسا کا باپ اب ایک بڑا عہدہ دار تھا چنانچہ وہ بھی اکبر کی بیوہ سلطان سلیمہ بیگم کی خدمت میں رہنے لگی۔ یہیں جہانگیر نے اُس کو دیکھا اور مئی ۱۶۱۱ء میں اُس کے ساتھ شادی کر لی۔ پہلے اُس کو نور محل کا خطاب دیا اور بعد میں نور جہاں کا۔ نور جہاں حُسن صورت کے علاوہ اور کمالات بھی رکھتی تھی۔ وہ مردوں کی طرح بہادر تھی اور اسقدر ذہین اور ہوشیار تھی کہ سلطنت کے جملہ کاموں کو نہایت قابلیت کے ساتھ انجام دیتی تھی۔ جہانگیر اُس سے بہت محبت کرتا تھا۔ نور جہاں نے بہت عمدہ تعلیم اور تربیت پائی تھی اور شعر کہنے کا شوق رکھتی تھی۔ اُس کی طبیعت میں اسقدر جدت اور تیزی تھی کہ عورتوں کی پوشاک میں نئی نئی ایجادیں کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ اُس کا اثر بہت زیادہ بڑھ گیا۔ اُس نے دربار میں ایک گروہ بنا لیا تھا جس کے ذریعہ سے سلطنت کے تمام معاملات اُس کے ہاتھ میں آ گئے تھے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا

کہ جہانگیر بالکل اس گروہ کے قبضہ میں تھا۔ یہ لوگ اُس کی پالیسی اور اُس کے مقاصد کو سمجھ گئے تھے اور اُسی پر عمل کرتے تھے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ آخر عمر میں شراب کی وجہ سے وہ کمزور اور آرام طلب ہو گیا تھا۔ دربار میں بہت سے با اثر امیر اس گروہ کے مخالف تھے اور اُن کو اب بھی یہ امید تھی کہ جہانگیر اپنے بڑے بیٹے خسرو کو ولیعہد مقرر کر دے گا کیونکہ خسرو کی کمزوریوں کے باوجود بھی جہانگیر اُس سے بہت محبت کرتا تھا۔

میواڑ کی فتح تم کو یاد ہوگا کہ میواڑ کے راجہ پرتاپ سنگھ نے اکبر کی اطاعت قبول نہیں کی تھی۔ اُس کے بیٹے امر سنگھ نے بھی اس پالیسی کو جاری رکھا اور مغلوں کا دلیری سے مقابلہ کرتا رہا۔ ۱۶۰۸ء میں مہابت خاں نے میواڑ پر حملہ کیا۔ لڑائی میں راجپوتوں کو شکست ہوئی۔ لیکن مغل سپاہی اُن کے پہاڑی قلعوں پر قبضہ نہیں کر سکے۔ ۱۶۱۳ء میں جہانگیر نے اجمیر میں قیام کیا اور اپنے تیسرے بیٹے شہزادہ خرم کو میواڑ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا۔ خرم نے شہروں اور قصبوں پر قبضہ کر لیا اور پہاڑی قلعوں کے راستے بند کر دئے۔ اب امر سنگھ کے پاس اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی اور اپنے بیٹے کرن سنگھ کو جہانگیر کے دربار میں بھیجدیا۔ جہانگیر نے اُس کی بہت عزت کی اور دربار کے بڑے منصب داروں میں شامل کر لیا۔ اس کامیابی پر جہانگیر کو بے حد خوشی ہوئی کیونکہ یہ وہ فتح تھی جو اکبر کو بھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

احمد نگر اکبر نے احمد نگر فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تھا اس کی وفات پر جہانگیر کو سب سے پہلے خسرو سے لڑنا پڑا لیکن اسی زمانہ میں احمد نگر میں بھی لڑائی شروع ہو گئی۔ ملک عنبر نے جو

ایک حبشی سردار تھا احمد نگر کی حالت بدل دی تھی اور نظام شاہی خاندان کو پھر برسراقتدار کر دیا تھا۔ اُس نے محکمہ مالگزاری میں ویسی ہی اصلاحات کیں جیسی کہ ٹوڈرمل نے شمالی ہندوستان میں کی تھیں اور مرہٹہ سرداروں کو اپنی فوج میں شامل کرکے احمد نگر کو بہت قوی بنا لیا۔ مرہٹہ سپاہیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اُنہوں نے اپنی ضروریات بہت کم کر لی تھیں اور نہایت مختصر سامان کے ساتھ میدان جنگ میں جا سکتے تھے۔ برخلاف اس کے مغلوں کی فوج دن بدن آرام طلب ہوتی جاتی تھی جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ اُن کے ساتھ بہت سازوسامان ہوتا تھا اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک جانے میں کافی وقت لگتا تھا جہانگیر نے اپنے عہد کے شروع میں کئی نامی سردار بھیجے لیکن اُن کو کچھ کامیابی نہ ہوئی اور ملک عنبر نے مرہٹہ سرداروں کی مدد سے احمد نگر پر بھی قبضہ کر لیا۔ میواڑ فتح کرنے کے بعد جہانگیر نے خاص طور سے دکن کی طرف توجہ کی۔ شہزادہ خرم کو آگے بھیجکر خود بھی روانہ ہوا اور مانڈو میں قیام کیا۔ خرم نے نربدا کو عبور کیا اور احمد نگر و بیجاپور سے گفت و شنید شروع کی۔ دکن کی ریاستیں اس قابل نہیں تھیں کہ مغلوں کی فوج کا مقابلہ کر سکتیں۔ چنانچہ انہوں نے اس شرط پر صلح کر لی کہ وہ تمام ملک جو ملک عنبر نے مغلوں سے چھین لیا تھا واپس دیدیا جائے۔ اسکے علاوہ شہزادہ خرم کی خدمت میں کچھ تحفے بھی پیش کئے گئے۔ س کامیابی پر جہانگیر نے خرم کو دولت اور عزت سے مالامال کر دیا۔ اُس کا منصب بہت بڑھا دیا گیا اور شاہجہاں کا خطاب بھی عطا ہوا۔ ان واقعات سے تم کو یہ معلوم ہو گیا کہ جہانگیر کے زمانہ میں مغلوں نے دکن میں نئی فتوحات نہیں کیں لیکن وہ یہی بہت بڑی کامیابی سمجھتے تھے کہ جو ملک اُن کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا وہ واپس لے لیا گیا۔

کانگڑہ

دکن کے بعد جہانگیر نے کانگڑہ فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ یہ قلعہ پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے بہت مضبوط خیال کیا جاتا تھا۔ اکبر نے اس کو لینے کی کوشش کی لیکن اُس میں کامیاب نہ ہوا۔ جہانگیر کو بھی اس کا باقاعدہ محاصرہ کرنا پڑا۔ چاروں طرف سے آمدورفت کے راستے بند کر دیئے گئے اور قلعہ کے سپاہی بھوکے مرنے لگے۔ آخر میں مجبور ہو کر اُنہوں نے شہنشاہ کی اطاعت قبول کر لی اور ۱۶۲۰ء میں کانگڑہ بھی مع اپنے مضافات کے سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گیا۔

شاہجہاں کی بغاوت

اب تک نورجہاں اور اُس کا بھائی آصف خاں دونوں خرم کے ساتھ تھے اور لوگوں کو یقین ہو چلا تھا کہ جہانگیر کے بعد وہی تخت کا مالک ہوگا۔ لیکن دکن اور راجپوتانہ کی فتوحات کے بعد نورجہاں کا خیال بدل گیا۔ نورجہاں کی ایک لڑکی شیر افگن سے تھی اُس نے اُس کی شادی شہزادہ شہریار سے کی جو جہانگیر کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا اور اب چاہتی تھی کہ کسی صورت سے تخت کا مالک بھی وہی بنے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نورجہاں اور شہزادہ خرم کی دو مختلف پارٹیاں ہو گئیں۔ آصف خاں چاہتا تھا کہ اُس کا داماد یعنی خرم، اور نورجہاں چاہتی تھی کہ اُس کا اپنا داماد یعنی شہریار ولیعہد قرار دیا جائے اسی اثناء میں دکن میں پھر لڑائی شروع ہو گئی اور خرم کو وہاں جانے کا حکم ملا۔ اُس کا بڑا بھائی خسرو بھی اُسی کے سپرد کر دیا گیا۔ شاہجہاں نے دکن کے معاملات نہایت خوبی اور کامیابی کے ساتھ سلجھائے۔ ملک عنبر کو شکست ہوئی اور وہ شاہجہاں کی اطاعت کرنے پر مجبور ہوا۔ اسی زمانہ میں شاہجہاں کی طرف سے جہانگیر کے پاس اطلاع پہنچی کہ خسرو درد قولنج میں گرفتار ہوا اور مر گیا۔

سنہ ۱۶۲۲ء میں شاہ ایران یعنی عباس شاہ نے قندھار پر قبضہ کرلیا جہانگیر کو اُس کے واپس لینے کی فکر ہوئی اور اُس نے طے کیا کہ یہ اہم کام بھی شہزادہ خرم کے سپرد کیا جائے۔ لیکن شاہجہاں نے خیال کیا کہ اس طریقے سے نورجہاں اُس کو سرحدی جھگڑوں میں پھنسا کر شہریار کا راستہ صاف کرنا چاہتی ہے اُس نے قندھار جانے سے انکار کردیا اور سنہ ۱۶۲۳ء میں ایک بڑی فوج لیکر آگرہ پر قبضہ کرنے کی غرض سے روانہ ہوا اور کھلم کھلا بغاوت شروع کردی۔ پہلی لڑائی دہلی سے کچھ فاصلہ پر بلوچپور کے قریب ہوئی جس میں شاہجہاں کو شکست ہوئی اور اُس کو بھاگنا پڑا۔ وہ دکن کی طرف گیا اور وہاں ملک عنبر اور گولکنڈہ کے سلطان سے مدد چاہی لیکن اُنھوں نے صاف انکار کردیا۔ اب شاہجہاں بھاگ کر بنگال پہنچا اور اُس پر قبضہ کرلیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اودھ اور الہ آباد بھی اپنے قبضے میں کرلے، لیکن شاہی فوج نے اُس کا مقابلہ کیا اور پھر شکست دی اب وہ دوبارہ دکن پہنچا اور ملک عنبر سے صلح کرکے برہانپور کا محاصرہ کرلیا۔ بادشاہ کی طرف سے مہابت خاں اور شاہزادہ پرویز اُس کے مقابلہ کے لئے بھیجے گئے۔ شاہجہاں کو برہانپور سے بھی بھاگنا پڑا اور اب اس کی حالت اسقدر خراب ہوگئی تھی کہ ہتیار ڈالنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ اُس نے جہانگیر کو لکھا کہ اُس کا قصور معاف کردیا جائے۔ جہانگیر نے اس درخواست کو قبول کرلیا۔ اور معافی کا فرمان بھیجدیا۔ شاہجہاں نے اپنے دو بیٹوں دارا شکوہ اور اورنگ زیب کو دربار میں بطور ضمانت بھیجدیا۔ اس وقت دارا کی عمر دس سال اور اورنگ زیب کی عمر سات سال کی تھی۔

جہانگیر کی وفات سنہ ۱۶۲۷ء شاہجہاں کی شکست کے بعد نورجہاں، مہابت خاں کی طرف سے بھی بدگمان ہوگئی

اور اُس کو حکم دیا کہ وہ فوراً دربار میں حاضر ہو کر وہ مال و اسباب پیش کرے جو بنگال میں اُس کے ہاتھ آیا ہے۔ مہابت خاں سمجھ گیا کہ اُس کا وہاں جانا خطرہ سے خالی نہیں۔ لیکن وہ اپنے ساتھ پانچ ہزار راجپوت لے کر پنجاب میں جہلم کے کنارے پر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اب اُس کو یقین ہو گیا تھا کہ نورجہاں اُس کی مخالفت پر آمادہ ہے۔ چنانچہ اُس نے موقع پا کر بادشاہ کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ شاہی فوج دن میں دریا کے پار ہو گئی تھی اور جہانگیر دوسرے دن صبح کو جانے والا تھا۔ شب میں مہابت خاں نے پل پر قبضہ کر کے بادشاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ نورجہاں بھیس بدل کر نکل گئی اور فوج کو جمع کر کے مقابلہ کی تیاری کرنے لگی۔ لیکن اُس کو کامیابی نہ ہوئی اور مہابت خاں سلطنت اور بادشاہ کا مالک ہو گیا۔ اُس کا یہ اقتدار زیادہ عرصہ تک قایم نہیں رہا۔ کیونکہ نورجہاں نے ایسی تدبیر کی کہ اپنے شوہر کے پاس آگئی اور اُس کو مہابت خاں کے پنجہ سے چھڑا لیا۔ مہابت خاں کو جہانگیر نے سندھ کی طرف روانہ کیا۔ لیکن اُس نے بادشاہ کا حکم نہیں مانا اور میواڑ میں پناہ لی اور آخر کار شاہجہاں سے مل گیا اس کے بعد ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کشمیر گیا لیکن اس کی صحت اب اسقدر خراب ہو گئی تھی کہ پہاڑ کی ہوا موافق نہیں آئی اور واپس آنا پڑا۔ اُس کی حالت برابر خراب ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ، نومبر ۱۶۲۷ء کو راستہ ہی میں اُس کا انتقال ہو گیا۔

جہانگیر کے ذاتی اوصاف

جہانگیر کے متعلق یہ غلط خیال ہے کہ وہ بالکل نالایق اور ناکارہ تھا اور شراب کے علاوہ اُس کو کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ برخلاف اس کے ہمعصر مورخ ہم کو بتلاتے ہیں کہ وہ

نہایت سمجھدار اور ہوشیار تھا۔ اُس نے نہایت عمدہ تعلیم پائی تھی اور ایسے ماحول میں پلا تھا کہ سلطنت کے کاموں سے بخوبی واقف ہوگیا تھا، وہ نہایت انصاف پسند تھا اور ظالموں کو بہت سخت سزا دیتا تھا۔ اُس نے اپنے کمرہ سے محل کے باہر تک ایک زنجیر لٹکوادی تھی کہ جس شخص کو فریاد کرنی ہو وہ زنجیر ہلاکر بادشاہ تک اپنی آواز پہنچادے۔ اُس کو غریبوں سے بہت ہمدردی تھی اور اُن کی مصیبت دور کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا لیکن کبھی کبھی غصہ میں ایسے سخت حکم دیدیتا تھا کہ جس سے لوگوں کو خیال ہوتا کہ وہ بڑا ظالم ہے۔ اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ اُس کا برتاؤ نہایت اچھا تھا۔ وہ اکثر مجرموں کو موقع دیتا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائیں۔ اکبر کی زندگی میں تو اُس نے ضرور بغاوت کی تھی لیکن اُس کے مرنے کے بعد وہ اکبر کا نام بڑی عزت سے لیتا تھا اور اُس کی قبر پر بھی جاتا تھا۔ عالموں اور درویشوں کی بڑی قدر و عزت کرتا تھا۔ وہ خود سُنّی مسلمان تھا، لیکن دوسرے مذہبوں کی توہین نہیں کرتا تھا فن مصوری سے اُس کو بہت دلچسپی تھی، جہانگیر کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ شراب بہت پیتا تھا۔ اس کی وجہ سے اُس کی صحت بھی خراب ہوگئی تھی اور مزاج بھی چڑچڑا ہوگیا تھا ورنہ وہ نہایت متین، سنجیدہ، رحم دل اور سخی انسان تھا۔ جہانگیر کو اپنی خوبصورت، وفادار اور قابل ملکہ یعنی نورجہاں پر بہت اعتماد تھا۔ نورجہاں نہایت باکمال عورت تھی اور سلطنت کے اہم سے اہم معاملات کو خوب سمجھتی تھی۔ بہادری اور ہمت میں وہ مردوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ شکار کھیلتی اور شیر مارتی تھی۔ خطرے کے موقعوں پر کبھی ہمت نہ ہاری جہلم کے کنارے پر اُس نے مہابت خاں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ وہ بہت فیاض عورت تھی اور یتیم لڑکیوں کی شادی کے لئے بہت روپیہ دیتی تھی اور غریبوں کی ہر طرح مدد کرتی تھی۔ جہانگیر نے اُس کو

بہت محبت تھی اور کوئی کام اُس کی مرضی کے خلاف نہیں کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے جہانگیر کی شراب بہت کم کرا دی تھی۔ شوہر کی وفات کے بعد جب شاہجہاں تخت پر بیٹھا تو نورجہاں نے حکومت کے معاملات سے دست بردار ہو کر گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اپنی زندگی کا بقیہ حصّہ اسی حالت میں گذار دیا۔

ولیم ہاکنس اور سر طامس رو

۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی قایم ہو چکی تھی اور انگریز چاہتے تھے کہ مغلوں سے کچھ مراعات حاصل کریں۔ اس مقصد کے لئے اُنھوں نے پہلے کیپٹن ہاکنس اور بعد میں سر طامس رو کو جہانگیر کے دربار میں بھیجا۔ تاریخ کے طالب علموں کے نزدیک ان کی اہمیت اس لئے ہے کہ اُنھوں نے اس ملک کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ کیپٹن ہاکنس ۱۶۰۸ء میں جیمس اوّل کا خط لیکر مغل دربار میں حاضر ہوا۔ وہ تین سال تک یہاں رہا۔ بادشاہ نے اُس پر مہربانی کی اور چند موقعوں پر اُس کو اپنی شراب کی مجلس میں بھی شریک کیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی ہاکنس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا کیونکہ پرتگیزوں نے کافی رسوخ حاصل کر لیا تھا اور اُنھوں نے انگریزوں کی شدید مخالفت کی۔

۱۶۱۵ء میں جیمس اوّل نے سر طامس رو کو سفیر بنا کر جہانگیر کے دربار میں بھیجا۔ سر طامس رو بہت ہوشیار اور تجربہ کار شخص تھا وہ ترکی زبان بول سکتا تھا اور اس طریقہ سے جہانگیر سے براہ راست گفتگو کر سکتا تھا۔ اب پرتگیزوں کا اثر بھی کم ہو گیا تھا۔ ان وجوہات سے طامس رو کو اپنے مشن میں کسی حد تک کامیابی ہوئی جس وقت وہ یہاں پہنچا تو جہانگیر اجمیر میں تھا۔ طامس رو وہیں جہانگیر

کی خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ تین سال تک یہاں رہا۔ جہانگیر کبھی اُس کو اپنے دربار میں بلواتا تھا اور گفتگو کرتا تھا۔ ایک موقع پر طامس رو نے ایک تصویر جہانگیر کو پیش کی۔ اُس نے تصویر بہت پسند کی۔ کیونکہ اُس کو فن مصوری سے بہت دلچسپی تھی۔ آخر کار بادشاہ نے انگریزوں کو سورت میں فیکٹری قایم کرنے کی اجازت دیدی۔ لیکن طامس رو اس کوشش میں کامیاب نہ ہوا کہ انگلستان اور مغلوں کے درمیان کوئی تجارتی عہدنامہ ہو جائے۔

ہاکنس اور طامس رو نے اس ملک کے انتظام اور دربار کے حالات لکھے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل دربار نہایت عالی شان ہوتا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ کسانوں اور عام لوگوں کی حالت اچھی نہ تھی۔ مگر نہ تو یہ لوگ اس ملک کی زبان اور لوگوں سے واقف تھے اور نہ ان کے پاس ایسے وسائل تھے جن کے ذریعہ سے صحیح معلومات حاصل کرتے۔ لہٰذا جہاں کہیں اُن کے بیانات چشم دید واقعات سے متعلق نہیں یا دوسری ہمعصر تاریخوں سے مختلف ہیں وہاں ہم اُن کی روایت تسلیم نہیں کر سکتے۔

باب ۳۳

شاہجہاں ۱۵۹۲-۱۶۶۶ء

شاہجہاں کی تخت نشینی ۱۶۲۸ء جہانگیر کی وفات کے وقت شاہجہاں دکن میں تھا لیکن اُس کا خسر آصف خاں موقع پر

موجود تھا۔ اُس نے فوراً خسرو کے بیٹے کو داور بخش کا لقب دیکر تخت پر بٹھا دیا۔ شہریار نے بھی اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ شاہجہاں ان واقعات کی خبر پاتے ہی لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس اثنا میں شہریار کے ساتھیوں کو شکست ہو چکی تھی اور شہریار گرفتار ہو کر اندھا کیا جا چکا تھا۔ ۹ جنوری ۱۶۲۸ء کو شاہجہاں نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ داور بخش شہریار اور چند اور شہزادے جن سے مخالفت کا اندیشہ تھا قتل کر دیئے گئے۔

شاہجہاں

اب شاہجہاں آگرہ آیا اور باقاعدہ نہایت شان و شوکت کے ساتھ رسم تاجپوشی ادا ہوئی۔

خان جہاں لودی کی بغاوت

شاہجہاں کو تخت پر بیٹھے ہوئے ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ بندیلوں کے سردار جھوجھر سنگھ نے بغاوت کی۔ شاہجہاں نے فوراً اُس کے خلاف ایک فوج بھیجی اور بغاوت آسانی سے فرو ہو گئی۔ اس کے بعد دکن کے صوبہ دار خان جہاں لودی نے بغاوت کی۔ جس وقت شاہجہاں دکن سے لاہور جا رہا تھا تو خان جہاں لودی نے اُس کی مخالفت کی تھی لیکن شاہجہاں نے اُس کو معاف کر دیا تھا۔ اب وہ دربار میں بلا لیا گیا تھا۔ لیکن ہمیشہ مغموم رہتا تھا ایک روز کسی نے اُس کے لڑکوں کو بہکا دیا کہ بادشاہ اُن کو قید کرنا چاہتا ہے۔ اس پر خان جہاں لودی بھاگ کر دکن پہنچا اور سلطان احمد نگر سے مل گیا۔ شاہجہاں

خود دکن گیا۔ شاہی فوجوں نے خانِ جہاں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اُس نے سلطان بیجاپور کے یہاں پناہ لی اور پھر وہاں سے بھاگ کر بندیل کھنڈ پہنچا۔ ۱۶۳۰ء میں شاہی فوج نے کالنجر کے قریب اُس کو پھر شکست دی اور اُس کا سر کاٹ کر شہنشاہ کی خدمت میں روانہ کر دیا۔

پرتگیزوں کی گوشمالی سنہ ۱۶۳۱-۱۶۳۲ء

بنگال میں پرتگیزی تاجروں نے وہاں کے لوگوں کو پریشان کر دیا تھا۔ یہ لوگ غلاموں کی تجارت کرتے تھے۔ اکثر ہندو اور مسلمان یتیم بچوں کو پکڑ کر لے جاتے تھے اور اُن کو زبردستی عیسائی بنا لیتے تھے۔ اُن کی دلیری اسقدر بڑھ گئی تھی کہ اُنہوں نے ممتاز محل کی دو کنیزوں کو پکڑ لیا تھا۔ شاہجہاں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اُس نے بنگال کے گورنر قاسم خاں کو حکم دیا کہ پرتگیزوں کی بستیاں اور تجارت تباہ کر دی جائیں۔ قاسم خاں نے اس حکم کی تعمیل میں ہگلی پر چڑھائی کر دی۔ پرتگیزوں نے اپنی بستی کو بہت بہادری کے ساتھ بچانے کی کوشش کی لیکن اُن کی تعداد کم تھی۔ آخر میں اُنہوں نے شکست کھائی۔ شہر پر مغلوں کا قبضہ ہو گیا اور اُن کے گودام اور مکانات مسمار کر دئے گئے۔ بہت سے گرفتار ہو کر آگرہ آئے جن میں سے بعض نے اسلام قبول کر لیا۔

نظام شاہی خاندان کا خاتمہ سنہ ۱۶۳۳ء

اکبر نے شمالی ہندوستان فتح کرنے کے بعد دکنی سلطنتوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ پانچ سال کی متواتر کوشش کے بعد خاندیس اور احمد نگر کا کچھ حصہ فتح کر سکا تھا۔ اُس کے بعد اُس کے جانشینوں نے اُس کی اس پالیسی کو جاری رکھا۔ مغلوں کی دکن کی پالیسی پر تفصیلی بحث اورنگزیب کے بیان میں کی جائیگی۔ اور پر تم نے پڑھا ہے کہ جہانگیر کے زمانہ میں ملک عنبر نے

لڑائی جاری رہی اور مغلوں نے جو کچھ کامیابی حاصل کی اُس کا سہرا شاہجہاں کے سر رہا۔ اب شاہجہاں خود تخت و تاج کا مالک تھا۔ سلطان احمد نگر نے خان جہاں لودی کو بغاوت کے وقت مدد دی تھی۔ اس کے علاوہ احمد نگر میں اندرونی خرابیاں بھی پیدا ہوگئی تھیں۔ سلطان مرتضیٰ نظام شاہ نے ملک عنبر کے بیٹے فتح خاں کو قید کر دیا تھا۔ لیکن اب اُس نے سوچا کہ مغلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ فتح خاں کو آزاد کیا جائے۔ چنانچہ اُس کو قید سے رہا کر کے دوبارہ وزیر مقرر کر دیا۔ فتح خاں آزاد ہونے کے بعد بھی اپنی بے عزتی کو نہ بھولا اور اپنے مالک سے بدلہ لینے کا موقع تلاش کرتا رہا اور آخر کار شاہی سرداروں کے اشارے پر اُس نے سلطان کو مروا ڈالا اور حسین شاہ کو جو نابالغ تھا تخت پر بٹھا کر خود سلطنت کا کام کرنے لگا۔ شاہ جی بھونسلا جو سلطان احمد نگر کا ایک باوفا مرہٹہ سردار تھا اس غداری کو نہ دیکھ سکا۔ اُس نے سلطان بیجاپور سے درخواست کی کہ احمد نگر پر قبضہ کر کے فتح خاں کو سزا دی جائے۔ ادھر شاہجہاں نے مہابت خاں خانخاناں کو فتح خاں کی مدد کے لئے بھیجدیا تھا لیکن فتح خاں کے دل میں بے ایمانی سمائی ہوئی تھی اُس نے دولت آباد کا قلعہ مہابت خاں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ مہابت خاں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ دولت آباد کا قلعہ بہت مضبوط اور محفوظ تھا۔ اس پر آسانی سے قبضہ نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اُنہوں نے فتح خاں اور دوسرے سرداروں کو رشوت دے کر قلعہ حاصل کر لیا۔ سلطان حسین شاہ جس کو فتح خاں نے تخت پر بٹھلایا تھا گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ سلطنت احمد نگر مغلیہ سلطنت میں شامل ہوگئی اور فتح خاں کو شاہجہاں نے ایک اعلیٰ منصب عطا کیا اس طریقہ سے تیس بتیس برس کی کوشش کے بعد ۱۶۳۳ء میں مغلوں نے نظام شاہی خاندان کا خاتمہ کر دیا۔

بیجاپور ۱۶۳۰ء میں بیجاپور کے سلطان نے احمد نگر کا ساتھ دیا تھا۔ شاہجہاں نے آصف خاں کو بیجاپور کے خلاف بھیجا تھا، لیکن اُس کو کچھ زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔ اسی زمانہ میں شمالی ہندوستان میں قحط پڑ رہا تھا اور شاہجہاں کی بیوی ممتاز محل کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان وجوہات سے دکن کی سلطنتوں کو دم لینے کا موقع مل گیا۔ بیجاپور نے اپنی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ چنانچہ احمد نگر کے خاتمہ پر جب شاہ جی بھونسلا نے مغلوں کے خلاف لڑائی کا سلسلہ جاری رکھا تو بیجاپوریوں نے بھی اُس کی مدد کی۔ شاہجہاں نے بھی اب بیجاپور اور گولکنڈہ کو ختم کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور ایک زبردست فوج لے کر خود دکن کو روانہ ہوا اور ان دونوں ریاستوں کو لکھ بھیجا کہ اُس کو خراج ادا کریں اور شاہ جی کو کسی قسم کی مدد نہ دیں۔ گولکنڈہ کے حکمراں نے شاہجہاں کی اطاعت قبول کر لی اور سکہ و خطبہ میں اُس کا نام داخل کر کے خراج دینا منظور کر لیا۔ لیکن سلطان بیجاپور اپنی ہٹ پر قایم رہا۔ اس پر شاہجہاں نے اپنی فوج کا ایک حصہ شاہ جی کے اور دوسرا بیجاپور کے خلاف روانہ کیا۔ اس فوج نے ملک کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ بیجاپوریوں نے بھی خوب مقابلہ کیا اور کنوؤں میں زہر ڈلوا دیا۔ مغلوں کو بہت دقت اُٹھانی پڑی۔ لیکن اُنہوں نے بھی پایہ تخت کے علاوہ قریب قریب سب ملک پر قبضہ کر لیا اور بُری طرح سے لوٹا۔ سلطان بیجاپور زیادہ عرصہ تک نہیں لڑ سکتا تھا اس لئے اُس نے مجبور ہو کر صلح کی۔ اور بیس لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ شاہ جی بھونسلا بھی اب مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، اُس نے بھی شاہجہاں کی اطاعت قبول کر لی۔ احمد نگر کا باقی ماندہ ملک مغلوں اور بیجاپوریوں نے آپس میں تقسیم کر لیا۔ یہ صلح جو ۱۶۳٦ء میں ہوئی تھی بیس سال تک قایم رہی۔ شاہجہاں نے دکن کا انتظام

اورنگ زیب کے سپرد کیا اور خود آگرہ واپس آگیا۔

ممتاز محل کی وفات اور تاج محل کی تعمیر

سنہ ۱۶۳۱ء میں شاہجہاں کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا صدمہ اُٹھانا پڑا۔یعنی اُس کی بیوی ممتاز محل کا انتقال ہوگیا۔ ارجمند بانو بیگم سنہ ۱۵۹۴ء میں پیدا ہوئی تھی اور سنہ ۱۶۱۲ء میں اُس کی شادی شہزادہ خرم کے ساتھ ہوئی۔ وہ نہایت خوبصورت تعلیم یافتہ اور خوش اخلاق عورت تھی غریبوں اور مفلسوں کی بہت مدد کرتی تھی۔شاہجہاں کے سب بچے اُسی سے پیدا ہوئے اور آخری بچی کے پیدا ہونے ہی میں اُس کی جان بھی گئی۔شاہجہاں

پر اس صدمہ کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ ایک ہفتہ تک کوئی کام نہیں کرسکا۔ اُس کے بال بھی بہت جلد سفید ہوگئے۔اُس وقت شاہجہاں دکن میں تھا۔وہاں سے واپس آکر اُس نے تاج محل کی تعمیر شروع کرادی اور اپنی بیوی کے لئے ایک ایسا مقبرہ بنوایا جس کی مثال دنیا میں نہیں۔مرنے کے بعد شاہجہاں کو بھی ممتاز محل کے برابر ہی دفن کیا گیا۔
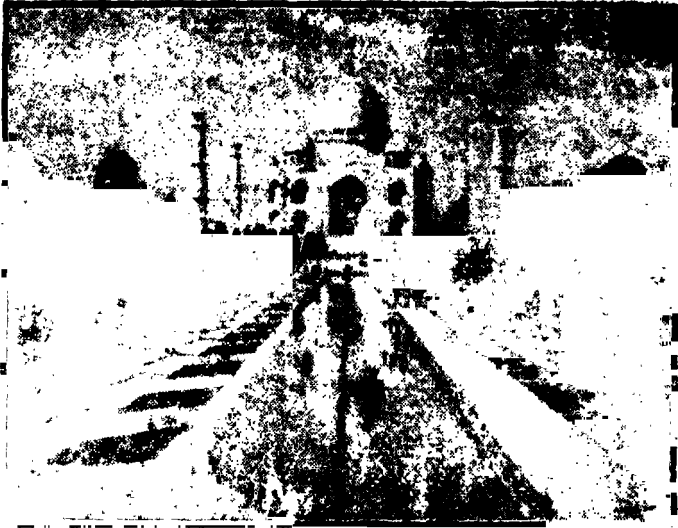
ماوراء النہر پر فوج کشی
۱۶۳۹ - ۱۶۴۷ء

مغل بادشاہ ابھی تک نہیں بھولے تھے کہ اُن کا اصلی وطن ماوراء النہر تھا اور اُس کے فتح کرنے کی خواہش ابھی تک اُن کے دل میں باقی تھی۔ چنانچہ جب شاہجہاں کو موقع ملا تو اُس نے حملہ کی تیاری کر دی۔ سمرقند کے حکمران نذر محمد اور اُس کے بیٹے عبدالعزیز میں جھگڑا تھا۔ نذر محمد نے شاہجہاں سے مدد مانگی۔ شاہجہاں نے فوراً مراد بخش کو ایک فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ نذر محمد تو بھاگ کر ایران چلا گیا، لیکن مراد بخش نے بلخ فتح کر کے وہاں کا انتظام شروع کیا۔ شاہجہاں چاہتا تھا کہ مراد کو بلخ کا گورنر مقرر کرے لیکن اُس نے واپس آنے کی اجازت مانگی اور واپس بلا لیا گیا۔ اُس کی بجائے شہزادہ اورنگ زیب کو بھیجا گیا اور نگ زیب نے بڑی بہادری اور استقلال

کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا اور لڑائی میں اُس کو شکست بھی دی لیکن اب مغلوں کو یہ تجربہ ہو گیا تھا کہ ان ملکوں کو فتح کرنا اور اُن پر حکومت کرنا نہایت مشکل ہے۔ چنانچہ یہی طے کیا گیا کہ اگر نذر محمد شاہجہاں کی اطاعت قبول کرلے تو ملک اُس کو واپس دیدیا جائے۔ نذر محمد نے اپنے پوتوں کو اورنگ زیب کی خدمت میں بھیج کر خود معذرت کرلی۔ اورنگ زیب نے ملک اُن کے حوالے کیا اور واپس ہو گیا لیکن راستہ میں ہزاروں جانیں سردی اور پہاڑی لٹیروں کی وجہ سے ضائع ہوئیں۔ شاہجہاں کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی کہ سمرقند اور بخارا بھی اُس کی سلطنت کا ایک صوبہ بن جائیں لیکن اورنگ زیب کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی اور لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ اُن کا شہزادہ معمولی سپاہی کی طرح ہر سختی برداشت کرسکتا ہے اور سخت سے سخت لڑائی میں کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

قندھار پر مغلوں کے ناکامیاب حملے ۱۶۴۹-۱۶۵۳ء

قندھار مغل اور ایرانی سلطنتوں کی سرحد پر واقع تھا۔ اس لئے دونوں کے نزدیک اُس کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ جہانگیر کے زمانہ میں ایرانیوں نے اس پر قبضہ کرلیا تھا۔ جہانگیر اُسکو فتح کرنا چاہتا تھا لیکن شاہجہاں نے اُس کا حکم نہیں مانا تھا اور جانے سے انکار کردیا تھا۔ شاہ ایران بہت طاقتور تھا اور قندھار کی واپسی قریب قریب محال تھی۔ لیکن یہ شاہجہاں کی خوش قسمتی تھی کہ قندھار کے گورنر علی مردان اور شاہ ایران کے تعلقات خراب ہو گئے اور علی مردان نے قندھار مغلوں کے حوالے کر دیا۔ اُس کے بدلے میں اُس کو ایک لاکھ روپیہ نقد اور پنج ہزاری منصب عطا ہوا۔ پہلے وہ کشمیر اور بعد میں کابل کا گورنر بنا کر بھیجا گیا۔ علی مردان نے

دہلی کے قریب ایک نہر نکالی اور لاہور کا مشہور شالامار باغ بھی اُسی کا بنوایا ہوا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ قندھار کے جانے پر ایرانی خاموش نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ اُنھوں نے بہت جلد اس پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ شاہجہاں نے قندھار پر حملہ کرنے کی تیاری شروع کر دی اور اورنگ زیب کو اس مہم پر روانہ کیا۔ لیکن چند ماہ بعد اُس کو ناکام واپس ہونا پڑا۔ تین سال بعد یعنی ۱۶۵۲ء میں اورنگ زیب کو دوبارہ قندھار فتح کرنے کے لئے بھیجا گیا۔ اس مرتبہ اُس کے ساتھ پہلے کے مقابلہ میں بہت زیادہ فوج اور سامانِ جنگ تھا۔ اُس نے بہت کوشش کی لیکن زیادہ کامیابی نہ ہوئی اور مجبور ہو کر شاہجہاں نے واپس آنے کا حکم دیا۔ اورنگ زیب چاہتا تھا کہ محاصرہ جاری رکھا جائے اس کو کامیابی کی امید بہت زیادہ تھی۔ لیکن شاہجہاں نے اس کی ایک نہ مانی اور فوج کو واپس بُلا لیا۔ وہ اورنگ زیب سے ناراض بھی ہو گیا اور اُس کو فوراً دکن جانے کا حکم دیا۔ اورنگ زیب کے مخالفوں نے اور خاص طور پر داراتے اُس کی ناکامیابی پر بہت طعنے دئے کہ شاہجہاں کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ مغلوں کی ناکامیابی کی وجہ اورنگ زیب کی نالائقی اور ناتجربہ کاری تھی۔ چنانچہ تیسری کوشش اور کی گئی اور اس مرتبہ دارا کو بھیجا گیا۔ دارا کے پاس فوج اور سامان وغیرہ پہلے سے کہیں زیادہ تھا لیکن وہاں جا کر اُس کو معلوم ہوا کہ ہندوستان میں بیٹھ کر خوشامدی درباریوں کے ساتھ وقت ضائع کرنے اور قندھار پر ایرانیوں سے مقابلہ کرنے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس نے بےحد کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا اور اپنے بھائی کی طرح اُس کو بھی ناکام واپس آنا پڑا۔ قندھار کے حملوں میں شاہجہاں نے بارہ[12] کروڑ روپیہ برباد کیا۔ اس کے علاوہ سلطنت مغلیہ کی قوت اور شہرت کو ایک زبردست صدمہ پہنچا۔ قندھار اب

ہمیشہ کے لیئے مغلوں کے ہاتھ سے گیا۔

تخت نشینی کے لئے جنگ

۱۶۵۷ء میں شاہجہاں بیمار پڑا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کے لیئے یہ بیماری جہلک ثابت ہوگی چنانچہ اُس کے بیٹوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ شاہجہاں کے چار بیٹے تھے۔ داراشکوہ جو سب سے بڑا تھا شاہجہاں کا چہیتا بیٹا تھا۔ بادشاہ اُس کو اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا اور اُس کے ساتھ ہر قسم کی رعایت کرتا تھا۔ اُس کو شاہ بلند اقبال کا خطاب بھی عطا کیا گیا تھا۔ وہ پنجاب کا صوبہ دار تھا۔ لیکن شاہجہاں کے پاس ہی رہتا تھا۔ دارانے اپنے غرور اور خودرائی کی وجہ سے درباریوں میں بہت مخالف بنا لیئے تھے۔ مذہبی خیالات میں وہ اس قدر آزاد تھا کہ لوگ اُس کو کافر سمجھنے لگے تھے۔ مسلمان سمجھتے تھے کہ اگر وہ تخت پر بیٹھ گیا تو غیر مسلموں کا اقتدار ملک میں پھر زیادہ ہو جائے گا۔ دوسرا بیٹا شاہ شجاع بنگال کا حاکم تھا۔ وہ ذہین اور قابل ضرور تھا لیکن شراب بہت پیتا تھا اور شیعہ مذہب ہونے کی وجہ سے سُنّی امیروں کی ہمدردی اُس کے ساتھ نہ تھی۔ سب سے چھوٹا مرادبخش گجرات کا حاکم تھا۔ وہ بہت بہادر اور جانباز تھا لیکن شراب، عیاشی اور آرام طلبی نے اُس کو بے کار کر دیا تھا۔ تیسرا بیٹا اورنگ زیب سب سے زیادہ ہوشیار تھا۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور تجربہ کار سپہ سالار تھا۔ سلطنت کے مختلف صوبوں میں گورنر رہ چکا تھا اور اس سلسلہ میں ملک کی سیاست اور نظام حکومت سے بخوبی واقف تھا۔ چونکہ پکا مسلمان تھا اسلیئے مسلمان امرا اُس کی مدد کے لیئے تیار رہتے۔ غرض یہ کہ تعلیم، تجربہ اور قابلیت کے لحاظ سے اورنگ زیب سب بھائیوں میں بہتر تھا لیکن شاہجہاں کی خواہش تھی کہ دارا شکوہ تخت پر بیٹھے۔ چاروں بھائی عمر رسیدہ اور

اثر والے تھے اور چونکہ ولیعہد مقرر کرنے کے لیے کوئی قانون نہ تھا اس لئے ہر ایک یہ سمجھتا تھا کہ وہ کوشش کرے تو تخت حاصل کر سکتا ہے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ مسئلہ بغیر لڑائی کے طے نہ ہوگا اور اس کے لئے تیار تھے۔

شاہجہاں کے بیمار پڑتے ہی داراشکوہ نے سلطنت کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اُدھر شجاع نے بنگال میں اور مراد بخش نے گجرات میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ چاروں بھائیوں میں صرف اورنگ زیب ہی ایسا تھا جو خاموش رہا۔ دربار میں اُس کی چھوٹی بہن روشن آرا بیگم اس کے ساتھ تھی اور بڑی بہن جہاں آرا بیگم داراشکوہ کے موافق تھی۔ اورنگ زیب نے مراد کو اس پر راضی کر لیا کہ وہ دونوں اپنی فوجیں ملا کر دارا کا مقابلہ کریں۔ اور فتح پانے کے بعد سلطنت کو تقسیم کریں۔ شاہ شجاع بھی اپنی فوج لے کر آگرہ کی طرف روانہ ہوا۔

ساموگڈھ کی لڑائی

دارا نے اُن کو روکنے کے لئے دو فوجیں بھیجیں۔ ایک فوج سلیمان شکوہ اور راجہ جے سنگھ کی سرکردگی میں شجاع کے خلاف بنگال کی طرف بڑھی اور دوسری راجہ جسونت سنگھ کی سرکردگی میں اورنگ زیب اور مراد کے خلاف روانہ ہوئی۔ شجاع بنارس تک آ گیا تھا۔ اور بہادر گڈھ کے مقام پر اُس کا اور سلیمان شکوہ کا مقابلہ ہوا شجاع نے شکست کھائی اور بھاگ گیا۔ دوسری فوج کا مقابلہ اورنگ زیب اور مُراد سے اُجین کے قریب دھرمت پر ہوا۔ جسونت سنگھ کو شکست ہوئی اور وہ اپنے وطن کو بھاگ گیا۔ اِس کامیابی سے اورنگ زیب کا حوصلہ بھی بڑھ گیا۔ اور اُس کی شہرت بھی زیادہ ہو گئی۔ دونوں بھائی اب آگرہ کی طرف بڑھے۔ دارا نے بھی مقابلہ کے لئے فوج جمع کی۔ آخر مئی ۱۶۵۸ء میں ساموگڈھ پر فریقین

کا مقابلہ ہوا۔ ابتدا میں شاہی فوج خوب لڑی لیکن دارا نے یہ غلطی کی کہ جب اُس کا ہاتھی زخمی ہوا تو اُس پر سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ سپاہیوں نے خیال کیا کہ دارا میدان جنگ چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اُن کے بھی پیر اُکھڑ گئے تھوڑی دیر میں یہ عظیم الشان فوج تتر بتر ہو کر چاروں طرف کو بھاگ گئی۔ اورنگ زیب نے حسب معمول لڑائی میں بڑی بہادری اور ہوشیاری دکھلائی۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا کہ میدان چھوڑ کر بھاگنے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ پھر بھی وہ پکڑے جائیں گے اور مارے جائیں گے۔ اس لئے یہی بہتر ہے کہ میدان میں سپاہی کی طرح جان دیں۔ اُس نے یہ بھی حکم دیا کہ ہاتھیوں کے پیر زنجیروں سے باندھ دئے جائیں تاکہ وہ بھی لڑائی کے وقت دھوکا نہ دیں۔ غرض یہ کہ یہ اورنگ زیب کی ہمت، بہادری اور استقلال کا نتیجہ تھا کہ اُس کو شاہی فوج کے مقابلہ میں کامیابی ہوئی۔ اورنگ زیب نے قلعہ پر جہاں شاہجہاں موجود تھا قبضہ کر لیا۔ اُس کے بعد شاہجہاں کو قلعہ سے باہر نکلنے کا موقع نہیں دیا گیا اور مرتے وقت تک وہ یہیں رہا۔

دارا شکوہ کا خاتمہ

ساموگڈھ پر شکست کھا کر دارا دہلی کی طرف بھاگا اور پنجاب ہوتا ہوا سندھ پہنچا۔ دارا کے مزاج میں جلد بازی بھی تھی اور خود رائی بھی۔ وہ کسی کے مشورہ پر کام نہیں کرتا تھا۔ اورنگ زیب اُس کا پیچھا برابر کر رہا تھا۔ اُس نے اب یہ طے کیا کہ ایک مرتبہ اورنگ زیب سے اور لڑے۔ چنانچہ اجمیر کے قریب دونوں میں جنگ ہوئی۔ دارا نے شکست کھائی اور بھاگ کر داور میں ملک جیون بلوچ کے پاس پناہ لی۔ میزبان نے اُس کو دھوکا دیا اور اورنگ زیب کے حوالے کر دیا۔ دہلی میں ہاتھی پر بٹھا کر اُس کو سارے شہر میں گھمایا گیا۔ ہاتھی کے ساتھ

جیون خاں بھی گھوڑے پر تھا۔ دارا کی یہ حالت دیکھ کر لوگ بہت افسوس کرتے تھے۔ اس کے بعد اُس پر کفر کا فتویٰ ہوا اور اُس کی سزا میں وہ قتل کر دیا گیا۔ دارا کے بڑے لڑکے سلیمان شکوہ نے گڑھوال میں پناہ لی تھی۔ وہ بھی گرفتار ہو کر اورنگ زیب کے سامنے آیا اور گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا گیا اور وہیں اُس کا خاتمہ ہوا۔ دارا کا چھوٹا لڑکا سپہر شکوہ جب بڑا ہوا تو اورنگ زیب نے اپنی ایک بیٹی کی شادی اُس کے ساتھ کر دی۔ اسی طرح مراد بخش کے لڑکے کے ساتھ بھی اُس نے اپنی دوسری لڑکی کی شادی کی۔ اُس سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے کہ اورنگ زیب نے صرف اُن شہزادوں کو سزا دی جو اُس کے خلاف لڑے تھے۔

اورنگ زیب کے دو بھائی ابھی زندہ تھے۔ مراد بخش اُس کے ساتھ تھا مگر شجاع نے تخت حاصل کرنے کے لئے پھر تیاری کی اور اورنگ زیب کے مقابلہ پر آیا لیکن شکست کھا کر بھاگا اور ڈھاکہ ہوتا ہوا اراکان کی طرف چلا گیا اور لاپتہ ہو گیا۔ مراد شروع سے اورنگ زیب کے ساتھ تھا اور دونوں میں یہ طے ہوا تھا کہ سلطنت تقسیم کر لی جائے گی۔ لیکن دارا کی شکست کے بعد مراد کو اورنگ زیب کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی تھی اور اُس کا خیال تھا کہ اورنگ زیب شاید پوری سلطنت کا مالک خود ہی بن جائے گا۔ چنانچہ اُس نے اپنی فوج وغیرہ علیحدہ جمع کرنی شروع کر دی اور اس طرح برتاؤ کیا گویا وہ بالکل خود مختار ہے۔ دہلی جاتے ہوئے متھرا پہنچ کر اورنگ زیب نے مراد کی دعوت کی۔ مراد نے اس قدر شراب پی کہ بیہوش ہو گیا۔ اس حالت میں اورنگ زیب کے حکم سے وہ گرفتار کر کے گوالیار بھیج دیا گیا۔

تین سال بعد اُس پر ایک قتل کا مقدمہ چلایا گیا اور جرم ثابت ہونے پر اُس کو قتل کر دیا گیا۔

شاہجہاں کی وفات اور کارنامے

شاہجہاں نے اپنی زندگی کے بقیہ آٹھ سال آگرہ کے قلعے میں گذارے اور ۱۶۶۶ء میں وفات پائی۔ ابتدا میں اُس نے اورنگ زیب کو شکایت کے خطوط لکھے جن کے جواب میں اُس نے نہایت مہذب طریقے سے اُس کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بادشاہت کے معنی یہ ہیں کہ ملک اور رعایا کی حفاظت کرے نہ کہ یہ کہ اپنے آپ کو آرام پہنچائے، اور یہ کہ سلطنت کسی کی موروثی جائداد اور ملکیت نہیں، بادشاہ ایک امین ہے اور مال و دولت اُس کے پاس امانت کے طور پر ہیں جو اُس کو خلق خدا پر خرچ کرنا چاہئے۔ کچھ عرصہ کے بعد شاہجہاں نے خط وکتابت بند کر دی۔ اُس کی بڑی بیٹی جہاں آرا جو نہایت نیک عورت تھی اس کے پاس رہتی اور خدمت کرتی تھی۔ شاہجہاں اپنا سارا وقت عبادت اور عالموں کی صحبت میں صرف کرتا تھا۔

شاہجہاں مغلیہ خاندان کا سب سے زیادہ شاندار بادشاہ تھا۔ اُس کی ذہانت اور قابلیت کا اظہار شروع ہی میں ہو چکا تھا۔ شہزادگی کے زمانہ میں اُس نے میواڑ اور دکن فتح کرنے میں بڑی ہوشیاری اور بہادری دکھلائی اور بہت شہرت حاصل کی۔ بعض مورخین نے اُس کو ظالم لکھا ہے اس لئے کہ اُس نے تخت نشینی کے وقت اپنے رشتہ داروں کو قتل کرایا۔ اُس کا یہ عمل سیاسی ضرورت کی وجہ سے تھا ورنہ وہ طبیعت سے نرم دل اور منصف مزاج تھا۔ شاہجہاں پکا سُنی

مسلمان تھا اور اسلام کے احکام پر عمل کرتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کا برتاؤ غیر مسلم رعایا کے ساتھ نہایت اچھا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں سے بہت محبت کرتا تھا لیکن آخر عمر میں اُس کو دارا اور جہان آرا کا بہت زیادہ خیال ہو گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کے بعد دارا ہی تخت و تاج کا مالک ہو۔ یہ اُس کی غلطی تھی کیونکہ وہ یہ خوب سمجھتا تھا کہ حکومت کرنے کی اہلیت سب سے زیادہ اورنگ زیب میں ہے۔ اورنگ زیب کی اُس نے آخر تک مخالفت کی اور یہی وجہ تھی کہ اورنگ زیب اُس کو آزادی نہ دینے پر مجبور تھا۔ جوانی کے زمانہ میں شاہجہاں نہایت بہادر سپاہی اور قابل سردار تھا۔ اُس کو شکار، سواری اور دوسرے مردانہ کھیلوں کا بہت شوق تھا لیکن بڑھاپا آنے پر قدرتاً وہ آرام طلب ہو گیا تھا۔ شاہجہاں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اُس نے فن تعمیر اور متعلقہ فنون کو کمال پر پہنچا دیا۔ دہلی، آگرہ، اجمیر اور لاہور میں اُس کی بنوائی ہوئی مسجدیں، قلعے اور دوسری عمارتیں اب تک لوگوں کو حیرت میں ڈالتی ہیں اور سب سے زیادہ قابل تعریف اُس کی بیوی کا مقبرہ یعنی تاج محل ہے جس کو دیکھنے کے لیے دنیا کے ہر حصہ سے سیاح آتے ہیں اور جو ہمارے ملک کے تمدن کی سب سے بہتر اور مایۂ ناز یادگار ہے۔ بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ شاہجہاں بہت فضول خرچ تھا اور ملک کا روپیہ اپنے دل کو خوش کرنے کی خاطر برباد کرتا تھا۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو روپیہ بھی خرچ ہوتا تھا وہ کسی نہ کسی طرح اسی ملک کے لوگوں کے پاس پہنچتا تھا۔ مثلاً تاج محل میں بیس ہزار کے قریب آدمی تقریباً بیس سال تک کام کرتے رہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملک کا روپیہ نہ بیکار جمع رہتا تھا اور نہ برباد

ہوتا تھا بلکہ کام میں آتا رہتا تھا اور اُس کا فائدہ اسی ملک کے رہنے والوں کو پہنچتا تھا اس سلسلہ میں یہ بتلانا ضروری ہے کہ مغلوں کی حکومت کا اثر ہندوستان کی اقتصادی حالت پر بہت اچھا پڑا تھا اور یہاں کے لوگ ہر فن میں ترقی کرنے لگے تھے۔

باب ۳۴

اورنگ زیب عالمگیر

۱۶۵۸ - ۱۷۰۷ء

اورنگ زیب کی تخت نشینی

اورنگ زیب نے ۱۶۵۹ء میں رسم تخت نشینی و تاجپوشی ادا کی اور "عالمگیر" کا لقب اختیار کیا۔ اورنگ زیب نہایت قابل اور ہوشیار تھا۔ وہ اپنے مذہبی عقیدوں میں بہت پختہ تھا۔ اُس کے نزدیک بادشاہت کا معیار بہت اونچا تھا۔ وہ اپنا سارا وقت عبادت اور سلطنت کے کام میں خرچ کرتا تھا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی زمانہ میں اُس نے ایک مفید کام یہ کیا کہ بہت سے ایسے محصول ہٹا دئے جن کی وجہ سے تجارت ترقی نہیں کر سکتی تھی۔ ان محصولوں کی تعداد اسی کے قریب تھی۔ اس سے شاہی خزانہ کو کئی کروڑ روپیہ کا نقصان پہنچا لیکن

اورنگ زیب نے رعایا کی بہبودی کے لئے یہ نقصان عظیم برداشت کیا۔

اورنگ زیب نے کم وبیش پچاس سال حکومت کی۔ اس مدت کو ہم دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا حصہ ۱۶۵۸ء سے ۱۶۸۱ء تک جس زمانہ میں اورنگ زیب نے شمالی ہندوستان میں رہ کر سلطنت کا انتظام کیا۔ دوسرا حصہ ۱۶۸۱ء سے اورنگ زیب کی وفات تک جس زمانہ میں اُس نے دکن کی حکومتوں اور مرہٹوں کے ملک کو سلطنت مغلیہ میں شامل کیا۔

مشرقی سرحد پر جنگ بنگال مدتوں سے مغلوں کے پاس تھا۔ مشرقی آسام کے راجہ اکثر سرحد پر حملہ کرتے اور لوٹ مار کر کے چلے جاتے۔ جس وقت اورنگ زیب اور اُس کے بھائیوں میں لڑائی ہو رہی تھی تو آسامیوں نے کامروپ پر جو مغلوں کے پاس تھا قبضہ کر لیا۔ ۱۶۶۰ء میں ڈھاکہ کے گورنر میر جملہ کو حکم ملا کہ اس ملک کو واپس لیا جائے اور آسامیوں کو واجبی سزا دی جائے۔ میر جملہ نے اس حکم کی تعمیل کی اور ملک کا بہت حصہ فتح کر لیا اس لڑائی میں بے شمار دولت، ہاتھی، اسلحہ جنگ اور دوسرا سامان مغلوں کے

ہاتھ آیا۔ لیکن برسات شروع ہوتے ہی آب و ہوا خراب ہوگئی اور آسامیوں نے لوٹ مار بھی شروع کردی۔ میر جملہ نے ان دقتوں کی بالکل پرواہ نہیں کی اور لڑائی جاری رکھی۔ شاہی فوج نے آسامیوں کو شکست دی لیکن اس کامیابی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی کیونکہ میر جملہ کا انتقال ہوگیا۔ اورنگ زیب نے میر جملہ کی جگہ شائستہ خاں کو گورنر مقرر کیا۔ اُس نے اراکان کے حکمراں کی بڑی سرکوبی کی کیونکہ وہ پرتگیزی لٹیروں کو پناہ دیتا تھا۔ یہ لوگ بڑے ظالم تھے۔ ہندو اور مسلمانوں کو پکڑ کر اُن کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے اور غلام بنا کر فروخت کر دیتے تھے۔ شائستہ خاں نے اورنگ زیب کی اجازت سے کشتیوں کی تعداد بڑھا کر حملہ کیا اور اراکان کے بادشاہ سے چٹگاؤں لے لیا اور جزیرہ سراندیپ پر بھی قبضہ کر لیا۔

سرحدی قبائل کی سرکوبی

ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر جو قبیلے پٹھانوں کے رہتے ہیں اُن کی وجہ سے ہمیشہ ہندوستانی حکومت کو دقت اُٹھانی پڑی ہے۔ اکبر کا دوست راجہ بیربل انہیں قبیلوں کے خلاف لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اورنگ زیب نے طے کیا کہ اس فتنہ کو کسی صورت سے دفع کرنا چاہیے۔ یوسف زئی قبیلے کے ایک سردار بھاگو نامی نے ضلع ہزارہ پر حملہ کیا۔ اٹک اور کابل کے حاکم کو حکم ہوا کہ ان باغیوں کو سزا دی جائے۔ بڑی دقتوں کے بعد پٹھانوں کو شکست ہوئی۔ ان کا مال و اسباب لوٹ لیا گیا۔ مکانات میں آگ لگا دی گئی اور فصیلیں تباہ کردی گئیں۔ ایک عرصہ تک یہ لوگ خاموش رہے۔ لیکن ۱۶۷۲ء میں آفریدیوں کا ایک سردار اکمل خاں نامی بادشاہ بن بیٹھا اور مغلوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ تین چار سال برابر لڑائی جاری رہی۔ آفریدیوں کے ساتھ اور قبیلے بھی باغی

ہوگئے اورنگ زیب نے اپنے کئی تجربہ کار اور قابل سرداروں کو بھیجا لیکن کسی کو بھی مکمل کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر کار اُس کو خود حسن ابدال جاکر قیام کرنا پڑا۔ اور بہت دقت کے بعد پٹھانوں کے خلاف کامیابی حاصل ہوئی۔ ۱۶۷۵ء میں اورنگ زیب دہلی واپس آگیا۔ اس کے بعد سرحد کے قبیلوں نے اورنگ زیب کے زمانہ میں بغاوت نہیں کی۔ لیکن شاہی سرداروں کو بڑی ہوشیاری سے کام کرنا پڑتا تھا۔

اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ اورنگ زیب پکا مسلمان تھا اور اسلام کے احکام کی پابندی سختی کے ساتھ کرتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ سلطنت کا انتظام اسلامی اصولوں پر کرے۔ اس سلسلہ میں اس نے کچھ ایسی اصلاحات کیں جن پر آج کل کے مورخ بہت سخت اعتراض کرتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اُس زمانہ میں لوگوں پر مذہب کا اثر بہت زیادہ تھا اور ہر شخص اپنے مذہب کی اشاعت کو حق کی اشاعت سمجھتا تھا اور انسانی مفاد کے لئے یہ اشاعت ضروری بھی سمجھتا تھا جیسے کہ آجکل کے لوگ اپنے سیاسی خیالات کا پروپیگنڈا اور اپنے ہم خیالوں کی تعداد بڑھانا اور اُن کو فائدہ پہنچانا اسقدر ضروری سمجھتے ہیں کہ لاکھوں آدمیوں کی جانیں ضائع کرنے میں اُن کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ چنانچہ عموماً اُس زمانہ میں بادشاہ اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ رعایت کرتے تھے۔ یورپ کی حکومتوں کا بھی یہی حال تھا۔ اکبر اس سے مستثنیٰ تھا اور اُس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی مذہب کی پیروی میں پختہ نہیں تھا لیکن جب دین الٰہی کی اشاعت شروع ہو گئی تھی تو اس مذہب میں داخل ہونے والے بادشاہ کے مقرب بن جاتے تھے۔ جہانگیر اور اُس سے زیادہ شاہجہان اسلام کے پیرو

تھے۔ لیکن اورنگ زیب ان سب سے زیادہ بڑھ گیا۔ اورنگ زیب منصف مزاج بھی تھا اور رعایا کا ہمدرد بھی لیکن اُس کو یقین کامل تھا کہ اسلام ہی سچا مذہب ہے۔ وہ یہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ دوسرے مسلمانوں میں بھی مذہب کی طرف رجحان پیدا کرے جو سالہا سال کے عیش و آرام کی وجہ سے مذہب سے ناآشنا ہوتے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے مقابلہ میں دو نئی طاقتیں پیدا ہو گئی تھیں یعنی شمال میں سکھ اور دکن میں مرہٹے لہٰذا اورنگ زیب چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت بھی درست کرے۔ لیکن اُس نے کچھ کام ایسے کئے جن کا اثر اس کی سلطنت اور ملک پر اچھا نہ ہوا۔ اُس کی مذہبی اصلاحوں میں سے چند یہ ہیں۔ سکوں پر کلمہ لکھا جاتا تھا۔ اورنگ زیب نے یہ بند کر دیا۔ ایرانی تیوہار نوروز منانے کی ممانعت کر دی گئی۔ درشن کی رسم بند ہو گئی۔ مسلمان امیروں کو حکم ہوا کہ ملاقات کے وقت اسلامی طریقہ سے السلام علیکم کہیں۔ شراب اور بھنگ پینے اور جوا کھیلنے والوں اور طوائفوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ محرم کے جلوس اور مستی کی مخالفت کی گئی۔ دربار میں گانا بجانا بھی بند ہو گیا۔ بعض علاقوں میں ہندو آئے دن بغاوت پر آمادہ رہتے تھے اور امن عامہ میں خلل ڈالتے تھے۔ ان کی سرکوبی کی گئی اور ان کے مندر توڑ دئے گئے۔ ۱۶۷۹ء میں اورنگ زیب نے جزیہ پھر لگا دیا جو کہ اکبر کے زمانہ میں معاف ہو چکا تھا۔ دہلی میں ایک مجذوب سرمد نامی رہتے تھے۔ داراشکوہ ان کا بڑا معتقد تھا۔ علمانے اُن کے قتل کا فتویٰ دیا اور وہ قتل کر دئے گئے۔ سکھوں کے نویں گرو تیغ بہادر پر یہ الزام تھا کہ وہ حکومت کے خلاف بغاوت پھیلاتے ہیں۔ چنانچہ اُن کو بھی سزائے موت دی گئی۔ سکھ قوم جو جہانگیر کے زمانہ ہی سے مغلوں کے خلاف تھی اب اور بھی برگشتہ ہو گئی اور

گرو گوبند سنگھ کی تربیت میں دن بدن طاقت پکڑنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں چاروں طرف بغاوتیں ہونے لگیں اور اورنگ زیب کا سارا وقت ان بغاوتوں کے فرد کرنے ہی میں گزرا۔

ستنامیوں کی بغاوت
۱۶۷۲ء

اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں ایک بےچینی پھیل گئی سب سے پہلے متھرا کے جاٹوں نے بغاوت کی۔ اس کے بعد ۱۶۷۲ء میں ستنامیوں نے بغاوت کی۔ یہ لوگ میوات اور نارنول میں آباد تھے۔ فقیروں کے سے کپڑے پہنتے تھے لیکن ان میں سے اکثر تجارت پیشہ اور کاشتکار تھے۔ ابتدا میں معمولی بغاوت معلوم ہوتی تھی لیکن رفتہ رفتہ ان باغیوں کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ ستنامیوں کے متعلق یہ مشہور ہو گیا کہ یہ لوگ جادوگر ہیں اور شاہی فوج کے افسر اس سے ڈرتے تھے۔ اورنگ زیب نے اس خوف کو دور کرنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ کچھ تعویذ لکھ کر اپنی فوج کے جھنڈوں میں باندھ دئے اور سپاہیوں سے کہا کہ اب ستنامیوں کا جادو نہیں چل سکتا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اُن کا جادو ختم ہو گیا کیونکہ مغل سرداروں کے دل سے خوف جاتا رہا اور اُنہوں نے آسانی سے باغیوں پر غلبہ پالیا۔ تقریباً دو ہزار ستنامی لڑائی میں مارے گئے۔

راجپوتوں کی بغاوت
۱۶۷۹-۱۶۸۰ء

۱۶۷۸ء میں جودھپور کے راجہ جسونت سنگھ نے جو افغانستان میں تھا وفات پائی۔ اُس وقت اُس کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ اورنگ زیب نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور ناگور کے راجہ اندر سنگھ کو جودھپور کے تخت پر بٹھا دیا۔ اورنگ زیب چاہتا تھا کہ جودھپور مکمل طور پر

مغلوں کے اثر میں آجائے اور اس کا یہ مقصد اندر سنگھ کو راجہ بنانے سے حاصل ہو گیا جسونت سنگھ کی وفات کے بعد اُس کی دو بیواؤں کے لڑکے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک تو مر گیا لیکن ایک زندہ رہا۔ اس لڑکے کا نام اجیت سنگھ تھا۔ راجپوت چاہتے تھے کہ جودھپور کے تخت کا یہی بچہ مالک ہو۔ لیکن فی الحال اورنگ زیب جودھپور کا انتظام کر چکا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اجیت سنگھ کی تعلیم و تربیت اُس کی نگرانی میں ہو اس لئے اُس نے اجیت سنگھ کو دہلی بلا لیا۔ راجپوتوں کو یہ بات پسند نہ آئی اور درگا داس جو جسونت سنگھ کے ایک سردار کا لڑکا تھا اجیت سنگھ کو ساتھ لے کر دہلی سے بھاگ گیا اور راجپوتانہ پہنچکر اُس کو چھپا دیا۔ اب راجپوتوں نے کھلم کھلا بغاوت شروع کر دی۔ اودے پور کا راجہ بھی اس بغاوت میں شریک ہو گیا۔ اورنگ زیب کو جب یہ معلوم ہوا تو وہ خود اجمیر گیا اور اپنی نگرانی میں شہزادہ معظم، اعظم اور اکبر کو راجپوتوں کے خلاف بھیجا۔ مغلوں نے شہروں اور قصبوں پر قبضہ کر کے راجپوتوں کو وہاں سے نکال دیا لیکن ان لوگوں نے پہاڑی قلعوں اور جنگلوں میں پناہ لی اور وہیں سے مغلوں کو پریشان کرتے رہے۔ ۱۶۸۱ء میں شہزادہ اکبر نے راجپوتوں کے ساتھ مل کر اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی۔ راجپوت چاہتے تھے کہ اورنگ زیب کی بجائے اکبر کو تخت دہلی پر بٹھائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اکبر کو بہکا دیا اور اس پر راضی کر لیا کہ وہ اپنی ساری فوج لے کر راجپوتوں کے ساتھ اجمیر پر حملہ کرے اور اورنگ زیب کو شکست دے کر اُس کے تخت و تاج کا مالک بن جائے۔ اکبر بہت کم عمر اور ناتجربہ کار تھا اس لالچ میں آگیا اور اجمیر پر حملہ کر دیا۔ اورنگ زیب کے لئے یہ نہایت نازک موقع تھا کیونکہ اُس کے پاس تھوڑے سے سپاہی تھے

اور باغی شہزادہ کے پاس ستر ہزار فوج تھی۔ لیکن مشکلوں کے وقت اورنگ زیب کا ذہن زیادہ تیز ہو جاتا تھا۔ وہ ذرا نہیں گھبرایا اور ایک ایسی تدبیر کی جس سے راجپوتوں کی ساری کوشش خاک میں مل گئی۔ اُس نے اکبر کو ایک خط لکھا جو راجپوتوں کے ہاتھ میں پہنچ گیا اور جس نے اُن کے دل میں شہزادہ اکبر کی طرف سے بدگمانی پیدا کر دی۔ اُن کو یقین ہو گیا کہ اکبر اُن کو دھوکا دے کر جال میں پھانس رہا ہے۔ چنانچہ وہ اُس کا کیمپ چھوڑ کر بھاگ گئے اکبر پھر بھاگ کر راجپوتوں کے پاس گیا۔ درگا داس کو اب یقین ہو گیا تھا کہ اورنگ زیب نے اُن کو لڑانے کے لئے یہ خط لکھا تھا۔ اُس نے اکبر کو دکن پہنچادیا۔ وہ ایک سال تک شیواجی کے لڑکے شنبھوجی کے پاس رہا پھر بمبئی کے راستہ سے ایران چلا گیا اور اپنی زندگی کا بقیہ حصہ وہیں گذارا۔

اکبر کی بغاوت فرو ہونے کے بعد بھی راجپوتوں سے جنگ جاری رہی۔ جون ۱۶۸۱ء میں اودے پور کے مہارانا نے صلح کر لی اور اپنے ملک کا کچھ حصہ جزیہ کے بدلے شہنشاہ کو دیدیا۔ لیکن جودھپوریوں سے لڑائی کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ اورنگ زیب نے اپنی زندگی میں اجیت سنگھ کو جودھپور کا راجہ نہیں مانا۔ اُس کی وفات کے بعد بہادر شاہ نے راجپوتوں سے صلح کر لی اور اجیت سنگھ کو جودھپور کا راجہ مان لیا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ لڑائی مغلوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ مغلوں کو مالی نقصان بھی ہوا اور راجپوتانہ کی چند ریاستیں مغلوں کے خلاف ہو گئیں لیکن مورخوں نے اس لڑائی کے نتائج بیان کرنے میں مبالغہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شخصی نظام حکومت میں جب مرکزی حکومت کمزور ہو جاتی ہے تو صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہونے لگتی ہیں۔ یہی حشر مغلیہ سلطنت کا ہوا اور بہادر شاہ

کی یہ کوشش کہ راجپوتوں سے صلح کرکے اُن کو مطیع کرلیا جائے کچھ زیادہ کارگر نہیں ہوئی۔

مغل حکومت اور سکھ

سکھ مذہب کے بانی گرو نانک ۱۴۶۹ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کی کوشش تھی کہ ہندو مسلم تفریق کو دور کیا جائے۔ سکھوں کے چوتھے گرو رام داس کی اکبر کے دربار میں بڑی عزت تھی لیکن گرو ارجن کے زمانہ میں مغلوں سے تعلقات خراب ہو گئے اور جیسا کہ تم کو معلوم ہے جہانگیر کے زمانہ میں اُن کو باغی شہزادہ خسرو کا ساتھ دینے کے جرم میں سزائے موت دی گئی۔ اُن کے بیٹے گرو ہرگوبند نے شاہجہاں کی مخصوص شکارگاہ میں شکار کھیلنا چاہا اور سرکاری ملازموں پر حملہ کیا۔ اس پر لڑائی شروع ہوگئی۔ ابتدا میں شاہی سپاہیوں کو شکست ہوئی لیکن آخرکار گرو ہرگوبند نے کشمیر میں پناہ لی اور وہیں ۱۶۴۵ء میں وفات پائی۔ ان کے جانشین گرو ہررائے ہوئے۔ دارا شکوہ ان کے پاس اکثر جایا کرتا تھا۔ اورنگ زیب نے بادشاہ ہونے کے بعد اس کے متعلق گرو ہررائے سے دریافت کیا۔ انہوں نے اپنے سب سے بڑے لڑکے رام رائے کو دربار میں بھیج دیا۔ لیکن ۱۶۶۱ء میں اپنی وفات سے پہلے گرو ہررائے نے بجائے اپنے بڑے بیٹے رام رائے کے دوسرے بیٹے ہرکشن کو گدی نشینی کے لئے نامزد کیا۔ ۱۶۶۴ء میں گرو ہرکشن نے بھی وفات پائی اور تیغ بہادر گرو ہوئے۔ رام رائے نے اورنگ زیب کی مدد سے گدی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اب گرو تیغ بہادر نے مغلوں کا باقاعدہ مقابلہ کیا اور اسی مقابلہ میں اپنی جان دیدی۔ اس واقعہ کو مورخوں نے مختلف طرح سے بیان کیا ہے لیکن کننگھم جس نے سکھوں کی تاریخ لکھی ہے کہتا ہے کہ یہ بات یقینی ہے کہ تیغ بہادر کو بغاوت کی وجہ سے قتل کیا گیا۔ جو

کچھ بھی وجہ ہو اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں کی قوم بھی مغلوں کی دشمن ہوگئی اور اُنکی دشمنی سے سلطنت مغلیہ کو کافی نقصان پہنچا۔ سکھوں کے آخری گرو گوبند سنگھ ہوئے

گرو گوبند سنگھ

اُنھوں نے سکھ قوم کو متحد کیا اور اُن کو سپاہی بنا دیا۔ وہ مغلوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اُس کے جانشین بہادر شاہ نے گرو گوبند سنگھ سے صلح کر لی۔ لیکن ۱۷۰۸ء میں گرو گوبند سنگھ کو دکن میں ایک پٹھان نے قتل کر دیا۔

مرہٹوں کا عروج

اورنگ زیب کی پچاس سالہ حکومت کا دوسرا دور ۱۶۸۱ء سے شروع ہوتا ہے جبکہ وہ راجپوتوں سے صلح کرکے دکن گیا۔ اس سے پہلے کہ ہم اُس کی لڑائیوں کے واقعات بیان کریں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹوں کے عروج کا مختصر حال لکھا جائے

مرہٹوں کا وطن مہاراشٹر کہلاتا ہے اور مغربی گھاٹ کے پورب میں واقع ہے۔ اس پہاڑی علاقے کی آب و ہوا بہت عمدہ ہے۔ یہاں کے باشندے چست محنتی اور جفاکش ہوتے ہیں۔ بھگتی کی تحریک نے جو سب سے پہلے دکن میں شروع ہوئی تھی مہاراشٹر کے لوگوں میں سیاسی اور قومی اتفاق کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ مرہٹے دکن کے مسلمان بادشاہوں کی فوجوں میں بڑی تعداد میں داخل ہو گئے تھے۔ ابتدا میں یہ لوگ احمد نگر کی طرف سے مغلوں کے خلاف لڑے لیکن رفتہ رفتہ بیجاپور اور گولکنڈہ کی فوجوں میں بھرتی ہونے لگے اور اُن کے بعض سردار اپنی قابلیت اور وفاداری کے سبب بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ گئے۔ اس سلسلہ میں شاہ جی بھونسلے کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے کیونکہ اسی کے بیٹے شیوا جی نے مرہٹوں کو ایک متحدہ اور مضبوط قوم بنا دیا اور ایک خودمختار سلطنت کی بنیاد رکھ کر اُن کو اس قابل کر دیا کہ مغلوں کے زوال کے بعد ملک کا اکثر حصہ اُن کے قبضہ میں آگیا۔

شیواجی کی ابتدائی زندگی

شیواجی کا باپ شاہ جی بھونسلا احمد نگر کی فوج میں سردار تھا۔ شاہجہاں نے جب احمد نگر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا تو شاہ جی بھونسلا نے بیجاپور کے سلطان کی ملازمت کر لی۔ شیواجی سنہ ۱۶۲۷ء میں پیدا ہوا اُسکی ابتدائی تربیت اُس کی ماں جیجابائی اور اُس کے اتالیق دادا جی کاندیو کی نگرانی میں ہوئی۔ جیجابائی ایک پرہیزگار ہندو عورت تھی۔ وہ بچپن ہی میں اپنے بیٹے کو پرانے زمانے کے لوگوں کی بہادری کے وہ قصے سنایا کرتی تھی جو ہندوؤں کی مذہبی کتابوں میں موجود ہیں۔ شیواجی کے دل پر اس کا یہ اثر ہوا کہ

وہ ہندو تہذیب اور تمدن کا دلدادہ ہو گیا اور اس کی بڑی وقعت کرنے لگا۔
داداجی کانڈیو نے اسلحہ جنگ کا استعمال اور ریاست کا کاروبار سکھلایا۔
اسی طرح بھگتی تحریک کے پیشوا رام داس اور تُوکارام نے اس کے دل میں
مذہب اور وطن کی محبت پیدا کر دی۔ خوش قسمتی سے جب وہ جوان ہوا تو
دکن کی سیاسی حالت ایسی تھی کہ
اس کو اپنے منصوبوں میں کامیابی
ہوئی۔ دکنی ریاستیں مغلوں کے
متواتر حملوں سے پامال ہو چکی تھیں
اور شاہان بیجاپور جن کے علاقے میں
شیواجی کی خاندانی جاگیر واقع تھی
بہت کمزور ہو گئے تھے۔ چنانچہ شیواجی
نے جس کی عمر ابھی بیس سال کی بھی نہ
تھی ایک فوج اکٹھا کر کے سرحدی قلعوں
پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ۱۶۴۶ء میں

شیواجی

اس نے تُورنا کا پہاڑی قلعہ لے لیا اور دو تین سال کے عرصہ میں قریب قریب
کے اور قلعے بھی اپنے قبضے میں کر لئے۔ اس کے بعد اس نے کانکن کے
زرخیز علاقہ پر حملہ کر کے کلیان فتح کیا۔ اس نے سلطان کے درباریوں میں
سے کچھ لوگوں کو رشوتیں دے کر اپنے ساتھ کر لیا تھا۔ یہ لوگ سلطان کو
سمجھا دیتے تھے کہ شیواجی یہ قلعے حکومت ہی کی طرف سے فتح کر کے باغی
اور سرکش جاگیرداروں کو سزا دیتا ہے۔
جب شیواجی کی زیادتی حد سے بڑھ گئی تو سلطان نے اس کے باپ سے کہا

لیکن شاہ جی بھونسلے نے کہہ دیا کہ اُس کا بیٹا اُس کے قبضے سے باہر ہے ۔ اسی دوران میں شاہ جی قید کر لیا گیا۔ شیواجی نے لوٹ مار ختم کر دی اور شاہجہاں کی مدد سے اپنے باپ کو رہا کرا لیا اور کچھ عرصہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

افضل خاں کا قتل ۱۶۵۹ء

تخت نشینی کی جنگ کے زمانہ میں سلطان بیجاپور کو مغلوں کے حملوں سے نجات ملی تو اُس نے شیواجی کی طرف توجہ کی اور اپنے ایک مشہور اور تجربہ کار سردار افضل خاں کو شیواجی کے خلاف بھیجا۔ اس وقت تک شیواجی کو کسی فوج سے مقابلہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اُس کو خیال پیدا ہوا کہ وہ اتنی بڑی فوج کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ چنانچہ اُس نے افضل خاں کو چالاکی سے قتل کر دیا۔ دونوں میں یہ طے پایا کہ ملکر سمجھوتہ کر لیا جائے۔ شیواجی اپنے کپڑوں کے نیچے ہتیار پہن کر افضل خاں سے ملنے گیا اور جس وقت افضل خاں اُس سے بغلگیر ہو رہا تھا تو اُس کو دھوکے سے پہلو میں خنجر بھونک کر مار ڈالا۔ سردار کے مرنے سے بیجاپور کے سپاہی تتر بتر ہو گئے اور چاروں طرف کو بھاگ گئے۔ اس واقعہ سے شیواجی کی شہرت تمام مہاراشٹر میں پھیل گئی۔ اب اُس نے اور قلعے فتح کر کے اپنی طاقت بھی بڑھالی اور بیجاپور کی فوجوں کو شکست دی۔ آخر کار بیجاپور کے سلطان کے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ شیواجی کو اُس کے فتح کئے ہوئے علاقے کا حکمراں تسلیم کرے۔

شائستہ خاں پر چھاپہ ۱۶۶۳ء

شیواجی اب اسقدر دلیر ہو گیا تھا کہ اُس نے مغلوں کے علاقے پر چھاپہ مارنا شروع کر دیا۔ اورنگ زیب نے امیر الامرا شائستہ خاں کو دکن بھیجا۔ شائستہ خاں نے چند شہروں اور قلعوں پر

قبضہ کرلیا۔ بارش شروع ہونے پر وہ پونا واپس آیا اور اُس مکان میں قیام کیا جہاں شیواجی پیدا ہوا تھا۔ وہ چار سو آدمیوں کو ساتھ لیکر برات کے بہانہ سے شہر میں داخل ہو گیا اور رات کے وقت شائستہ خاں پر چھاپہ مارا۔ رمضان کا زمانہ تھا اور چند باورچیوں کے علاوہ جو کھانا پکانے میں مشغول تھے سب لوگ سو رہے تھے۔ مرہٹوں نے پہلے اُن کو قتل کیا اور پھر مکان کے اندر گھس گئے۔ شائستہ خاں نے دو تین مرہٹوں کو مارا اور بھاگ کر جان بچائی۔ لیکن بھاگتے وقت اُس کی اُنگلیاں کٹ گئیں۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد یعنی ۱۶۶۴ء میں شیواجی نے سورت پر حملہ کیا اور بہت سا مال و اسباب لوٹا۔

شیواجی اورنگ زیب کے دربار میں ۱۶۶۶ء

اب اورنگ زیب نے شیواجی کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے کا مصمم ارادہ کرلیا اور اپنے دو بہترین سپہ سالار یعنی دلیر خاں اور مرزا راجہ جے سنگھ کو دکن روانہ کیا۔ جے سنگھ نے تھوڑے ہی عرصہ میں مرہٹوں کے اکثر قلعوں پر قبضہ کر کے راج گڈھ پر چڑھائی کی تیاری شروع کردی۔ شیواجی کو اپنی شکست کا یقین تھا۔ چنانچہ اُس نے جے سنگھ کے پاس صلح کا پیغام بھیجا اور تئیس ضلعے مغلوں کو دے کر اُن کی طرف سے بیجاپور کے خلاف لڑنے پر راضی ہو گیا۔ اس کے بدلے میں اُس کو بیجاپور کے بعض حصّوں میں چوتھ وصول کرنے کا حق دیدیا گیا۔

۱۶۶۶ء میں جے سنگھ کے کہنے سے شیواجی خود اورنگ زیب کے دربار میں حاضر ہوا لیکن بادشاہ کا برتاؤ اُس کو پسند نہیں آیا۔ لہذا ایک دن مٹھائی کے ٹوکرے میں بیٹھ کر محل سے نکل گیا اور بنگال۔ اڑیسہ اور گونڈوانہ ہوتا ہوا اپنے وطن پہنچ گیا۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ اورنگ زیب کی یہ بہت بڑی

سیاسی غلطی تھی کہ اُس نے شیواجی کو ناخوش کر دیا جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو اورنگ زیب نے شیواجی کو راجہ کا خطاب اور اُس کے بیٹے شنبھوجی کو پنجہزاری منصب عطا کیا اور جاگیر بھی دی لیکن شیواجی کو اس سے کہیں زیادہ اُمید تھی۔ اُس نے دربار ہی میں اپنی ناراضگی کا اظہار کر دیا۔ اس کے علاوہ شیواجی کو یہ بات بھی ناگوار ہوئی کہ قیدیوں کی طرح اُس کی نگرانی کی جاتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ اگر بادشاہ شیواجی کو اپنا دوست بنا لیتا تو اُسکی مدد سے دکن کی سلطنتوں کو نہایت آسانی سے فتح کر لیتا اور اُس کو دکن میں اتنی طویل مدت تک ٹھہرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ لیکن یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جو منصب اور خطاب شیواجی کو عطا ہوا وہ بڑے بڑے راجپوت راجاؤں کو ملتا تھا اور اُس کے نزدیک یہ بے انصافی ہوتی کہ مغل بادشاہ ایک مرہٹہ سردار کو راجپوت راجاؤں سے بڑھ کر عزت اور منصب عطا کرے۔ لیکن اس وقت شیواجی کی طاقت کسی راجپوت راجہ سے کم نہ تھی۔ اورنگ زیب نے اُس کی اہمیت اور قوت کا صحیح اندازہ نہیں کیا۔ اب سیاسی حالات کا رنگ دوسرا تھا اور مغلوں کو بھی اپنا رویہ بدلنا چاہیئے تھا۔ بہرحال دربار سے واپس جانے کے بعد شیواجی نے اپنی سلطنت کو بڑھانے اور مستحکم کرنے کا پورا ارادہ کر لیا اور ایک بڑی حد تک اپنے اس مقصد میں وہ کامیاب بھی ہوا۔

شیواجی کا نظام حکومت — سنہ ۱۶۷۴ء میں شیواجی نے تاجپوشی کی رسم ادا کی اور ایک خود مختار راجہ کی حیثیت سے رہنے لگا۔ شیواجی اپنی سلطنت کو سوراجیہ کہتا تھا۔ یہ وہ ملک تھا جس کا وہ خود انتظام کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اور اضلاع تھے جن میں وہ چوتھ یا لگان کا چوتھائی حصہ وصول کرتا تھا۔ یہ حصہ مغلئی کہلاتا تھا۔ شیواجی صرف بہادر

سپاہی اور قابل سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ ملک کے انتظام کی قابلیت بھی رکھتا تھا۔ اُس نے اپنے نظام حکومت کی بنیاد قدیم ہند و اصولوں پر رکھی تھی لیکن بعض چیزوں میں اُس نے مغلوں کی بھی نقل کی۔ اُس کی مجلس انتظامیہ میں آٹھ ممبر ہوتے تھے۔ حکومت کا سارا کام اٹھارہ مختلف محکموں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ کل سلطنت میں تین صوبے تھے۔ ہر صوبے میں ایک صوبہ دار رہتا تھا۔ مقدمات طے کرنے کے لئے پنچایتیں موجود تھیں۔ زمین کی باقاعدہ پیمائش کی جاتی تھی۔ اور پیداوار کا ⅖ حصّہ بطور مالگزاری کے لیا جاتا تھا۔ شیواجی مالگزاری اپنے تنخواہ دار ملازموں کے ذریعہ سے وصول کرتا تھا۔ وہ کاشتکاروں کا بہت خیال رکھتا تھا اور ضرورت کے وقت اُن کو پیشگی روپیہ دیدیا جاتا تھا تاکہ وہ بیج اور مویشی وغیرہ خرید لیں۔ فوج کے سپاہیوں کو بھی تنخواہ خزانہ سے ملتی تھی۔ رسالے میں پچیس سواروں کا ایک دستہ ہوتا تھا جس کا افسر حوالدار کہلاتا تھا۔ پانچ حوالداروں کے اوپر ایک جملہ دار اور دس جملہ داروں پر ایک ہزاری مقرر ہوتا تھا۔ شیواجی کے پاس ایک جہازی بیڑہ بھی تھا۔

شیواجی کے اوصاف اور کارنامے

شیواجی اپنے زمانہ کا بہت بڑا اور بہادر سپاہی تھا۔ دکنی ریاستوں اور مغلوں کی طاقت کے باوجود بھی اُس نے ایک خودمختار ریاست قائم کرلی۔ یہ معمولی کارنامہ نہیں، وہ بلند حوصلہ بھی تھا اور جفاکش بھی۔ اُس میں وہ اوصاف موجود تھے جن کی وجہ سے اُس کے ساتھی اُس پر جان قربان کرنے کو تیار تھے۔

شیواجی کا باپ احمد نگر اور بعد میں بیجاپوری فوج میں ایک سردار تھا لیکن شیواجی نے ایک نئی اور خودمختار سلطنت ہی نہیں قائم کی بلکہ اپنی قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اُس سے پہلے مرہٹوں کی قوم ایک گمنام قوم تھی۔ اُس نے اُن کو اس قدر

منظم اور مضبوط کر دیا کہ وہ مغلوں اور دکن کی طاقتور ریاستوں کا مقابلہ کرنے لگے اور اس مقابلہ میں کامیاب بھی ہوئے۔ شیواجی پر مکر و فریب اور دھوکہ بازی کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض موقعوں پر اُس نے دھوکے سے کام لیا۔ لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتا تو دشمن کے خلاف کامیابی نہیں ہو سکتی تھی اور اُس کی زندگی کا مقصد حاصل نہ ہوتا یعنی وہ ایک نئی اور خود مختار سلطنت کی بنیاد نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قوم اور مذہب کی اُس نے بہت بڑی خدمت کی اور تاریخ میں ہمیشہ کے لئے اپنا نام چھوڑ گیا۔ شیواجی نے اپنی سیاسی زندگی لوٹ مار سے شروع کی اور یہ سلسلہ اُس کی وفات تک بلکہ اُس کے بعد بھی جاری رہا لیکن اس کے باوجود بھی اس میں بہت سی خوبیاں تھیں۔ اس کا حکم تھا کہ جب سپاہی لوٹ مار کو جائیں تو مسجد یا قرآن شریف یا کسی عورت کو نقصان نہ پہنچائیں۔ جب قرآن پاک کی کوئی جلد اُس کے ہاتھ لگتی تو وہ اُس کا بہت احترام کرتا اور اپنے کسی مسلمان سپاہی کے سپرد کر دیتا۔ اگر کوئی عورت قید ہو کر آتی تو جس وقت تک اُس کے رشتہ دار اُس کو چھڑا نہ لے جاتے وہ خود اُس کی نگہداشت کرتا۔ وہ اپنی رعایا کی عزّت اور آبرو کا ہمیشہ خیال رکھتا تھا جو شخص اُس کی حکم عدولی کرتا تھا وہ سخت سزا پاتا تھا۔ شیواجی فیاض، منصف مزاج اور غریب پرور راجہ تھا۔ وہ خود تو پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اکبر کی طرح عالموں کی عزت کرتا تھا اور طالب علموں کی مدد کرتا تھا۔

اورنگ زیب کا ورود دکن میں

شیواجی کے مرنے سے دکن کی سیاست میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اُس کا لڑکا اور جانشین شنبھوجی اپنے باپ کی طرح تو قابل نہ تھا لیکن ایک بہادر سپاہی ضرور تھا۔ اورنگ زیب نے خیال کیا ممکن ہے کہ دکن کی ریاستیں اور

مرہٹے شہزادہ اکبر کو جو راجپوتانہ سے بھاگ کر دکن آگیا تھا دہلی کا بادشاہ تسلیم کریں۔ چنانچہ وہ راجپوتوں سے فوراً صلح کرکے دکن کو روانہ ہو گیا اور ایک زبردست فوج کے ساتھ مارچ ۱۶۸۲ء میں اورنگ آباد پہنچکر قیام کیا۔ پہنچتے ہی اس نے شہزادہ معظم اور اعظم کو مرہٹوں کے خلاف روانہ کیا اُنھوں نے بڑے بڑے شہروں پر تو قبضہ کر لیا لیکن اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکے۔ مرہٹوں سے لڑائی ختم ہونے نہ پائی تھی کہ دکن کی مسلمان ریاستوں سے شروع ہو گئی اور اورنگ زیب کو اپنی عمر کا باقی حصہ یہیں گذارنا پڑا۔ دکن کی ریاستیں فتح ہو کر سلطنت مغلیہ میں شامل ہو گئیں۔ مرہٹوں کا راجہ یعنی شاہو گرفتار ہو کر مغلوں کے پاس آ گیا لیکن پچیس سال کی متواتر لڑائی کی وجہ سے نظام سلطنت میں خرابیاں پیدا ہونے لگیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اورنگ زیب کے بعد ہی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔

بیجاپور اور گولکنڈہ اپریل ۱۶۸۵ء میں اورنگ زیب نے بیجاپور کا محاصرہ شروع کر دیا۔ بیجاپوریوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخر کار اکتوبر ۱۶۸۶ء میں اُنھوں نے قلعہ مغلوں کو دیدیا۔ بیجاپور کا آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ قید ہو گیا اور اُس کا ملک مغلوں کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے گولکنڈہ بھی فتح کرکے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ گولکنڈہ کے سلطان ابوالحسن شاہ کے خلاف یہ الزام تھا کہ اُس نے مغلوں کے دشمنوں کو مدد دی تھی۔ بیجاپور کے سلطان کی طرح ابوالحسن بھی گرفتار ہو گیا۔

اورنگ زیب کی آخری فتوحات بیجاپور اور گولکنڈہ فتح کرنے کے بعد اورنگ زیب نے پوری توجہ مرہٹوں کی طرف کی۔ ۱۶۸۹ء میں مرہٹوں کا دارالسلطنت اور راجہ مغلوں کے قبضے میں

آ گئے۔ شنبھوجی نے اورنگ زیب کے سامنے بدزبانی کی جس کی سزا میں اُس کو قتل کر دیا گیا۔ اُس کا بیٹا مغلوں کے پاس رہا۔ شنبھوجی کے قتل کے بعد بھی لڑائی جاری رہی۔ کیونکہ اب بھی بعض قلعے مرہٹوں کے ہاتھ میں تھے۔ مغلوں کو ان قلعوں کے فتح کرنے میں بہت وقت اٹھانی پڑی اور اورنگ زیب کی عمر کے بقیہ اٹھارہ سال اسی کوشش میں گذرے۔ بڑے بڑے شہر اور قلعے تو مغلوں کے ہاتھ میں تھے لیکن پھر بھی مرہٹے بہت پریشان کرتے تھے۔ اُن کی لوٹ مار کا سلسلہ جاری تھا اور اب وہ مغلوں کے کیمپ پر بھی اکثر چھاپہ مارتے تھے اور راستوں پر قبضہ کر لیتے تھے۔ اس قسم کی لڑائی سے ملک میں بدامنی اور بےچینی پھیلنے لگی۔ اورنگ زیب نے باوجود اپنی ضعیفی کے انتہائی کوشش کی کہ مرہٹوں کو اسی طرح ختم کر دے جیسے کہ گولکنڈہ اور بیجاپور کو کیا تھا، لیکن اس میں اس کو پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ شاہو کی گرفتاری کے بعد شنبھاجی کے چھوٹے بھائی راجہ رام نے سلطنت کا کام اپنے ذمہ لیا۔ رائے گڈھ فتح ہونے پر راجہ رام نے جنجی کے قلعے میں پناہ لی۔ یہ قلعہ نہایت مضبوط تھا اور کئی سال کی کوشش کے بعد مغلوں کے قبضہ میں آیا۔ راجہ رام بھاگ کر ستارا پہنچا۔ مغلوں نے اُس کو بھی فتح کر لیا۔ ستارا فتح ہونے سے پہلے راجہ رام مرگیا۔ لیکن اُس کی بیوی تارا بائی جو اپنی ذہانت اور تدبر کے لئے مشہور تھی مغلوں کا مقابلہ کرتی رہی۔

اورنگ زیب کی پالیسی دکن میں

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کا سب سے بڑا سبب اورنگ زیب کی دکن کی پالیسی ہے۔ اگر اورنگ زیب دکن کی مسلمان ریاستوں کو فتح نہ کرتا تو مرہٹوں کی طاقت اسقدر نہ بڑھتی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب مذہبی تعصب کی وجہ سے یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی شیعہ ریاست

ہندوستان میں باقی رہے۔ لیکن تاریخی واقعات پر غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسقدر بڑا ملزم نہیں تھا جیسا کہ بعض مورخوں کا خیال ہے۔ دکن کا مسئلہ کوئی نیا مسئلہ نہیں تھا۔ ہم کو معلوم ہے کہ اکبر نے سب سے پہلے دکن کا کچھ حصہ اپنی سلطنت میں شامل کیا اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اُس کو اور موقع ملتا تو وہ اپنی فتوحات جاری رکھتا۔ اُس کے بعد جہانگیر اور شاہجہاں کے زمانہ میں بھی پالیسی رہی جہانگیر کو کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی لیکن شاہجہاں نے احمد نگر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اورنگ زیب کی پالیسی بالکل وہی تھی جو دوسرے مغل بادشاہوں کی تھی۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ اگر دکن کی ریاستیں قائم رہتیں تو مرہٹے زور نہ پکڑتے۔ درحقیقت واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں کی طاقت ان ریاستوں ہی کی وجہ سے بڑھی اور اب وہ اسقدر قوی ہو گئے تھے کہ یہ ریاستیں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ اورنگ زیب جانتا تھا کہ دکن میں صرف مغل ہی امن قائم کر سکتے ہیں اور اُس کی صورت یہی ہے کہ وہاں اپنی حکومت قائم کی جائے۔ چنانچہ یہ ضروری ہو گیا تھا کہ یا تو دکن کا خیال بالکل چھوڑ دیا جائے اور مغلیہ سلطنت صرف شمالی ہندوستان تک محدود رہے۔ یا دکن کو فتح کر کے مکمل طریقہ پر سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔ دکن کو اپنی حالت پر چھوڑ دینے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے وہی کیا جو اُس کی جگہ پر اگر اکبر ہوتا تو کرتا یعنی یہ کہ دکن کی ریاستوں کو فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن مرہٹوں کے مقابلہ کی وجہ سے اُس کا سارا وقت لڑنے میں گذرا اور اُس کو اتنی فرصت نہیں ملی کہ دکن میں سلطنت کی بنیاد ایسی ہی مضبوط کر دیتا جیسی کہ اکبر نے شمالی ہند میں کر دی تھی۔

اورنگ زیب کی سیرت | اورنگ زیب مغل خاندان کا بہت بڑا بادشاہ

گذرا ہے۔ اپنی شہزادگی کے زمانہ میں اُس نے اپنی شجاعت، ہمت اور قابلیت کا سکہ جما لیا تھا۔ اُس کے لڑکپن کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ اُس نے گھوڑے پر سے اُتر کر ایک مست ہاتھی کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا۔ شاہجہاں بھی سمجھتا تھا کہ اورنگ زیب اُس کے بیٹوں میں سب سے زیادہ قابل ہے۔ چنانچہ بڑی بڑی مہموں پر اُس کو بھیجتا تھا۔ وہ نہایت مستقل مزاج تھا۔ اور لڑائی کے گُروں سے خوب واقف تھا۔ دشمن کا مقابلہ بڑے اطمینان سے کرتا اور کبھی گھبراتا نہ تھا۔ اوائل عمر میں شاہجہاں نے اُس کو بلخ کی مہم پر بھیجا۔ لڑائی کے دوران میں ظہر کی نماز کا وقت آ گیا۔ اورنگ زیب کے ساتھیوں نے منع کیا لیکن وہ نہیں مانا۔ گھوڑے سے اُتر کر اُس نے نہایت اطمینان سے نماز ادا کی اور پھر لڑنے لگا۔ وہ ایک بہادر سپاہی اور قابل سردار ہی نہیں تھا بلکہ ایک زبردست فاضل اور ادیب بھی تھا۔ اُس کے خطوط بکثرت موجود ہیں اور فارسی ادب میں اعلیٰ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ حافظِ قرآن بھی تھا اور فقہ، منطق اور فلسفہ سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا۔ قرآن شریف اپنے ہاتھ سے لکھ کر مدینہ بھیجتا تھا۔ وہ نہایت عابد، زاہد اور متقی تھا اور چاہتا تھا کہ حکومت میں ہر بات شریعت کے موافق ہو۔ خود انتہائی سادہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اپنی ذات کے خرچ کے لئے خزانہ شاہی سے ایک پیسہ نہیں لیتا تھا بلکہ ٹوپیاں سیتا اور اُس کی آمدنی سے اپنی گذر کرتا تھا۔ عیش و عشرت، آرام طلبی اور شعر و شاعری کو بالکل فضول سمجھتا تھا۔ گانا بجانا بھی دربار میں بند کرا دیا تھا۔ اس کا رعب لوگوں کے دلوں پر ایسا ہی تھا جیسے چار سو برس پہلے سلطان بلبن کا تھا۔ کسی شخص کو اُس کے سامنے مذاق کرنے، چغلی کھانے اور جھوٹ بولنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کا ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرتا تھا اور ہر وقت سلطنت

کے کام میں لگا رہتا۔ جن لوگوں نے بڑھاپے میں اُس کو کام کرتے ہوئے دیکھا تھا وہ حیرت کرتے تھے کہ اتنی عمر میں یہ شخص کسقدر کام کرتا ہے۔ اورنگزیب اپنی ذمہ داریوں کو خوب سمجھتا تھا اور اپنے فرائض منصبی ادا کرنے میں پوری کوشش کرتا تھا۔ وہ نہایت منصف مزاج بادشاہ تھا اور چھوٹے چھوٹے معاملات کو بڑی محنت اور ایمانداری کے ساتھ طے کرتا تھا۔ امیر اور غریب میں کوئی تفریق نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹوں کو بھی قصور کرنے پر قید کر دیتا تھا۔ اُس کو کسی پر بھروسہ نہیں تھا اور نہ اُس کا کوئی رازدار تھا۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی حیثیت سے اورنگ زیب میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک بیدار مغز اور قابل بادشاہ میں ہونی چاہئیں لیکن باوجود ان صفات کے وہ کامیاب نہ ہوا۔ اکثر مورخوں کا خیال ہے کہ وہ اپنی مذہبی پالیسی کی وجہ سے ناکامیاب رہا لیکن تاریخی واقعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی اکبر اور اس کے جانشینوں کی پالیسی سے کچھ مختلف تھی اور وہ چاہتا تھا کہ حکومت کا پورا انتظام اسلامی شریعت کے مطابق ہو اور ایک حد تک اُس نے اس مقصد میں کامیابی بھی حاصل کی لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اُس کے عہد کی تمام بغاوتیں اُس کی مذہبی پالیسی کی وجہ سے ہوئیں۔ راجپوت، سکھ اور مرہٹوں کی بغاوتوں کو ہم مذہبی بغاوتیں نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اکثر موقعوں پر اورنگ زیب کی طرف سے ہندو اپنے ہمذہبوں کے خلاف لڑتے تھے۔ اورنگ زیب کے بعض مذہبی احکامات ہندوؤں کو ضرور ناپسند تھے لیکن اس حد تک نہیں کہ اُن کی وجہ سے کوئی ایسی تحریک ہوتی جس میں سب ہندو شریک ہوتے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ اورنگ زیب ایک

عرصہ دراز تک دکن میں لڑتا رہا۔ اس کی وجہ سے ملک کی اقتصادی حالت بہت خراب ہو گئی۔ علاوہ ازیں بادشاہ کو ایک عرصہ تک شمالی ہندوستان جانے کا موقع نہیں ملا اور شخصی حکومت میں بادشاہ کی موجودگی بہت ضروری ہے۔ شاہی خزانہ خالی ہو گیا اور فوج کے سپاہی آرام طلب ہو گئے۔ غرض یہ کہ اورنگ زیب کو ایک کاہل اور آرام طلب فوج کے ساتھ دکن کی قوتوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور یہ اُس کی قابلیت اور خوبی تھی کہ باوجود اس کے اس نے جنوبی ہندوستان فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ لیکن اس پالیسی کی وجہ سے جو خرابیاں پیدا ہوئیں اُن کو درست کرنے کا مشکل کام وہ اپنے جانشینوں کے لئے چھوڑ گیا۔ اُس کے جانشین اس قابل نہ تھے کہ سلطنت کو سنبھالتے اور ان خرابیوں کو دور کرتے۔ چنانچہ اُس کے بعد سلطنت برابر کمزور ہوتی گئی اور نئی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔

باب ۳۵

مغلیہ سلطنت کا زوال

بہادر شاہ ۱۷۰۷-۱۷۱۲ء | اورنگ زیب کی وفات کے وقت اس کے تین بیٹے زندہ تھے۔ اس کی وصیت تھی کہ معظم شاہ شمالی اور مشرقی صوبوں کا بادشاہ ہو۔ آگرہ سے جنوب اور جنوب مغرب کی طرف کا

ملک اعظم کے سپرد کیا جائے اور گولکنڈہ اور بیجاپور میں کام بخش حکمرانی کرے۔ لیکن اُس کے مرتے ہی ان بھائیوں نے لڑنا شروع کر دیا۔ اعظم مالوہ کا گورنر تھا۔ وہ اپنے باپ کے انتقال کی خبر پاکر دکن پہنچا اور اُس کے دکن وغیرہ کا انتظام کیا۔ معظم شاہ جمرود میں تھا۔ وہاں سے فوراً آگرہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ معظم اور اعظم میں آگرہ کے قریب لڑائی ہوئی۔ اعظم مارا گیا اور معظم تخت پر بیٹھا اور بہادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔ معظم چاہتا تھا کہ کام بخش بیجاپور اور گولکنڈہ کی گورنری پر قائم رہے۔ لیکن اُس نے اس تجویز کو نہیں مانا اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بہادر شاہ ایک بڑی فوج لے کر دکن پہنچا۔ کام بخش نے مقابلہ کیا اور لڑائی میں کام آیا۔

بہادر شاہ نے شیواجی کے پوتے شاہو کو رہا کر دیا۔ اُس کے رہا ہوتے ہی مرہٹوں میں تخت نشینی کے لئے جنگ شروع ہوگئی اور مغلوں کو اُس طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اب اُس نے راجپوتانہ کی طرف توجہ کی۔ اُسی وقت سکھوں نے بغاوت کی۔ اس لئے بہادر شاہ نے راجپوتوں سے صلح کر کے میواڑ اور مارواڑ کے راجاؤں کے حقوق کو تسلیم کر لیا اور پنجاب کی طرف بڑھا۔ گرو گوبند سنگھ نے بندہ کو سکھوں کا سردار مقرر کیا تھا۔ گوبند سنگھ بہادر شاہ کے ساتھ دکن گئے تھے وہاں وہ قتل ہوگئے۔ اُن کے قتل ہونے کے بعد بندہ نے پنجاب پہنچکر ایک بڑی فوج اکٹھا کر لی اور ۱۷۱۰ء میں سرہند پر قبضہ کر کے خوب لوٹا اور مسلمانوں کو پریشان کیا۔ بہادر شاہ راجپوتانہ سے روانہ ہو کر پنجاب پہنچا اور لوہ گڈھ میں سکھوں کو محصور کر لیا سکھوں کو شکست ہوئی لیکن بندہ جان بچا کر بھاگ گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد امن و امان قایم ہوگیا۔ ۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ مر گیا۔ تخت نشینی کے وقت بہادر شاہ ایک سن رسیدہ شخص تھا۔

اُس زمانہ میں جو کچھ مغلوں کو کامیابی ہوئی وہ اُن تجربہ کار اور لایق افسروں کی بدولت ہوئی جو اورنگ زیب کے ساتھ کام کر چکے تھے۔ پھر بھی بادشاہ کی کمزوری کا نتیجہ یہ ہوا کہ درباری امرا میں پارٹیاں ہوگئیں۔ اُن میں سے تورانی اور ہندوستانی امرا اکثر سنی تھے اور ایرانی امرا زیادہ تر شیعہ تھے۔ چنانچہ سیاسی اور ذاتی اختلافات کے علاوہ مذہبی اختلافات بھی موجود تھے۔

فرخ سیر ۱۷۱۳-۱۷۱۹ء

بہادر شاہ کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹوں میں لڑائی شروع ہوگئی سب سے بڑا لڑکا کامیاب ہوا اور جہاندار شاہ کا لقب اختیار کرکے تخت پر بیٹھا دہلی پہنچکر اُس نے عیاشی اور آرام طلبی کی زندگی شروع کردی۔ اسی اثنا میں اُس کا بھتیجا فرخ سیر ایک بڑی فوج لے کر بنگال سے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ آگرہ کے قریب دونوں میں لڑائی ہوئی۔ جہاندار شکست کھا کر دہلی کو بھاگا لیکن گرفتار ہوگیا اور فرخ سیر کے حکم سے قتل کردیا گیا۔

فرخ سیر خود نااہل تھا لیکن اُس کے ساتھ دو سید بھائی عبداللہ اور حسین علی تھے جن کی مدد سے اُس نے تخت حاصل کیا تھا اور جو اُس کے دربار میں بہت اثر رکھتے تھے۔ بادشاہ اُن سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ مارواڑ کے راجہ اجیت سنگھ نے اجمیر پر قبضہ کرلیا۔ فرخ سیر نے سید حسین علی کو بھیجا۔ اُس نے راجپوتوں کو بادشاہ کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کردیا اور اجیت سنگھ کو اپنی ایک لڑکی کی شادی فرخ سیر کے ساتھ کرنی پڑی۔

فرخ سیر کو سکھوں سے بھی لڑنا پڑا۔ سکھوں نے مغل فوجوں کا بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخرکار اُن کو شکست ہوئی۔ بندہ اور اُس کے ساتھی گرفتار ہوئے اور قتل کردئے گئے۔ سید عبداللہ اور حسین علی کا اثر اب بہت بڑھ گیا تھا۔

اُن کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ بادشاہ اُن کے خلاف ہے چنانچہ اُنھوں نے اپنی مدد کے لئے مرہٹوں کی ایک فوج دکن سے منگالی۔ اب اُن کی مخالفت آسان نہ تھی۔ اُنھوں نے فرخ سیر کو تخت سے اُتار کر قید کیا اور دو مہینہ بعد قتل کروا دیا۔ اُس کے بعد کئی شہزادے تخت پر بیٹھے لیکن چند ماہ کے اندر ہی اُن کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ اب بہادر شاہ کا ایک پوتا تخت پر بیٹھا اور محمد شاہ کا لقب اختیار کیا۔

محمد شاہ
۱۷۱۹ - ۴۸ء

محمد شاہ نے تقریباً تیس سال بادشاہت کی مگر سلطنت کو تباہی سے نہ بچا سکا۔ اُس کے عہد میں کئی صوبہ دار خود مختار ہو گئے۔ ترکی سپہ سالار قلیچ خاں نے جو نظام الملک آصف جاہ کے لقب سے مشہور ہے۔ دہلی کی سازشوں سے تنگ آ کر دکن میں سکونت اختیار کر لی۔ سید حسین علی اُس کے خلاف دکن کو روانہ ہوا لیکن راستہ میں محمد شاہ نے اُسے قتل کرا دیا اور دہلی واپس آ کر اُس کے بھائی عبداللہ کو قید کر لیا اور کچھ عرصہ کے بعد اُس کو بھی زہر دے کر مروا ڈالا۔ سید بھائیوں سے چھٹکارا پانے کے بعد بھی محمد شاہ کی حالت کچھ بہتر نہ ہوئی کیونکہ دربار میں فرقہ بندی اور سازشوں کا سلسلہ جاری رہا جن کی وجہ سے مرکزی حکومت کمزور ہو گئی۔ ۱۷۲۴ء میں نظام الملک آصف جاہ نے آصفیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اسی زمانہ میں اودھ کا صوبہ دار نواب سعادت علی خاں خود مختار ہو گیا۔ اسی طرح بنگال میں علی وردی خاں نے خود مختار حکومت قایم کر لی۔ وہ ۱۷۵۶ء تک زندہ رہا۔ اس کے بعد اُس کا پوتا سراج الدولہ بنگال کا حکمراں ہوا۔ شاہانِ مغلیہ میں محمد شاہ آخری بادشاہ تھا جس نے شاہجہاں کے تختِ طاؤس پر بیٹھ کر دربار کیا لیکن اُس کے تیس سالہ عہد میں سلطنت کے مختلف حصوں میں خود مختار حکومتیں قایم ہو گئیں۔ سکھوں

روہیلوں اور مرہٹوں نے بغاوتیں شروع کر دیں اور جہاں جہاں موقع پایا ملک پر قبضہ کر لیا۔ ان حالات کا جو کچھ نتیجہ ہوا وہ ظاہر ہے۔ سلطنت دن بدن کمزور ہوتی گئی۔ محمد شاہ کے جانشین احمد شاہ۔ عالمگیر ثانی اور شاہ عالم تقریباً ساٹھ سال تک تخت دہلی کے مالک رہے، لیکن ان کے عہد کی تاریخ دراصل سکھوں اور مرہٹوں کے عروج اور بیرونی حملوں کی تاریخ ہے۔

نادر شاہ نادر شاہ ۱۷۳۶ء میں تخت ایران پر بیٹھا اور اگلے سال اس نے قندھار کا محاصرہ کیا۔ اسی زمانہ میں اس نے محمد شاہ کو خط لکھا کہ وہ قندھار سے بھاگے ہوئے لوگوں کو کابل میں پناہ نہ لینے دے۔ محمد شاہ نے اس کا وعدہ کر لیا لیکن اس کو پورا نہ کر سکا اور نادر شاہ کے ایلچی کو جو اس کی شکایت لے کر آیا تھا واپس نہیں جانے دیا۔ چنانچہ ۱۷۳۸ء میں قندھار فتح کرنے کے بعد نادر شاہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور غزنی، کابل اور پشاور کو فتح کرتا ہوا لاہور پہنچا۔ محمد شاہ کے دربار میں جب یہ خبر پہنچی تو پہلے نادر شاہ کا مذاق اڑایا گیا، لیکن جب وہ لاہور پر قبضہ کر کے دہلی کی طرف روانہ ہوا تو پریشانی ہوئی اور مختلف صوبوں کے گورنروں کو حکم ہوا کہ اپنی اپنی فوجیں لے کر دہلی آئیں۔ کرنال کے قریب لڑائی ہوئی اور باوجود اس کے کہ ایرانی فوج تعداد میں بہت کم تھی اس کو کامیابی ہوئی اور ہندوستانی فوج کے ہزارہا سپاہی میدان جنگ میں مارے گئے۔ محمد شاہ خود نادر شاہ کے پاس ملنے گیا۔ نادر شاہ بہت اخلاق سے پیش آیا لیکن اس نے محمد شاہ سے اس بات کی شکایت کی کہ وہ سلطنت کے کاموں سے بے خبر ہے اور بادشاہ کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اسقدر غافل اور مدہوش رہے۔ بہرحال اس نے وعدہ کیا کہ وہ ہندوستان کی سلطنت کو بدستور مغلوں کے پاس رہنے دیگا، لیکن وہ چاہتا تھا کہ دہلی جاکر

اپنی فوج کو کچھ عرصہ آرام کرنے کا موقع دے اور خزانہ سے روپیہ لے کر واپس چلا جائے۔ بدقسمتی سے دہلی میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ نادر شاہ قتل کر دیا گیا۔ اس افواہ کے مشہور ہوتے ہی دہلی والوں نے ایرانیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ نادر شاہ فوراً قلعے سے باہر آیا۔ اُس کو جب معلوم ہوا کہ کئی سو ایرانی سپاہی مار ڈالے گئے تو اُس کو بہت غصہ آیا اور اُس نے قتل عام کا حکم دے دیا۔ ایرانی سپاہیوں نے حکم پاتے ہی قیامت بپا کر دی۔ شہر میں خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ ایرانیوں نے جس کو پایا مار ڈالا۔ یہاں تک کہ عورتیں اور بچے بھی اُن کے ہاتھ سے نہ بچے۔ چاندنی چوک، دریبہ اور جامع مسجد کے اردگرد آگ لگا دی اور شہر کو دل بھر کر لوٹا۔ جب مقتولوں کی تعداد تیس ہزار سے بھی گذر گئی تو نظام الملک نے نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے آقا کی طرف سے رحم کی درخواست کی۔ اس پر نادر شاہ نے اپنی فوج کو روک دیا۔ اب اُس نے شاہی خزانہ اور تختِ طاؤس پر قبضہ کر لیا۔ محمد شاہ نے اُس کی تمام شرطیں مان لیں۔ اپنی لڑکی کی شادی اُس کے لڑکے کے ساتھ کر دی اور دریائے سندھ کے مغربی جانب کا سارا ملک اُس کو دیدیا۔ کہا جاتا ہے کہ تخت طاؤس میں کوہ نور بھی جڑا ہوا تھا۔ یہ وہی مشہور تاریخی ہیرا ہے جس کا ایک ٹکڑا آجکل شہنشاہ برطانیہ کے تاج کی زینت ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ تخت طاؤس میں جو جواہرات جڑے ہوئے تھے وہ دو کروڑ روپیہ سے کم نہ تھے اور تقریباً اسی قدر نقد روپیہ بھی نادر شاہ ہندوستان سے اپنے ساتھ لے گیا۔

نادر شاہ کے حملہ سے مغلیہ سلطنت کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ سڑکوں پر لاشوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے جن کے سڑ جانے کی وجہ سے آب و ہوا بالکل خراب ہو گئی تھی ہر طرف تباہی اور بربادی کے آثار نمایاں تھے۔ حکومت کا وقار تقریباً ختم ہو گیا۔

اور مغل بادشاہ کی سلطنت اور اختیارات روز بہ روز کم ہوتے گئے۔

مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ

۱۷۴۸ء میں محمد شاہ نے وفات پائی اور اس کا بیٹا احمد شاہ تخت پر بیٹھا۔ احمد شاہ بھی حکومت کرنے کا اہل ثابت نہیں ہوا۔ چھ سال بعد امیروں نے اسکو تخت سے اُتار کر جہاندار شاہ کے بیٹے عالمگیر ثانی کو تخت پر بٹھلایا۔ اس کے مختصر عہد حکومت کا سب سے اہم واقعہ احمد شاہ ابدالی کا حملہ ہے۔ نادر شاہ کے بعد افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کی حکومت قایم ہو گئی تھی اور پنجاب میں بھی اُس کا حاکم رہتا تھا۔ ۱۷۵۷ء میں شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی کو خوب لوٹا۔ اُس کے بعد جاٹوں کو شکست دی اور دوآبہ کے لوگوں سے روپیہ وصول کر کے واپس چلا گیا۔ اُس کی واپسی کے بعد بعض امیروں نے مرہٹوں کی مدد سے عالمگیر شاہ کو مار کر ایک اور شہزادہ کو تخت پر بٹھلایا لیکن اسی زمانہ میں اُس کے لڑکے علی گوہر نے الہ آباد میں شاہ عالم کا لقب اختیار کر کے اپنے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا۔

۱۷۶۴ء میں شاہ عالم اور نواب اودھ کی متحد فوج کو انگریزوں نے بکسر کے مقام پر شکست دی۔ شاہ عالم انگریزوں کی پناہ میں آگیا اور الہ آباد میں رہنے لگا۔ اس کے بدلے میں شاہ عالم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال۔ بہار اور اُڑیسہ کی دیوانی عطا کی اور ۱۷۷۱ء تک اُن کے اثر میں رہا۔ اس کے بعد وہ مادھوجی سندھیا کے ساتھ دہلی چلا گیا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد مرہٹوں کی طاقت کم ہو گئی تھی لیکن اُنھوں نے بہت جلد پھر عروج حاصل کر لیا اور اب اُن کا اثر اسقدر بڑھ گیا تھا کہ مغل بادشاہ صرف اُن کے قبضہ ہی میں نہیں تھا بلکہ ۱۷۸۴ء میں اُس نے سندھیا کے کہنے سے پیشوا کو وزیر اعظم کا خطاب عطا کیا۔

چار سال بعد ایک پٹھان امیر نے جس کا نام غلام قادر خاں تھا۔ شاہ عالم کو گرفتار کیا اور اس کی آنکھیں نکلوالیں۔ دہلی فتح ہونے کے بعد یہ ضعیف اور لاچار بادشاہ پھر انگریزوں کے قبضہ میں آگیا۔ اس کا بیٹا اکبر شاہ ثانی بھی اپنے باپ کی طرح نام کا بادشاہ تھا اور اس مشہور خاندان کا آخری حکمراں یعنی بہادر شاہ ثانی ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد جلا وطن کر کے کلکتہ بھیجدیا گیا اور ۱۸۶۲ء میں رنگون میں وفات پائی۔

پیشواؤں کا عروج

سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ مرہٹوں کی طاقت بڑھتی گئی۔ اورنگ زیب نے شیواجی کے لڑکے شنبھوجی کو قتل کروادیا تھا لیکن اُس کا پوتا یعنی شاہو مغلوں کے پاس تھا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اُس کو چھوڑ دیا گیا۔ شاہو بالکل نا اہل اور ناکارہ ثابت ہوا اور سلطنت کا سارا انتظام پیشوا کے ہاتھ میں آگیا۔ پہلا پیشوا بالاجی وشوناتھ تھا۔ نہایت قابل اور سمجھ دار شخص تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ تمام حکومت کا وہی مالک ہوگیا اور شیواجی کے جانشینوں کی وہی حالت ہوگئی جو اورنگ زیب کے جانشینوں کی دہلی میں تھی۔ یہ کہنا کسی صورت سے غلط نہ ہوگا کہ اٹھارویں صدی میں مرہٹوں کی تاریخ درحقیقت برہمن پیشواؤں کی تاریخ ہے۔ مرہٹوں کو اپنی قوت بڑھانے میں سب سے زیادہ مدد مغلوں کی خانہ جنگی سے ملی۔ سید حسین علی نے مرہٹوں کی مدد سے فرخ سیر کو تخت سے اُتار کر محمد شاہ کو بادشاہ بنایا تھا۔ اس کے صلے میں محمد شاہ نے پیشوا کو دکن کے چھ صوبوں میں چوتھ اور سردیش مکھی وصول کرنے کا اختیار عطا کیا۔ نظام الملک کا صوبہ حیدرآباد بھی ان میں شامل تھا۔ اور نظام اور مرہٹوں کے درمیان جھگڑے اسی وقت سے شروع ہوتے ہیں۔ ۱۷۲۰ء میں جب بالاجی وشوناتھ نے وفات پائی تو اُس کا لڑکا باجی راؤ پیشوا مقرر ہوا۔ قوت

سے یہ عہدہ موروثی ہوگیا۔ باجی راؤ اپنے باپ سے بھی زیادہ قابل تھا۔ اب
مرہٹوں کی سلطنت میں پیشوا کا اثر اس قدر زیادہ ہوگیا تھا کہ راجہ کا کچھ بھی اختیار
باقی نہیں رہا تھا۔ اس خاندان میں سات راجہ ہوئے اور اُن کی سلطنت برائے نام
۱۸۱۸ء تک رہی۔ لیکن شاہو نے ۱۷۲۷ء میں تمام اختیارات اپنے وزیر یعنی پیشوا
کو دیدیئے تھے۔ باجی راؤ نے اپنی قابلیت اور بہادری سے مرہٹوں کی قوت اور سلطنت
کو بہت ترقی دی۔ مغلیہ سلطنت فتح کرنے کے متعلق اس کا مشہور قول ہے
کہ "تنہ پر ضرب لگانا چاہیئے مرجھائی ہوئی شاخیں خود بخود گر جائیں گی" چنانچہ
نظام الملک کو شکست دیکر وہ شمال کی طرف متوجہ ہوا اور گجرات، مالوہ اور
بندیلکھنڈ کو روندتا ہوا، ۱۷۳۷ء میں دہلی کے قریب پہنچا اور مغل سپاہیوں
کو شکست دی لیکن دہلی پر قبضہ نہیں کر سکا اور شاہی فوج کے آنے سے
پیشتر ہی واپس ہوگیا۔ اب نظام الملک کو دکن سے بلایا گیا۔ وہ کچھ دنوں
بادشاہ کے پاس قیام کرنے کے بعد مرہٹوں کے مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔
لیکن بھوپال کے قریب باجی راؤ نے اس کو شکست دی اور صلح کرنے پر مجبور کیا۔

گیکوار، سیندھیا اور ہلکر

اسی زمانہ میں کئی مرہٹہ ریاستوں کی بنیاد پڑی۔
جن میں سے بعض ابتک موجود ہیں۔ وسط ہند میں رگھوجی
بھونسلا نے اپنی علیحدہ حکومت قائم کرکے ناگپور کو پایۂ
تخت بنایا۔ گجرات میں پیلاجی گیکوار نے ایک نئے خاندان کی بنیاد رکھی۔
اسی طرح اندور میں ملہار راؤ ہلکر اور گوالیار میں مانوجی سندھیا نے اپنی اپنی
حکومتیں قائم کریں۔ ناگپور کے بھونسلا خاندان کے علاوہ باقی سب خاندان
اس وقت تک موجود ہیں۔ یہ چاروں سردار جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کامیاب
سپہ سالار تھے۔ مرہٹہ سلطنت کے بیرونی حصوں کی مالگذاری وصول کرنے کا کام

ان کے سپرد کیا گیا تھا۔ مالگزاری جمع کرکے یہ لوگ اپنا حصہ نکال لیتے تھے اور باقی روپیہ پیشوا کو روانہ کر دیتے تھے۔ پیشوا مہاراجہ ستارہ کے نائب کی حیثیت سے ان سب پر حکومت کرتا تھا۔

سنہ ۱۷۴۰ء میں باجی راؤ کی وفات پر اُس کا بڑا لڑکا بالاجی راؤ پیشوا ہوا اُس نے اپنے باپ اور دادا کے طرز عمل کو جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اب پیشوا تقریباً خودمختار ہوگیا۔ اس کے زمانہ میں راگھوجی بھونسلا نے بنگال پر حملہ کیا۔ علی وردی خاں نے اُڑیسہ کا صوبہ دے کر بھونسلا سے صلح کرلی اور خراج دینے کا وعدہ بھی کرلیا۔ دکن اور وسط ہندوستان میں حملے کرنے کے بعد اُن لوگوں نے شمال کی طرف رُخ کیا۔ سنہ ۱۷۵۶ء میں احمد شاہ ابدالی نے تیسری مرتبہ ہندوستان پر حملہ کیا اور دہلی کو لوٹا۔ یہاں سے جاتے وقت اُس نے دہلی کے بادشاہ عالمگیر ثانی کو روہیلہ سردار نجیب الدولہ کی نگرانی میں چھوڑا اور پنجاب میں اپنے بیٹے تیمور شاہ کو گورنر مقرر کیا۔ احمد شاہ ابدالی کے جانے کے بعد دہلی میں خانہ جنگی پھر شروع ہوگئی۔ غازی الدین نے اپنے مخالفوں کو نیچا دکھلانے کے لیے مرہٹوں کو بُلایا۔ چنانچہ پیشوا کا بھائی رگھوبا ایک بڑی فوج لیکر آیا اور دہلی پر قبضہ کرلیا۔ اُس کے بعد وہ پنجاب میں داخل ہوا اور دریائے سندھ تک سارا ملک اُس کے قبضہ میں آگیا۔ لیکن جب وہ دکن واپس گیا تو معلوم ہوا کہ باوجود اتنی فتوحات کے اُس کے پاس مال و دولت کچھ بھی نہ تھا بلکہ وہ مقروض ہوگیا تھا۔ اب پیشوا نے فوجی اختیارات اور انتظامات رگھوبا سے لیکر اپنے رشتہ کے بھائی سداشیو بھاؤ کے سپرد کئے۔ اسوقت مرہٹوں کی سلطنت اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ شاید مغلوں کی بجائے مرہٹے ہی سارے ہندوستان پر حکومت کریں گے، لیکن مرہٹوں نے یہ بڑی

غلطی کی کہ پنجاب فتح کر کے احمد شاہ ابدالی کو اپنا دشمن بنا لیا۔ وہ یہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ پنجاب پر اُس کے دشمنوں کا قبضہ ہو۔ چنانچہ ۱۷۵۹ء میں وہ چوتھی مرتبہ ہندوستان آیا، مرہٹوں نے مقابلہ کیا، لیکن شکست کھائی۔ اسی سال عالمگیر شاہ ثانی قتل کر دیا گیا اور شاہ عالم اُس کی جگہ تخت پر بیٹھا۔

پانی پت کی تیسری لڑائی سنہ ۱۷۶۱ء

شاہ ابدالی کے حملے کی خبر جب دکن پہنچی تو مرہٹوں نے ارادہ کیا کہ شمالی ہندوستان میں اپنے کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ قائم کریں۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ایک بڑی زبردست فوج تیار کی اور پیشوا کے بیٹے وشواس راؤ کو اس کا کمانڈر مقرر کیا۔ لیکن وشواس راؤ کی عمر بہت کم تھی اس لئے صحیح معنوں میں اس فوج کا کمانڈر سدا شیو بھاؤ ہی تھا مرہٹوں نے دہلی پر آسانی سے قبضہ کر لیا اور آگے بڑھ کر پانی پت کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ مرہٹہ فوج کی تعداد دو لاکھ سے زیادہ تھی اور شاہ ابدالی کے پاس تقریباً چالیس ہزار سوار اور اسی قدر پیادہ سپاہی تھے۔ مرہٹوں نے اپنے کیمپ کے چاروں طرف ساٹھ فیٹ چوڑی اور بارہ فیٹ گہری خندق کھدوائی تھی۔ سات آٹھ میل کے فاصلہ پر احمد شاہ درانی کا کیمپ تھا۔ ایک عرصہ تک دونوں فوجیں اسی طرح پڑی رہیں۔ مرہٹہ فوج کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ رسد وغیرہ آسانی سے مہیا نہیں ہو سکتی تھی۔ بھاؤ نے کوشش کی کہ شاہ ابدالی کو پنجاب دے کر صلح کر لے لیکن وہ کسی شرط پر صلح کے لئے راضی نہیں ہوا اور آخر کار ۱۴ جنوری سنہ ۱۷۶۱ء کو علی الصباح مرہٹے لڑنے پر مجبور ہوئے۔ فریقین بڑی بہادری اور تن دہی سے لڑے۔ دوپہر تک یہی معلوم ہوتا تھا کہ مرہٹوں کی فتح ہو گی۔ لیکن سہ پہر کے قریب پیشوا کا لڑکا وشواس راؤ زخمی ہو کر گھوڑے سے گر گیا۔ مرہٹوں پر اس کا

اسقدر بڑا اثر ہوا کہ وہ یکایک میدان سے بھاگ نکلے۔ پٹھانوں نے بارہ کوس تک اُن کا پیچھا کیا اور ہزاروں کو تہ تیغ کیا۔ بعض مؤرخوں کا خیال ہے کہ مرہٹوں کے تقریباً دو لاکھ آدمی مارے گئے۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ مارے گئے اُن کی تعداد بہت زیادہ تھی اور مرہٹہ خاندانوں میں بہت کم ایسے تھے جن پر اس لڑائی کا کوئی اثر نہ ہوا ہو بالاجی باجی راؤ کو اس شکست کی خبر ان الفاظ میں ملی "دو موتی گھل گئے۔ ستائیس اشرفیاں ضائع ہوگئیں اور چاندی اور تانبے کا کوئی حساب نہیں لگایا جا سکتا" احمد شاہ کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ فن جنگ سے خوب واقفیت رکھتا تھا اور جانتا تھا کہ صبر و استقلال سے کام لینا نہایت ضروری ہے برخلاف اس کے مرہٹوں کا سردار بھاؤ مغرور اور ضدی تھا اور اپنے ساتھیوں کے مشورہ پر عمل نہیں کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اُس نے اپنی فوج کی تعداد اسقدر بڑھالی تھی کہ اُس کے کھانے پینے کا انتظام بہت مشکل ہوگیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ مرہٹوں نے اس قسم کی لڑائیاں نہیں لڑی تھیں اور یہ طریقۂ جنگ اُن کے لئے نیا اور ناموزوں تھا۔

پانی پت کی لڑائی کے نتائج

یہ لڑائی ہندوستان کی اہم ترین لڑائیوں میں شمار کی جاتی ہے اور اس کے نتائج کا ہمارے ملک کی تاریخ پر بہت بڑا اثر پڑا ہے۔ تمام مہاراشٹر نے اس شکست کا سوگ منایا۔ پیشوا کو بیحد صدمہ ہوا اور وہ چند ماہ کے اندر ہی مر گیا۔ مرہٹوں کے علاوہ سلطنت مغلیہ کو بھی ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ تقریباً ختم ہوگئی۔ احمد شاہ چاہتا تھا کہ یہاں ٹھہر کر حکومت کا انتظام کرے لیکن اُس کے سپاہی راضی نہیں ہوئے اور سکندر اعظم کی طرح اُس کو بھی اپنی مرضی کے خلاف ہندوستان سے جانا پڑا۔ اُس کے بعد پنجاب کے اکثر حصوں پر سکھوں نے قبضہ کر لیا۔ مرہٹوں کی سلطنت کا

بھی شیرازہ بکھر گیا۔ پیشوا کا اقتدار ختم ہوگیا۔ گوالیار، اندور، بڑودہ اور ناگپور کے راجہ تقریباً خود مختار ہوگئے۔ مرہٹہ اور مغل سلطنتوں کے کمزور ہوجانے سے انگریزوں کو اپنی سلطنت قائم کرنے میں بہت آسانی ہوگئی۔ اب ملک کے ہر حصے میں چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں جو آپس میں لڑ لڑ کر کمزور ہوتی گئیں اور آخرکار اُن میں سے اکثر انگریزی سلطنت میں شامل ہوگئیں۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب

پانی پت کی لڑائی کے بعد مغلوں کی سلطنت قریب قریب ختم ہوگئی۔ نام کے لئے تو ابھی یہ خاندان سو برس تک تخت دہلی کا مالک رہا۔ لیکن اب مغل بادشاہ اس قدر کمزور اور لاچار ہوگئے تھے کہ ملک کی سیاست میں اُن کو کوئی دخل نہ تھا ہر جگہ ایک نئی خود مختار ریاست موجود تھی اور شاہان دہلی کبھی انگریزوں اور کبھی مرہٹوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح رہتے تھے۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں دہلی اور آگرہ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور اب مغل بادشاہ کی حیثیت انگریزوں کے ایک وظیفہ خوار سے زیادہ نہ رہی۔ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ پر بغاوت کا الزام لگایا گیا اور اس خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اس موقع پر بے محل نہ ہوگا کہ ہم اُس شاندار اور مایۂ ناز سلطنت کے زوال کے اسباب پر غور کریں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کیا وجوہات تھیں جن کی بنا پر اتنی مضبوط اور مستحکم سلطنت اسقدر تھوڑے عرصہ میں ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔

بعض مورخوں کے نزدیک سلطنت کے زوال کی ذمہ داری سب سے زیادہ اورنگ زیب پر ہے کیونکہ اُس نے اکبر کی پالیسی کو چھوڑ دیا اور ہندوؤں کو ناراض کردیا۔ یہ خیال غلط ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اورنگ زیب پکا مسلمان تھا اور چاہتا تھا کہ ملک میں اپنے مذہب کے اُصولوں کے موافق حکومت کرے اور اس سلسلہ

میں اُس نے بعض ایسی اصلاحات کیں جو ہندوؤں کو پسند نہ آئیں۔ لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ ملک کے تمام ہندو اُس کے خلاف ہو گئے تھے اور اُنھوں نے سلطنت کے خلاف بغاوت کی۔ سکھ۔ راجپوت اور مرہٹوں کی بغاوتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اُن کے اسباب مختلف تھے۔ سکھوں کا جھگڑا جہانگیر کے زمانہ سے چلا آتا تھا۔ شیواجی نے شاہجہاں کے عہد میں اپنی قوت بڑھانا شروع کردی تھی۔ راجپوتوں سے اورنگ زیب کے زمانہ میں لڑائی ہوئی۔ لیکن یہ مذہبی نہیں سیاسی جنگ تھی جس میں کچھ راجپوت ریاستیں بادشاہ کے ساتھ تھیں اور کچھ اُس کے خلاف، ان واقعات کی بنا پر یہ کہنا کہ اورنگ زیب کی مذہبی اصلاحات کی وجہ سے مغلیہ سلطنت کو زوال آیا صحیح نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ مغلوں کی دکن کی پالیسی نے اُن کو بہت نقصان پہنچایا۔ سترھویں صدی کے شروع سے اٹھارھویں صدی کے شروع تک مغل فوجیں دکن میں لڑتی رہیں۔ ان لڑائیوں کا اثر صرف مغلوں کی مالی حالت پر ہی نہیں ہوا بلکہ نظام حکومت کے ہر پہلو پر پڑا۔ مغلیہ نظام حکومت ایک شخصی نظام تھا جس کی کامیابی کے لئے یہ ضروری تھا کہ بادشاہ قابل بھی ہو اور سلطنت کے معاملات پر توجہ بھی کرے۔ دکن کی لڑائیوں کا سلسلہ اکبر کے زمانہ میں شروع ہوا تھا۔ جہانگیر اور شاہجہاں کا دکن کی مسلمان ریاستوں نے مقابلہ کیا اور ایک حد تک اُن کو اس مقابلہ میں کامیابی بھی ہوئی۔ اورنگزیب کے زمانہ میں ان سلطنتوں کے علاوہ مرہٹے بھی کافی طاقتور ہو گئے تھے اور اُس کے سامنے صرف یہی سوال نہ تھا کہ دکن کی سلطنتوں کو فتح کرکے اپنی سلطنت کو وسیع کرے بلکہ اب اس مسئلہ کی شکل بدل گئی تھی۔ اگر وہ اس طرف توجہ نہیں کرتا تو مرہٹے اپنی ایک خودمختار ریاست دکن میں قائم کرنے کی کوشش کرتے اور اس میں کامیاب ہو جاتے۔ کیونکہ مسلمان ریاستیں بہت کمزور ہو چکی تھیں۔ دکن کی لڑائیوں کا

ملک کی انتظامی اور اقتصادی حالت پر بھی بہت بُرا اثر پڑا۔ اورنگ زیب پچیس
سال تک متواتر دکن میں لڑتا رہا۔ اس عرصہ میں شمالی ہندوستان کے انتظامات
میں دقتیں اور ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں۔
مغل خاندان کے حق میں یہ چیز سخت مضر ثابت ہوئی۔ اسکے علاوہ اورنگ زیب
دوسرے لوگوں پر بہت کم بھروسہ کرتا تھا اور چھوٹے چھوٹے کاموں میں بھی دخل
دیتا تھا جب تک وہ شمالی ہندوستان میں رہا تو اس سے کچھ زیادہ نقصان نہیں
ہوا لیکن اُس کے دکن پہنچنے پر اسکی اس پالیسی کا بُرا اثر صاف طور پر معلوم
ہونے لگا۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ مغلوں کے زوال کا سب سے بڑا سبب
یہ تھا کہ اُن کی اپنی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔ یہ لوگ اس قدر کاہل اور
آرام طلب ہوگئے تھے کہ میدان جنگ میں پالکیوں پر بیٹھ کر جاتے تھے اور
فوج کے ساتھ سازوسامان اتنا زیادہ ہوتا تھا کہ اُن کا کیمپ "شہر رواں"
معلوم ہوتا تھا۔ سامان اور خدمت گزاروں کی زیادتی کی وجہ سے مغل فوج
ایک جگہ سے دوسری جگہ بہت دیر میں پہنچتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ اورنگ زیب
کو پھرتیلے مرہٹہ سواروں کے مقابلہ میں آسانی سے کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ اس
کی ذمہ داری اورنگ زیب پر نہیں تھی۔ مغل فوج کی خرابیاں شاہجہاں
ہی کے عہد میں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ تم کو یاد ہوگا کہ قندھار فتح کرنے کی
بہت کوشش کی گئی لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اسی طرح بلخ اور بدخشاں
کے حملوں میں بھی نقصان اُٹھانا پڑا۔ بلکہ ایک حد تک یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اورنگزیب
اپنی ذاتی قابلیت اور ہوشیاری کی وجہ سے ایسی آرام طلب فوج کے
باوجود بھی اپنے دشمنوں پر فتوحات حاصل کرتا رہا۔ اس کے بعد اُس کے
جانشین بہت کمزور ثابت ہوئے اور اتنی بڑی سلطنت کو قبضہ میں نہ رکھ سکے۔

اُس زمانہ میں آمدورفت کے ذرائع بہت کم اور خراب تھے۔ چنانچہ دور کے صوبوں میں خودمختار حکومتیں بہ آسانی قائم ہوگئیں۔ دکن میں نظام الملک آصف جاہ بنگال میں علی وردی خاں اور اودھ میں نواب سعادت علی خاں نے شاہی دربار کی سازشوں سے بیزار ہوکر تخت دہلی سے قطع تعلق کرلیا۔ روہیلکھنڈ میں روہیلے سردار تقریباً خودمختار ہوگئے۔ سکھوں اور مرہٹوں کا حال اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی زمانے میں ایران سے نادرشاہ آیا دھلی کو لوٹا اور واپسی پر اپنے ساتھ بہت سے مال اور تخت طاؤس لے گیا۔ نادرشاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے حملے کرنے شروع کئے۔ پہلے پنجاب کو اپنی سلطنت میں شامل کیا پھر دہلی کو لوٹا اور آخرکار مرہٹوں کو پانی پت کے مقام پر بڑی بھاری شکست دی۔ جس زمانہ میں شمالی ہندوستان میں یہ اہم واقعات پیش آرہے تھے اُسی زمانہ میں انگریز لوگ مدراس اور بمبئی میں اپنا اقتدار بڑھا رہے تھے۔ ۱۷۶۵ء میں اُنھوں نے شاہ عالم سے بہار اور بنگال کی دیوانی حاصل کرکے رفتہ رفتہ مختلف صوبوں پر قبضہ کرنا شروع کیا یہاں تک کہ تمام ملک پر اُن کا قبضہ ہوگیا اور ۱۸۵۷ء میں مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ کو گرفتار کرکے بنگال بھیج دیا گیا۔

باب ۳۶

عہدِ مغلیہ میں تہذیب و تمدّن

مغلوں کا عہد ہندوستان کی تاریخ کا بہترین زمانہ ہے اور ہم اُس کو تاریخ ہند کا عہد زرّیں کہہ سکتے ہیں۔ مغل خاندان سے پہلے بھی شاہان دہلی کی سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی لیکن مغلوں نے تقریباً تمام ملک پر اپنی حکومت قائم کرلی۔ فتوحات اور وسعت سلطنت سے زیادہ قابل تعریف بات یہ ہے کہ اُنھوں نے اس ملک میں ایک ایسے مستحکم نظام حکومت کی بنیاد رکھی کہ کئی صدیاں گزرنے کے بعد بھی اُس کے آثار موجود ہیں۔ اسی طرح زندگی کے ہر شعبے میں ہندوستانیوں نے نمایاں ترقی کی جس کا ذکر اس جگہ صرف اختصار کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

علم و ادب مغلوں کے زمانہ میں علم و ادب نے بہت نمایاں ترقی کی کیونکہ مغل بادشاہ خود بھی پڑھے لکھے تھے اور علم کی سرپرستی میں بڑی فیاضی اور دریا دلی سے کام لیتے تھے۔ اس خاندان کا بانی یعنی بابر بادشاہ عربی، ترکی اور فارسی کا ماہر تھا۔ اُس کی مادری زبان ترکی تھی اور اسی زبان میں اس نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ تزک بابری اُس زمانہ کی مشہور ترین تصانیف میں شمار کی جاتی ہے۔ ہمایوں بھی ایک علم دوست بادشاہ تھا۔ اُس کو جغرافیہ اور نجوم سے خاص طور پر دلچسپی تھی لیکن تخت نشینی کے بعد اس کو

اتنا موقع نہیں ملا کہ کوئی کتاب خود تصنیف کرتا۔ مگر اُس کے آفتابچی جوہر نے جو اُس کے ساتھ ہمیشہ رہا کرتا تھا اُس کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ اس کتاب کا نام تذکرۃ الواقعات ہے اور اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اکثر واقعات مصنف کے چشم دید ہیں۔ اکبر خود تو جاہل تھا لیکن علم کی سرپرستی میں وہ سب سے بڑھ گیا اور اس کے زمانہ میں فارسی اور ہندی میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ بہت سے مؤرخوں نے ہندوستان کی تاریخیں لکھیں۔ ان میں سے ابوالفضل کا اکبر نامہ اور آئین اکبری۔ نظام الدین احمد کی طبقات اکبری اور ملّا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ قابل ذکر ہے۔ ان سب کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ ابوالفضل کے بڑے بھائی فیضی نے لیلاوتی کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا۔ فیضی فارسی کے بہترین شاعروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اکبر کے دربار میں اور بہت سے نامور شاعر تھے۔ جہانگیر کو عمدہ تعلیم ملی تھی اور اُس کی علم دوستی اور ادب نوازی کا سب سے بڑا ثبوت اسکی اپنی لکھی ہوئی سوانحعمری یعنی تزک جہانگیری موجود ہے۔ شاہجہاں کے عہد میں بھی کئی تاریخی کتابیں تصنیف ہوئیں۔ جو اسوقت تک تاریخی دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں شاہجہاں کا بڑا بیٹا داراشکوہ تصوّف کا دلدادہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندو مذہب اور اسلام میں جو باتیں مشترک ہیں وہ لوگوں کو بتلائی جائیں، اُپنشد، بھگوت گیتا اور یوگ وششٹھ کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا اور داراشکوہ نے خود چند رسالے علم تصوف میں تصنیف کئے ہیں۔ اورنگ زیب شاعری کے خلاف تھا۔ لیکن پھر بھی بہت عمدہ ادیب تھا اس کی قابلیت کا اندازہ اس کے خطوط سے لگایا جا سکتا ہے جو ہزاروں کی تعداد میں اسوقت موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ شائع ہوگئے ہیں لیکن زیادہ تر ابھی قلمی نسخوں ہی میں محفوظ ہیں۔ مغلیہ خاندان میں بہت سی شہزادیاں بھی اپنی علم پروری

اور قابلیت کے سلئے مشہور ہیں۔ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم نے ہمایوں نامہ تصنیف
کیا۔ اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء کی شاعری کی شہرت اب تک باقی ہے
نور جہاں اور ممتاز محل کو بھی علم و ادب سے خاص دلچسپی تھی۔ اس سے یہ بھی پتہ
چلتا ہے کہ شاہی خاندان کی لڑکیاں بھی بہت عمدہ تعلیم پاتی تھیں۔

ہندی اور اردو اکبر کے عہد میں ہندی زبان کی سوئی ہوئی قسمت جاگی
اکبر کو ہندی سے بہت دلچسپی تھی بہت سے مسلمان امرا
کو بھی اس زبان کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ مرزا عبدالرحیم خانخاناں کے ہندی دوہے
بہت مشہور ہیں اور اب تک اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ اکبر کے بہت سے
درباریوں میں سے راجہ ٹوڈرمل راجہ مان سنگھ اور راجہ بھگوانداس ہندی میں
شعر کہتے تھے۔ بیربل کی شاعری اکبر کو اس قدر پسند تھی کہ اس نے راجہ کو کوی رائے
کا خطاب عطا کیا تھا۔ آگرہ کے مشہور نابینا ہندی شاعر سورداس نے سور ساگر لکھی۔
رس کھان ایک مسلمان ہندی شاعر تھا جس کی ہندی کویتائیں بہت عمدہ ہیں۔
تلسی داس بھی عہد اکبری کی مشہور ہستیوں میں سے ہیں وہ ۱۶۲۳ء تک زندہ رہے۔ اُن
کی ہندی رامائن اسوقت تک شمالی ہندوستان میں گھر گھر پڑھی جاتی ہے۔ جہانگیر
کے زمانہ میں کیشو اور شاہجہاں کے زمانہ میں سندر دو بڑے شاعر ہوئے ہیں،
بہاری لال چوبے کا نام بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اُس کے ہر دوہے کے بدلے
جے پور کے مرزا راجہ نے ایک اشرفی انعام دی تھی۔

اُردو زبان کی بنیاد مغلیہ خاندان سے پہلے پڑ چکی تھی۔ حضرت امیر خسرو اُردو
کے سب سے پہلے شاعر ہیں۔ اُن کے زمانہ سے لے کر عہد اکبری تک اس زبان نے کوئی
خاص ترقی نہیں کی لیکن یہی وہ زمانہ تھا جبکہ یہ نئی زبان نشوونما پاتی رہی۔ اکبر کے
زمانہ میں ہندو مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی خوشگواری کا اثر اس زبان پر

بھی ہوا۔ اس کے علاوہ راجہ ٹوڈرمل نے کوشش کی کہ محکمۂ مال میں اُن لوگوں کو ملازم رکھا جائے جو فارسی زبان سے خوب واقف ہوں۔ بہت سے ہندؤں نے فارسی پڑھنا شروع کردی۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد اس زبان نے اتنی ترقی کرلی کہ اس کو ادبی زبان کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ سترھویں اور اٹھارویں صدی میں شمالی و نیز جنوبی ہندوستان میں بہت سے نامور شاعر ہوئے جن کا کلام اس وقت تک بہت بلند خیال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ولی دکنی۔ خان آرزو۔ حاتم اور آبرو پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلوں کا زوال، شروع ہوجاتا ہے لیکن اُردو کے بہترین شاعر اسی انحطاط کے زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔ میر و سوداؔ سے لے کر غالب و ذوق کے زمانہ تک اُردو شاعری برابر ترقی کرتی رہی۔ چنانچہ سلطنت کے انتہائی زوال کا زمانہ اُردو شاعری کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔

فنِ تعمیر مغلوں کے عہد میں ہندوستانیوں نے ہر فن میں نمایاں ترقی کی لیکن فن تعمیر میں سب سے زیادہ کمال حاصل کیا۔ تمام مغل بادشاہوں کو عمارتیں بنوانے کا شوق تھا۔ لہٰذا اس فن میں یہاں کے لوگ برابر ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ شاہجہاں کے عہد میں یہ فن انتہائی کمال پر پہنچ گیا۔ اس جگہ صرف چند مشہور عمارتوں کا مختصر طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ بابر نے صرف چار سال حکومت کی لیکن متعدد عمارتیں بنوائیں جن میں سے پانی پت اور سنبھل کی مسجدیں اب تک موجود ہیں۔ ہمایوں کو اتنی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا کہ وہ زیادہ عمارتیں نہیں بنوا سکا۔ لیکن سوریوں کے عہد میں کافی عمارتیں تیار ہوئیں دہلی میں پُرانے قلعے کی مسجد اور سہسرام میں اُن کا مقبرہ شیر شاہ سور کی یادگار ہیں۔ اکبر کے زمانہ میں اس فن نے بہت ترقی کی۔ اُس کی عمارتوں میں ہندو طرز کا اثر

پایا جاتا ہے۔ اُس کی سب سے پہلی عمارت ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ یہ ہندوستان کی بہترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے۔ اس عمارت میں ایرانی اثر بہت زیادہ ہے کچھ عرصہ بعد اکبر نے فتح پور سیکری میں رہائش اختیار کی اور بہت سی عمارتیں تیار کرائیں۔ بلند دروازہ ۱۷۶ فیٹ اونچا ہے اور ہندوستان میں اس سے زیادہ اونچا کوئی دروازہ نہیں۔ یہ دروازہ ۱۶۰۲ء میں دکن کی فتح کی یادگار کے طور پر بنوایا گیا تھا۔ سیکری کی مسجد اور حضرت شیخ سلیم چشتی کا مزار بھی قابل دید ہیں راجہ بیربل اور جے پور والی رانی کے مکانات بھی اس وقت تک موجود ہیں۔ اسکے علاوہ سکندرہ میں اکبر نے اپنا مقبرہ اپنی زندگی ہی میں بنوانا شروع کر دیا تھا۔ یہ جہانگیر کے عہد میں مکمل ہوا۔ اکبر کا مقبرہ ہندوستان کے بہترین مقبروں میں سے ہے۔ آگرہ اور لاہور کے قلعے بھی اکبر کے عہد میں شروع ہوئے تھے۔ جہانگیر کو مصوری سے بہت دلچسپی تھی۔ لیکن اُس کی ملکہ نور جہاں کی بنوائی ہوئی عمارتیں موجود ہیں۔ آگرہ میں نور جہاں کے والد اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے۔ جس میں نہایت خوبصورت کام ہو رہا ہے۔ لاہور میں جہانگیر کا مقبرہ نور جہاں نے بنوایا۔ یہ پہلے کھلا ہوا تھا۔ لیکن شاہجہاں نے اُس پر بہت عمدہ اور خوبصورت گنبد تیار کرایا اور اب وہ لاہور کی بہترین عمارتوں میں سے ہے۔

شاہجہاں نے فن تعمیر کو اس قدر ترقّی دی کہ اُس کی عمارتیں ہندوستان ہی نہیں بلکہ تمام دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار کی جاتی ہیں۔ اس بادشاہ نے دہلی کو دوبارہ اپنا پایۂ تخت بنایا اور اُس کا نام بدل کر شاہجہاں آباد رکھا اپنے دارالسلطنت میں اُس نے ایک نہایت عمدہ قلعہ اور ایک نہایت خوبصورت اور شاندار جامع مسجد تیار کرائی۔ یہ مسجد دنیا کی سب سے خوبصورت مسجدوں میں سمجھی جاتی ہے۔ قلعے کے اندر بہت سی عمارتیں تھیں جن میں سے بعض اس وقت تک محفوظ ہیں۔ دیوان خاص کو

فردوس بریں کہا گیا ہے۔ مغلوں کو یہ جگہ اس قدر پسند آئی کہ آخر تک مغل بادشاہ اسی قلعے میں رہے۔ اس کے علاوہ کابل، اجمیر اور لاہور میں بھی شاہجہاں نے بہت سی عمارتیں بنوائیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ کی درگاہ میں کئی مسجدیں ہیں لیکن سب سے زیادہ خوبصورت شاہجہاں کی بنوائی ہوئی سنگ مرمر کی مسجد ہے۔ شاہجہاں آباد کے تیار ہونے سے پہلے شاہجہاں آگرہ ہی میں رہتا تھا۔ آگرہ کے قلعے کی موتی مسجد جو نہایت خوبصورت ہے اسی بادشاہ کی یادگار ہے۔ لیکن اس کی سب سے عالی شان اور مشہور عمارت اُس کی پیاری بیوی ارجمند بانو بیگم کا روضہ ہے۔ تاج محل دنیا کے عجائبات میں سے ہے اور اُس کو دیکھنے کے لئے دنیا کے ہر حصّہ سے لوگ ہندوستان آتے ہیں۔ بیشک تاج محل ایک ایسی نادر چیز ہے کہ اس پر ہندوستان کے لوگ فخر کر سکتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ اُس کی خوبی کو پورے طور سے اس کتاب میں بیان کیا جا سکے۔ اگر کوئی شخص اُس کی خوبی دیکھنا چاہتا ہے تو اُس کو چاہیئے کہ اُس عمارت کو خود جا کر دیکھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عمارت بائیس سال میں مکمل ہوئی۔ اور اس پر تین کروڑ روپیہ صرف ہوا۔ اورنگ زیب کو فن تعمیر سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ مذہبی خیال کا آدمی تھا اور شان و شوکت کو بیکار سمجھتا تھا لیکن پھر بھی اُس نے بہت سی مسجدیں تعمیر کرائیں جن میں سے بعض اس وقت تک موجود ہیں۔ دہلی کے قلعے میں اُس نے ایک چھوٹی سی خوبصورت سنگ مرمر کی مسجد تیار کرائی۔ لاہور کی بادشاہی مسجد اور متھرا اور بنارس کی مسجدیں بھی اُس کی یادگار ہیں۔

مغلوں کے علاوہ سلاطین دکن نے بھی بہت عمدہ عمدہ عمارتیں بنوائی ہیں۔ ان میں سے بیجاپور کی عمارتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ بیجاپور میں اس قدر مقبرے محلات اور مسجدیں اب تک موجود ہیں کہ شاید ہی کسی اور شہر میں ہوں اور اُن میں سے بہت سی قابل دید ہیں۔

عمارتوں کے علاوہ مغل بادشاہوں نے بہت سے باغات بھی تیار کرائے۔ بابر کو شکایت تھی کہ ہندوستان میں خوبصورت باغ نہیں ہیں اور اُسی نے باغات کا سلسلہ شروع کیا۔ جہانگیر اور شاہجہاں نے اُس کو کمال پر پہنچا دیا آگرہ۔ دہلی۔ لاہور کابل اور بالخصوص کشمیر کے مغل باغات اسوقت تک ہمارے ملک کے بہترین باغات میں شمار کئے جاتے ہیں۔

مُصوّری اور نقاشی وغیرہ

فن تعمیر کی طرح مغل بادشاہوں کو مصوّری سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ تزک بابری کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بابر خوبصورت پھولوں، چشموں اور قدرتی مناظر کا دلدادہ تھا۔ ہمایوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایران سے دو مصوّر اپنے ساتھ لایا تھا لیکن تخت دوبارہ حاصل کرنے کے بعد وہ بہت جلد مر گیا۔ اکبر کو بچپن ہی سے اس فن سے دلچسپی تھی۔ اُس کے زمانہ میں ایرانی اور ہندوستانی ماہرین فن نے ایک دوسرے سے اثر لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس فن میں ایک نئی شان پیدا ہوگئی اسی کو "مغل اسکول" کہتے ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں یہ فن کمال پر پہنچ گیا۔ جہانگیر خود اس فن میں اتنا ماہر تھا کہ اپنی کتاب تزک جہانگیری میں لکھتا ہے کہ ایک مصوّر تصویر کا چہرہ بنائے اور دوسرا آنکھوں کا حصّہ بھرے تو میں دیکھ کر فوراً پہچان لونگا کہ یہ حصّہ فلاں مصوّر کا بنایا ہوا ہے۔ جہانگیر کے بعد مصوّری کا زوال شروع ہوتا ہے شاہجہاں کو عمارتوں سے دلچسپی تھی لیکن اُس کا بڑا بیٹا دارا شکوہ مصوّروں کی سرپرستی کرتا تھا۔ اس کا ذاتی البم اس وقت تک موجود ہے۔ اورنگ زیب نے اس فن کے ماہروں کی کوئی ہمت افزائی نہیں کی۔ چنانچہ یہ فن راجپوتوں تک محدود ہو کر رہ گیا۔

فن مصوّری کے علاوہ اور بھی فنون تھے جنھوں نے اس زمانہ میں ترقی کی

مثلاً سنگتراشی، نقاشی اور خوشنویسی۔ اس کتاب میں اسقدر گنجائش نہیں کہ ان سب کا علیحدہ علیحدہ تفصیل کے ساتھ ذکر کیا جائے۔ لیکن اب بھی ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں اور عجائب خانوں میں ان کے حیرت انگیز نمونے موجود ہیں جنکو دیکھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مغلوں کے عہد میں اس ملک کے رہنے والوں نے تہذیب اور تمدن میں کس حد تک ترقی کر لی تھی۔

موسیقی مغل بادشاہ علم موسیقی کی سرپرستی میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ بابر کو گانے سے بہت شوق تھا۔ ہمایوں بھی ہفتہ میں دو روز گانے کی مجلس منعقد کرتا تھا۔ سوری افغانوں کو بھی گانے سے دلچسپی تھی۔ لیکن اکبر کے عہد میں اور فنون کی طرح اس نے بھی بہت نمایاں ترقی کی۔ اُس کے دربار میں مرد عورت ہندوستانی اور غیر ملکی ہر قوم کے گانے بجانے اور ناچنے والے موجود تھے۔ ان سب کی سات جماعتیں تھیں اور ہر ایک کے لئے ہفتہ میں ایک خاص دن مقرر ہوتا تھا۔ گوالیار کا مشہور اُستاد میاں تان سین بھی اکبر کے دربار میں تھا۔ اُس کی قبر گوالیار میں ہے اور دور دور سے گانے والے زیارت کے لئے آتے ہیں اُن کا خیال ہے کہ اُس کی قبر کے درخت کی پتیاں چبانے سے گلا صاف ہو جاتا ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں راجہ بھگوانداس، راجہ مان سنگھ۔ سب کے سب موسیقی سے شوق رکھتے تھے۔ اس فن کی سنسکرت کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہوا اور بہت سی راگنیاں ایجاد ہوئیں۔ جہانگیر اور شاہجہاں کے عہد میں بھی موسیقی کا چرچا رہا لیکن اورنگ زیب نے اُس کو دربار میں بالکل بند کروا دیا۔

صنعت و حرفت مغلوں کی دولت اور شان و شوکت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس ملک میں مختلف صنعتیں اور تجارت بہت ترقی پر تھیں۔ لاہور۔ آگرہ۔ فتحپور سیکری اور احمد آباد وغیرہ میں کپڑا بننے کے بہت سے

کارخانے حکومت کی سرپرستی میں قائم ہوئے۔ یہاں بہت عمدہ قسم کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ لاہور اور کشمیر کی ڈھال۔ آگرہ اور سیکری کی دریاں اور ڈھاکہ کی ململ اب تک مشہور ہیں۔ اس زمانہ میں بیرونی ممالک سے تجارت بہت ہوتی تھی چین سے برتن آتے تھے اور یہاں سے نیل اور اون باہر کے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اکبر کے زمانہ میں زراعت نے بھی بہت ترقی کی اور بہت سی اوسر اور بیکار زمینوں میں کاشت ہونے لگی۔ تمباکو سب سے پہلے یہاں اکبر کے عہد حکومت کے آخری سال میں آیا۔ اس کا بہت جلد رواج ہو گیا اور پھر اس کی کاشت بھی ہونے لگی۔

تم نے جو کچھ اوپر پڑھا ہے اُس سے ایک حد تک اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغلیہ عہد میں ہندوستان نے کسقدر ترقی کی۔ مغلوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی ساری قوتیں اُس کو بہتر بنانے میں صرف کر دیں۔ یہی وجہ تھی کہ قرون وسطی میں مغلیہ سلطنت دنیا کی بہترین اور سب سے زیادہ شاندار دولتمند سلطنتوں میں شمار کی جاتی تھی اور مغل بادشاہوں کی شان و شوکت اور اُن کے دبدبہ اور قوت کا سکہ دنیا کے ہر حصہ میں مان لیا گیا تھا اور اُن کی سرپرستی میں ہندوستان نے زندگی کے ہر شعبہ میں اسقدر حیرت انگیز ترقی کی کہ لوگ اُس کو "جنت نشان" کہنے لگے تھے۔

باب ۳

یورپ کے تاجروں کا ہندوستان آنا

یورپ اور ہند کے تجارتی تعلقات

ہندوستان اور یورپ کے ممالک کے تجارتی تعلقات بہت قدیم زمانہ سے قائم ہیں۔ دکن کی قدیم سلطنتیں روم اور دوسرے اُن ملکوں کے ساتھ تجارت کیا کرتی تھیں جو بحر روم کے ساحل پر واقع ہیں۔ ہندوستان سے باہر جانے والی چیزوں میں ریشم، ریشمی کپڑا، روئی، چینی کے برتن، جواہرات، بیش قیمت پتھر، خوشبوئیں اور گوند وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے بدلے میں اونی کپڑا، چمڑہ، ٹین، سیسہ اور دوسری معدنیات باہر سے یہاں آتی تھیں۔ اس تجارت کے تین مختلف راستے تھے۔ سب سے مشہور راستہ وہ تھا جو بحر قلزم سے گذر کر اسکندریہ اور وہاں سے بحرِ روم میں ہوکر وینس اور جنیوا کو جاتا تھا۔ دوسرا راستہ ہند کے مغربی ساحل سے ہوتا ہوا عراق اور ایشیائے کوچک سے گذر کر قسطنطنیہ جاتا تھا۔ یہاں سے تجارتی مال وینس اور جنیوا کو جاتا تھا اور پھر یورپ کے مختلف شہروں میں پہنچکر فروخت ہوتا تھا۔ تیسرا راستہ وسط ایشیا کے ممالک میں سے گذر کر جاتا تھا۔ ایک مدت تک یورپ کے عیسائی تاجران ریاستوں کے ذریعہ سے مشرقی ملکوں سے تجارت کرتے رہے، لیکن جب ترکوں نے عروج حاصل کیا اور بحر روم کے مشرقی ساحل کے

ملکوں پر قبضہ کر لیا تو عیسائی تاجروں کے لئے یہ راستے بند ہو گئے اور اُن کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ہندوستان تک پہنچنے کے لئے کوئی نیا راستہ تلاش کیا جائے جس پر ترکوں کا قبضہ نہ ہو۔ اُسی راستہ کی جستجو میں اہلِ اسپین مغرب کی جانب امریکہ پہنچ گئے اور پرتگال کے رہنے والے افریقہ کی گرد ہو کر ہندوستان آئے یعنی کولمبس نے ۱۴۹۲ء میں براعظم امریکہ دریافت کیا۔ اور ۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما جو ایک پرتگیزی ملاح تھا افریقہ کے گرد ہو کر ہندوستان پہنچا اور کالی کٹ کے قریب اُترا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے یہ دو بہت اہم واقعات ہیں جن کا اثر صرف امریکہ و ہندوستان ہی پر نہیں بلکہ تمام دنیا کی تاریخ پر پڑا ہے۔ اس وقت تک مشرق کے ساتھ جو تجارت ہوتی تھی اُس کا فائدہ زیادہ تر ان قوموں کو پہنچتا تھا جو بحرِ روم کے ساحل پر آباد تھیں، لیکن اب راستہ بدل جانے سے تجارت ان لوگوں کے ہاتھ سے نکل گئی اور اسپین، پرتگال، انگلستان، فرانس اور ہالینڈ کے رہنے والوں کے ہاتھ میں آگئی اور عرب اور مصری تاجروں کی بجائے اب مغربی یورپ کے ممالک اس سے فائدہ اُٹھانے لگے۔ یورپ کے ان ملکوں کی بحری طاقت نے بھی اسی وقت سے ترقی کی ہے۔ یہاں تک کہ ان قوموں نے ایشیا اور افریقہ کے اکثر حصّوں پر قبضہ کر لیا اور یورپ کی تہذیب اور ترقی کا سکّہ ساری دنیا پر بیٹھ گیا۔

پرتگیزوں کا اقتدار

واسکوڈی گاما جب ۱۴۹۸ء میں کالی کٹ پہنچا تو وہاں کا راجہ زمورن بہت مہربانی سے پیش آیا۔ لیکن پرتگیز متعصب، تنگ نظر اور ظالم تھے اور ہندوستانیوں سے نفرت کرتے تھے اُن کا برتاؤ اسقدر خراب تھا کہ بہت جلد اُن کو کالی کٹ چھوڑنا پڑا۔ جاتے وقت وہ کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ لے گئے اور معلوم نہیں کہ

ان بیچارے ہندوستانیوں پر کیا گذری اور اُن کا کیا حشر ہوا۔

لیکن پرتگیزوں نے ہندوستان کی حالت کا بہت جلد اندازہ لگا لیا اور وہ سمجھ گئے کہ اس ملک میں دولت و ثروت بھی موجود ہے اور آپس کی نا اتفاقی بھی۔ چنانچہ اُنہوں نے کوچین اور کنانور میں قیام کیا۔ اور کالی کٹ کے راجہ کو تباہ کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ غرض کہ یہاں بہت جلد اُن کے پیر جم گئے اور رفتہ رفتہ اُن کی طاقت بڑھتی رہی اور اُنہوں نے ہندوستان و افریقہ میں سمندر کے کنارے پر متعدد قلعے بنا لئے۔ مسلمانوں سے اُن کو قدیمی عداوت تھی اور اسوقت جنوبی ہندوستان اور چین کی تجارت کا بیشتر حصہ عربوں کے ہاتھ میں تھا۔ لہذا پرتگیزوں نے اُن کا مقابلہ کیا اور بہت سے مقامات پر اپنا قبضہ کر لیا۔

۱۵۰۹ء میں البوقرق جو پرتگیزوں کا بہت بڑا مدبر اور فاتح تھا ہندوستان کا گورنر مقرر ہوا۔ ۱۵۱۰ء میں اُس نے گوا فتح کیا جو آج تک پرتگال کے مشرقی مقبوضات کا دار السلطنت ہے۔ اس کے علاوہ مشرقی مجمع الجزائر اور خلیج فارس میں بھی پرتگیزوں کا اثر قائم کر دیا۔ جب ۱۵۱۵ء میں البوقرق مرا تو پرتگیزوں کی طاقت اس قدر کافی مضبوط ہو گئی تھی کہ اُن کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا اور ہندوستان، ایران اور عرب کے اکثر بڑے بندرگاہوں پر اُن کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن پرتگیزی سلطنت کا یہ عروج زیادہ مدت تک قائم نہیں رہا اور سولھویں صدی کے آخر میں اُن کا زوال شروع ہو گیا۔ اس زوال کا سب سے بڑا سبب اُن کا مذہبی تعصب تھا۔ اُن کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جب وہ یہاں آئے تو اُن کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں انجیل۔ اور ہندو اور مسلمانوں کو وہ نہایت نفرت اور حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اُن کے افسر خودسر، مغرور اور راشی ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کا ملک

بہت چھوٹا تھا اور اُس کے ذرائع محدود تھے۔ اُن کی تجارت اس وقت تک فروغ پر رہی جب تک کہ یورپ کی کوئی دوسری قوم اُن کے مقابلہ پر نہ آئی لیکن جب دوسری قوموں نے بھی مشرقی ممالک سے تجارت کا سلسلہ شروع کر دیا تو پرتگیزوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مغربی ساحل پر اُن لوگوں نے سورت، بمبئی، گوا، ڈمن اور ڈیو میں اپنی تجارتی کوٹھیاں قائم کر لی تھیں اور مشرقی ساحل پر بھلی پٹم کی فیکٹری تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سولھویں صدی میں پرتگیزوں نے بحری طاقت اور تجارت میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی | پرتگیزوں کی ترقی کو دیکھ کر یورپ کی دوسری قوموں کو بھی ہندوستان آنے کی خواہش ہوئی۔ پہلے اُنھوں نے یہ کوشش کی کہ کوئی نیا راستہ تلاش کریں اور اُس کوشش میں بہت سے ملاحوں نے اپنی جان دیدی لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار اس پر مجبور ہوئے کہ پرتگیزوں کے تلاش کیے ہوئے راستے ہی کو استعمال کریں۔ چنانچہ بہت کوشش کے بعد انگلستان اور ہالینڈ میں کمپنیاں قائم ہوئیں اور کچھ عرصہ کے بعد حکومت فرانس نے بھی ہندوستان سے تجارت کرنے کے لئے ایک کمپنی قائم کی۔

انگریزوں کی کمپنی ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو قائم ہوئی کیونکہ اُس روز ملکہ ایلزبتھ نے لندن کے چند تاجروں کو مشرقی جزائر کے ساتھ تجارت کرنے کی غرض سے ایک اجازت نامہ عطا کیا جس کی رو سے اس نو ساختہ کمپنی کے علاوہ کوئی انگریز تاجر تنہا یا کمپنی بنا کر دنیا کے اس حصے میں تجارت نہیں کر سکتا تھا۔ انگریزوں نے سب سے پہلے مجمع الجزائر ملایا میں تجارت شروع کی، پہلی دفعہ ہی میں اتنا کثیر فائدہ ہوا کہ جو لونگیں اُنھوں نے ۲۹۴۸ پاونڈ میں خریدی تھیں وہ لندن میں ۳۶۲۸۷ پاونڈ میں فروخت ہوئیں۔ اس سے اُن کے حوصلے بڑھ گئے اور

اُن کی تجارت کو فروغ ہونے لگا۔ جب ہالینڈ کے رہنے والوں نے جن کو ولندیز بھی کہتے ہیں مجمع الجزائر میں تجارتی رقابت کی وجہ سے انگریزوں کی مخالفت شروع کی تو انگریزوں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ ۱۶۱۱ء میں اُنہوں نے مچھلی پٹم میں ایک گودام کھولا اور دوسرے سال سورت میں تجارتی کوٹھیوں کی بنیاد ڈالی۔ تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ سر طامس رو جہانگیر کے دربار میں حاضر ہوا تھا اُس کے آنے کا مقصد یہی تھا کہ سلطنت مغلیہ کے مختلف حصوں میں انگریزوں کو تجارت کرنے کی اجازت مل جائے، طامس رو سے پہلے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے ولیم ہاکنس کو اسی غرض سے مغلیہ دربار میں بھیجا تھا لیکن وہ اپنے مقصد میں کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ کرسکا۔ چنانچہ کمپنی نے سر طامس رو کو انگلستان کے بادشاہ جیمس اوّل کا خط لے کر مغل بادشاہ کے دربار میں بھیجا۔ طامس رو نے تین سال کی متواتر کوشش کے بعد کمپنی کے لئے کچھ مراعات حاصل کرلیں۔

مدراس بمبئی اور کلکتہ

رفتہ رفتہ انگریزوں نے بہت ترقی کی اور مختلف مقامات پر اپنی فیکٹریاں اور گودام قائم کرلئے۔ اختصار کی وجہ سے کمپنی کی ابتدائی تاریخ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھی جاسکتی اس زمانہ میں کمپنی کو بیجا مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن اُس نے بہت استقلال کے ساتھ ان ابتدائی منزلوں کو طے کیا۔ چنانچہ سترھویں صدی کے آخر میں کئی مقامات ایسے تھے جہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کافی اثر تھا۔ ان میں سے مدراس، بمبئی اور کلکتہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۶۳۹ء میں سر فرانسس ڈے نے ساحل کارومنڈل پر چندرگری کے راجہ سے مچھلی پٹم کے جنوب میں ایک قطعہ زمین خرید کر ایک فیکٹری کی بنیاد ڈالی اور حفاظت کے لئے ایک قلعہ بھی بنایا جس کا نام فورٹ سینٹ جارج رکھا۔ انگریزی تاجر اسی قلعہ کے اندر رہا کرتے تھے اور دیسی تاجروں نے اُس کے

ارد گرد سکونت اختیار کر لی، چنانچہ یہ حصّہ بلیک ٹاؤن کے نام سے مشہور ہوگیا۔ رفتہ رفتہ یہ آبادی بڑھ کر ایک مکمل شہر بن گیا اور مدراس کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہندوستان میں مدراس انگریزوں کا پہلا شہر ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد انگریزوں نے بنگال میں ہگلی اور قاسم بازار میں فیکٹریاں قائم کیں اور آگے بڑھ کر پٹنہ اور آگرہ میں بھی گودام بنائے۔ بمبئی کا بندرگاہ انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کی شادی پر پرتگال کے بادشاہ نے اپنی بیٹی کے جہیز میں دیا تھا۔ چارلس نے اُس کو دس پاؤنڈ سالانہ کرایہ پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح ہندوستان کا بہترین بندرگاہ کمپنی کے ہاتھ میں آگیا۔ کلکتہ کی بنیاد اس طرح پڑی کہ ۱۶۵۰ء میں ڈاکٹر باؤٹن نے جو بنگال کے مغلیہ صوبیدار کا درباری طبیب تھا۔ اُس کے توسط سے اُس صوبہ میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کر لی، چنانچہ اگلے سال ہُگلی کے مقام پر ایک فیکٹری قائم ہوگئی۔ لیکن کچھ مدت کے بعد مغل بادشاہ اورنگ زیب اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں جنگ ہوئی جس میں کمپنی نے شکست کھائی اور مجبور ہو کر صلح کر لی اور اورنگ زیب نے ایک معافی کا فرمان جاری کر دیا۔ اسی زمانہ میں بنگال کے صوبہ دار سے کالی گھاٹ اور اس کے ساتھ اور گاؤں کمپنی نے خرید لئے اور فورٹ ولیم تعمیر کیا۔ ان گاؤں کی آبادی برابر بڑھتی رہی۔ کالی گھاٹ کالی کتہ اور بعد میں کلکتہ کہلانے لگا۔ بنگال پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے کلکتہ کو وہاں کا دارالسلطنت بنایا۔ بعد میں سارے ہندوستان کا بھی دارالسلطنت کلکتہ ہی قرار پایا۔ کلکتہ بمبئی سے زیادہ بڑی جگہ ہے اور سلطنت برطانوی میں لندن کے بعد سب سے بڑا شہر ہے۔

ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۶۰۲ء میں اہل ہالینڈ نے بھی ایک کمپنی مشرقی ممالک سے تجارت کرنے کے لئے

قائم کی۔ اس زمانہ میں ہالینڈ کے رہنے والے جن کو ولندیز بھی کہتے ہیں نہایت بہادر جفاکش اور ہوشیار ملاح اور عالی حوصلہ تاجر تھے، چنانچہ ان لوگوں نے انگریزوں سے پہلے مجمع الجزائر ملایا میں اپنی نوآبادیاں قائم کرلیں اور پرتگیزوں سے بہت سے مقامات چھین کر اپنے قبضہ میں کر لئے۔ سورت، سیرام پور، کوچین، مچھلی پٹم اور چن سورہ میں اُنہوں نے اپنے قلعے اور گودام بنائے۔ ان لوگوں کا مقصد تجارت کے علاوہ نوآبادیات کا قائم کرنا بھی تھا لیکن چونکہ ہندوستان کے حالات نوآبادیات کے لئے موافق نہ تھے اس لئے مشرقی مجمع الجزائر میں تو ولندیزوں کی نہایت عمدہ نوآبادیاں قائم ہوگئیں مگر ہندوستان میں وہ کچھ زیادہ ترقی نہ کر سکے۔ جن کوٹھیوں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے یہ سامان تیار کرنے کی فیکٹریاں نہ تھیں بلکہ کمپنی کے ملازم اور سوداگروں کی سکونت اور مال و اسباب خرید و فروخت کرنے کے مقامات تھے۔

انگلش ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی تاریخ

اگرچہ یورپ میں انگلستان اور ہالینڈ کے سیاسی تعلقات بہت خوشگوار تھے اور دونوں ملکوں میں پروٹسٹنٹ مذہب برسر اقتدار تھا لیکن ہندوستان میں آکر وہ ایک دوسرے کے ایسے ہی رقیب بن گئے جیسے کہ پرتگیز اور ولندیز یا پرتگیز اور انگریز تھے۔ بہت جلد ان کمپنیوں کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ اپنی تجارت کی ترقی اور حفاظت کے لئے اُن کو کچھ فوجی طاقت کی بھی ضرورت ہوگی۔ لہذا نوآبادیوں اور قیام گاہوں میں انہوں نے اس کا انتظام شروع کر دیا اور جب کچھ عرصہ کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال ہوا تو یورپین سوداگر قلعے بنا کر باقاعدہ فوج رکھنے لگے۔ اب اُن کا خرید و فروخت کا سلسلہ اس قدر وسیع ہوگیا تھا اور اُن کے ملازموں کی تعداد اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان سب چیزوں کے انتظام

کے لئے اُن کو بڑے بڑے مقامات پر کونسلیں قائم کرنی پڑیں۔ ان کونسلوں کا ایک پریزیڈنٹ یا صدر ہوتا تھا اور کچھ ممبر ایسے مقامات کو جہاں کونسل قائم کی جاتی تھی پریزیڈنسی کہتے تھے۔ انگریزی کمپنی کی پریزیڈنسیاں کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں تھیں۔

انگریزوں کی کمپنی کو ابتدائی زمانے میں دوسری قوموں کی مخالفت کے علاوہ اپنے ملک والوں کی رقابت کا بھی سامنا کرنا پڑا کمپنی کے تجارت کے منافع کو دیکھ کر دوسرے انگریزی تاجروں نے بھی ہندوستان سے تجارت کرنے کے لئے کمپنیاں قائم کیں۔ اس سے کمپنی کو نقصان پہنچنے لگا۔ ان میں ایک کمپنی خاص طور پر قابل ذکر ہے جس کو ہم پرانی کمپنی کے مقابلے میں جدید کمپنی کہہ سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے پرائیوٹ طور پر بھی ہندوستان سے تجارت شروع کر دی تھی۔ بہرحال کچھ عرصہ تک مقابلہ اور دقتوں کے بعد یہ کمپنیاں آپس میں متحد ہوگئیں اور ۱۷۰۸ء میں "متحدہ ایسٹ انڈیا کمپنی" قائم ہوگئی۔

فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی فرانسیسیوں نے بھی دوسری قوموں کی طرح ایک زمانے تک ہندوستان سے تجارت کا سلسلہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن ۱۶۶۴ء سے پہلے کامیاب نہ ہو سکے۔ اس سال میں فرانس کے مشہور وزیر مالیات کول برٹ نے فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بنیاد ڈالی۔ اور چونکہ حکومت فرانس کی سرپرستی میں کمپنی قائم ہوئی تھی اس لئے اُس نے بہت جلد ترقی کر لی اور کئی مقامات پر اپنی فیکٹریاں اور گودام قائم کئے جن میں ماہی، پانڈیچری اور چندر نگر قابل ذکر ہیں۔ فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے نواب اور راجاؤں کے سیاسی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا اور بہت جلد اپنے اثر کو بڑھا لیا۔ انگریزوں نے بھی فرانس کے بڑھتے ہوئے اثر کو دیکھ کر یہی پالیسی اختیار کی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں قوموں میں ایک طویل جنگ کا سلسلہ چھڑ گیا۔

باب ۳۸

انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان لڑائی

دکن کی سیاسی حالت

یورپ سے آنے والی قوموں میں فرانسیسی سب سے بعد میں ہندوستان آئے تھے۔
لیکن فرنچ کمپنی نے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کر کے اپنی قوت کو بہت جلد بڑھالیا اور اپنی حکومت قائم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن کو یہ خیال ہندوستان کے سیاسی حالت دیکھ کر ہی پیدا ہوا۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا اور ملک میں چاروں طرف طوائف الملوکی اور بد امنی کے آثار ظاہر ہونے لگے مغلیہ سلطنت کے زوال کا اثر سب سے جلد اور سب سے زیادہ دکن اور بنگال میں ہوا اور ان دونوں صوبوں میں خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ یہ دونوں صوبے دہلی سے بہت فاصلے پر واقع تھے، دوسرے یہ کہ مرہٹوں نے دکن بلکہ سارے ملک میں اپنی لوٹ مار سے بد امنی اور بے چینی پیدا کر دی تھی۔
انگریزوں اور فرانسیسیوں نے ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر اپنے پیر جمالئے اور آخر کار اُن میں سے ایک قوم ملک پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوئی۔
مغلیہ سلطنت کے زمانے میں دکن کا بہت بڑا حصّہ نظام کے زیر حکومت تھا۔

لیکن شاہان دہلی کی کمزوری اور نااہلی کی وجہ سے نظام نے دہلی سے قطع تعلق کر کے خود مختار حکومت قائم کر لی تھی۔ بمبئی اور مدراس میں انگریزوں نے اپنی طاقت کو خوب مضبوط کر لیا تھا اور پانڈیچری اور ماہی میں فرانسیسی موجود تھے۔ دپونا، ستارہ اور کونکن پر مرہٹوں کا قبضہ تھا۔ اس کے علاوہ مرہٹے ہر اُس ریاست پر لوٹ مار اور حملہ کرتے رہتے تھے جو اپنی حفاظت نہیں کر سکتی تھی۔ کرناٹک پر جس کا پایہ تخت ارکاٹ تھا نظام کا ایک نائب حکومت کرتا تھا۔ ترچناپلی اور تنجور میں ہندو راجاؤں کی حکومت تھی۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ کوئی حکومت بہت زیادہ طاقتور نہیں ہو سکتی۔ برخلاف اس کے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی فوجیں فنون جنگ سے خوب واقف تھیں اور اُن کا جنگی سامان بہت بہتر اور عمدہ تھا۔ اُن کے پاس جہاز بھی کافی تھے اور بحری طاقت بہت بڑھی ہوئی تھی۔ دیسی راجہ اور نواب جب ایک دوسرے کے خلاف لڑتے تو انگریز اور فرانسیسی اُن کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ اُن کی آپس کی مخالفت کے اسباب صرف مقامی ہی نہ تھے بلکہ یورپ، امریکہ اور دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی انگریز اور فرانسیسی آپس میں لڑتے رہتے تھے۔

۱۷۴۰ء میں کرناٹک کا نواب دوست علی خاں تھا۔ اُس کا بیٹا صفدر علی اور داماد چندا صاحب ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف رہتے تھے۔ اسی زمانے میں مرہٹوں نے کرناٹک پر حملہ کیا۔ چندا صاحب نے بھاگ کر ترچناپلی کے قلعہ میں پناہ لی اور دوست علی لڑائی میں مارا گیا۔ مرہٹوں نے صفدر علی سے صلح کر لی۔ اب چندا صاحب کو دھوکا دینے کی غرض سے مرہٹے کرناٹک سے لوٹ گئے اور جوں ہی چندا صاحب ترچناپلی سے باہر آیا وہ اُس پر ٹوٹ پڑے اور اُسکو گرفتار کر کے لے گئے۔ اُس کی بیوی اور دوست علی کی بیوہ نے پانڈیچری میں پناہ لی۔

مرہٹوں نے فرانسیسیوں سے کہا "ان عورتوں اور اُن کے جواہرات کو ہمارے حوالے کر دو"۔ فرانسیسی گورنر ڈوما نے یہ جواب دے کر انکار کر دیا "یہ خواتین شاہ فرانس کی مہمان ہیں اور فرانسیسی بجائے اس کے کہ وہ اُن کو واپس کر دیں لڑکر مرنا پسند کریں گے" مرہٹوں نے ملک میں لوٹ مار مچا دی، لیکن ڈوما نے ان عورتوں کو اپنے قبضے میں رکھا۔ اس سے ہندوستانیوں کی نظروں میں فرانسیسیوں کی عزت بہت بڑھ گئی اور نظام نے ڈوما کو ایک خلعت بھیجا شہنشاہ نے بھی اُس کو منصب اور نواب کا خطاب عطا کیا۔ اس طریقہ سے ان اجنبی قوموں کی طاقت کا شہرہ سارے ملک میں پھیل گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد صفدر علی بھی قتل کر دیا گیا۔ اور نظام نے اپنے امراء میں سے انورالدین کو کرناٹک کا گورنر بنا کر بھیجا۔

کرناٹک کی پہلی لڑائی

۱۷۴۴ء میں یورپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ چھڑ گئی، چنانچہ ہندوستان میں بھی ان دونوں قوموں کو آپس میں لڑنے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اُس زمانے سے ہندوستان کی تاریخ پر یورپ کے واقعات کا بہت کچھ اثر ہونے لگا۔ فرانسیسی مقبوضات کا گورنر اس وقت ڈوما کا جانشین ڈوپلے تھا۔ وہ بلا شک و شبہ فرانسیسی گورنروں میں سب سے زیادہ بلند حوصلہ اور قابل تھا۔ اُس نے لابورڈونے سے جو حال ہی میں ہندوستان آیا تھا اور فرانسیسی بیڑے کا امیرالبحر تھا کہا، مدراس کو اپنے قبضے میں کر لو؛ چنانچہ اُس نے مدراس کا محاصرہ کر کے اس کو فتح کر لیا۔ محاصرہ سے قبل ڈوپلے نے نواب کرناٹک سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ مدراس کو فتح کر کے نواب کے حوالے کر دے گا، لیکن فتح ہونے کے بعد ڈوپلے نے صاف انکار کر دیا۔ اس پر نواب نے ڈوپلے کے خلاف ایک فوج بھیجی لیکن نواب کی فوج کو فرانسیسیوں

کے مقابلے پر شکست ہوئی۔ اس لڑائی کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ ایک عمدہ یوروپین فوج کے مقابلہ میں ہندوستانی بڑی فوج بھی بیکار ہے۔ درحقیقت ہندوستانیوں اور اہل یورپ کے درمیان یہ پہلی لڑائی تھی۔

ڈوپلے کی کامیابی کا سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوا۔ ۱۷۴۸ء میں انگریزی جہازوں کا ایک بیڑہ ہندوستان آیا اور پانڈیچری پر حملہ کیا، لیکن فرانسیسیوں نے نہایت بہادری سے اپنی اس نوآبادی کو بچا لیا۔ اسی سال یورپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان ایلاشیپل کی صلح ہوئی جس کی رو سے انگریزوں کو مدراس واپس کر دیا گیا۔ جس وقت لابور ڈونے نے مدراس فتح کیا تھا تو وہ چاہتا تھا کہ کچھ روپیہ لے کر انگریزوں کو یہ شہر واپس کر دیا جائے لیکن ڈوپلے اس پر راضی نہ ہوا تھا۔ اب صلحنامہ ایلاشیپل کی رو سے اس کو مدراس واپس کرنا پڑا۔ پھر بھی یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پہلی لڑائی میں انگریزوں کے مقابلہ میں فرانسیسیوں کو کامیابی ہوئی۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی دوسری لڑائی ۱۷۴۹-۱۷۵۴ء

پہلی لڑائی کے موقع پر انگریزی اور فرانسیسی کمپنیوں کو یہ بہانہ مل گیا تھا کہ دونوں قومیں یورپ میں برسرپیکار تھیں لیکن اس وقت یہ صورت نہ تھی۔ پھر بھی حیدرآباد اور کرناٹک کی تخت نشینی

کے سلسلہ میں جو لڑائیاں ہوئیں اُن میں انگریزی اور فرانسیسی سپاہیوں نے حصہ لیا۔
۱۷۴۸ء میں دکن کے صوبیدار نظام الملک کا انتقال ہوا اور اُس کا لڑکا ناصر جنگ
تخت پر بیٹھا۔ ناصر جنگ کے مقابلہ میں مظفر جنگ نے جو نظام الملک کا پوتا تھا تخت کا
دعویٰ کیا اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے چندا صاحب کے ساتھ جو ستارہ
میں قید تھا مراسلت شروع کی کہ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو چندا صاحب کو کرناٹک کا نواب
بنا دے گا۔ ڈوپلے نے اس منصوبے کی تائید کی اور مرہٹوں کو ایک کثیر رقم دے کر
چندا صاحب کو رہا کرا لیا۔ اب چندا صاحب اور فرانسیسیوں کی متحدہ فوج کرناٹک
میں داخل ہوئی۔ انورالدین نواب کرناٹک کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔
چندا صاحب کرناٹک کا نواب مقرر ہوا۔ محمد علی جو انورالدین کا لڑکا تھا اپنی جان
بچا کر بھاگا اور ترچناپلی کے قلعے میں پناہ گزیں ہوا۔ ناصر جنگ نے یہ حالات
دیکھ کر ارادہ کیا کہ مفسدوں کو سزا دے اور ایک بڑی فوج کے ساتھ کرناٹک
کی طرف روانہ ہوا۔ مظفر جنگ نے ہمت ہار دی اور ناصر جنگ کی اطاعت قبول
کر لی۔ ڈوپلے کی کامیابی کو اس سے صدمہ ضرور پہنچا لیکن اُس نے اپنی کوشش
برابر جاری رکھی۔ اُس کی خوش قسمتی سے دسمبر ۱۷۵۰ء میں ناصر جنگ اپنے ایک امیر کے
ہاتھ سے قتل ہوا اور مظفر جنگ دکن کا صوبیدار بن گیا۔ اُس کی تاجپوشی کی رسم
پانڈیچری میں ادا ہوئی اور اس موقع پر فرانسیسیوں اور اُن کی کمپنی کو نہایت قیمتی
تحفے ملے۔ اس طرح ڈوپلے نے اپنی قابلیت سے دکن میں دو نوابوں پر اثر قائم کر لیا۔
فرانسیسیوں کی اس کامیابی کو دیکھ کر انگریزوں نے بھی اس بات کا
فیصلہ کیا کہ دکن کے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کریں۔ چنانچہ اب
لڑائی درحقیقت یورپ کی دو طاقتوں کے مابین تھی اور ہندوستانی نواب
برائے نام اس میں شریک تھے۔

ارکاٹ کا محاصرہ ۱۷۵۱ء

انگریزوں نے طے کیا کہ نواب محمد علی کو جو ترچناپلی کے قلعے میں موجود تھا مدد پہنچائی جائے۔ چندا صاحب نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا اور فرانسیسیوں کی مدد سے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا ظاہری حالات دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ فرانسیسیوں کے مقابلہ میں انگریزوں کو کامیابی ہوگی لیکن اس نازک موقع پر کلائیو کی قابلیت نے جنگ کا نقشہ بالکل بدل دیا۔

کلائیو کمپنی کی ملازمت میں بحیثیت ایک کلرک کے داخل ہوا تھا۔ لیکن اس کو اس کام سے بالکل دلچسپی نہ تھی اور تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اُس نے فوجی ملازمت اختیار کر لی۔ جس وقت نواب محمد علی کو مدد پہنچانے کا سوال پیش ہوا تو کلائیو نے انگریزی افسروں کو یہ بات سمجھائی کہ ترچناپلی کے بچانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ چندا صاحب کے دارالسلطنت ارکاٹ پر قبضہ کر لیا جائے۔ جب انگریزی فوجیں ارکاٹ پر حملہ کریں گی تو چندا صاحب اپنی فوج کو ارکاٹ کے بچانے کی غرض سے وہاں سے ہٹانے لگا۔ کلائیو کی یہ تجویز مان لی گئی اور یہ طے پایا کہ ایک مختصر فوج کلائیو ہی کی سرداری میں ارکاٹ فتح کرنے کے لئے بھیجی جائے۔ اگست ۱۷۵۱ء میں کلائیو نے ارکاٹ پر قبضہ کر لیا چندا صاحب نے فوراً ارکاٹ واپس لینے کے لئے ایک فوج روانہ کی۔ کلائیو نے

سات ہفتہ تک اس فوج کا بڑی دلیری سے مقابلہ کیا اور دشمن کو ناکام واپس جانے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد اُس نے ارنی اور کاویری پاک کے مقامات پر فتوحات حاصل کیں۔ آخر کار محمد علی کو کامیابی ہوئی اور چند اصاحب قتل کر دیا گیا۔ اس طرح کلائیو کی قابلیت اور بہادری نے حالات بالکل بدل دئے۔ فرانسیسیوں نے لڑائی جاری رکھی۔ لیکن اب انگریز بھی پیچھے نہ ہٹے۔ اس عرصہ میں اپنے چچا کی طرح مظفر جنگ بھی کرناٹک سے حیدرآباد جاتے ہوئے راستے میں قتل کر دیا گیا۔ لیکن فرانسیسی سردار بسی نے جو اس وقت موجود تھا نظام الملک کے ایک اور بیٹے صلابت جنگ کو نظام مقرر کر دیا۔ نظام پر بسی کا بہت زیادہ اثر تھا اور اُس نے فرانس کے لئے شمالی سرکار کا علاقہ حاصل کر لیا جس کی سالانہ آمدنی چالیس لاکھ روپیہ تھی۔ اس علاقے سے فرانسیسیوں کی آمدنی اور طاقت بہت زیادہ بڑھ گئی۔

جنگ کا خاتمہ

اس میں شک نہیں کہ اب ڈوپلے کا اقتدار بہت کم ہو گیا تھا اور اُس کی پالیسی ناکامیاب ثابت ہو چکی تھی لیکن پھر بھی وہ لڑائی کو ختم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ مگر دونوں کمپنیوں کے ڈائرکٹروں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس لڑائی سے فریقین کو نقصان ہے کیونکہ اُن کی تجارت بالکل خراب ہوئی جاتی تھی۔ لہذا اُنھوں نے یہ طے کر لیا کہ جنگ کا جلد از جلد خاتمہ کیا جائے۔ ۱۷۵۴ء میں ڈوپلے کو واپس بلا لیا گیا کیونکہ اس لڑائی کی ذمہ داری سب سے زیادہ اُسی پر تھی اور اُس کے جانشین گاڈیے ہیو نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ ڈوپلے یقیناً ایک لائق منتظم، ہوشیار اور بلند حوصلہ مدبر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی قوم اور ملک کی عزت اور حکومت بڑھائے اور اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے وہ ہر قربانی کے لئے تیار تھا۔ لیکن اُس کی بدقسمتی سے حکومت فرانس نے اُس کا ساتھ نہیں دیا اور یہاں سے واپس جانے کے چند سال بعد اُس نے

نہایت مفلسی اور بیکسی کی حالت میں پیرس میں وفات پائی۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تیسری لڑائی سنہ ۱۷۵۷-۱۷۶۳ء

اب دونوں قوموں میں صلح ہوگئی تھی اور یہ طے ہوگیا تھا کہ ہندوستانی لڑائیوں اور نوابوں کے معاملات میں دخل نہ دیں گے اور نہ شاہان مغلیہ کی طرف سے خطابات وغیرہ قبول کریں گے لیکن یہاں کے حالات ایسے تھے کہ فریقین میں سے کوئی بھی اس قرارداد پر عمل نہ کرسکا دوسرے یہ کہ صلح کے تھوڑے ہی دنوں بعد یورپ میں ہفت سالہ جنگ چھڑ گئی اور حسب معمول انگلستان اور فرانس ایک دوسرے کے خلاف لڑنے لگے۔

سنہ ۱۷۵۶ء میں جب یہ لڑائی شروع ہوئی تو کلایو بنگال میں تھا۔ اُس نے فوراً چندرنگر کو جو بنگال میں فرانسیسی تجارت کا مرکز تھا فتح کرلیا۔ فرانس نے بھی کاؤنٹ لالی کے ماتحت ایک فوج ہندوستان روانہ کی۔ لالی ایک نہایت قابل سپاہی تھا مگر اُس کی تیزمزاجی اُس کی کامیابی کے راستہ میں اکثر حائل ہوجاتی تھی. اور بہت معمولی سی باتوں پر اُس کو غصہ آجاتا تھا بہرحال اپریل سنہ ۱۷۵۸ء میں وہ پانڈیچری پر اُترا اور مدراس کا محاصرہ کرنے کے لئے تیاری شروع کی۔ فورٹ سینٹ ڈیوڈ پر اُس نے بمباری کرکے قبضہ کرلیا، لیکن اُس کی کامیابی بس یہیں ختم ہوگئی۔ اُس نے ایک غلطی یہ بھی کی کہ بسی کو حیدرآباد سے واپس بلالیا اور بہت جلد اُس میں اور اُس کے افسروں میں اختلاف رائے شروع ہوگیا۔ بسی کے واپس آنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرنل فورڈ نے جس کو کلایو نے بنگال سے دکن کی طرف روانہ کیا تھا شمالی سرکار کے علاقہ پر قبضہ کرلیا اور فرانسیسیوں کا اثر نظام کے دربار میں تقریباً ختم ہوگیا۔ ادھر کاؤنٹ لالی نے دسمبر سنہ ۱۷۵۸ء میں مدراس کا محاصرہ کرلیا اس میں بھی اس کو ناکامیابی ہوئی۔ سنہ ۱۷۶۰ء میں سرآیرکوٹ نے وانڈیواش کے مقام

پر اُس کو شکست فاش دی۔ انگریزوں نے مچھلی پٹم فتح کر لیا اور اگلے سال یعنی ۱۷۶۱ء میں پانڈیچری بھی انگریزوں کے ہاتھ آ گیا۔ واندیواش کی لڑائی بہت اہم خیال کی جاتی ہے کیونکہ اس میں فرانسیسیوں کی قسمت کا قطعی فیصلہ ہو گیا۔ اور یہ بات معلوم ہو گئی کہ آئندہ کون سی قوم شاہان مغلیہ کے بجائے ہندوستان پر حکومت کرے گی۔

انگریزوں کی فتح کے اسباب

اس امر پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اس بیس سالہ جنگ و جہد میں آخر کار انگریزوں کو فتح کیونکر ہوئی اور فرانسیسی کیوں ناکامیاب رہے؟ سب سے پہلی وجہ یہ ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی حالت فرنچ کمپنی کے مقابلہ میں بہت بہتر تھی۔ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ اُن کی کامیابی اُن کی اپنی کوشش ہی پر منحصر ہے برخلاف اس کے فرانسیسی لوگوں کا خیال تھا کہ اُن کی کمپنی فرانسیسی حکومت کے ایک محکمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لڑائی کے دوران میں بھی انگریزوں نے تجارت کے کام کو نہایت زور شور کے ساتھ جاری رکھا اور فرانسیسیوں کے مقابلہ میں کئی گنا روپیہ کمایا۔ انگریزوں کی کمپنی انگریزی حکومت سے بے نیاز تھی اور فرانسیسی کمپنی کو ہر وقت حکومت فرانس کی طرف سے دخل اندازی کا خطرہ تھا اور یہی سبب تھا کہ انگریزی کمپنی سے انگلستان کی قومی ہمدردی وابستہ تھی اور فرانس کی کمپنی کے معاملات میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ انگریزی افسروں اور سرداروں میں فرانسیسیوں کے مقابلہ پر بہت زیادہ اتحاد اور میل تھا۔ تم کو یاد ہو گا کہ پہلی جنگ میں مدراس فتح ہونے کے بعد فرانسیسی گورنر ڈوپلے اور فاتح مدراس، لابورڈونز میں اس پر جھگڑا ہوا تھا کہ آیا مدراس انگریزوں کو واپس کر دیا جائے۔ فرانسیسیوں کے قبضہ میں

رہے۔ برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ انگریزی افسروں نے کلائیو جیسے معمولی سپاہی کی تجویز کو بھی مان لیا اور اس پر عمل کیا۔ تیسری لڑائی میں فرانسیسیوں کے معاملات کاؤنٹ لالی جیسے بدمزاج افسر کے ہاتھ میں تھے۔ ایک بہت اہم وجہ انگریزوں کی کامیابی کی یہ تھی کہ بنگال کے زرخیز صوبہ پر اُن کا قبضہ ہوگیا تھا۔ فرانسیسیوں کے پاس ایسا زرخیز علاقہ کوئی نہ تھا۔ آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ انگریزوں کی بحری طاقت دن بدن ترقی کر رہی تھی اور فرانسیسیوں کے مقابلہ میں اُن کے جہازی بیڑوں نے فتوحات حاصل کرنا شروع کر دی تھیں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ یورپ سے آنے والی قوموں کے لئے ہندوستان فتح کرنے اور اُس پر حکومت کرنے کے واسطے بحری قوت انتہائی ضروری تھی اور انگریزوں کی کامیابی میں بڑی حد تک اس کو دخل ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ انگریز لوگ صرف اپنی بحری طاقت کی وجہ سے کامیاب ہوئے۔ تاریخ کے طالب علموں کو چاہئے کہ اوپر کے بیان کئے ہوئے اسباب کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور کسی خاص سبب کو بہت زیادہ اہمیت نہ دیں۔ درحقیقت انگریزوں کی یہ شاندار کامیابی ان تمام اسباب کا مجموعی نتیجہ ہے۔

باب ۳۹

انگریزوں کا تسلّط بنگال پر

بنگال اٹھارہویں صدی کے وسط میں دکن کی طرح بنگال میں بھی خود مختار حکومت اور یورپی قوموں کی فیکٹریاں اور گودام قائم ہو چکے تھے۔ انگریزوں نے

سترہویں صدی کے آخر میں کلکتہ کی بنیاد رکھی اور دوسرے مقامات پر بھی گودام وغیرہ بنا کر نہایت امن و امان سے اپنا تجارت کا کام کرنے لگے۔ فرانسیسیوں نے چندر نگر اور ڈچ تاجروں نے چنسورہ میں اپنی فیکٹریاں قائم کی تھیں۔

اس وقت بنگال کا حاکم علی وردی خاں نامی ایک ترکی امیر تھا وہ نہایت قابل اور سمجھدار شخص تھا۔ اُس نے اپنے زمانے میں مرہٹوں کے حملے سے بنگال کو محفوظ رکھا۔ ۱۷۵۶ء میں علی وردی خاں کی وفات پر اُس کا نوجوان اور ناتجربہ کار پوتا سراج الدولہ تخت پر بیٹھا۔ تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد سراج الدولہ کے تعلقات کلکتہ کے انگریزی سوداگروں سے خراب ہو گئے۔ سراج الدولہ کی ناراضگی کا سبب یہ تھا کہ اُنہوں نے اُس کے بھاگے ہوئے مجرموں کو اپنے یہاں پناہ دی تھی اور معاہدے کے خلاف کلکتہ کی قلعہ بندی شروع کر دی تھی۔ سراج الدولہ نے جب منع کیا تو وہ نہ مانے اور نہ اس مجرم کو واپس دیا جس نے اُن کے پاس پناہ لی تھی۔

سراج الدولہ

قدرتی طور پر یہ بات سراج الدولہ کو ناگوار معلوم ہوئی اور اُس نے ایک بڑی فوج کے ساتھ کلکتہ پر حملہ کر کے اُس کو فتح کر لیا۔ بہت سے انگریز لوگ جو کلکتہ میں اُس وقت موجود تھے وہاں سے چلے گئے اور جو باقی بچے وہ قید ہو گئے۔

یورپی مؤرخوں کا بیان ہے کہ ان قیدیوں میں سے جن کی تعداد ایک سو چھیالیس[۱۴۶] تھی۔ نواب کے افسروں کی لاپرواہی کی وجہ سے تقریباً ایک سو تئیس[۱۲۳] قیدی گرمی سے ہلاک ہو گئے۔ اس واقعہ کو یورپی مؤرخ "کلکتہ کی کال کوٹھری" کے نام سے بیان کرتے ہیں لیکن یہ تعجب کی بات ہے کہ ہندوستانی مؤرخوں نے اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔

پلاسی کی لڑائی جون ۱۷۵۷ء

جب ان واقعات کی خبر مدراس پہنچی تو وہاں سے ایک بڑی فوج کلائیو کی سرکردگی میں اور ایک جہازی بیڑہ امیرالبحر واٹسن کے ساتھ بنگال کی طرف بھیجا گیا۔ انگریزوں نے کلکتہ کو آسانی سے فتح کر لیا اور سراج الدولہ کا مقرر کیا ہوا گورنر بہت جلد شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اس کے بعد کلائیو اور سراج الدولہ کے درمیان صلح ہو گئی۔ جس کی رو سے کمپنی کو اس کے تمام حقوق اور مقبوضات واپس مل گئے۔ اور اس کی اجازت مل گئی کہ انگریز اپنی حفاظت کے لئے ضروری تعمیر کریں۔ نواب نے اس کا بھی وعدہ کیا کہ جو کچھ انگریزوں کو نقصان ہوا ہے وہ پورا کرے گا۔ لیکن کلائیو اب چاہتا تھا کہ بنگال کا نواب ایسا شخص ہو جو انگریزوں کے اثر میں رہے۔ اس کو اس مقصد میں کامیابی حاصل کرنے کا موقع بہت جلد مل گیا۔ کیونکہ سراج الدولہ کے خلاف اس کے امراء میں سازش شروع ہو گئی تھی۔ اس سازش کا سرغنہ سراج الدولہ کا سپہ سالار میر جعفر تھا۔ کلائیو نے بھی اس سازش میں شرکت کی اور میر جعفر کو بنگال کا تخت حاصل کرنے میں مدد دینے کا وعدہ کر لیا۔ یہ تمام کارروائی ایک سوداگر امین چند نامی کی معرفت عمل میں آئی تھی۔ جب سب معاملات طے ہو گئے تو امین چند نے دھمکی دی کہ اگر مجھے اس کے معاوضہ میں تیس[۳۰] لاکھ روپیہ کی رقم نہ دی گئی تو میں سارا راز فاش کر دوں گا۔ کلائیو نے

اس کا جواب مکاری سے دیا - اُس نے دو اقرار نامے لکھے - ایک سفید کاغذ پر اور دوسرا سُرخ کاغذ پر - سفید کاغذ پر جو اصلی اقرار نامہ تھا اُس میں امین چند کے حصّہ کا کوئی ذکر نہیں تھا، لیکن سُرخ کاغذ میں اُس کا حصّہ تیس لاکھ روپیہ کا دکھلایا گیا تھا - دنیا میں ایک جرم کے لئے اکثر کئی جرم کرنے پڑتے ہیں - واٹسن نے اس جعلی کاغذ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا - کلائیو نے اپنی اس چال کو کامیاب بنانے کے لئے اُس کے جعلی دستخط بنائے - بہرحال کلائیو اپنی تدبیرمیں کامیاب ہوا - امین چند دھوکے میں آگیا اور خاموش رہا - بعد میں جب انگریزوں کی کامیابی کے بعد اُس کو معلوم ہوا کہ اُس کو کس طرح سے دھوکا دیا گیا تو اُس پر ایسا صدمہ ہوا کہ وہ اُس سے جانبر نہ ہو سکا -

تمام معاملات طے کرنے کے بعد کلائیو نے سراج الدولہ کو لکھا کہ اُس نے معاہدہ کے خلاف فرانسیسیوں سے گفت وشنید کی ہے اور جواب نہ ملنے پر وہ تین ہزار سپاہی ساتھ لے کر مرشد آباد کی طرف روانہ ہو گیا - سراج الدولہ اپنی فوج کے ساتھ پلاسی کے میدان میں تھا - راستہ میں کلائیو نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور بہت بحث کے بعد فیصلہ کیا کہ کلکتہ واپس جانا چاہئے - لیکن جب رات کے وقت کلائیو نے تنہائی میں اس مسئلہ پر غور کیا تو وہ اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اب واپس جانا مناسب نہیں - چنانچہ اُس نے آگے بڑھنے کا حکم دیا - ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کی مشہور لڑائی ہوئی - سراج الدولہ کو دغاباز میر جعفر سے کوئی مدد نہ ملی - چنانچہ شکست کھا کر اُس کو میدان جنگ سے بھاگنا پڑا - دشمن کے سپاہیوں نے اُس کا پیچھا کیا اور آخرکار وہ گرفتار ہو کر آیا اور میر جعفر کے بیٹے میرن شاہ کے حکم سے قتل کر دیا گیا - میر جعفر اب بنگال کا نواب مقرر ہوا -

جنگ پلاسی کی اہمیت اور انگریزوں کا اقتدار

پلاسی کی لڑائی اس ملک کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس لئے کہ انگریزی سلطنت کے قیام کی ابتدا یہیں سے ہوتی ہے۔ نام کے لئے تو بنگال کا نواب میر جعفر تھا لیکن حقیقت میں انگریزوں کا اثر اتنا بڑھ گیا تھا کہ نواب بالکل بے بس اور لاچار تھا اُن کی خدمتوں کے صلہ میں میر جعفر نے کلائیو اور دوسرے انگریز افسروں کو بہت بڑی بڑی رقمیں بطور انعام کے دیں اور کمپنی کو ۲۴ پرگنے کا علاقہ عطا کیا۔ ۱۷۵۹ء میں "چوبیس پرگنہ" کی آمدنی جو تقریباً دو لاکھ روپیہ تھی کلائیو کو مل گئی۔ بنگال میں کلائیو کی کامیابی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اسی زمانے میں چن سورہ اور چندر نگر بھی فتح ہو گئے۔ چار سال کی قلیل مدت میں کلائیو نے اپنی کوششوں سے سوداگروں کی ایک جماعت کو بنگال کا مالک بنا دیا اور دو یورپی قوموں کو قطعی طور پر پسپا کر دیا۔ اگر ہم ۱۷۶۰ء میں انگریزوں کی حالت کا مقابلہ اُس وقت سے کریں جب کہ کلائیو بنگال میں نہیں آیا تھا تو ہم کو اندازہ ہو جائے گا کہ اُس نے اپنی قوم کی کسقدر بڑی خدمت کی اور کیسا نام پیدا کیا۔ جس طریقہ سے اُس نے یہ کامیابی حاصل کی وہ قابل اعتراض ضرور ہے لیکن اس کامیابی کے شاندار ہونے میں کسی کو بھی شک کی گنجائش نہیں۔

نواب میر قاسم

کلائیو کے جانے پر ونسٹارٹ بنگال کا گورنر مقرر ہوا۔ اس وقت بد نظمی پھیل چکی تھی اور بنگال کی حالت ابتر تھی کمپنی کا خزانہ بھی خالی تھا۔ لہذا کلکتہ کی کونسل نے طے کیا کہ میر جعفر کو گدی سے اُتار کر اُس کے داماد میر قاسم کو نواب بنا دیا جائے۔ میر قاسم نے اُس کے صلے میں کمپنی کو بردوان۔ مدناپور اور چٹگاؤں کے ضلعے اور انگریزی افسروں کو بڑی بڑی رقمیں عطا کیں۔ میر قاسم ایک لائق خوددار اور ہوشیار جوان تھا۔ اگرچہ

اُس نے تخت اپنے خسر کی طرح انگریزوں کو روپیہ دے کر حاصل کیا تھا لیکن وہ
اس کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا کہ اُن کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح رہے۔ وہ چاہتا
تھا کہ اپنے زمانۂ حکومت میں جہاں تک ہو سکے امن و امان قایم کرے۔ چنانچہ اس
میں اور کلکتہ کی کونسل کے ممبروں میں بہت جلد اختلافات شروع ہو گئے۔ بہت عرصہ
سے انگریزی کمپنی کو صوبۂ بنگال میں بغیر محصول کے تجارت کرنے کا حق حاصل تھا۔
یہ مراعات مغل بادشاہ نے صرف کمپنی کو دی تھیں نہ کہ اُس کے ملازموں اور
دوسرے تاجروں کو جو اپنی ذاتی تجارت بھی کرتے تھے لیکن یہ لوگ اس قدر
دلیر ہو گئے تھے کہ اپنی ذاتی تجارت کی چیزوں پر بھی محصول نہیں دیتے تھے۔
اور اس سے بھی بڑھ کر معاملات اس حد تک پہنچ گئے تھے کہ دوسرے سوداگروں
کا مال انگریز لوگ اپنے نام سے بھیج دیتے تھے اور حکومت بنگال اتنی کمزور
تھی کہ ان چیزوں کا بھی محصول نہیں لے سکتی تھی۔ میر قاسم نے ان ناجائز
کارروائیوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن کمپنی کے ملازموں نے ایک نہ سُنی۔
میر قاسم خوب سمجھتا تھا کہ اس چیز سے صرف اُس کی حکومت ہی کو نہیں نقصان
پہنچتا ہے بلکہ ہندوستانی تاجروں کی حالت بھی تباہ ہو رہی تھی۔ چنانچہ اُس
نے مجبور ہو کر یہ حکم دیا کہ ہندوستانی تاجر بھی بغیر کسی محصول کے بنگال میں تجارت
کریں۔ میر قاسم کا یہ حکم بالکل جائز اور ٹھیک تھا۔ لیکن اس سے انگریز اور
ہندوستانی تاجروں میں کوئی فرق نہ رہا اور اب انگریز تاجر وہ فائدہ نہیں
اُٹھا سکتے تھے جو اب تک اُٹھا رہے تھے۔ انگریزوں نے میر قاسم کی شدید
مخالفت کی اور اُس کو بغاوت پر مجبور کر دیا۔ میر قاسم کو اس قدر غصہ آیا
کہ اُس نے دو سو انگریزوں کو جو اُس کے قبضہ میں تھے قتل کروا دیا۔ اس
پر جنگ چھڑ گئی۔ انگریزوں نے اُس کو دو لڑائیوں میں شکست دے کر بنگال

سے باہر نکال دیا اور ۱۷۶۳ء میں میر جعفر کو دوبارہ گدی پر بٹھایا۔ میر جعفر نے پھر انگریزوں کو پوری آزادی سے بغیر کسی محصول کے تجارت کرنے کی اجازت دیدی اور اس نے علاوہ انگریزوں کے نقصانات کی اُسکو تلافی کرنی پڑی۔

بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء

میر قاسم شکست کھاکر اودھ کی جانب بھاگا۔ اودھ کے حاکم شجاع الدولہ نے جو نواب وزیر اودھ کہلاتا تھا میر قاسم سے امداد کا وعدہ کیا۔ چنانچہ شاہ عالم بادشاہ دہلی نواب وزیر اور میر قاسم نے مل کر بنگال پر چڑھائی کی، انگریزی افسر میجر منرو نے بکسر کے مقام پر ان تینوں کی متحدہ فوج کو شکست دی۔ اس مشہور لڑائی میں انگریزوں کے آٹھ سو سینتالیس اور دوسرے فریق کے دو ہزار سپاہی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ شاہ عالم نے اُسی وقت اپنی شکست مان لی لیکن نواب وزیر کے تعاقب میں انگریزی فوجوں کو لکھنؤ اور الہ آباد تک جانا پڑا۔ پلاسی کی طرح بکسر کی لڑائی بھی نہایت اہم لڑائیوں میں شمار کی جاتی ہے۔ ایک لحاظ سے اُس کو پلاسی سے بھی زیادہ اہم خیال کرنا چاہئے۔ پلاسی میں صرف صوبہ بنگال کے نواب سے مقابلہ تھا برخلاف اس کے بکسر کے میدان میں انگریزی فوج نے شہنشاہ ہند اُس کے وزیر اور صوبیدار بنگال کی فوجوں کو شکست دی۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میجر منرو کی کامیابی نے کلایو کی کامیابی کو مکمل کردیا اور بنگال پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔

کلایو اور بنگال کی گورنری

ہندوستان سے واپس جانے پر کلایو کی بہت قدر ہوئی کیونکہ اُس کی قابلیت اور ہوشیاری کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ ہندوستان سے کافی دولت لے گیا تھا اور اپنے ملک کے مشہور آدمیوں میں شمار ہونے لگا تھا۔

لیکن اُس کے مخالفین کی تعداد بھی کافی تھی، چنانچہ اُس پر اعتراضوں کی بوچھار ہو رہی تھی اور وہ جاگیر جو اُس کو شاہ دہلی نے عطا کی تھی ضبط کر لی گئی تھی۔ ان حالات میں خبر پہنچی کہ بنگال کی حالت بہت ابتر ہے اور خطرہ ہے کہ انگریزوں کا اقتدار اور اثر جاتا رہے۔ اس لئے کمپنی کے ارباب حل وعقد نے یہی طے کیا کہ کلائیو کو دوبارہ بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا جائے۔ اُس کی جاگیر کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ دس سال تک اور اگر اس دوران میں وہ مرجائے تو اُس کی زندگی تک جاگیر کی آمدنی اُس کو دی جائے۔ اور ۱۷۶۵ء میں کلائیو دوبارہ بنگال کا گورنر مقرر ہو کر آیا۔

دیوانی کلائیو جو اب لارڈ کلائیو ہو گیا تھا اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ بنگال کے نظام حکومت میں اصلاحات کرے۔ اس کے علاوہ شاہ عالم نواب وزیر اور نواب بنگال کے معاملات کو بھی طے کرنا ضروری تھا۔ چنانچہ وہ الہ آباد پہنچا اور نواب اودھ اور شاہ دہلی سے صلح کر لی۔ انگریزوں کی یہ پہلی کامیاب اور اہم صلح ہے۔ اس عہدنامہ کی رو سے شاہ عالم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال، بہار اور اُڑیسہ کی دیوانی یعنی مال گزاری وصول کرنے کا حق عطا کیا۔ کمپنی نے اس مال گزاری میں سے چھبیس لاکھ روپیہ شہنشاہ کو دینا منظور کیا۔ کڑا اور الہ آباد شاہ عالم کو دیدئے گئے اور اودھ کی بقیہ سلطنت نواب وزیر کو واپس کر دی گئی، لیکن اُس کو پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان انگریزوں کی نظر کرنا پڑا۔ مرہٹوں کے خلاف انگریزوں اور نواب وزیر کے درمیان ایک عہدنامہ ہو گیا کہ اگر مرہٹے اُن میں سے کسی کے ملک پر حملہ کریں گے تو وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ اس صلح نے انگریزوں کی حیثیت بالکل بدل دی، تاجروں کی ایک جماعت اب ہندوستان کے ایک بڑے صوبہ کی مالگزاری وصول کرنے

اور اُس کا انتظام کرنے کی حقدار ہوگئی۔ پلاسی کی لڑائی کے بعد سے نواب بنگال اُن کے زیر اثر تھا، لیکن اس صلح کے بعد کمپنی شاہ دہلی کی طرف سے بنگال و بہار کی دیوان مقرر ہوگئی۔ اب بنگال کا نواب صرف برائے نام نواب رہ گیا کیونکہ حکومت کے اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئے۔

حکومت دو عملی اب اُس نے بنگال میں ایک نئے نظام حکومت کی بنیاد ڈالی جس کو حکومت دو عملی کہتے ہیں، اس لئے کہ کلایو نے دو نائب دیوان مقرر کئے اور دیوانی کے تمام فرائض کی انجام دہی کا ذمہ دار اُن ہی کو بنایا۔ صرف فوجی انتظام اپنے ہاتھ میں رکھا۔ تاکہ ملک میں امن اور انگریزی اقتدار قائم رہے اور ہندوستانی "نائب دیوان" روپیہ بہم پہنچاتے اور رعایا کے معاملات طے کرتے تھے۔ حکومت دو عملی سے لوگوں کو سخت تکلیف پہنچی اور ملک میں ابتری پھیلنے لگی۔ اس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ رعایا کی خوشحالی کی ذمہ داری کا احساس نہ کمپنی کو تھا اور نہ کسی اور کو۔ نواب بنگال کو بھی کمپنی نے ۵۳ لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔

اب کلایو نے اپنی توجہ کمپنی کے ملازموں کی اصلاح کی طرف کی۔ تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ کمپنی کے ملازم ہندوستانی نوابوں اور رئیسوں سے روپیہ وصول کرتے تھے اور یہاں سے جو بھی واپس جاتا تھا اُس کے متعلق خیال ہوتا تھا کہ وہ بہت کچھ روپیہ لایا ہوگا۔ کلایو نے حکم دیدیا کہ آئندہ کمپنی کا کوئی ملازم کسی قسم کے تحفے قبول نہ کرے۔ اُس نے یہ بھی قاعدہ بنادیا کہ نمک کی تجارت سے جو فائدہ ہو اُس میں سے کمپنی کے اعلیٰ افسروں کی تنخواہوں میں کچھ اضافہ کر دیا جاتے۔ فوج کے سپاہیوں کو جو بھتہ ملتا تھا وہ بھی بند کر دیا گیا۔ ان اصلاحات کا اثر جن لوگوں کی آمدنی پر پڑا وہ کلایو کے بہت مخالف ہو گئے۔ لیکن اُن کا مقابلہ کرنے میں

کلائیو نے بڑی ہمت۔ دلیری اور استقلال سے کام لیا۔ ان اصلاحات اور انتظامات کے بعد کلائیو ۱۷۶۷ء میں انگلستان واپس چلا گیا۔ وہاں بھی اُس کی مخالفت ہوئی جس کا صدمہ اُس پر اس قدر زیادہ ہوا کہ ۱۷۷۴ء میں اُس نے خودکشی کر لی۔

کلائیو کی سیرت اور کارنامے

کلائیو تاریخ ہند اور نیز تاریخ انگلستان کی مشہور ترین ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُس کو انگریزی حکومت کا بانی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ دکن میں فرانسیسی اثر کو اُسی نے سب سے پہلے کم کیا اور بنگال میں انگریزی سلطنت کا سنگ بنیاد بھی اُسی نے رکھا۔ کلائیو نہایت ہوشیار اور قابل مدبر اور ایک بہادر سپاہی تھا لیکن اُس کی ان تمام خوبیوں کے ساتھ ہم یہ نہیں بھول سکتے کہ ہندوستان میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے جو ذرائع اور طریقے اُس نے استعمال کئے وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اپنی قوم کی اُس نے بہت بڑی خدمت کی، لیکن سراج الدولہ اور امین چند کے ساتھ جو برتاؤ اُس نے کیا وہ کسی طرح قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح میر جعفر سے روپیہ وصول کرنے میں اُس نے سنگدلی اور طمع سے کام لیا۔ اُس کے دشمنوں نے پارلیمنٹ میں بھی اُس کی ان کارروائیوں کے خلاف رزولیوشن پیش کئے۔ کلائیو پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اُس نے اپنا خاتمہ اپنے ہاتھ سے کیا۔

باب ۱۴

وارن ہیسٹنگز بحیثیت گورنر بنگال

۱۷۷۲ - ۱۷۷۴ء

بنگال کی حالت ۱۷۶۷ - ۱۷۷۲ء

کلائیو کے جانے کے پانچ سال بعد وارن ہیسٹنگز گورنر بنگال مقرر ہو کر آیا۔ اس زمانہ میں بنگال کی حالت نہایت ابتر ہو گئی تھی۔ کمپنی کی مالی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ کمپنی نے بنگال، بہار اڑیسہ کی دیوانی تو حاصل کر لی تھی۔ لیکن اُس کی ساری ذمہ داریاں اپنے اوپر نہیں لی تھیں۔ بلکہ دو نائب دیوان مقرر کر دئے گئے تھے جو ان فرائض کو انجام دیتے تھے۔ کمپنی کے ملازم بے ایمانی کرتے تھے اور کمپنی کے مفاد پر اپنی ذاتی تجارت کو مقدم سمجھتے تھے۔ علاوہ ازیں ۱۷۷۰ء میں بنگال میں سخت قحط پڑا جو تقریباً دو سال تک رہا۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ بنگال کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی قحط کی وجہ سے ہلاک ہو گئی۔ انگریزی تاجروں نے قحط کی مصیبت کم کرنے کے لئے کوئی خاص تدبیر نہ کی بلکہ اس گرانی سے خوب فائدہ اُٹھایا اور بہت روپیہ کمایا۔ زراعت کی حالت نہایت ابتر ہو گئی۔ صنعت و حرفت پر تباہی آ گئی اور چاروں طرف بدنظمی پھیل گئی۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈائرکٹروں نے وارن ہیسٹنگز کو بنگال کا گورنر بنا کر بھیجا۔

وارن ہیسٹنگز کی اصلاحات

ہم ہیسٹنگز کے دورِ حکومت کو دو حصّوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ۱۷۷۲ء سے ۱۷۷۴ء تک وہ بنگال کا گورنر رہا۔ اس کے بعد ریگولیٹنگ ایکٹ کی رو سے وہ گورنر جنرل مقرر ہوا اور بنگال کے علاوہ بمبئی اور مدراس پر بھی اُس کو کچھ اختیارات حاصل ہو گئے۔ ہیسٹنگز کی پالیسی اور اُس کے اخلاق و عادات کے متعلق مورخوں میں اختلاف رائے ہے۔ اِن اختلافات پر اس جگہ تفصیلی بحث نہیں کی جا سکتی لیکن اس میں شک نہیں کہ اُس نے انگریزی اقتدار اور حکومت کو قائم رکھنے میں جو کوشش کی اور جس قابلیت سے کام لیا وہ قابلِ تعریف ہے۔

ہیسٹنگز کے لئے سب سے پہلا اور ضروری کام یہ تھا کہ ملکی انتظامات کی خرابیوں کو دور کرے اور اُس کے بعد کمپنی کی مالی حالت کو ٹھیک کرے۔ حکومت دو عملی کی خرابیاں ظاہر ہو چکی تھیں۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اب طے کیا کہ کمپنی خود دیوانی کے فرائض انجام دے۔ چنانچہ فوجی نظام کے علاوہ مالگزاری کی وصولیابی پولیس کا انتظام اور مقدمات کا طے کرنا بھی اُس کے ذمّہ ہو گئے۔ نائب دیوان کے عہدے توڑ دیئے گئے اور محمد رضا خاں اور شتاب رائے پر مقدمات چلائے گئے لیکن اُن پر کوئی جرم ثابت نہیں ہوا۔ ہیسٹنگز نے خزانہ مرشد آباد سے کلکتہ کو منتقل کر دیا۔ کمپنی کے مقبوضات چھ صوبوں میں تقسیم کر دئے گئے اور ہر صوبے کے لئے ایک کونسل مقرر ہو گئی۔ کونسل کے ممبر مالیہ اکٹھا کرنے کا ٹھیکہ زمینداروں کو دیتے تھے اور مالیہ اور دیوانی کے متعلق مقدمات طے کرتے تھے۔ کلکتہ میں ایک صدر دیوانی عدالت قائم کی گئی جو ماتحت عدالتوں کی اپیل سنتی تھی۔ ہیسٹنگز کے اس انتظام کو بعض مورخوں نے پنج سالہ انتظام بھی کہا ہے اس لئے کہ ابتدا میں مالیہ وصول کرنے کا ٹھیکہ

پانچ سال کے واسطے دیا گیا تھا لیکن اس میں کچھ خرابیاں معلوم ہوئیں تو پھر ایک سال کے لئے دیا جانے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد تجربہ نے بتلایا کہ یہ انتظام ناقص ہے اور اس میں کچھ تبدیلیاں کی گئیں۔ مال و فوجداری کی عدالتیں علیحدہ علیحدہ کر دی گئیں۔ تمام بنگال کے لئے ایک ریونیو بورڈ بھی قائم ہوا۔ فوجداری کی عدالت کے انتظام کے لئے نائب ناظم مقرر کئے گئے اور ہندو اور مسلمانوں کے مقدمات اُن کے ذاتی مذہبی قوانین کے مطابق فیصل کئے جانے لگے۔ ان اصلاحات سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی نے حکومت کی اکثر ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں۔

لارڈ ہیسٹنگز

دوسرا مسئلہ ہیسٹنگز کے سامنے کمپنی کی مالی مشکلات کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ وارن ہیسٹنگز کو اپنے دورِ حکومت میں کئی کام ایسے کرنے پڑے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے اچھے نہ تھے لیکن مالی مشکلات نے اُس کو مجبور کر دیا تھا۔ بنگال کے نواب کو کمپنی ۳۲ لاکھ روپیہ سالانہ دیا کرتی تھی۔ ہیسٹنگز نے اس رقم کو نصف کر دیا لیکن اب نواب کو یہ روپیہ باقاعدہ ملنے لگا۔ اسی طرح شاہ عالم کو جو چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ کی رقم دی جاتی تھی وہ بند کر دی گئی۔ الٰہ آباد کے صلحنامہ کے

مطابق شاہ عالم کو کڑا اور الہ آباد کے ضلعے دئے گئے تھے اور بنگال کی دیوانی کے عوض کمپنی نے چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب شاہ عالم الہ آباد چھوڑ کر دہلی آ گیا تھا اور وہاں مرہٹوں کے زیر سایہ سکونت اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ ہیسٹنگز نے اس بناء پر کہ شاہ عالم انگریزوں کے اثر سے نکلکر مرہٹوں کے ساتھ ہو گیا ہے اس کا روپیہ بند کر دیا۔ کڑا اور الہ آباد اس سے لے لئے گئے اور نواب وزیر اودھ کے ہاتھ پچاس لاکھ روپیہ میں فروخت کر دئے گئے۔ سیاسی مصلحت کے لحاظ سے یہ کام بہت اچھا تھا کیونکہ شاہ عالم کو روپیہ دینے کے معنی یہ تھے کہ سندھیا کی قوت کو بڑھایا جائے۔

جنگ روہیلہ اسی جذبہ کے ماتحت یعنی کمپنی کی مالی حالت درست کرنے کے لئے ہیسٹنگز نے نواب وزیر کو روہیلوں کے خلاف مدد دی اور اُن کی تباہی کا باعث ہوا۔ روہیلے پٹھان تھے اور شمالی ہندوستان کے اُس حصہ میں رہتے اور حکومت کرتے تھے جس کو آجکل روہیلکھنڈ کہتے ہیں۔ یہ علاقہ بہت زرخیز ہے اور مرہٹوں کی خواہش تھی کہ اُس پر حملہ کر کے لوٹ مار کریں۔ مرہٹوں کی اس دھمکی کے خوف سے روہیلوں کے سردار حافظ رحمت خاں نے نواب وزیر اودھ سے مدد مانگی اور اس کے بدلے میں چالیس لاکھ روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ ۱۷۷۲ء میں جب روہیلوں اور نواب وزیر کے درمیان یہ صلح نامہ ہوا تھا تو سر رابرٹ بارکر موجود تھا۔ ۱۷۷۳ء میں مرہٹوں نے روہیلکھنڈ پر حملہ کیا اور نواب وزیر نے ایک فوج روہیلوں کی مدد کے لئے روانہ کی لیکن مرہٹے بغیر لڑے ہوئے واپس چلے گئے۔ نواب وزیر نے چالیس لاکھ روپیہ طلب کیا۔ حافظ رحمت خاں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ نواب وزیر کی فوج نے لڑائی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ چنانچہ شجاع الدولہ نے جو اس وقت اودھ کا نواب تھا

انگریزوں کی مدد سے روہیلکھنڈ پر حملہ کیا اور کٹرہ کے قریب ضلع شاہجہاں پور میں اُن کو زبردست شکست دی۔ اودھ اور انگریزوں کے سپاہیوں نے اس فتح کے بعد ملک کو بری طرح سے لوٹا اور برباد کیا اور غریب رعایا پر طرح طرح کے ظلم کئے۔ نواب نے انگریزی فوج کے اخراجات برداشت کرنے کے علاوہ چالیس لاکھ روپیہ کمپنی کو ادا کر دیا۔ روہیلوں کی حکومت ختم ہو گئی اور تقریباً تمام ملک رامپور کی ریاست کے علاوہ سلطنت اودھ میں شامل کر لیا گیا۔ اس جنگ میں حصہ لینے اور روہیلوں کو برباد کرنے کی وجہ سے ہیسٹنگز پر بہت سے اعتراضات ہوئے جن کا تذکرہ بعد میں کیا جائیگا۔ یہ ضرور ہے کہ جنگی اور سیاسی مصلحتوں کے لحاظ سے یہ لڑائی انگریزوں کے لئے بہت فائدہ مند تھی لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ ہیسٹنگز کا رویّہ اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض تھا۔ انگریز مورخوں میں سے بعض نے اس کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور بعض نے ہیسٹنگز پر اعتراضوں کی بوچھار کر دی ہے۔ اوّل تو یہ مسئلہ بھی بحث طلب ہے کہ شجاع الدولہ چالیس لاکھ روپیہ مانگنے میں حق بجانب تھا یا نہیں لیکن بہرصورت صلحنامہ نواب وزیر اور روہیلوں کے درمیان ہوا تھا اور انگریزوں کے لئے اس معاملہ میں دخل دینا مناسب نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر ہیسٹنگز نے اپنی فوج بھیجی تھی تو اس کو اس کا خیال رکھنا چاہیئے تھا کہ روہیلے، اُن کا ملک اور اُن کی رعایا تباہ و برباد نہوں۔ اُس نے یہ نہیں کیا اور ایک اُس حکومت کو برباد کروادیا جس نے کمپنی کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا تھا۔

حیدر علی اور سلطنت میسور

فرانسیسیوں کی شکست کے بعد دکن میں انگریزوں کا قدم اچھی طرح سے جم گیا تھا اور اُن کی حکومت کی بنیاد مضبوط ہو گئی تھی۔ اس وقت اُن کے دو دشمن تھے۔

ایک مرہٹے اور دوسرا حیدر علی، جس نے سلطنت میسور کی قوت بہت بڑھالی تھی۔ نظام سے انگریزوں کے تعلقات بہتر تھے لیکن سیاسی رقابت اور مخالفت کی وجہ سے ان ہندوستانی ریاستوں کے آپس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔

حیدر علی لودی افغان تھا۔ اُس کا باپ فتح محمد میسور میں فوجدار تھا اور جاگیر حاصل کرچکا تھا۔ حیدر علی نہایت بہادر اور نڈر سپاہی تھا اور فنون جنگ میں اُس نے خوب مہارت حاصل کرلی تھی۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی دوسری لڑائی میں وہ میسور کے فوجی دستے میں موجود تھا۔ اسی سلسلہ میں اُس کو پانڈیچری جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں فرانسیسی فوج کے نظم و نسق سے وہ بہت متاثر ہوا۔ ۱۷۵۵ء میں حیدر علی کو ڈنڈی گل کا فوجدار بنا کر بھیجا گیا۔ میسور کا راجہ ایک کمزور شخص تھا۔ اس کی ماں چاہتی تھی کہ اپنے بیٹے کو برہمن وزیر کے قابو سے نکالے چنانچہ اُس نے حیدر علی کی مدد طلب کی

حیدر علی

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو وزیر معزول کردیا گیا اور اُس کی بجائے حیدر علی سلطنت میسور کا وزیر مقرر ہوا۔ اُس نے حکومت کے سب معاملات بہت جلد اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اگرچہ اُس کے نکالنے کی بہت کوشش کی گئی لیکن اُس کا اثر اور اختیارات بڑھتے ہی گئے اور آخر کار وہ سلطنت میسور کا مالک ہوگیا۔ اُس نے بہت جلد سلطنت میسور کو وسیع اور طاقتور بنالیا۔ وہ جاہل ضرور تھا لیکن متعصب اور تنگ نظر نہ تھا۔ مرہٹے اُس کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ لہٰذا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ

مرہٹوں کی طاقت بہت زیادہ بڑھے اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے انگریزوں کے خلاف اُن کی مدد لینے سے انکار کر دیا۔

میسور کی پہلی لڑائی سنہ ۱۷۶۷-۱۷۶۹ع

حیدر علی کو مرہٹوں کے مقابلہ میں شکستیں ہوئیں لیکن انگریزوں کے خلاف ابتدا میں اُس کو کامیابی ہوئی۔ انگریزوں کو اُس کی طرف سے اس لئے اور بھی خطرہ تھا کہ اُس کے قبضے میں کئی بندرگاہ تھے اور وہ اُن کے ذریعہ سے فرانسیسیوں سے مدد لے سکتا تھا۔ انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کو حیدر علی کے خلاف اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، لیکن یہ اتحاد زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا۔ چنانچہ حیدر علی نے کرناٹک پر حملہ کیا اور لوٹا اور کئی لڑائیوں میں انگریزوں پر فتح پائی۔ انگریزوں کا خیال تھا کہ وہ حیدر علی کی طاقت کو تباہ کر دیں گے لیکن اس میں اُن کو کامیابی نہ ہوئی اور سنہ ۱۷۶۹ع کے صلحنامہ کی رو سے فریقین نے فتح کیا ہوا ملک واپس کرنے کا وعدہ کیا اور انگریزوں نے یہ بھی وعدہ کیا کہ اگر حیدر علی پر کوئی حملہ کرے گا تو وہ اُس کی مدد کریں گے۔ لیکن یہ وعدہ پورا نہیں ہوا۔ سنہ ۱۷۷۱ع میں مرہٹوں نے میسور پر حملہ کیا۔ حیدر علی نے انگریزوں سے مدد مانگی۔ وہ اُس کی مدد نہیں کر سکے۔ اب حیدر علی اُن کا سخت دشمن ہو گیا۔

ریگولیٹنگ ایکٹ سنہ ۱۷۷۴ع

ریگولیٹنگ ایکٹ وہ قانون ہے جو برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانی مقبوضات کی حکومت کے لئے تیار کیا تھا۔ یہ پہلا ایکٹ ہے جس کی رو سے پارلیمنٹ نے ہندوستان کے لئے ایک نظام حکومت قائم کیا اور کمپنی کے معاملات میں پارلیمنٹ کے دخل دینے کا بھی یہ پہلا موقع تھا۔

تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ بنگال کی مالی اور انتظامی حالت نہایت ابتر تھی۔ کچھ

لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ تاجروں کی ایک جماعت کو ملک کی حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو ملک فتح کیا ہے وہ گورنمنٹ انگلستان کو اپنے قبضے میں لے لینا چاہئے۔ یہاں کے حالات کی تفتیش کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی اُس نے بہت سخت رپورٹ پیش کی۔ دوسرے یہ کہ کمپنی کی مالی حالت اسقدر خراب ہو گئی تھی کہ حکومت انگلستان سے اُس کو روپیہ قرض مانگنا پڑا۔ گورنمنٹ نے روپیہ تو دیدیا لیکن یہاں کی بدنظمیاں دور کرنے کی غرض سے یہ ایکٹ پاس کیا۔ اس ایکٹ کی رو سے کمپنی کا نظام حکومت مندرجہ ذیل اصولوں کی بنا پر قائم کیا گیا۔

(۱) کورٹ آف ڈائرکٹرس اور پروپرائٹرس کا دستور اساسی بنا دیا گیا یعنی ان جماعتوں کے عہدہ داروں کے انتخاب۔ اختیارات اور مدت کے متعلق قواعد و ضوابط مرتب کئے گئے۔

(۲) بنگال میں بجائے گورنر کے گورنر جنرل کا عہدہ قائم کیا گیا۔ اُس کی مدد کے لئے چار ممبروں کی ایک کونسل بھی وجود میں آئی۔ ان ممبروں کے اختیارات مساوی تھے لیکن ووٹ برابر ہونے کی حالت میں گورنر جنرل کو کاسٹنگ ووٹ کا حق تھا۔

(۳) گورنر جنرل بنگال کو مدراس اور بمبئی کی پریسیڈنسیوں میں بھی صلح اور جنگ کے معاملات میں کچھ اختیارات دیئے گئے تھے۔

(۴) کلکتہ میں ایک عدالت عالیہ قائم کی گئی جس میں ایک چیف جسٹس اور تین جج مقرر ہوئے۔ پہلا چیف جسٹس سر ایلجا امپے تھا۔

(۵) کمپنی کے ملازموں کو تحفے قبول کرنے اور اپنی ذاتی تجارت کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔

ریگولیٹنگ ایکٹ کے نقائص

یہ ایکٹ اپنے مقصد میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ اس میں چند خرابیاں تھیں۔ کونسل میں ہر معاملہ کثرت رائے سے طے ہوتا تھا۔ گورنر جنرل کو ممبروں کے مقابلہ میں کوئی خاص اختیارات حاصل نہ تھے۔ پہلی کونسل کے چار ممبروں میں سے فرانسس کلیورنگ اور مانسن انگلستان سے آئے تھے اور ہیسٹنگز کے سخت مخالف تھے۔ فرانسس اور ہیسٹنگز کی مخالفت تو دشمنی کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس مخالفت کی وجہ سے ہیسٹنگز کو بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کونسل کے ممبروں اور گورنر جنرل کے ان تعلقات کا ذکر آگے بھی آئے گا۔

عدالت عالیہ کے قیام سے بھی وہ فائدہ نہ ہوا جس کی توقع تھی۔ اکثر عدالت عالیہ اور کمپنی کی صدر دیوانی عدالت میں اختلاف ہو جاتا تھا۔ اس دقت کو دور کرنے کے لئے وارن ہیسٹنگز نے سر الیجا امپے کو جو عدالت عالیہ کا چیف جسٹس تھا صدر دیوانی عدالت کا بھی صدر بنا دیا تھا۔ ہیسٹنگز کی اس کارروائی پر بعد میں بہت اعتراضات ہوئے۔

دوسری پریسیڈنسیوں کے گورنروں پر گورنر جنرل کو بہت محدود اختیارات دئے گئے تھے اور ان گورنروں کا رتبہ تقریباً خود مختار حکمرانوں کا سا تھا۔

چند سال کے تجربہ سے ریگولیٹنگ ایکٹ کے یہ نقائص خوب واضح ہو گئے اور جب دوسرا ایکٹ پاس ہوا تو یہ خرابیاں دور کر دی گئیں۔ ریگولیٹنگ ایکٹ کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ہندوستان کے نظام حکومت کے لئے پارلیمنٹ کا تیار کیا ہوا یہ سب سے پہلا ایکٹ ہے۔ اس کے بعد کئی ایکٹ پاس ہوئے جن کی رو سے بہت سی تبدیلیاں عمل میں آئیں۔ سنہ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

باب ۱۴

وارن ہیسٹنگز بحیثیت گورنر جنرل بنگال

۱۷۷۴-۱۷۸۵ء

گورنر جنرل اور نئی کونسل

ریگولیٹنگ ایکٹ کے ماتحت ہیسٹنگز بنگال کا گورنر جنرل مقرر ہوا اور مدراس اور بمبئی کے گورنر اس کے ماتحت ہو گئے۔ کونسل کے چار ممبروں میں سے تین انگلستان سے آئے اور ایک یہیں موجود تھا۔ ان تینوں نے اپنی ایک پارٹی بنالی اور ہر معاملہ میں گورنر جنرل کی مخالفت شروع کر دی۔ ایکٹ کی رو سے گورنر جنرل کو کاسٹنگ ووٹ کا حق اس وقت تھا جبکہ ممبروں کی رائیں دونوں طرف برابر ہوں اور چونکہ فرانسس اور اس کے دو ساتھی تقریباً ہمیشہ ایک ہی رائے دیتے تھے اس لئے گورنر جنرل بالکل بے بس تھا۔ اس کے دور حکومت کے ابتدائی حصے میں یہی صورت حال رہی اور اکثر معاملات اس کی رائے کے خلاف طے ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ آپس کی مخالفت دشمنی کی حد تک پہنچ گئی اور فرانسس وغیرہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ کسی نہ کسی صورت سے گورنر جنرل کو نیچا دکھلائیں۔

نند کمار کی پھانسی سنہ ۱۷۷۵ء

اسی سلسلہ میں نند کمار کا واقعہ پیش آیا۔ نند کمار کلکتہ کا ایک مالدار برہمن تھا اور ہیسٹنگز سے بعض وجوہات کی بنا پر بغض رکھتا تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ کونسل کے ممبر گورنر جنرل کے مخالف ہیں تو مارچ ۱۷۷۵ء میں اُس نے کونسل کے سامنے اس امر کی شہادت پیش کی کہ ہیسٹنگز نے میر جعفر کی بیوہ منی بیگم سے رشوت لی۔ ہیسٹنگز کے مخالف ممبروں نے فوراً اس معاملہ کو ہاتھ میں لیا۔ اور نند کمار کو ثبوت بہم پہنچانے کی غرض سے طلب کیا۔ ہیسٹنگز اس توہین کو برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اُس کی کونسل ہی اُس پر مقدمہ چلائے اور وہ بطور مجرم کے سامنے آئے۔ چنانچہ وہ کونسل چھوڑ کر چلا گیا۔ کونسل کے ممبروں نے یہ رزولیوشن پاس کیا کہ ہیسٹنگز نے واقعی روپیہ وصول کیا ہے اور اب یہ رقم کمپنی کو واپس کرے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہیسٹنگز نے نند کمار پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ لیکن اسی دوران میں موہن پرشاد نے نند کمار کے خلاف مقدمہ دائر کیا اور بتلایا کہ نند کمار نے جعل سازی کی ہے۔ عدالت عالیہ نے فیصلہ کیا کہ نند کمار مجرم ہے اور انگریزی قانون کے مطابق اُس کے لئے پھانسی کی سزا تجویز کی۔ چنانچہ اُس کو پھانسی دیدی گئی۔ درحقیقت یہ سزا بہت سخت تھی۔ علاوہ اس کے مقدمہ میں غیر معمولی عجلت سے کام لیا گیا۔ دوران مقدمہ میں ججوں نے مجرم سے جرح کی۔ سزا تجویز ہونے پر مجرم نے درخواست کی تھی کہ پھانسی اُس وقت تک ملتوی کی جائے جب تک گورنر جنرل کے الزامات کی شہادت پوری نہ ہو۔ لیکن یہ درخواست نامنظور ہوئی۔ ان تمام واقعات کی بنا پر کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نند کمار کو پھانسی اسی لئے دی گئی کہ اُس نے گورنر جنرل پر الزام لگانے کی کوشش کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ہیسٹنگز نے یہ غلطی کی کہ معاملہ کو صاف نہ ہونے دیا۔ اگر نند کمار اپنا

ثبوت پیش کر دیتا تو معلوم ہو جاتا کہ درحقیقت واقعہ کیا ہے۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نندکمار کے الزامات واقعی صحیح تھے یا غلط کیونکہ اُس کو ثبوت دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔

مرہٹوں کی پہلی لڑائی
۱۷۷۵-۱۷۸۲ء

بالاجی باجی راؤ کے بعد اُس کا دوسرا بیٹا مادھو راؤ پیشوا ہوا۔ مادھو راؤ ایک بلند حوصلہ اور عقلمند حکمراں تھا۔ لیکن اُس نے اپنے چچا رگھوبا کو اپنا مخالف بنا لیا۔ رگھوبا نے نظام کی مدد سے اپنے بھتیجے پر چڑھائی کی۔ کچھ عرصہ کے لئے چچا بھتیجوں میں صلح ہو گئی۔ لیکن یہ صلح زیادہ مدت تک قائم نہ رہی مرہٹوں کی ان خانہ جنگیوں سے نظام نے فائدہ اُٹھایا اور اپنے کھوئے ہوئے ملک کا بہت سا حصہ واپس لے لیا۔ ۱۷۷۲ء میں مادھو راؤ کا بھی انتقال ہو گیا۔ نارائن راؤ گدی پر بیٹھا لیکن کچھ عرصہ بعد قتل کر دیا گیا۔ اب رگھوناتھ راؤ یعنی رگھوبا کو گدی حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ مرہٹے سردار اُس کے خلاف تھے اور نانا فرنویس نے جو اس وقت سب سے قابل مرہٹہ مدبر تھا نارائن راؤ کے لڑکے کی حمایت کی، اگرچہ یہ لڑکا ابھی بچہ ہی تھا اور نارائن راؤ کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا بلکہ اور سندھیا نے بھی اُس کی مدد نہ کی، چنانچہ وہ بھاگ کر گجرات چلا گیا اور انگریزوں سے مدد مانگی۔

حکومت بمبئی کی عرصہ سے خواہش تھی کہ سالسیٹ اور بسین کے بندرگاہ جو مرہٹوں نے پرتگیزوں سے چھین لئے تھے اُس کے قبضہ میں آجائیں۔ چنانچہ حکومت بمبئی اس شرط پر رگھوبا کی مدد کے لئے تیار ہو گئی کہ وہ یہ دونوں بندرگاہ جو تجارتی نقطۂ نظر سے بہت اہم تھے اُس کے حوالے کر دے۔ رگھوبا نے کچھ پس و پیش کیا۔ اس پر انگریزوں نے بغیر اُس کی اجازت کے سالسیٹ پر قبضہ کر لیا۔

۱۷۷۵ء میں رگھوبا نے "سورت کے معاہدہ" پر دستخط کر دئے جس کی رو سے دونوں بندرگاہ انگریزوں کو مل گئے۔ یہ عہد نامہ حکومت بمبئی نے کلکتہ کی کونسل سے بغیر مشورہ کئے ہوئے کیا تھا۔ حالانکہ ریگولیٹنگ ایکٹ کے بموجب بمبئی اور مدراس کی حکومتیں گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے ماتحت تھیں۔ بہر حال کلکتہ کی کونسل نے اس عہد نامہ کو مسترد کر دیا اور پونا کی حکومت سے ایک نیا عہد نامہ کیا جو "پرندھر کا صلحنامہ" کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے انگریزوں نے رگھوبا کو مدد نہ دینے کا وعدہ کیا اور سالسیٹ ان کو مل گیا۔ اسی اثنا میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے "معاہدہ سورت" کو منظور کر لیا۔ حکومت بمبئی نے کلکتہ کونسل کی ہدایات کے خلاف اس پر عمل کیا اور پونا کی طرف فوج روانہ کی۔ اس فوج کے سرداروں نے دب کر مرہٹوں سے صلح کر لی لیکن ڈائرکٹروں نے اس صلح کی شرائط کو منظور نہیں کیا۔ چنانچہ جنگ جاری رہی اور اس میں ایک حد تک انگریزوں کو کامیابی بھی ہوئی آخر کار سندھیا کی کوشش سے "سلبائی کے صلحنامہ" پر دستخط ہو گئے۔ اس صلحنامہ کی رو سے سالسیٹ انگریزوں کے پاس رہا لیکن باقی ملک جو انگریزوں کے قبضہ میں آگیا تھا وہ مرہٹوں کو واپس مل گیا۔ اس صلحنامہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ انگریزوں اور پرتگیزوں کے علاوہ دوسری یورپین قومیں مرہٹوں کے ملک میں تجارت نہ کر سکیں گی۔ فتح سنگھ کو گائیکواڑ بڑودہ تسلیم کر لیا گیا اور رگھوبا کو تین لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ دے کر حکومت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت بمبئی نے سخت غلطی کی تھی کہ یہ جنگ شروع کر دی تھی لیکن گورنر جنرل نے برطانوی حکومت کی عظمت اور وقار کو بچا لیا۔

میسور کی دوسری لڑائی ۱۷۸۰-۱۷۸۴ء تم کو یاد ہوگا کہ میسور کی پہلی لڑائی کے اختتام پر جو صلح ہوئی تھی

اُس میں باہمی رفاقت اور اعانت کا عہد ہوا تھا۔ اُس کے تھوڑے عرصہ بعد ہی
مرہٹوں نے حیدر علی کے ملک پر حملہ کیا اور اُس کو شکست دی۔ صلحنامہ کی شرائط
کے مطابق حیدر علی نے انگریزوں سے مدد مانگی۔ اُنہوں نے انکار کر دیا۔ حیدر علی کو
شکست ہوئی اور شدید نقصان اُٹھانا پڑا۔ انگریزوں کی اس وعدہ خلافی کو وہ
کبھی نہیں بھولا۔ اب وہ اُن کا جانی دشمن ہو گیا اور اُن کے خلاف فرانسیسیوں
سے دوستی کی۔ وہ نظام اور مرہٹوں کو بھی اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا لیکن انگریزوں
کی پالیسی نے اُس کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ جب کرناٹک میں جنگ چھڑ گئی تو انگریزوں
نے پانڈیچری پر قبضہ کر لیا اور ماہی کو بھی جو مشرقی ساحل پر فرانسیسی بندرگاہ تھا
اپنے قبضہ میں لینے کی تدبیر کی۔ حیدر علی نے اُن سے منع کیا کہ ماہی پر دست اندازی نہ
کریں لیکن اُنہوں نے اس بات پر کوئی توجہ نہ کی لہذا حیدر علی نے جنگ کا
اعلان کر دیا۔

حیدر علی نے کرناٹک پر چڑھائی کی اور انگریزی فوج کو پولی لور کے مقام
پر ۱۷۸۰ء میں شکست دی۔ ایک انگریزی افسر حیدر علی سے اسقدر خائف ہوا
کہ اُس نے اپنی توپیں ایک تالاب میں پھینک دیں اور مدراس کو لوٹ گیا۔
وارن ہیسٹنگز کو جب اس شکست کی خبر ملی تو اُس نے ایک فوج سر آئر کوٹ
کی سرکردگی میں روانہ کی۔ ناگپور کا راجہ بھونسلا سولہ لاکھ روپیہ لیکر غیر جانبدار
ہو گیا۔ آئر کوٹ اور حیدر علی کے درمیان پورٹو نووو کے مقام پر لڑائی ہوئی
جس میں حیدر علی کو شکست ہوئی۔ پولی لور اور شولنگھر کی لڑائیوں میں بھی
اُس کو شکست ہوئی لیکن وہ نا اُمید نہ ہوا اور اپنے مقصد میں کامیابی
حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ آخر کار بڑی حد تک اُس نے اپنے نقصانات
کی تلافی کر لی۔ اُس کے بیٹے ٹیپو نے تنجور کے ضلع میں انگریزوں کو شکست دی۔

۱۷۸۲ء میں ایک فرانسیسی بحری بیڑہ حیدر علی کی مدد کی غرض سے کنانور پہنچا۔ جس نے میسور کی فوج میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑادی۔ اُس بیڑے کا سردار امیرالبحر سفرن تھا جس نے انگریزی تاجروں کو بہت نقصان پہنچایا۔ اسی سال دسمبر کے مہینہ میں حیدر علی کا انتقال ہو گیا۔ وہ انگریزوں کے خلاف بڑی بہادری سے لڑا لیکن اُس کا خود یہ قول تھا کہ "میں انگریزوں کو خشکی پر بہ آسانی ہرا سکتا ہوں مگر سمندر کو خشک کرنے کی طاقت نہیں رکھتا" یعنی خشکی پر انگریز اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے لیکن اُن کی بحری طاقت کے سامنے وہ بالکل بے بس تھا۔

بہر حال اُس کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے اور جانشین یعنی ٹیپو سلطان نے لڑائی جاری رکھی اور کچھ عرصہ کے بعد صلح کی۔ اپنے اندرونی معاملات کی پیچیدگیوں اور اس خیال سے کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں لڑائی بند ہو جائیگی فرانسیسیوں نے ٹیپو کی مدد سے ہاتھ کھینچ لیا چنانچہ وہ جنگ ختم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ۱۷۸۴ء میں فریقین نے "منگلور کے صلحنامہ" پر دستخط کردئے اور جو ملک فتح ہوا تھا اور جو سپاہی گرفتار ہوئے تھے وہ واپس ہو گئے۔

چیت سنگھ ۱۷۷۸-۱۷۸۰ء

ان لڑائیوں کی وجہ سے جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے کمپنی کی مالی حالت بہت ابتر ہو گئی اور اس حالت کو درست کرنے کے لئے ہیسٹنگز کو وہ تدبیریں اختیار کرنی پڑیں جن پر بعد میں سخت اعتراضات ہوئے۔ چیت سنگھ راجہ بنارس اور بیگمات اودھ کے واقعات قابل ذکر ہیں۔ راجہ بنارس ۱۷۷۵ء کے عہدنامہ کی رو سے کمپنی کا تابع ہو گیا تھا اور ساڑھے بائیس لاکھ روپیہ سالانہ بطور خراج کے

ادا کرتا تھا۔ ۱۷۷۸ء میں لڑائی شروع ہونے پر گورنر جنرل نے سالانہ خراج کے علاوہ پانچ لاکھ روپیہ کی رقم اور طلب کی۔ ۱۷۷۹ء میں یہ مطالبہ پھر کیا گیا۔ راجہ نے کہا کہ عہدنامہ کی رو سے یہ مطالبہ درست نہیں۔ اس پر انگریزی فوجیں اُس کے خلاف روانہ کی گئیں اور اُس کو مجبور کیا گیا کہ علاوہ پانچ لاکھ روپیہ کے اُن فوجوں کا خرچ بھی برداشت کرے جو اُس کے خلاف بھیجی گئی تھیں۔ ۱۷۸۰ء میں پانچ لاکھ روپیہ کا مطالبہ پھر کیا گیا۔ اس مرتبہ راجہ نے اس مطالبہ سے بچنے کی غرض سے دو لاکھ روپیہ ہیسٹنگز کے لئے کلکتہ روانہ کیا۔ ہیسٹنگز نے یہ رقم بطور نذرانہ کے قبول کر لی اور اپنی طرف سے کمپنی کو دیدی لیکن چیت سنگھ سے پانچ لاکھ کی رقم بھی وصول کی گئی۔ ہیسٹنگز کی اس کارروائی پر بعد میں بہت اعتراضات ہوئے۔ بعض مورخین نے اس کو بے گناہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ۱۷۸۳ء میں جو سلیکٹ کمیٹی مقرر ہوئی تھی اُس نے اس معاملہ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ جس ظلم اور دھوکہ بازی سے اس معاملہ میں کام لیا گیا اُس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ گورنر جنرل نے راجہ سے ایک کثیر رقم لینے کے بعد بھی اُس کو تباہ اور برباد کر دیا۔

ابھی گورنر جنرل کے مطالبے ختم نہیں ہوئے تھے اور اب راجہ سے کہا گیا کہ دو ہزار سوار کمپنی کی مدد کے لئے بھیجے۔ چیت سنگھ پوری فوج نہیں بھیج سکا۔ اس پر ہیسٹنگز نے یہ طے کیا کہ راجہ کے "قصور" کو کمپنی کی مالی مشکلات کے دور کرنے کا ذریعہ بنائے۔ چنانچہ اُس نے راجہ پر پچاس لاکھ روپیہ جرمانہ کیا اور اس رقم کے وصول کرنے کے لئے کلکتہ سے بنارس روانہ ہوا۔ راجہ بکسر کے مقام پر گورنر جنرل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن اُس کو جواب ملا کہ بنارس میں ملے۔ وہاں بھی پہنچ کر ہیسٹنگز نے ملنے سے انکار کر دیا اور اپنے مطالبات لکھ کر

بھیج دئے۔ راجہ نے نہایت شائستہ الفاظ میں اس خط کا جواب دیا۔ لیکن ہیسٹنگز نے راجہ پر سازش اور بغاوت کا الزام لگا کر اُس کو قید کر دیا۔ راجہ نے کچھ نہیں کیا مگر اُس کے سپاہی اپنے راجہ کی توہین نہ دیکھ سکے اور لڑنے کے لئے تیار ہو گئے۔ اسوقت چیت سنگھ اپنی جان بچا کر گوالیار کی طرف چلا گیا۔ ہیسٹنگز بھی چنار کی طرف بھاگ گیا اور وہاں سے ایک فوج لے کر آیا اور بنارس پر قبضہ کر لیا۔ چیت سنگھ کو معزول کر دیا گیا اور اُس کا بھتیجا گدی پر بٹھلا دیا گیا۔ اور سالانہ خراج کی رقم بجائے ساڑھے بائیس لاکھ کے چالیس لاکھ روپیہ مقرر کر دی گئی۔ ان واقعات کی بنا پر پارلیمنٹ میں بھی اُس پر بہت سے اعتراضات کئے گئے۔

بیگمات اودھ

راجہ بنارس کی طرح ہیسٹنگز نے بیگمات اودھ سے بھی روپیہ وصول کیا۔ آصف الدولہ نواب وزیر اودھ کمپنی کا قرضدار تھا۔ گورنر جنرل نے قرضہ کا تقاضا کیا۔ نواب نے یہ عذر پیش کیا کہ میرے باپ کا خزانہ اور جائداد میری ماں اور دادی کے قبضے میں ہیں۔ یہ دولت اُن کو کونسل کے فیصلے کے مطابق دی گئی تھی لیکن نواب کا خیال تھا کہ اُس کی حق تلفی کی گئی ہے۔ چنانچہ ہیسٹنگز نے طے کیا کہ بیگمات سے روپیہ وصول کیا جائے بیگمات نے اپنی دولت دینے سے انکار کیا لیکن اُن کے ساتھ نہایت سختی برتی گئی اور زبردستی اُن سے روپیہ لے لیا گیا۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے ہیسٹنگز کا یہ فعل قابل ملامت ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ بیگمات کو جو کچھ دولت ملی تھی وہ کونسل کے فیصلے کے مطابق ملی تھی۔ دوسرے یہ کہ وصولیابی کے سلسلے میں جو ظلم وستم ان پر کئے گئے وہ قابل ملامت ہیں۔ دوسرے الزامات کے ساتھ ہیسٹنگز کو پارلیمنٹ میں اس کی بھی جوابدہی کرنی پڑی۔ بعض مورخوں کا خیال ہے کہ ہیسٹنگز کا اس میں

بہت زیادہ قصور نہیں۔ لیکن ریزیڈنٹ کی خط و کتابت اور دوسرے کاغذات
کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس تشدّد کی ذمہ داری سب سے زیادہ
ہیسٹنگز پر ہی ہے۔ ایک ریزیڈنٹ نے صاف طور پر تحریر کر دیا کہ اس ملک میں
عورتوں کے ساتھ اس سے زیادہ سختی نہیں کی جا سکتی جتنی کہ میں کر چکا ہوں۔ اس
طرح سے ہم کو اس امر کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ درحقیقت اس کی ذمہ داری
ہیسٹنگز پر ہی ہے نہ کہ اُس کے ماتحتوں پر۔

وارن ہیسٹنگز کا دورِ حکومت اور اُس کے کارنامے

۱۷۸۵ء میں ہیسٹنگز کا دورِ حکومت ختم ہوا اور وہ اپنے وطن کو واپس چلا گیا۔ ہیسٹنگز ہندوستان کے
قابل ترین گورنر جنرلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ جس وقت اُس کا تقرر ہوا تھا تو
ملک کی حالت اچھی نہ تھی، کمپنی کی حکومت مستحکم نہ تھی اور چاروں طرف بدنظمی
اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ وارن ہیسٹنگز نے اپنی قابلیت اور کوشش
سے بدنظمی کو بڑی حد تک دور کر دیا اور ملک میں امن و امان قائم کیا۔ اُس کا
سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ جس وقت انگریزوں کو امریکہ کی جنگ آزادی
میں شکست ہوئی اُس وقت اُس نے اُن کی حکومت اور شہرت کی ہندوستان
میں حفاظت کی اور اُس کو تباہی سے بچا لیا۔ یہ معمولی کارنامہ نہ تھا اور اس کے
لئے اُس کے ہموطن جس قدر بھی اُس کی عزت کریں کم ہے۔ لیکن اخلاقی نقطۂ نظر
سے اُس کو بہت سے کام قابل مذمت ہیں۔ ان پر اعتراضات ہوئے اور
ہوتے رہیں گے لیکن اس میں شک نہیں کہ اُس نے یہ سب کام اپنے ذاتی
مفاد کے لئے نہیں کئے بلکہ اپنی قوم کی خاطر کئے۔ اُس کے دوران حکومت
ہی میں اُس کے مخالف پیدا ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اُس کے راستے میں

مشکلیں پیدا کیں لیکن وہ اپنی ہمت، استقلال اور قابلیت سے ان لوگوں کا مقابلہ کرتا رہا اور آخر میں کامیاب ہوا۔ اُس نے بہت سی اصلاحات بھی کیں۔ ہندوؤں کے دھرم شاستر کو ایک جگہ مرتب کرایا اور اس مقصد کے لئے اُس نے فاضل پنڈتوں کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ کلکتہ میں مدرسہ کی بنیاد ڈالی اور مسلمانوں کا بھی مذہبی قانون مرتب کرایا۔

ہیسٹنگز جب انگلستان واپس پہنچا تو اُس پر مقدمہ چلایا گیا۔ اُس کے مخالفوں نے اس مقدمہ کے لئے پوری تیاری کر لی تھی۔ انگلستان کے مشہور مقرر ایڈمنڈ برک نے اُس کی مخالفت میں بڑی پُرجوش تقریریں کیں جو اس وقت بھی کتاب کی شکل میں پڑھی جاسکتی ہیں۔ یہ مقدمہ سات سال تک جاری رہا۔ ہیسٹنگز کی تمام دولت اسی میں صرف ہوگئی اور وہ مفلس ہوگیا۔ آخر میں ہاؤس آف لارڈس نے اُس کو جملہ الزامات سے بری کردیا اور اُس کی پنشن بھی مقرر کردی گئی۔ یہ کہنا کسی صورت سے غلط نہ ہوگا کہ اگر کلائیو ہندوستان میں انگریزی حکومت کا بانی تھا تو ہیسٹنگز نے اُس کی بنیادوں کو مستحکم اور مضبوط بنانے میں بہت کوشش کی اور بڑی حد تک کامیاب ہوا۔

باب ۴۴

لارڈ کارنوالس اور سرجان شور

ولیم پٹ کا انڈیا بل سنہ ۱۷۸۴ء

ہیسٹنگز کے بعد میکفرسن نے جو کلکتہ کونسل کا ایک ممبر تھا لارڈ کارنوالس کے آنے تک گورنر جنرل کے فرائض انجام دیئے۔ سنہ ۱۷۸۶ء میں کارنوالس ہندوستان پہنچ گیا اور سنہ ۱۷۹۳ء تک اُس نے حکومت کی۔ اس زمانہ میں اُس نے میسور کی تیسری لڑائی بھی لڑی اور بہت سی اصلاحات بھی کیں۔

اوپر بتلایا گیا ہے کہ رگیولیٹنگ ایکٹ میں بہت سے نقائص تھے اُن کو دور کرنے کے لئے پہلے مسٹر فاکس نے اور بعد میں مسٹر ولیم پٹ نے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا۔ فاکس کا بل ہاؤس آف لارڈس میں پاس نہیں ہوا اور قانون نہ بن سکا، اُس کی وزارت کو مستعفی ہونا پڑا اور نئے الکشن کے بعد ولیم پٹ وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اُس نے بھی اپنا بل پیش کیا جو قانونی حیثیت حاصل کرنے کے بعد پٹ کا انڈیا ایکٹ ہو گیا۔ نئے ایکٹ کی رو سے کمپنی کے تجارتی اختیارات برقرار رہے لیکن ڈائرکٹروں کے سیاسی اختیارات پارلیمنٹ کے قائم کردہ "بورڈ آف کنٹرول" کی وجہ سے بہت محدود ہو گئے۔ اس بورڈ کا ایک صدر ہوتا تھا جس کے اختیارات رفتہ رفتہ بہت وسیع ہوتے گئے اور

جو ۱۸۵۸ء کے بعد "سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا" (یا وزیر ہند) کہلانے لگا۔ ہندوستان کے معاملات میں کمپنی کی پالیسی کا پورا اختیار "بورڈ آف کنٹرول" کو دیدیا گیا اور ان معاملات میں اُسی کا فیصلہ آخری سمجھا جاتا تھا۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ممبروں کی تعداد بجائے چار کے تین کر دی گئی۔ اب آپس کی مخالفت کا احتمال جاتا رہا کیونکہ گورنر جنرل اپنے مخصوص ذاتی ووٹ کے استعمال سے ضرورت کے وقت اہم مسئلوں کو فیصل کر دیتا تھا اور کام میں رُکاوٹ نہیں ہوتی تھی۔ بمبئی اور مدراس کی حکومتیں گورنر جنرل کی ماتحت کر دی گئیں۔ بمبئی اور مدراس کی کونسلوں کے ممبروں کی تعداد بھی تین کر دی گئی۔ گورنروں کو مخصوص ذاتی ووٹ کا اختیار تو تھا ہی۔ اب ممبروں کی تعداد تین ہو جانے کی وجہ سے یہ فائدہ ہوا کہ دونوں طرف رائیں برابر ہونے کی صورت میں گورنر اپنے خاص ووٹ کے ذریعہ سے فیصلہ اپنے موافق کر سکتا تھا یعنی اگر تین ممبروں میں سے ایک بھی گورنر کے ساتھ ہو تو فیصلہ اُس کی رائے کے موافق ہوگا۔ اس ایکٹ نے دیسی ریاستوں کے ساتھ بیجا لڑائی کو ممنوع قرار دیدیا اور کمپنی نے دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی چھوڑ دی۔ لیکن جیسا کہ تم آگے پڑھوگے یہ طریقہ کار زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا۔

کارنوالس کا بندوبست استمراری

لارڈ کارنوالس کے عہد کا سب سے زبردست کارنامہ اس کی وہ اصلاحات ہیں جو بندوبست کے سلسلہ میں کی گئیں۔

جو مغلوں کے زمانہ سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ گاؤں کی مالگزاری زمین کی پیداوار کے مطابق مقرر کی جاتی تھی۔ مالگزاری زمینداروں کے ذریعہ سے وصول ہوتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ کسان اور حکومت کے درمیان تعلق پیدا کرنے کا بہترین

وسیلہ خیال کئے جاتے تھے۔ یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ زمیندار لوگ زمین کے مالک نہ تھے بلکہ ٹھیکہ دار کی طرح مالگزاری وصول کر کے حکومت کو دیدیتے تھے۔ شروع میں انگریزوں نے بنگال میں یہی دستور رکھا لیکن بعد میں پنچسالہ ٹھیکہ داری کا طریقہ جاری کیا۔ کارنوالس کے عہد میں یہ سوال پیدا ہوا کہ ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے کہ زمیندار رعیت پر زیادہ سختی نہ کریں اور زمین کی حالت بہتر بنانے میں پوری کوشش کریں۔ مسٹر جان شور کی رائے تھی کہ زمینداروں کو ٹھیکہ دس سال کے لیئے دیا جائے لیکن کارنوالس نے اس سے اختلاف کیا اُس کی رائے تھی کہ مالگزاری کی رقم ہمیشہ کے واسطے مقرر کر دی جائے۔ اس سے زمینداروں کو زراعت میں دلچسپی پیدا ہو جائے گی اور گورنمنٹ کا مالیہ بھی بغیر کسی دقت کے وصول ہو سکے گا۔

کارنوالس

زمیندار اور کسان دونوں اپنی زمینوں کو ترقی دینے میں پوری کوشش کریں گے۔ چنانچہ اُس نے بنگال کی مالگزاری کی رقم ہمیشہ کے لئے مقرر کر دی۔ یہ نظام جس کو "بندوبست استمراری" کہتے ہیں بہار اور اُڑیسہ میں بھی جاری کیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ زراعت میں خوب ترقی ہوئی لیکن اُس کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ گورنمنٹ کا مالیہ ہمیشہ کے لئے مقرر ہو گیا۔ زمین کی پیداوار میں ترقی ہوتی رہی لیکن گورنمنٹ کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکا۔

اس بندوبست سے زمیندار کو بہت نفع پہنچا اور حکومت اور کسان کی حالت بدستور رہی۔ زمیندار کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے کسان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہیں خرابیوں کی وجہ سے دوسرے صوبوں میں بندوبست استمراری جاری نہیں کیا گیا۔

اصلاحات

محکمہ مالیات کے علاوہ کارنوالس نے دوسرے محکموں میں بھی متعدد اصلاحات کیں اُس نے مالیہ کا انتظام عدالت دیوانی سے علیحدہ کر دیا۔ ہر ضلع میں جج مقرر کئے۔ کلکتہ، ڈھاکہ، پٹنہ اور مرشدآباد میں چار عدالتیں قائم کیں جو صدر دیوانی عدالت کے ماتحت تھیں۔ فوجداری کے مقدمات طے کرنے کے لئے صوبجاتی عدالتوں کے جج دورے کرتے تھے۔

کارنوالس نے کمپنی کے ملازموں کی تنخواہیں بڑھادیں۔ اُس زمانہ میں یہ لوگ رشوت اور تحفے بہت کثرت سے لیتے تھے اور جیسا کہ تم اوپر پڑھ چکے ہو بڑے بڑے ذمہ دار افسر اس جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔ کارنوالس کا خیال تھا کہ تنخواہیں بڑھادینے کے بعد رشوت ستانی میں بہت کمی ہو جائے گی۔ پولیس کے محکمہ میں بھی اُس نے بہت کچھ تبدیلیاں کیں۔ ہر ضلع میں تھانے قائم کئے اور ہر تھانہ میں ایک داروغہ کا تقرر کیا جو اپنے ماتحتوں سے مدد لیتا تھا۔ غرض یہ کہ کارنوالس نے نظام حکومت میں بہت سی اصلاحیں کر کے اس ملک کے جدید نظام کی ابتدائی شکل پیدا کر دی لیکن کارنوالس کے دور حکومت کی ایک بڑی خرابی یہ تھی کہ بڑی بڑی جگہوں پر صرف انگریزوں کا تقرر کیا جاتا تھا اور ہندوستانی اس کے اہل نہیں سمجھے جاتے تھے۔

میسور کی تیسری لڑائی ۱۷۹۱-۱۷۹۲ء

پٹ کے انڈیا ایکٹ میں صاف طور پر گورنر جنرل کو ہندوستانی

ریاستوں سے لڑنے کی ممانعت کی گئی تھی لیکن واقعات نے کارنوالس کو میسور کے حکمراں ٹیپو سلطان سے لڑنے پر مجبور کیا۔ لڑائی کی اصل وجہ تو یہ تھی کہ انگریز یہ نہیں چاہتے تھے کہ ٹیپو کی طاقت زیادہ بڑھے۔ لیکن فوری سبب یہ ہوا کہ ۱۷۸۹ء میں ٹیپو نے ٹراونکور پر حملہ کیا۔ یہاں کا راجہ کمپنی کا دوست تھا۔ چنانچہ کمپنی کو میسور کے خلاف جنگ کرنے کا بہانہ مل گیا۔ نظام کمپنی اور پیشوا میں ایک معاہدہ ہوا اور گورنر جنرل نے دکن جاکر فوج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ ۱۷۹۱ء میں وہ مغربی گھاٹ سے گذر کر بنگلور پر حملہ آور ہوا اور سلطان ٹیپو کے دارالسلطنت سرنگا پٹم کی طرف روانہ ہوا۔ لیکن رسد کے ختم ہوجانے اور بار برداری کے جانوروں کے ہلاک ہونے کی وجہ سے اس کو اس مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ اس نے بنگلور پر اپنی فوج کو دوبارہ ترتیب دی اور رسد وغیرہ کا انتظام کرکے پھر سرنگا پٹم پر حملہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے کہ اس کا دارالسلطنت فتح ہو ٹیپو سلطان نے صلح کر لی۔ اس کی رو سے سلطان نے اپنی سلطنت کا تقریباً نصف حصہ انگریزوں کو دیا اور تین کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کیا۔ آدھی رقم اسی وقت ادا کردی گئی اور بقیہ کے لئے ضمانت کے طور پر اس نے اپنے دو بیٹوں کو بھیج دیا۔ ٹیپو کے دے ہوئے علاقے میں سے شمالی حصہ مرہٹوں کو ملا جس سے ان کی سلطنت کی سرحد دریائے تنگ بھدرا تک پہنچ گئی۔ میسور کے شمال و مشرق میں جو اضلاع تھے وہ نظام کے ہاتھ آئے۔ کرناٹک کی سرحد اور ساحل مالابار کے اضلاع مثلاً ڈنڈی گل اور بارہ محل انگریزوں کے حصے میں رہے۔ راجہ کرگ اب انگریزوں کے ساتھ ہوگیا۔ بندرگاہوں میں سے صرف منگلور ٹیپو سلطان کے پاس رہ گیا۔ اس لڑائی سے ٹیپو کی سلطنت اور قوت کو بہت بڑا صدمہ پہنچا لیکن اس کی اس شکست نے انگریزوں سے اس کو اور زیادہ متنفر کر دیا

اب وہ دل میں اُن کا اور زیادہ مخالف ہو گیا۔

سر جان شور ۱۷۹۳-۱۷۹۸ء

لارڈ کارنوالس کے بعد سر جان شور جو کونسل کا سینیر ممبر تھا گورنر جنرل مقرر ہوا۔ لارڈ کارنوالس کا خیال تھا کہ کمپنی کے ملازموں میں سے گورنر جنرل کا تقرر نہیں ہونا چاہیئے لیکن اُس نے سر جان شور کی اسقدر تعریف کی تھی کہ اُس کو یہ عہدہ مل گیا۔ سر جان شور کے متعلق اُس کے جانشین یعنی ولزلی کی رائے بہت خراب تھی جس کا اُس نے اظہار بھی کیا ہے۔ بہرحال شور کا خیال تھا کہ پٹ کے انڈیا ایکٹ پر عمل کرنا اُس کا اولین فرض ہے۔ چنانچہ اُس نے عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کیا اور دیسی ریاستوں میں بہت کم دخل دیا۔ لیکن اُس کے اس رویہ سے کمپنی کی حکومت اور نام کو نقصان پہنچا۔

کھاردا کی لڑائی ۱۷۹۵ء

اٹھارہویں صدی کے آخری دور میں مہاداجی سندھیا کی شخصیت خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ اُس نے دہلی کے مغل بادشاہ پر اپنا اثر قائم کر لیا تھا اور اپنی سلطنت اور فوج کو بہت بڑھا لیا تھا۔ سپاہیوں کی جنگی تعلیم کے لئے اُس نے یورپی افسر مقرر کر کے اپنی فوج بہت قوی کر لی تھی۔ ۱۷۹۴ء میں اُس نے وفات پائی اور مرہٹوں کی سرداری نانا فرنویس کو ملی۔ اب اُنہوں نے دکن کی طرف توجہ کی اور نظام سے چوتھ طلب کیا۔ نظام نے انگریزوں سے مدد مانگی کیونکہ اُس عہد نامے کی رو سے جو کارنوالس کے زمانہ میں ہوا تھا اُنہوں نے نظام سے مدد کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن سر جان شور نے عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ مرہٹوں نے کھاردا کے مقام پر نظام کو شکست دی۔ نظام کو اپنے ملک کا بہت سا حصہ اور تین کروڑ روپیہ مرہٹوں کو دینا پڑا۔

سر جان شور کے اس رویہ کا بہت بُرا اثر ہوا۔ دیسی ریاستوں کی نظر میں کمپنی کے وعدے قابل اعتماد نہ رہے اور جیسا کہ تم کو آگے معلوم ہوگا نظام نے بھی اپنی فوج میں فرانسیسی افسروں کا تقرر کیا۔

آصف الدولہ کی وفات اور اُس کے جانشین

سر جان شور کے عہد حکومت کا دوسرا اہم واقعہ آصف الدولہ کی وفات ہے۔ اُس کے بعد وزیر علی خاں اُس کا جانشین مقرر ہوا، لیکن لوگ اُس کے بہت مخالف تھے۔ چنانچہ سر جان شور خود اودھ گیا اور نواب کو تخت سے اُتار کر سعادت علی خاں کو تخت پر بٹھلایا۔ اودھ سے ایک نیا عہد نامہ ہوا جس کی رو سے اودھ کے خراج میں اضافہ ہوگیا اور الہ آباد انگریزوں کو مل گیا۔

باب ۳۴

لارڈ ولزلی

لارڈ ولزلی ۱۷۹۸-۱۸۰۵ء

ولزلی ہندستان کے سب سے بڑے گورنر جنرلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ تقرر کے وقت اُس کی عمر سنتائیس سال کی تھی خوش قسمتی سے جس وقت وہ یہاں آیا تو ملک کی حالت ایسی تھی کہ اُس کو اپنی قابلیت دکھلانے کا پورا موقع ملا۔ عدم مداخلت کی کمزور پالیسی نے کمپنی کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ ولزلی نے صرف اس

نقصان کی تلافی ہی نہیں کی بلکہ اپنی فتوحات اور پالیسی سے انگریزوں کا اقتدار بہت بڑھا دیا۔ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اُس کی موافقت نہیں کی لیکن پھر بھی اُس نے مرہٹوں اور سکھوں کے علاوہ ہندوستان کی تمام دیسی ریاستوں کی خود مختار حکومتوں کا خاتمہ کر دیا۔ کمپنی کے اقتدار اور حکومت میں جسقدر توسیع اُس کے زمانہ میں ہوئی اتنی کسی کے عہد میں نہیں ہوئی تھی اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اُس نے کمپنی کو ہندوستان کی حکومتوں میں سب سے زیادہ قوی بنا دیا۔

لارڈ ولزلی

ولزلی کے کارناموں کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم عدم مداخلت کے نتائج اور ہندوستان کی سیاسی حالت پر ایک اجمالی نظر ڈالیں۔ اسوقت انگریزوں کو سب سے زیادہ خطرہ ٹیپو سلطان کی طرف سے تھا۔ پچھلی لڑائی میں اُس کو شکست ہوئی تھی اور اُس نے صلح بھی کر لی تھی لیکن اُس کی دلی خواہش تھی کہ اپنا کھویا ہوا ملک واپس لے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُس نے حکومت فرانس سے خط وکتابت شروع کر دی تھی۔ گو ہندوستان سے فرانسیسی اثر تقریباً ختم ہو چکا تھا لیکن یورپ کی سیاسیات کا رنگ اسقدر تیزی سے بدل رہا تھا کہ یہ بات ناممکن نہیں معلوم ہوتی تھی کہ فرانسیسی اپنا اثر دوبارہ ہندوستان میں قائم کر لیں۔ فرانس کا مشہور فاتح نیپولین بونا پارٹ اس وقت مصر میں تھا اور یہ خبر مشہور

ہو چکی تھی کہ مشرقی ممالک میں بھی وہ انگریزوں کی حکومت کو تباہ کرنا چاہتا ہے۔ نظام نے بھی اپنا رویہ بدل دیا تھا۔ خاردا کی لڑائی کے موقع پر اُس کو تلخ تجربہ ہوا تھا اُس وقت سے اُس نے بجائے انگریزوں کے فرانسیسیوں کو اپنی فوج میں لینا شروع کردیا تھا۔ ان میں سب سے مشہور جنرل ریمنڈ تھا۔ گویا انگریزوں کا اثر اب سلطنت حیدر آباد سے بھی اُٹھ گیا تھا۔ شمالی ہندوستان میں مرہٹوں کا اقتدار بہت بڑھ گیا تھا۔ مغل شہنشاہ اور اُس کا دار السلطنت بالکل اُن کے قبضے میں تھے۔ نظام اور ٹیپو کی طرح سندھیا اور ہلکر نے بھی اپنی فوجوں میں فرانسیسی افسر مقرر کر لئے تھے۔ ان واقعات سے بہ آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرجان شور کی پالیسی نے انگریزوں کا اقتدار کس حد تک کھو دیا تھا۔ چنانچہ ولزلی کے نزدیک یہ مسئلہ بہت اہم تھا کہ دیسی ریاستوں میں انگریزی اثر پھر قائم ہو جائے اور یہ ریاستیں انگریزوں کے خلاف آپس میں اتحاد نہ کریں۔ ولزلی نے اُن کی نا اتفاقی سے خوب فائدہ اُٹھایا اور عہد معاونت کے ذریعہ سے اُن کو مجبور کیا کہ اپنے خارجی تعلقات کمپنی کی مرضی پر چھوڑ دیں:

عہد معاونت اگرچہ ولزلی "عہد معاونت" کا موجد نہیں لیکن اُس نے اس قسم کے عہد نامے اتنی زیادہ تعداد میں کئے اور اُن سے کمپنی کی سلطنت کو اسقدر فائدہ پہنچا کہ تاریخ ہند میں یہ پالیسی اُسی کے نام کے ساتھ منسوب کی جاتی ہے۔ عام طور پر "عہد معاونت" میں حسب ذیل شرائط ہوتی تھیں۔

۱ ۔۔ دیسی ریاست کے خارجی تعلقات ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت ہو جاتے تھے یعنی وہ ریاست انگریزوں کی مرضی کے خلاف کسی دوسری ریاست سے صلح یا جنگ نہیں کرسکتی تھی۔

۲ - دیسی ریاست کو ایک انگریزی ریزیڈنٹ رکھنا پڑتا تھا۔
۳ - ریاست میں ایک فوج رہتی تھی جس کے افسر وغیرہ انگریز ہوتے تھے لیکن اس فوج کے تمام اخراجات ریاست برداشت کرتی تھی۔
۴ - ریاست انگریزوں کے علاوہ دوسری یورپین قوموں کے افراد کو ملازم نہیں رکھ سکتی تھی۔
۵ - ریاست کے اندرونی انتظامات میں کمپنی کو دخل دینے کا کوئی حق نہ تھا اور ان معاملات میں راجہ یا نواب خود مختار ہوتا تھا۔
۶ - ان تمام شرائط کے بدلے میں کمپنی اس بات کا ذمہ لیتی تھی کہ ریاست کو بیرونی حملوں اور مقامی بغاوتوں کے موقعوں پر مدد دے گی۔

ان شرائط پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عہد معاونت کرنے والی ریاست انگریزوں کی ماتحت ہو جاتی تھی اور اس کی خود مختاری کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ انگریزوں کو سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ان کی فوج کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا اور خرچ میں زیادتی نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ فوج جو دیسی ریاست میں رکھی جاتی تھی درحقیقت انگریزی ہی فوج ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ ریاستوں میں سے فرانسیسی اثر جاتا رہا اور انگریزوں کا اثر دوبارہ قائم ہو گیا۔ لیکن ریاست کے حق میں عہد معاونت نقصان دہ ثابت ہوا۔ یہی نہیں کہ فوج پر راجہ یا نواب کا کوئی اثر باقی نہیں رہا۔ بلکہ اب یہ لوگ اسقدر مطمئن اور محفوظ ہو گئے کہ ان کے حوصلے پست ہو گئے کیونکہ ریاست کو دشمنوں سے بچانے کی ذمہ داری بجائے ان کے انگریزوں پر آ گئی۔ عہد معاونت نے اس سے بھی زیادہ نقصان ریاستوں کے باشندوں کو پہنچایا۔ ہندوستان میں نااہل فرماں رواؤں کے ظلم وستم سے بچنے کے لئے رعایا کے ہاتھ میں ایک زبردست ذریعہ تھا۔ یعنی

بغاوت اور قتل۔ اب یہ ذریعہ تقریباً ختم ہو گیا۔ انگریزی فوجوں کے مقابلہ میں
یہ تدبیر آسانی سے کارگر نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی بنا پر بعض لوگوں نے
اس پالیسی کی سب سے بڑی خرابی یہ بتلائی ہے کہ اس کے ذریعہ سے انگریزی
حکومت ایک ظالم اور نااہل حکمراں کا ساتھ دیتی تھی اور بیکس رعایا کی
مصیبتوں کا خیال نہ کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ریاستوں کے اندرونی معاملات
میں عدم مداخلت کی پالیسی زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکی اور آخرکار حکومت
ہند کو اپنا رویہ بدلنا پڑا۔ بہرحال ولزلی کے سامنے جو مسئلہ پیش تھا اُس کا تعلق
زیادہ تر ریاستوں کے خارجی تعلقات سے ہی تھا۔ چنانچہ اُس نے اُسی پر زور دیا
اور اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ سب سے پہلے نظام نے عہد معاونت پر دستخط کئے اور
تمام فرانسیسی افسروں کو اپنی ملازمت سے علیحدہ کر دیا۔ اس کے بعد بعض
دوسری ریاستوں نے بھی یہ شرائط مان لیں۔ لیکن ٹیپو سلطان اور مرہٹوں
سے ولزلی کو لڑنا ہی پڑا۔

میسور کی آخری لڑائی ١٧٩٩ء

ولزلی کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ انگریزوں کا
سب سے خطرناک دشمن ٹیپو سلطان ہے۔ اُس
نے پچھلی لڑائی میں شکست کھائی تھی لیکن اُس
کے بعد اپنی قوت بڑھانے میں بہت کوشش کی اور عرب، قسطنطنیہ اور کابل
وغیرہ آدمی بھیجے۔ فرانس سے بھی اُس کو کچھ مدد ملنے کی امید تھی۔ جس وقت ولزلی
ہندوستان پہنچا تو اُس کو معلوم ہوا کہ اُسی وقت کچھ فرانسیسی سپاہی بھی میسور
کے علاقے میں اترے ہیں۔ اُس نے بہت جلد طے کر لیا کہ میسور سے لڑنا ضروری
ہے۔ لیکن کمپنی کی فوجیں جنگ کے لئے تیار نہ تھیں۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے
لڑائی ملتوی کرنا پڑی۔ وہ چاہتا تھا کہ ١٧٩٠ء کی طرح مرہٹوں اور نظام کو

اپنے ساتھ ملالے۔ مرہٹے اس پر تیار نہیں ہوئے لیکن نظام نے ستمبر ۱۷۹۸ء میں اُس نے "عہد معاونت" کر لیا۔ اب ولزلی نے سلطان میسور کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مدراس اور بمبئی سے انگریزی فوجیں سرنگا پٹم کی طرف روانہ ہوئیں۔ لڑائی میں ٹیپو کو شکست ہوئی۔ انگریزوں نے سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ ٹیپو کو کچھ شرائط صلح پیش کی گئیں لیکن اُس نے اُن کو قبول نہ کیا۔ آخر کار اُس کو شکست ہوئی اور ایک بہادر سپاہی کی طرح وہ لڑائی ہی میں مارا گیا۔ ریاست میسور اب بالکل ولزلی کے قبضہ میں تھی۔ اس نے طے کیا کہ ٹیپو کے خاندان کو ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اُس کی سلطنت کے کچھ اضلاع کمپنی نے لئے اور کچھ اضلاع نظام کو دے گئے اور باقی ماندہ ریاست اُس ہندو خاندان کو دیدی گئی جس کو ہٹا کر حیدر علی نے گدی حاصل کی تھی۔ نئے راجہ کو انگریزوں سے "عہد معاونت" کرنا پڑا۔ ٹیپو کا سب سے بڑا کارنامہ یہی تھا کہ اُس نے انگریزوں کی حکومت کو تسلیم نہیں کیا اور اپنی حکومت اور آزادی کی خاطر جان دے دی۔

تنجور۔ سورت۔ کرناٹک اور اودھ میسور کی لڑائی کے بعد ولزلی نے چند ریاستیں بغیر لڑے ہوئے کمپنی کے قبضہ میں کر لیں۔ تنجور کے راجہ سے اُس نے ایک عہد نامہ کیا جس کی رو سے راجہ نے اپنی ریاست کمپنی کو دیدی اور اُس کے بدلے میں سالانہ پنشن قبول کر لی۔ اسی طرح سورت کے نواب کی پنشن مقرر کر کے اُس کی ریاست بھی کمپنی کی سلطنت میں شامل کر لی گئی۔ ارکاٹ بھی اسی طریقہ سے لے لیا گیا۔ ۱۸۰۱ء میں نواب ارکاٹ کی وفات پر ٹیپو سلطان اور نواب کے کچھ خطوط ولزلی کو ملے۔ اُس نے اُن سے یہ نتیجہ نکالا کہ نواب انگریزوں کے دشمن یعنی ٹیپو سے ملا ہوا تھا۔ ان خطوط سے یقینی طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا لیکن ولزلی کے لئے یہ بہانہ کافی تھا۔

چنانچہ اس نے کرناٹک پر قبضہ کر لیا اور نواب کو ریاست کی آمدنی کا پانچواں حصہ بطور پنشن اور نواب کا خطاب دیدیا گیا۔

اسی زمانہ میں ولزلی نے اودھ کے ساتھ ایک نیا عہد نامہ کیا۔ اودھ کے تعلقات کمپنی سے اچھے تھے اور نواب اودھ نے انگریزوں کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا تھا لیکن ولزلی نے بہانہ تلاش کر لیا۔ نواب کو یہ سمجھایا گیا کہ اودھ کی شمالی مغربی سرحد پر بیرونی حملوں کا خطرہ ہے اس لئے اس کو چاہیئے کہ اپنی دیسی فوج کم کر کے انگریزی فوج میں کچھ اضافہ کرے۔ نواب نے اس میں کچھ پس وپیش کیا۔ اور پرانے عہدناموں کا حوالہ دیا۔ لیکن یہ مطالبہ برابر جاری رہا۔ تنگ آکر نواب نے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ وہ تخت سے دست بردار ہونا چاہتا ہے۔ ولزلی نے اس تجویز کو فوراً منظور کر لیا۔ لیکن نواب کی اس شرط کو نہیں مانا کہ اس کے بعد اس کا بیٹا گدی پر بیٹھے اور جب اس پر نواب نے اپنی تجویز واپس لے لی تو گورنر جنرل اس سے سخت ناراض ہو گیا اور اس کو ایک نئے عہد نامہ پر دستخط کرنے کے لئے مجبور کیا جس کی رو سے نواب نے روہیلکھنڈ اور گنگا و جمنا کے درمیان کے شمالی اضلاع انگریزوں کو دیدئے۔ یہ کل علاقہ تقریباً اودھ کی ریاست کا نصف تھا۔ تم کو یاد ہوگا کہ نواب اودھ نے روہیلکھنڈ کا علاقہ انگریزوں کی مدد سے لیا تھا اور انگریزوں کو اس کے صلہ میں ایک کثیر رقم ادا کی تھی۔ اب اس علاقہ پر بھی اپنا قبضہ کر لیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ نواب اودھ کی سلطنت کا انتظام نہایت خراب تھا اور کمپنی کی حکومت سے رعایا کو بہت کافی فائدہ ہوا اور اس میں بھی شک نہیں کہ کمپنی کے لئے بھی یہ علاقہ بہت مفید اور اچھا تھا۔

مرہٹوں کی دوسری لڑائی ۱۸۰۳-۱۸۰۵ء

۱۸۰۰ء میں مرہٹوں کے مشہور وزیر نانا فرنویس کا انتقال ہو گیا۔

اس پر مرہٹہ سرداروں میں جھگڑے شروع ہو گئے اور ۱۸۰۲ء میں ہلکر نے سندھیا اور پیشوا کی متحدہ فوجوں کو پونا کے قریب شکست دی۔ باجی راؤ بھاگ کر بسین پہنچا اور وہاں اُس مشہور عہد نامے پر دستخط کر دئے جس کی رو سے اُس کو انگریزوں کی اطاعت قبول کرنی پڑی اور جو تاریخ ہند کے مشہور ترین عہد ناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس عہد نامہ نے مرہٹوں کی آزادی اور قوت کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ انگریزوں کی ایک فوج پیشوا کو پونا لے گئی اور اُس کو دوبارہ گدی پر بٹھلایا۔ سندھیا اور بھونسلا کو پیشوا کی یہ حرکت بُری معلوم ہوئی اور وہ جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ ولزلی نے بھی جنگ کی تیاری نہایت بڑے پیمانہ پر کی۔ اُس کی فوج کے دو حصے تھے۔ جنوبی فوج گورنر جنرل کے بھائی آرتھر ولزلی کے ماتحت تھی اور شمالی فوج لارڈ لیک کے۔ اگست ۱۸۰۳ء میں آرتھر ولزلی نے احمد نگر پر قبضہ کیا۔ اور اگلے مہینے میں سندھیا اور بھونسلا کی متحدہ فوجوں کو اسّی کے مقام پر شکست فاش دی۔ مرہٹوں کو دوسری شکست ارگاؤں کے مقام پر ہوئی۔ گوال گڈھ پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ شمالی ہند میں لارڈ لیک نے علی گڑھ۔ دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا اور لاسواری کے میدان میں سندھیا کو زبردست شکست دی۔ بھڑوچ۔ بندیلکھنڈ اور اُڈیسہ بھی فتح ہو گئے۔ اب سندھیا اور بھونسلا نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ اُن کو ملک کا بہت حصہ دیا اور اُن کی دوسری شرائط بھی مان لیں۔ گایکواڑ بڑودہ نے بغیر جنگ کے انگریزوں سے عہد نامہ کر لیا۔ پیشوا اور نظام کو بھی ملک کا کچھ حصہ دیا گیا۔

اُس کے بعد ہلکر سے بھی جنگ ہوئی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ہلکر نے ریاست جے پور پر لوٹنے کی غرض سے حملہ کیا۔ اس پر انگریزوں کو اُس سے اعلانِ جنگ

کرنا پڑا۔ اُس کی فوج کو ڈیگ کے مقام پر شکست ہوئی۔ اگرچہ شکست بہت زبردست تھی لیکن ہلکر پھر بھی مقابلہ پر جما رہا۔ لارڈ لیک نے بھرت پور کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کیا۔ لیکن اُس کو قلعہ فتح کرنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ یہ واقعہ بہت اہم ہے اس لئے کہ ہندوستان کے لوگوں کے دل میں یہ خیال ہو گیا کہ بھرت پور کا مضبوط قلعہ کمپنی کی فوج بھی فتح نہیں کر سکتی۔ قلعہ مٹی کا بنا ہوا تھا اور انگریزی توپوں کا اُس پر بالکل اثر نہیں ہوا۔ لیک نے اس قلعہ پر چار حملے کیے اور ہر دفعہ وہ پسپا ہوا۔ ان حملوں میں تین ہزار سے زیادہ آدمی زخمی ہوئے اور مارے گئے۔ لڑائی کے شروع میں بھی کرنل مانسن کی فوج کو ناکامی ہوئی تھی اور راجپوتانہ سے اُس کو واپس ہونا پڑا تھا۔ ان شکستوں کا اثر ولزلی کے حق میں اچھا نہ ہوا۔ اُس کو واپس بلا لیا گیا اور لارڈ کارنوالس دوبارہ گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آیا۔

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے ولزلی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا اور اُس کی خدمات کی قدر نہ کی۔ اس سلسلہ میں ہم کو یہ بات مدنظر رکھنا چاہیئے کہ ولزلی کی لڑائیوں نے کمپنی کو سخت مالی نقصان پہنچایا تھا اور کمپنی کا قرضہ اُس کے عہد میں بہت بڑھ گیا تھا۔ ولزلی کا برتاؤ بھی ڈائرکٹروں کی طرف کچھ زیادہ اچھا نہ تھا۔ انگلستان میں عام طور پر لوگوں کا خیال تھا کہ ہندوستان میں کمپنی کی سلطنت اب اس قدر وسیع ہو گئی ہے کہ اس پر حکومت کرنا مشکل ہے اور اب اس میں اضافہ کی گنجائش نہیں لیکن یہ اعتراضات بڑی حد تک غلط تھے۔ ولزلی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان میں کمپنی کے لئے سب سے بہتر پالیسی یہی ہے کہ دیسی ریاستوں میں اثر قائم کرے اور اس ملک کی سب سے بڑی طاقت بن جائے۔ اُس کی رائے صحیح ثابت ہوئی اور جس قدر

زمانہ گذرتا گیا اس رائے کی صحت ظاہر ہوتی گئی۔ اُس کے جانے کے چند ہی سال بعد لارڈ ہیسٹنگز نے اس مقصد کو پورا کیا اور مرہٹوں کو شکست دے کر کمپنی کا سکہ تمام ہندوستان پر بٹھا دیا۔ صرف پنجاب کمپنی کے تحت میں نہ تھا لیکن وہاں کا راجہ رنجیت سنگھ کمپنی کا وفادار دوست تھا۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ولزلی نے انگریزی سلطنت کی بنیاد قائم کرنے میں بہت شاندار حصہ لیا۔

لارڈ کارنوالس ۱۸۰۵ء

لارڈ کارنوالس دوبارہ گورنر جنرل مقرر ہو کر ہندوستان آیا تو اُس کی عمر بہت زیادہ ہو چکی تھی لیکن اس کی صلح پسندی کی وجہ سے ڈائرکٹروں نے اسی کا انتخاب کیا۔ اُن کا خیال تھا بلکہ اُن کو اُمید تھی کہ کارنوالس اُن تمام خرابیوں کو دور کر دے گا جو ولزلی کے زمانے میں پیدا ہو گئی ہیں۔ چنانچہ یہاں آکر اُس نے یہی طے کیا کہ عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی جائے لیکن تین ماہ کے اندر ہی اُس کا انتقال ہو گیا۔

باب ۴۴

سر جارج بارلو ۱۸۰۵-۱۸۰۷ء لارڈ منٹو ۱۸۰۷-۱۸۱۲ء

سر جارج بارلو اور عدم مداخلت

سر جارج بارلو کلکتہ کونسل کا ممبر تھا۔ اس نے اپنے عہد میں ڈائرکٹروں کی ہدایت

پر عمل کیا اور عدم مداخلت کی پالیسی پر کاربند رہا۔ سندھیا کو گوہد اور گوالیار کے قلعے واپس کردئے گئے اور یہ طے ہوگیا کہ دریائے چمبل کے شمال میں سندھیا کو اور اُس کے جنوب میں کمپنی کو دخل اندازی کا کوئی حق نہ ہوگا۔ اسی طرح ہلکر کو بھی اُس کا تمام علاقہ واپس دے دیا گیا اگرچہ وہ اس بات پر تیار تھا کہ ٹونک۔ رامپور اور چند دیگر اضلاع کمپنی کو دیدے۔ اس کے علاوہ وہ معاہدے جن کی رو سے کمپنی نے راجپوت ریاستوں کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا منسوخ کر دئے گئے ان میں جے پور کی ریاست بھی شامل تھی۔ سر جارج بارلو کا خیال تھا کہ کمپنی کو اپنی سلطنت کے علاوہ کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہلکر اور سندھیا نے راجپوتانہ کی ریاستوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

اس گورنر جنرل کے عہد کا دوسرا واقعہ ویلور کی بغاوت ہے۔ اس بغاوت کا سبب یہ تھا کہ کچھ نئے فوجی قوانین ایسے جاری کئے گئے تھے جن سے خیال ہوتا تھا کہ ہندوستانی سپاہیوں کے مذہب میں گورنمنٹ دخل اندازی کرنا چاہتی ہے۔ مثلاً ایک نئے طرز کی پگڑی استعمال کرنے اور مونچھوں کو خاص طریقہ پر کتروانے کا حکم ہوا اور پریڈ کے وقت تلک لگانے کی ممانعت کردی گئی۔ اس پر ہندو سپاہیوں کو شک ہوا کہ اُن کو عیسائی بنایا جا رہا ہے۔ اُنہوں نے بغاوت کی اور اپنے انگریز افسروں کو قتل کر دیا۔ ٹیپو سلطان کے لڑکے وہاں رہتے تھے اُن پر شبہ ہوا کہ بغاوت اُنہوں نے کرائی ہے چنانچہ اُن کو کلکتہ بھیج دیا گیا اور ولیم بنٹنک کو جو مدراس کا گورنر تھا واپس بلالیا گیا۔

لارڈ منٹو ۱۸۰۷-۱۸۱۳ء ۱۸۰۷ء میں لارڈ منٹو جو بورڈ آف کنٹرول کا صدر تھا گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا۔ اُس نے وارن ہیسٹنگز کے مقدمہ میں اُس کے خلاف کام کیا تھا اس لئے

خیال تھا کہ وہ عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کرے گا۔ وہ چاہتا بھی تھا کہ اس پہ عمل کرے لیکن یہاں کے حالات اس قسم کے تھے کہ کمپنی کا گورنر جنرل بالکل خاموش نہیں رہ سکتا تھا چنانچہ منٹو کو بھی بندیلکھنڈ اور برآر میں لڑنا پڑا۔ یہ علاقہ مرہٹوں سے انگریزوں کو ملا تھا لیکن وہاں کے زمیندار اور سردار نہایت سرکش اور مغرور تھے اور اُن کے پاس مضبوط قلعے اور لڑنے والے کافی تعداد میں تھے۔ منٹو نے اُن کے خلاف ایک فوج بھیجی اور کالنجر اور اجے گڑھ کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اس کے علاوہ روہیلوں کے سردار امیر خاں کو راجہ بھونسلا کے ملک سے نکال کر باہر کر دیا۔ اس طرح منٹو کو ملک میں امن قائم کرنے کے لئے لڑنا پڑا۔

معاہدہ امرتسر ۱۸۰۹ء

اس زمانہ میں ہندوستان کے اندرونی جھگڑوں کے علاوہ حکومت برطانیہ کے لئے فرانس کی طرف سے بھی خطرہ تھا۔ بعض مدبروں کا خیال تھا کہ نپولین اور زارِ روس خشکی کے راستے سے ہندوستان پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ اس خطرہ کا سدِ باب کرنے کے لئے منٹو نے کوشش کی کہ ایران، افغانستان، سندھ اور پنجاب کی حکومتوں سے معاہدے کئے جائیں۔ چنانچہ اس غرض کے لئے ان ملکوں کو سفیر روانہ کئے گئے۔

پنجاب میں اس وقت رنجیت سنگھ حکومت کر رہا تھا۔ اُس سے پہلے سکھوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں لیکن رنجیت سنگھ نے اپنی قابلیت سے اُن میں سے بہت سی فتح کر کے اپنے قبضہ میں کر لیں اور ۱۷۹۹ء میں لاہور کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اُس کی خواہش تھی کہ دریائے ستلج اور جمنا کے درمیان جو ریاستیں واقع تھیں اُن کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کر لے لیکن انگریز

کہتے تھے کہ یہ ریاستیں سندھیا کے ماتحت تھیں اور اُس کی شکست کے بعد اب کمپنی کے ماتحت ہیں۔ کمپنی کی طرف سے رنجیت سنگھ کے دربار میں ٹیکاف کو بھیجا گیا۔ اُس نے بہت دقت کے بعد اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کی اور اپریل ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ نے صلحنامہ کر لیا۔ اس مختصر صلحنامہ کی رو سے طے ہو گیا کہ رنجیت سنگھ کو ستلج اور جمنا کے درمیان کی ریاستوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور انگریز اُس کی سلطنت میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کرینگے۔ اب یہ ریاستیں کمپنی کی حفاظت میں آگئیں۔ اپنی زندگی میں رنجیت سنگھ نے اس صلحنامہ کی شرائط پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں سے اس کے تعلقات بہت اچھے رہے۔

ایران - افغانستان اور سندھ کو سفیروں کی روانگی

ایران سے معاہدہ کرنے کے لیے سر جان ملکم کو بھیجا گیا۔ وہ پہلے بھی ولزلی کے عہد میں ایران جا چکا تھا۔ اسی زمانہ میں حکومت برطانیہ نے اپنا سفیر علیحدہ بھیجدیا جس کی وجہ سے ملکم کے راستے میں بہت رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ آخر کار کمپنی کی گورنمنٹ نے اُسی معاہدہ کو مان لیا جو برطانوی سفیر نے حکومت ایران سے کیا تھا۔ شاہ ایران نے وعدہ کیا کہ وہ کسی ایسی فوج کو اپنے ملک میں سے نہیں گزرنے دے گا جو ہندوستان پر حملہ کرنا چاہے گی اور انگریز اس کے بدلے میں ایران کو یورپ کی قوموں کے خلاف امداد دیں گے۔ اگر ان میں سے کوئی ایران پر حملہ آور ہوگی۔ مسٹر الفنسٹن کو اسی مقصد کے لیے افغانستان روانہ کیا گیا لیکن افغانوں نے شاہ شجاع کو تخت سے اُتار کر ملک سے نکال دیا تھا۔ الفنسٹن اس سے پشاور میں ملا لیکن اُس کو اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ شاہ شجاع ہندوستان میں

انگریزوں کا وظیفہ خوار ہو کر رہنے لگا اور تیس سال بعد افغانستان کی پہلی لڑائی کے دوران میں مارا گیا۔ سندھ کے امیروں سے بھی باہمی امداد اور دوستی کا عہد نامہ ہو گیا۔ آگے چل کر تم پڑھو گے کہ انگریزوں نے افغانستان کی لڑائی کے موقع پر سندھ کے عہد نامہ کی خلاف ورزی کی۔

جاوا اور جزائر الہند پر حملہ یورپ میں نپولین نے بہت سے ممالک کو فتح کر لیا تھا اور ان ممالک کے بحری مقبوضات پر انگریز قبضہ کرتے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بوربان، ماریشس اور کیپ آف گڈ ہوپ پر بھی قبضہ کر لیا۔ ۱۸۱۱ء میں منٹو نے جاوا پر زبردست حملہ کیا۔ گورنر جنرل خود بھی جاوا گیا۔ نپولین نے مقابلہ کے لئے ایک فوج روانہ کی جس کو شکست ہوئی اور جاوا پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن نپولین کی شکست کے بعد ڈچ لوگوں کو اُن کے فتح کئے ہوئے علاقے واپس کر دئے گئے۔ صرف کیپ آف گڈ ہوپ انگریزوں کے پاس رہ گیا۔

لارڈ منٹو کو ان خدمات کے صلے میں خطاب عطا ہوا اور ۱۸۱۳ء میں وہ انگلستان واپس چلا گیا وہاں پہنچ کر اُس کا جلد ہی انتقال ہو گیا۔

باب ۴۵

لارڈ ہیسٹنگز ۱۸۱۳-۱۸۲۳ء۔ لارڈ امہرسٹ ۱۸۲۳-۱۸۲۸ء

۱۸۱۳ء کا چارٹر ۱۸۱۴ء میں کمپنی کے چارٹر کی میعاد ختم ہونے والی تھی۔ چند سال پہلے ہی سے لوگوں کو اس مسئلہ سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔ پارلیمنٹ کے سامنے دو سوال پیش تھے پہلا سوال یہ تھا کہ آیا کمپنی کے مقبوضات حکومت برطانیہ اپنے ہاتھ میں لے یا نہیں اور دوسرا سوال یہ تھا کہ آیا کمپنی کو تجارت کا اجارہ پھر ملنا چاہئے یا نہیں۔ اس اصول سے تو اب لوگوں کو اتفاق نہیں تھا کہ مشرق کی ساری تجارت جس میں اس قدر نفع ہوتا تھا صرف کمپنی ہی کے ہاتھ میں رہے اور دوسرے لوگ اس سے قطعی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کوئی نہیں چاہتا تھا کہ کمپنی کی ہستی کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ بہر حال بہت بحث مباحثہ کے بعد پارلیمنٹ نے کمپنی کا نیا چارٹر ایکٹ وضع کیا۔ اس کی رو سے ہندوستان کی تجارت عام کر دی گئی لیکن کمپنی کو چین سے تجارت کرنے کا اجارہ اور اپنے مقبوضات پر حکومت کرنے کا اختیار بیس سال کے لئے اور دیا گیا۔ اس چارٹر کی ایک نئی خصوصیت یہ تھی کہ دس ہزار پاؤنڈ کی رقم سالانہ تعلیمی اغراض کے لئے منظور کی گئی۔ ابتدا میں کچھ عرصہ تک اس رقم کا کچھ زیادہ معقول استعمال نہ ہو سکا لیکن بعد میں گورنمنٹ نے ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کی کوشش شروع کر دی۔

لارڈ ہیسٹنگز

لارڈ ہیسٹنگز کی عمر اس وقت تقریباً ساٹھ سال کی تھی۔ اُس کو لڑائی کا ذاتی تجربہ تھا کیونکہ وہ خود سپاہی رہ چکا تھا لیکن ہندوستان میں وہ ولزلی کی پالیسی کے خلاف تھا۔ اُس کی رائے میں عدم مداخلت کی پالیسی زیادہ مناسب تھی مگر جب وہ خود یہاں آیا اور سیاسی حالات سے اُس کو واقفیت ہوگئی تو اُس کی رائے بدل گئی۔ یہاں تک کہ وہ کام جو ولزلی کے زمانہ میں نامکمل رہ گیا تھا اُس کے زمانہ میں تکمیل کو پہنچا۔ مرہٹوں کی قوت کو اُس نے تقریباً ختم کردیا۔ پنڈاریوں کے ظلم سے اس ملک کے باشندوں کو نجات دلائی اور کمپنی کے مقبوضات میں اس قدر اضافہ کیا کہ اُس کا نام سلطنت انگریزی کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

جنگ نیپال ۱۸۱۴-۱۸۱۶ء

نیپال کا پہاڑی ملک بنگال اور اودھ کی شمالی سرحد پر واقع تھا۔ اُس کی لمبائی تقریباً سات سومیل اور چوڑائی کم وبیش سوا سومیل تھی۔ اٹھارویں صدی میں گورکھا قوم نے اس ملک کی حکومت پر قبضہ کرلیا تھا۔ اُن کی جنوبی سرحد کمپنی سے ملتی تھی اسی پر دونوں میں جھگڑا ہوا۔ گورکھوں نے کچھ حصہ کمپنی کے ملک کا دبالیا تھا۔ انگریزوں نے اُس کی واپسی کے لیئے کہا۔ گورکھوں نے انکار کردیا اور لڑائی چھڑ گئی۔ کمپنی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی چنانچہ گورنر جنرل نے نواب اودھ سے ایک کثیر رقم لڑائی کے خرچ کے لیئے لی۔ اگرچہ انگریزوں کی فوج

۳۴ ہزار تھی اور گورکھوں کی صرف بارہ ہزار لیکن ابتدا میں انگریزوں کو ناکامیابی ہوئی۔ نیپال پہاڑی ملک ہے وہاں کے باشندے بہت مضبوط اور جفاکش ہوتے ہیں۔ انگریزوں کی چار فوجیں مختلف راستوں سے نیپال میں داخل ہوئیں لیکن ان میں سے ایک فوج کے علاوہ جس کا کمانڈر جنرل اکڑلونی تھا سب کو شکست ہوئی۔ اکڑلونی نے گورکھوں کے سردار امر سنگھ کو گھیر لیا اور حکومت نیپال کو مجبور کیا کہ صلح کرے۔ چنانچہ مارچ ۱۸۱۶ء میں سگولی کا صلحنامہ ہوا۔ نیپال کے راجہ نے ترائی کا علاقہ کمائوں اور گڑھوال انگریزوں کو دیدیئے اور اپنے پایۂ تخت کاٹھمانڈو میں ایک انگریزی ریزیڈنٹ رکھنا قبول کرلیا۔ اب کمپنی کی سلطنت کوہ ہمالیہ تک پہنچ گئی اور اُن پہاڑوں پر اُن کا قبضہ ہوگیا جہاں اب شملہ اور نینی تال جیسے خوبصورت شہر آباد ہیں۔

پنڈاریوں کا خاتمہ

پنڈاری ابتدا میں مرہٹہ فوجوں کے ساتھ جاتے تھے لیکن رفتہ رفتہ اُنہوں نے اپنی جماعت اور قوت اتنی بڑھا لی تھی کہ ان کو مرہٹوں کی امداد کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ سب سے پہلے تاریخ میں اُن کا ذکر اورنگ زیب اور شیواجی کی لڑائیوں کے سلسلہ میں ملتا ہے۔ اُنیسویں صدی کے شروع میں سندھیا نے مالوہ میں اُن کو کچھ علاقہ دیدیا تھا۔ ولزلی کے بعد انگریزوں اور مرہٹوں میں صلح ہوئی تھی۔ چنانچہ پنڈاریوں کو لوٹ مار کا خوب موقع ملا اور وسط ہندوستان میں اُنہوں نے ایک قیامت برپا کردی۔ اس وقت پنڈاریوں کے تین مشہور سردار تھے۔ واصل محمد، چیتو اور کریم خاں۔ جب وہ کسی علاقے پر حملہ آور ہوتے تو ایک ہزار سے لے کر چار ہزار تک کا گروہ بناتے تھے۔ وہ نقل و حرکت میں اس قدر تیز تھے کہ "لوٹ مار کا بیان ہی اُن کے آنے کی پہلی خبر دیتا تھا" اُن کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ وہ اپنے ساتھ ساز و سامان

لے کر نہیں چلتے تھے۔ اُن کے پاس نہ خیمے ہوتے تھے اور نہ بستر۔ اُن کے گھوڑے بھی ایسے ہی تیز رفتار اور جفاکش تھے جیسے وہ خود تھے۔ چنانچہ وہ بہت تیزی کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچ سکتے تھے۔ راستے میں اناج وغیرہ لوٹ کر وہ اپنے لئے رسد بہم پہنچاتے تھے۔ جو اشیاء وہ آسانی سے لیجا سکتے تھے وہ لیجاتے تھے اور باقی چیزیں تباہ اور برباد کر دیتے تھے۔ جن لوگوں پر وہ یورش کرتے اُن کو طرح طرح کی تکلیفیں دے کر مار ڈالتے تھے یا اُن کو اپنے گھوڑوں کی مالش کرنے رسد پہنچانے اور بھاری قسم کا اسباب ڈھونے پر مجبور کرتے تھے۔ اکثر گاؤں کو وہ جلا کر خاک کر دیتے تھے۔ پنڈاریوں کو اپنی ان حرکات میں سب سے زیادہ مدد کمپنی کی عدم مداخلت کی پالیسی سے ملی۔ ولزلی کے بعد انگریزوں نے چند سال تک دوسری ریاستوں کے معاملات میں قطعی دخل نہیں دیا۔ پنڈاریوں نے ان ریاستوں میں خوب لوٹ مار کی اور اپنی تعداد اور قوت بہت بڑھالی۔

کچھ عرصہ کے بعد پنڈاریوں نے کمپنی کے ملک پر بھی چھاپے مارنے شروع کر دئے۔ اب یہ ممکن نہ تھا کہ اُن کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ گورنر جنرل کو یقین تھا کہ غالباً پنڈاریوں کی سرکوبی کے سلسلہ میں اُس کو مرہٹوں سے لڑنا پڑے گا جس پیمانہ پر اس نے انتظامات کئے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرہٹوں سے بھی لڑائی کے لئے تیار تھا۔ اس مقصد کے لئے جو فوج مہیا کی گئی اُس کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تھی اور اس وقت تک کمپنی نے کسی جنگ کے لئے اتنی کثیر فوج جمع نہیں کی تھی۔ ہیسٹنگز نے راجپوت ریاستوں اور سندھیا کو بھی مجبور کیا کہ وہ انگریزوں کی مدد کریں۔ سندھیا نے گوالیار کے عہدنامے میں امداد کا وعدہ کیا اور مدد بھی دی۔ فوج کا ایک حصہ شمالی ہندوستان سے گورنر جنرل کے ساتھ روانہ ہوا اور دوسرا حصہ جس کا سردار سر ٹامس ہسلپ تھا دکن سے چلا۔ پنڈاری چاروں

طرف سے گھر گئے۔ ان میں بہت سے مارے گئے اور گرفتار ہوئے۔ واصل محمد نے خودکشی کر لی۔ چیتو جنگل کی طرف بھاگ گیا جہاں اُس کو چیتے نے کھا لیا۔ کریم خاں نے اطاعت قبول کر لی۔ اور اُس کو جاگیر دیدی گئی۔ امیر خاں کو ٹونک کا نواب بنا دیا گیا۔ جیسا کہ خیال تھا پنڈاریوں کی لڑائی ختم ہونے سے پہلے مرہٹوں کی لڑائی شروع ہوگئی۔ اُس وقت معلوم ہوا کہ ہیسٹنگز کی تیاریاں بالکل بجا اور ضروری تھیں اور پنڈاریوں کا خاتمہ کرکے ہیسٹنگز نے ایک ایسا کام کیا جس سے ملک کے بڑے حصّہ میں امن و امان قائم ہوگیا۔

مرہٹوں کی تیسری لڑائی ۱۸۱۷-۱۸۱۸ء

باجی راؤ نالائق ترین پیشواؤں میں سے تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے انگریزوں کا اثر پونا میں نہ رہے اور اس مقصد کے لئے جنگ کی تیاریاں اور دوسرے مرہٹہ سرداروں سے خط و کتابت کر رہا تھا۔ الفنسٹن نے جو اس وقت پونا میں ریزیڈنٹ تھا بہت قابلیت اور دلیری سے کام لیا اور جون ۱۸۱۷ء میں پیشوا کو مجبور کرکے ایک نئے عہد نامے پر دستخط کروا لئے۔ اس کی رو سے باجی راؤ نے انگریزوں کو کچھ ملک کا حصّہ دینے کے علاوہ مرہٹوں کی سرداری یعنی پیشوائی چھوڑ دی اور اپنے دارالسلطنت میں انگریزی فوج کا ایک دستہ رکھنا بھی منظور کر لیا۔ اس سے ایک سال قبل ناگپور کے بھونسلا راجہ نے بھی انگریزوں سے "عہد معاونت" کر لیا تھا۔ لیکن ان عہد ناموں سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوا اور نومبر ۱۸۱۷ء میں جبکہ سندھیا بھی ایک نیا صلحنامہ کر رہا تھا باجی راؤ نے جنگ کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے کرکی کی ریزیڈنسی پر حملہ کیا لیکن شکست کھائی اور بھاگ گیا۔ کچھ دنوں تک وہ ادھر اُدھر مارا مارا پھرا اور آخر کار کورے گاؤں اور اشٹی کے مقامات پر

نگریزوں سے پھر لڑا۔ ان دونوں لڑائیوں میں بھی اُس کو شکست ہوئی۔ اب اُس کے پاس اطاعت کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس کو تخت سے اُتار دیا گیا اور آٹھ لاکھ روپیہ سالانہ پینشن پر کانپور کے قریب بٹھور میں رہنے کی اجازت دیدی گئی۔ کرکی کی لڑائی سے تین ہفتہ بعد ناگپور کے راجہ سے بھی جنگ چھڑ گئی اور سیتابلدی میں ایک مختصر انگریزی فوج نے مرہٹوں کی کہیں زیادہ بڑی فوج کو شکست دی۔ ریاست ناگپور کا کچھ حصہ انگریزوں نے اپنے قبضے میں لے لیا اور بقیہ ریاست بھونسلا راجہ کے ایک پوتے کو دیدی گئی۔ اندور میں بھی اسی طرح کے فسادات اُٹھے اور مہید پور کے مقام پر ہلکر کی فوج کو شکست ہوئی۔ جنوری ۱۸۱۸ء میں اندور سے ایک نیا صلحنامہ ہوا جس کی رو سے دریائے نربدا کے جنوب میں جس قدر ملک ہلکر کے پاس تھا وہ انگریزوں کو مل گیا اور حکومت اندور نے انگریزی فوج اور ریزیڈنٹ رکھنا قبول کر لیا۔ سندھیا نے انگریزوں کو اجمیر اور گائکواڑ نے احمد آباد کا علاقہ دیدیا۔ اس طرح ہیسٹنگز نے مرہٹوں کی قوت کا خاتمہ کر دیا اور اب یہ ریاستیں بھی قطعی طور پر کمپنی کے تابع ہو گئیں۔ پنجاب کے علاوہ اب اس ملک میں کوئی بڑی خودمختار سلطنت باقی نہ رہی۔

اس جنگ کے بعد ہیسٹنگز نے جو انتظامات کیے اُن میں خاص طور پر اس بات کا لحاظ رکھا کہ مرہٹہ سرداروں کی سلطنتیں آپس میں ایک دوسرے سے مل نہ سکیں۔ یہ امر غور کرنے کے قابل ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد ہندوستان میں مرہٹے ایک مستقل اور بڑی سلطنت کیوں قائم نہ کر سکے اور انگریزوں کے مقابلہ میں آخر کار اُن کو کیوں شکست ہوئی۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مرہٹوں نے کبھی اس طرف توجہ نہ کی کہ اُن کی رعایا خوشحالی اور

فارغ البالی کی زندگی بسر کرے۔ اُن کے نزدیک دوسری سلطنتوں کو فتح کرنا اور وہاں لوٹ مار کرنا اپنی سلطنت کی اصلاحات کے مقابلہ میں زیادہ اہم تھا۔ اُن کی فوجوں میں مختلف قوموں اور مذہبوں کے لوگ بھرتی ہوتے تھے اور اُن کی لڑائیوں کا مقصد اکثر و بیشتر ذاتی مفاد ہی ہوتا تھا اُن کے سردار آپس میں اتفاق نہیں کر سکتے تھے اور اُن کی ناکامیابی کا سب سے بڑا سبب اُن کی نااتفاقی ہی تھی۔ مرہٹوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں ملک کی تہذیب اور تمدن کو ترقی دینے میں کوئی نمایاں حصّہ نہیں لیا اُن کی کامیابی کا انحصار فوجی قوت پر تھا اور جب ان کا مقابلہ ایک ایسی قوم سے ہوا جو فوجی طاقت میں اُن سے کمزور نہ تھی تو اُن کو شکست ہوئی اور اُن کی خود مختار حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

انتظامی اصلاحات

ہیسٹنگز کے کارناموں کی تفصیل ان لڑائیوں پر ہی نہیں ختم ہو جاتی۔ اُس نے بہت سی اصلاحات بھی کیں جو قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ اُس کی شہرت کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ اُس نے مرہٹوں کی قوت کو ختم کر دیا مفتوحہ علاقے کا انتظام الفنسٹن کے سپرد کیا گیا اور اُس نے اس فرض کو نہایت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ اسی طرح منرو نے مدراس میں رعیت واری بندوبست قائم کیا عدالتی کارروائی کو مختصر اور آسان بنا دیا گیا۔ ہندوستانی مجسٹریٹوں کی تعداد زیادہ ہوگئی اور انگریزی کلکٹروں کو فوجداری کے اختیارات عطا کر دئے گئے۔ ہیسٹنگز کو تعلیمی معاملات سے بہت دلچسپی تھی۔ کلکتہ میں اس زمانہ میں ایک کالج اور قرب و جوار میں ورناکیولر اسکول قائم کئے گئے۔

لارڈ ایمہرسٹ۔ برما کی پہلی لڑائی سنہ ۱۸۲۴-۱۸۲۶ء

لارڈ ایمہرسٹ کے عہد حکومت سنہ ۱۸۲۳-۱۸۲۸ء کا مشہور واقعہ برما کی پہلی لڑائی ہے۔ برما کے موجودہ شاہی خاندان کی بنیاد الومپرا نے سنہ ۱۷۵۲ء

میں ڈالی تھی۔ برما کے راجاؤں نے کافی ملک فتح کر لیا تھا اور اب وہ چاہتے تھے کہ اُن کی سلطنت خلیج بنگال تک پہنچ جائے۔ ۱۸۱۷ء میں برما کی فوجوں نے آسام پر حملہ کیا اور ایک سال بعد وہاں کے راجہ نے حکومت ہند کو خط لکھا کہ ڈھاکہ۔ مرشد آباد وغیرہ درحقیقت اُن کے ہیں۔ ہیسٹنگز اس وقت پنڈاریوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ برما کی فوجوں کی کامیابی نے اُن کا دماغ خراب کر دیا تھا۔ وہ لوگ بہت مغرور ہو گئے تھے اور سمجھتے تھے کہ کمپنی کا مقابلہ آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۸۲۳ء میں برما کی فوج نے انگریزی علاقہ پر حملہ کر دیا۔ راجہ نے اپنے سپہ سالار مہابندولہ کو حکم دیا کہ انگریزوں کو بنگال سے نکال کر اُن کے گورنر جنرل کو گرفتار کر لے اور بیڑیاں پہنا کر اُس کے سامنے لائے۔ گورنر جنرل نے تین فوجیں برما کے خلاف روانہ کیں۔ ایک برہمپتر کے راستہ سے آسام میں داخل ہوئی۔ دوسری خشکی کے راستہ سے اراکان کی طرف بھیجی گئی اور تیسری رنگون پر حملہ آور ہوئی۔ برما والوں کا غرور کچھ کام نہ آیا وہ رنگون کو خالی کر کے شمال کی طرف روانہ ہو گئے۔ انگریزی فوج نے شہر کو تباہ کر دیا۔ برما کا سپہ سالار مہابندولہ مارا گیا۔ اُس کے مرتے ہی فوج کا شیرازہ بکھر گیا اور وہ بھاگ نکلی۔ انگریزی فوج کا ایک حصہ برما کے دارالسلطنت آوا کے قریب پہنچ گیا۔ ۱۸۲۶ء میں یندابو کا صلحنامہ ہوا جس کی رو سے برما کی حکومت نے آسام۔ اراکان اور تناسرم کے علاقے اور ایک کروڑ روپیہ بطور تاوانِ جنگ انگریزوں کو دئے اور برطانوی ریزیڈنٹ اپنے ملک میں رکھنا منظور کر لیا۔ اس لڑائی میں کمپنی کو زبردست مالی نقصان ہوا لیکن اُس علاقے کے رہنے والے جو کمپنی کو ملا، حکومت برما کے مظالم سے محفوظ ہو گئے اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

بھرت پور کی فتح ۱۸۲۶ء

اس دور کا دوسرا واقعہ بھرت پور کی فتح ہے۔ تم کو یاد ہوگا کہ لارڈ لیک نے اس قلعہ کو فتح کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کو کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ۱۸۲۵ء میں راجہ بھرت پور کا انتقال ہو گیا۔ اس کے نابالغ لڑکے کو اس کے ایک رشتہ دار نے گدی سے اتار دیا اور خود راجہ بن بیٹھا۔ انگریزی حکومت نے اس غاصب کے مقابلہ میں نابالغ راجہ کا ساتھ دیا۔ لارڈ کومبرمیر نے بھرت پور کے مضبوط قلعے کا محاصرہ کیا اور ایک بڑی سرنگ کھدوا کر اس کو فتح کر لیا۔ اس کامیابی سے انگریزوں کی فوجی طاقت کا سکہ سارے ہندوستان پر جما دیا۔

باب ۴۶

لارڈ ولیم بینٹنک اور اس کی اصلاحات

بینٹنک ۱۸۲۸-۱۸۳۵ء

ولیم بینٹنک کو مدراس کی گورنری سے علیحدہ ہونا پڑا تھا کیونکہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ ویلور کی بغاوت کو وہ کامیابی کے ساتھ فرو نہیں کر سکا۔ لیکن اس نے بحیثیت گورنر جنرل کے اس ملک میں ایسی مفید اصلاحیں کیں کہ اس کا نام ہندوستان کے ممتاز گورنر جنرلوں میں شمار ہونے لگا۔ درحقیقت اس کا عہد ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کی پہلی منزل ہے۔ اس سے پہلے کمپنی اور دیسی ریاستوں کے درمیان لڑائی کا سلسلہ ایک عرصۂ دراز

تک جاری رہا اور اُس کے بعد
بھی غدر تک لڑائیاں ہوتی رہیں۔
ان دو سلسلوں کے بیچ میں یہ چند
سال صلح اور امن کے تھے۔ اس
زمانہ میں بینٹنک نے بہت سی اصلاحا
جاری کیں۔ انگلستان میں بھی اس
وقت اخلاقی، مذہبی اور سیاسی
اصلاحات ہو رہی تھیں۔ ان کا اثر
ایک حد تک ہندوستان پر بھی ہوا
جس کا ثبوت ہم کو اس گورنر جنرل کے
کارناموں میں صاف نظر آتا ہے۔

مالی اور قانونی اصلاحات

سب سے پہلے بینٹنک کو گورنمنٹ کی مالی حالت درست کرنی تھی۔ اُس نے اس کام کو ایسی خوبی سے انجام دیا کہ چند سال کے اندر ہی کمپنی کے اخراجات میں زبردست کمی ہوگئی۔ نئے قواعد کے مطابق اُن فوجی ملازموں کو جو کلکتہ سے چار سو میل کے اندر رہتے تھے صرف آدھا بھتہ ملنے لگا۔ اس سے بہت کافی بچت ہوئی۔ لیکن گورنر جنرل کے بہت لوگ مخالف ہو گئے۔ دوسری اصلاح اس سلسلہ میں یہ کی گئی کہ افیون کی کاشت پر لائیسنس لگا دیا گیا اس نے حکم دیدیا کہ سوائے بمبئی کے کسی اور بندرگاہ سے افیون باہر نہ بھیجی جائے۔ اب افیون کی تجارت کا سارا نفع کمپنی ہی کو پہنچنے لگا اور سندھ کے امیروں کی آمدنی میں بہت کمی ہوگئی۔

بینٹنک نے لارڈ کارنوالس کی صوبجاتی عدالتوں کو توڑ دیا۔ کارنوالس کے زمانہ سے جج سال میں دو مرتبہ دورہ کر کے مقدمات فیصل کرتے تھے۔ اب وہ ہر ماہ بجانے لگے۔ اب تک ہندوستانی بہت چھوٹی چھوٹی جگہوں پہ مقرر کئے جاتے تھے لیکن اب ہندوستانی ججوں کے اختیارات اور تنخواہوں میں اضافہ کر دیا گیا اور ایک مفید اصلاح یہ بھی کی گئی کہ عدالتی زبان فارسی کی بجائے اُردو کر دی گئی۔ اُس کے عہد کا ایک اور مشہور کارنامہ یہ تھا کہ صوبہ شمالی ومغربی (یعنی صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ) کا بندوبست رابرٹ برڈ نے دس سال کی محنت کے بعد پورا کیا۔ یہ بندوبست تیس سال کے لئے کیا گیا تھا۔

رسم ستی

بینٹنک کی وہ اصلاح جس نے لاتعداد عورتوں کو آگ کی نذر ہونے سے بچایا رسم ستی کا انسداد تھا۔ یہ رسم قدیم زمانے سے اس ملک میں جاری تھی اور ہندو اس کو اپنے مذہب کا ایک رکن سمجھنے لگے تھے۔ شوہر کے مرنے پر اس کی بیوہ کو زندہ جلا دیا جاتا تھا اور متعدد مثالیں ایسی موجود ہیں جن میں کسی بڑے آدمی کی وفات پر کئی کئی عورتیں جلائی گئیں۔ مسلمانوں کے عہد میں اس امر کی کوشش کی گئی کہ ان مظلوم عورتوں کو اس ظلم وستم سے بچایا جائے لیکن اس سے زیادہ کامیابی نہ ہوئی کیونکہ جلانے سے پہلے عورت سے اقرار لیا جاتا تھا کہ وہ بخوشی جلنے کو تیار ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں وہ اپنی صحیح رائے آزادی کے ساتھ نہیں دے سکتی تھی۔ اس طرح اس بُری رسم کا رواج برابر بڑھتا ہی گیا اور ہزاروں عورتیں اس ملک میں ہر سال آگ کی نذر ہوتی رہیں۔ بینٹنک سے پہلے بھی کمپنی کی خواہش تھی کہ اس رسم کو بند کر دیا جائے لیکن حکومت کی ہمت نہیں پڑی کہ ایک ایسی رسم کو ناجائز قرار دیا جائے جس کو ہندو لوگ اپنے مذہب کا ایک رکن خیال

کرتے تھے۔ لارڈ بینٹنک نے اس اہم ذمہ داری کو اپنے اوپر لیا اور ۱۸۲۹ء میں ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے ستی جرم قرار دیدی گئی۔ اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ بینٹنک نے ہندو قوم پر بہت بڑا احسان کیا کہ اُن کی عورتوں کو ایسی وحشیانہ رسم کا نشانہ بننے سے بچایا۔

ٹھگی بینٹنک کی دوسری اصلاح یہ تھی کہ اُس نے ٹھگوں کی خوفناک جماعت سے ہندوستان کے رہنے والوں کا پیچھا چھڑایا۔ ٹھگوں کا ذکر ہم کو ہندوستان کی تاریخ میں سلاطین دہلی کے عہد میں ملتا ہے۔ مغلوں کے زمانہ میں بھی ان کا ذکر آتا ہے۔ لیکن اس وقت تک اُن کو مکمل طور پر تباہ نہیں کیا گیا تھا اور انگریزوں کے ابتدائی زمانہ میں ان کے گروہ نے کافی ترقی کرلی تھی۔ یہ لوگ کالی کی پوجا کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ انسان کی قربانی سے وہ اس کو خوش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ بھیس بدل کر وہ جنگلوں میں گھومتے تھے اور موقع پاکر مسافروں کو مار ڈالتے اور اُن کا مال و اسباب چھین لیتے تھے۔ بینٹنک نے کرنل سلیمن کی مدد سے اس گروہ کی بیخ کنی کی اور مسافروں کے جان و مال کو محفوظ کیا۔ راجپوتوں میں ایک وحشیانہ رسم دختر کشی کی تھی وہ بھی اسی زمانہ میں بند کی گئی۔

بینٹنک کے ان کارناموں کی ہر شخص کو تعریف کرنی پڑتی ہے اور ان ہی کی وجہ سے اس کی شہرت بہت زیادہ بڑھ گئی باوجودیکہ دوسرے گورنر جنرلوں کی طرح اُس نے کمپنی کے لئے نئی فتوحات نہیں کیں۔ اس کی کامیابی امن و صلح کی کامیابی تھی نہ کہ جنگ و جدل کی۔

انگریزی تعلیم ۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ کی رو سے کمپنی کو اجازت تھی کہ ایک لاکھ روپیہ کی رقم ہندوستانیوں کی تعلیم پر خرچ

کرے۔ اب کمپنی کو ہندوستانیوں کی تعلیم سے دلچسپی بھی پیدا ہوگئی تھی اور اُس کی ضرورت بھی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ اب حکومت کا انتظام بغیر ہندوستانیوں کو شریک کیے ہوئے نہیں چل سکتا تھا۔ لیکن سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ آیا اس ملک میں انگریزی تعلیم اور مغربی علم و ادب کو رواج دیا جائے یا صرف مشرقی علوم وفنون کو ترقی دینے میں کوشش کی جائے۔ گورنر جنرل کی کونسل میں اس مسئلہ پر بہت بحث ہوئی اور میکالے نے جو نئے چارٹر ایکٹ کے تحت میں کونسل کا ممبر قانون مقرر ہو کر آیا تھا بہت پُرجوش تقریروں میں مشرقی علوم کی مخالفت کی۔ آخر کار گورنر جنرل نے اُس کی رائے مان لی اور یہ طے کر دیا کہ ہندوستانیوں کو مغربی سائنس اور علوم سکھلائے جائیں اور ان کی تعلیم بھی انگریزی زبان میں ہو۔ تاریخ ہند کے دورِ جدید میں یہ اصلاح ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تنلو سال کے اندر اس پالیسی کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس اصلاح سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کو مغربی ادب وسائنس سے واقفیت ہو گئی اور مغربی قوموں کی طرح اُن میں بھی قومیت اور آزادی کے جذبات پیدا ہوگئے لیکن ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہندوستانی طلبا کے دماغوں کو ایک غیر ضروری اور بیجا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے۔ جب وہ کسی علم کو غیر ملکی زبان کے ذریعہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو مجبوراً طوطے کی طرح حفظ کرتے ہیں اس طریقہ سے اُن کی دماغی قوت ایک حد تک بیکار صرف ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار ایسی خوبی اور آسانی کے ساتھ نہیں کر سکتے جیسے کہ اپنی مادری زبان میں کرتے۔ ایک اور زبردست نقصان اس اصلاح سے ہوا کہ ہماری اپنی زبان نہایت کس مپرسی کی حالت میں رہی۔

اس اصلاح کے بعد گورنر جنرل نے عدالتوں کی زبان فارسی کی بجائے انگریزی کردی اور کچھ کارروائی اُردو میں ہونے لگی اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں نے انگریزی میں مہارت حاصل کرنے کی پوری کوشش کی اور اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

بینٹنک اور دیسی ریاستیں

بینٹنک عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کرنا چاہتا تھا لیکن پھر بھی بعض ریاستوں کے معاملات میں اُس کو دخل دینا ہی پڑا۔ میسور کا راجہ کرشن راج بہت ظالم اور بے رحم تھا۔ اس کی ریاست نا اہل لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ آخر کار رعایا بغاوت پر آمادہ ہوگئی اور ۱۸۳۱ء میں گورنر جنرل نے ایک فوج روانہ کی جس نے میسور میں امن و امان قائم کردیا۔ مہاراجہ کو گدی پر سے اُتار دیا گیا اور کمپنی نے اُس کا وظیفہ مقرر کرکے ریاست کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پچاس سال تک یہ انتظام کمپنی کے پاس رہا اور لارڈ رپن کے عہد میں ریاست پھر اُسی خاندان کے ایک راجکمار کو واپس دے دی گئی۔

میسور کی طرح کُرگ میں بھی رعایا اپنے راجہ کے ظلم سے تنگ آگئی تھی۔ گورنر جنرل نے ایک چھوٹی سی فوج روانہ کی۔ اُس نے وہاں امن قائم کردیا اور راجہ کو گدی سے اُتار دیا اور کُرگ کی ریاست رعایا کی استدعا پر انگریزی حکومت میں شامل کرلی گئی۔ بھوپال۔ گوالیار اور جے پور میں بھی جھگڑے ہوئے لیکن بینٹنک نے زیادہ مداخلت نہیں کی اور اپنے اُصول پر کاربند رہا۔

۱۸۳۱ء میں بینٹنک اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے درمیان معاہدہ دوستی ہوا اور ۱۸۳۵ء میں ولیم بینٹنک انگلستان واپس چلا گیا۔

۱۸۳۳ء کا چارٹر ایکٹ

۱۸۱۳ء کے چارٹر یا اجازت نامے کی

میعاد ختم ہونے والی تھی۔ چنانچہ اُس کی تجدید کی گئی اور نئے چارٹر کی رُو سے کمپنی کے قیام کی مدت بیس سال کے لئے پھر بڑھادی گئی۔ لیکن اب اُس سے چین کی تجارت کا ٹھیکہ بھی چھین لیا گیا اور ہر شخص کو ہندوستان و چین سے تجارت کرنے کا اختیار مل گیا۔ کمپنی کو یہ بھی حکم ملا کہ چالیس سال کے اندر تجارتی کاروبار کو ختم کرکے ہمہ تن ملکی معاملات میں مصروف ہو جائے۔ گورنر جنرل بنگال اب گورنر جنرل ہند کے خطاب سے موسوم ہونے لگا۔ اُس کی کونسل کے اختیارات میں یہ اضافہ ہوگیا کہ بجائے "ریگولیشنز" کے وہ "ایکٹس" پاس کرنے لگی۔ کونسل میں ایک نیا ممبر بڑھادیا گیا۔ یہ ممبر قانون کہلاتا تھا۔ اور میکالے سب سے پہلا ممبر قانون مقرر ہوکر آیا۔ اس ایکٹ کی رو سے آگرہ میں چوتھی پریزیڈنسی قائم کی گئی۔ لیکن بعد میں بجائے پریزیڈنسی کے اُس کو صوبہ شمالی و مغربی بنادیا گیا۔ ایک اہم تبدیلی اس چارٹر نے یہ کی کہ اس کے ذریعہ سے گورنمنٹ نے اس اصول کو مان لیا کہ آئندہ کوئی ہندوستانی اپنے مذہب۔ وطن۔ نسل یا رنگ کی وجہ سے سرکاری ملازمت یا عہدے سے محروم نہ رکھا جائے گا اور گورنر جنرل کو یہ بھی حکم ہوا کہ رسم غلامی کو اس ملک سے جلد از جلد دور کرے۔

سر چارلس مٹکاف ۱۸۳۵-۱۸۳۶ء

مٹکاف کمپنی کے قابل ترین ملازموں میں سے تھا۔ وہ حال ہی میں آگرہ پریزیڈنسی کا گورنر مقرر ہوا تھا۔ بینٹنک کے جاتے پر اس کو عارضی طور سے گورنر جنرل کے عہدہ پر مقرر کردیا گیا۔ وہ شاید مستقل بھی ہو جاتا لیکن ہندوستانی پریس کو آزادی دینے کی وجہ سے اُس پر اعتماد نہ رہا۔ ہندوستانی پریس پر ولزلی کے زمانے سے بہت سی قیود لگادی گئی تھیں۔ مٹکاف نے

ان سب کو اُڑا دیا اور اخبارات آزادی کے ساتھ چھپنے لگے۔ اس سے ملک میں بیداری پیدا ہو گئی لیکن مٹکاف کو اس نیک اصلاح کا یہ صلہ ملا کہ اُس کو مستقل گورنر جنرلی ہی سے محروم نہیں کیا گیا بلکہ مدراس کا گورنر بھی نہیں بنایا گیا۔ چنانچہ مجبور ہو کر اس نے استعفار دیدیا اور چلا گیا۔

باب ۴۷

افغانستان کی پہلی لڑائی اور سندھ کا الحاق

لارڈ آک لینڈ ۱۸۳۶-۱۸۴۲ء۔ لارڈ النبرا ۱۸۴۲-۱۸۴۴ء

لارڈ آک لینڈ لارڈ آک لینڈ کے عہد کا سب سے اہم واقعہ افغانستان کی لڑائی ہے۔ لارڈ آک لینڈ ایک تجربہ کار حکمراں تھا۔ لیکن بعض اوقات اپنی ضد سے کام خراب کر دیتا تھا۔ تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ یورپین قوموں میں انگریزوں کے سب سے بڑے دشمن فرانسیسی تھے اور یہی وجہ تھی کہ لارڈ منٹو نے ایران۔ افغانستان اور پنجاب کو مشن روانہ کئے تھے۔ ۱۸۱۵ء میں نپولین کی شکست کے بعد فرانس کی طرف سے تو کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا۔ مگر اب اس سے بھی زیادہ خطرہ روس کی طرف سے تھا اور لوگوں کا خیال تھا کہ روس اپنی بڑھتی ہوئی قوت کے ذریعہ سے شمالی مغربی حدوں سے

گزر کر ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ یہی خطرہ تھا جس کی وجہ سے آک لینڈ کے زمانہ میں انگریزوں اور افغانوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ کمپنی کو اس جنگ میں بہت زبردست نقصان اُٹھانا پڑا۔

جنگ افغانستان کے اسباب

اب کمپنی کی سلطنت دریائے ستلج و سندھ تک پہنچ گئی تھی اور اول الذکر دریا انگریزوں اور سکھوں کے درمیان حدِ فاصل تھا۔ سکھوں سے تو انگریزوں نے معاہدہ کے ذریعہ سے دوستانہ تعلقات قائم کر لئے تھے۔ لیکن سکھوں کے بعد افغانستان کی سلطنت تھی اور حکومت ہند کے لئے یہ ضروری تھا کہ حکومت افغانستان سے بھی دوستی پیدا کرے کیونکہ تاریخ سے ظاہر ہے کہ ہندوستان پر اس طرف سے حملہ کرنے والے انہیں پہاڑی دروں میں ہو کر گذرے ہیں۔ اس وقت افغانستان کی حکومت دوست محمد بارک زئی کے ہاتھ میں تھی اس نے شاہ شجاع درانی کو تخت سے اُتار کر افغانستان سے باہر نکال دیا تھا۔ شاہ شجاع بھاگ کر ہندوستان آ گیا۔ اور یہاں کچھ عرصہ تک سکھوں کے پاس رہا اور اب انگریزی حکومت کی طرف سے اُس کو لدھیانہ میں رہنے کی اجازت مل گئی تھی۔

دوست محمد چاہتا تھا کہ انگریزوں سے معاہدہ کر کے دوستی قائم کرے۔ اس دوستی کے لئے اُس نے یہ شرط لگائی تھی کہ انگریز پشاور پر اُس کو قبضہ دلوا دیں۔ آک لینڈ اس کے لئے کسی حالت میں تیار نہ تھا لیکن پھر بھی اُس نے کیپٹن برنس کو کابل بھیجا۔ اُسی زمانہ میں روسیوں کا ایجنٹ بھی افغانستان آیا۔ دوست محمد یقینی انگریزوں سے معاہدہ کرنے کا زیادہ خواہاں تھا لیکن گورنر جنرل کا رویہ اُس کی طرف ایسا تھا کہ معاہدہ نہ ہو سکا۔

آک لینڈ چاہتا تھا کہ دوست محمد روسیوں سے کسی قسم کا معاہدہ نہ کرے۔

لیکن اس پر راضی نہ تھا کہ روسیوں کے خلاف اُس کی مدد کرے۔ چنانچہ امیر افغانستان نے روسی سفیر کی طرف توجہ کی۔ آک لینڈ نے اس کے جواب میں وہ کارروائی کی جس کی وجہ سے اُس کو افغانستان سے لڑنا پڑا۔ اُس نے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع سے ۱۸۳۸ء میں ایک معاہدہ کیا اور یہ طے کر لیا کہ سکھوں کی مدد سے شاہ شجاع کو افغانستان کے تخت پر بٹھائے تاکہ حکومت کابل بالکل اُس کے قبضے میں رہے۔ اس میں شک نہیں کہ لارڈ آک لینڈ کی یہ پالیسی بالکل غلط تھی۔ روسیوں کے لئے یہ کوئی آسان کام نہ تھا کہ افغانستان و پنجاب کی وسیع سلطنتوں سے گذر کر ہندوستان پر حملہ کریں۔ دوسری غلطی یہ تھی کہ شاہ شجاع کو بادشاہ بنانے کا ارادہ کیا۔ افغانوں نے اُس کو اپنے ملک سے نکال دیا تھا۔ اُس نے دو مرتبہ تخت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ اب وہاں کے لوگ اس کو پسند نہیں کرتے تھے۔ پھر وہ یہ کیسے برداشت کر لیتے کہ انگریز اُن کے ملک کو فتح کر کے شاہ شجاع کو بادشاہ بنائیں۔ لارڈ آک لینڈ نے ان معاملات پر غور نہ کیا۔ اپنی ضد پر اڑا رہا اور لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

جنگ افغانستان کا پہلا دور

انگریزی فوج فیروزپور کی چھاؤنی سے روانہ ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے اُس فوج کو اپنی سلطنت میں سے گذرنے کی اجازت نہیں دی۔ چنانچہ تمام فوج سندھ میں ہو کر بولن درّے میں سے گذری۔ امیران سندھ سے جو معاہدے ہوئے تھے اُن کی رو سے یہ فوج سندھ میں بھی داخل نہیں ہو سکتی تھی لیکن گورنر جنرل نے ان معاہدوں کا خیال نہیں کیا اور انگریزی فوجیں اسی راستے سے گئیں۔ شاہ شجاع بھی فوج کے ساتھ تھا۔ میکناٹن اُس کا مشیر کار مقرر ہوا اور سر الکزنڈر برنس اُس کا نائب تھا۔ راستے میں بہت سی

مشکلات پیش آئیں لیکن اپریل ۱۸۳۹ء میں قندھار پر اس فوج کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد غزنی فتح ہوا اور اگست میں شاہ شجاع اور انگریزی فوجیں کابل میں داخل ہو گئیں۔ دوست محمد مقابلہ نہ کر سکا اور شمال کی طرف بھاگ گیا۔ اس کامیابی پر گورنر جنرل اور فوج کے افسروں کو خطابات اور انعامات عطا ہوئے لیکن بہت جلد یہ بات ظاہر ہو گئی کہ شاہ شجاع کی حکومت اس کے ملک میں زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ اب حکومت ہند کے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ کیا تدبیر کی جائے۔ اگر فوج کو واپس بلایا جاتا ہے تو شاہ شجاع کی حکومت بہت جلد ختم ہو جائے گی اور اگر فوج وہیں قیام کرتی ہے تو خرچ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ ملک کی حالت اس قدر خطرناک تھی کہ باوجود اس کے کہ ۱۸۴۰ء میں دوست محمد نے اطاعت قبول کر لی اور وہ کلکتہ بھیج دیا گیا لیکن پھر بھی فوجیں واپس نہ کی گئیں۔ اس موقع پر سب سے بہتر طریقہ کار یہ ہوتا کہ مع شاہ شجاع کے انگریز واپس آ جاتے۔ یہ نہیں کیا گیا بلکہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ فوجیں وہیں قیام کریں اور خرچ کم کر دیا جائے۔ رفتہ رفتہ ملک میں بغاوتیں ہونے لگیں۔ اس وقت افغانوں کا سردار دوست محمد خاں کا لڑکا اکبر خاں تھا۔ اسی زمانہ میں افغانوں نے برنس اور میکناٹن کو قتل کر دیا۔ آخر کار گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ انگریزی فوج ہندوستان واپس جائے۔ چنانچہ سولہ ہزار سپاہی اور لشکری جنوری کے مہینہ میں کابل سے جلال آباد کی طرف روانہ ہوئے۔ راستہ میں برف اور گولہ باری برابر جاری رہی اور ایک ہفتہ کے بعد اس پوری فوج میں سے صرف ایک شخص ڈاکٹر برائیڈن جلال آباد زندہ پہنچا۔ یہ بھی نیم مردہ تھا۔ شاہ شجاع بھی قتل کر دیا گیا تھا۔ انگریزی فوجوں پر ہندوستان میں اس سے زیادہ بڑی مصیبت کبھی نہیں پڑی تھی۔ لارڈ آک لینڈ پر جس قدر صدمہ اس شکست

اور بدنامی سے ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ جنرل سیل کو جلال آباد سے پشاور بلا لیا جائے۔ لیکن بعد میں جنرل پالک کو پشاور بھیجا گیا کہ وہ جلال آباد پہنچکر سیل کی مدد کرے۔ لیکن اُس سے پہلے کہ پالک پشاور سے روانہ ہوا، لارڈ آک لینڈ ہندوستان سے واپس چلا گیا۔

جنگ افغانستان کا دوسرا دور

۱۸۴۲ء میں لارڈ آک لینڈ کی جگہ لارڈ النبرا گورنر جنرل ہو کر آیا۔ اُس نے آتے ہی انگریزوں کی کھوئی ہوئی شہرت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اسوقت رابرٹ سیل جلال آباد میں محصور تھا اور جنرل ناٹ قندھار میں تھا۔ گورنر جنرل نے جنرل پالک کی سرکردگی میں خیبر کے راستے سے ایک فوج روانہ کی۔ اُس نے ستمبر ۱۸۴۲ء میں کابل فتح کیا اور وہاں کا بازار جسمیں میکناٹن کی لاش عام لوگوں کو دکھلائی گئی تھی توپوں سے اُڑا دیا گیا۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ افغانستان سے فوجیں واپس بلائی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جنرل ناٹ واپسی پر سلطان محمود کے مقبرے سے وہ کواڑ اپنے ساتھ لایا جن کے متعلق خیال تھا کہ سومنات سے سلطان غزنی لے گیا تھا۔ گورنر جنرل نے اپنے اعلان میں ان کواڑوں کا ذکر بہت فخر کے ساتھ کیا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ درحقیقت یہ کواڑ سومنات کے نہیں بلکہ وہیں کے تیار شدہ تھے۔ بہرحال اب دوست محمد کو کابل واپس جانے کی اجازت مل گئی اور انگریزوں نے افغانستان کو اُس کے قبضہ میں چھوڑ دیا۔

پہلے اس لڑائی سے کمپنی کی شہرت اور اقتدار کو بہت بڑا صدمہ پہنچا۔ اسوقت تک کمپنی کی فوجوں نے ایسی ناکامیابی کا منہ کسی جنگ میں نہیں دیکھا تھا اور نہ کبھی اُن کو اتنا نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ باوجود اس نقصان عظیم اور صرف کثیر کے

انگریزوں کو اپنے مقصد میں کسی حد تک بھی کامیابی نہیں ہوئی اور آخر کار دوست محمد ہی کو امیر کابل تسلیم کرنا پڑا۔

سندھ کا الحاق ۱۸۴۳ء

سندھ پر تالپور خاندان کے بلوچی سردار حکومت کرتے تھے۔ کمپنی اور امیران سندھ کے درمیان کئی عہدنامے ہو چکے تھے جن کی رو سے کمپنی کو دریائے سندھ کے راستے سے تجارت کرنے کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ اُس زمانہ میں دریائے سندھ کی اہمیت بہت زیادہ تھی کیونکہ شمالی مغربی ہندوستان کی تجارت کے لئے سب سے بہتر راستہ یہی تھا۔ جنگ افغانستان کے موقع پر لارڈ آک لینڈ نے ان معاہدوں کی خلاف ورزی کی اور اپنی فوجیں سندھ کے راستے سے روانہ کیں۔ مگر امیران سندھ نے پھر بھی کمپنی کی مخالفت نہیں کی۔ لیکن النبرا نے اس کا کچھ خیال نہیں کیا اور یہ طے کر لیا کہ سندھ کو انگریزی سلطنت میں شامل کیا جائے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُس نے سر چارلس نیپیر کو بہت وسیع اختیارات دیکر سندھ کو روانہ کیا۔ چارلس نیپیر نے امیران سندھ کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ وہ لڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس جنگ میں صرف دو لڑائیاں میانی اور دابو کے مقامات پر ہوئیں۔ جن میں امیروں کو شکست ہوئی۔ سندھ کا تمام علاقہ سلطنت انگریزی میں شامل کر لیا گیا باسوائے ریاست خیرپور جس کے امیر نے انگریزوں کی مخالفت نہیں کی تھی۔ سندھ پر جس طریقہ سے قبضہ کیا گیا وہ اخلاقی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہے۔ سر چارلس نیپیر نے خود اس امر کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ کمپنی کی حکومت امیروں کی حکومت سے بہت بہتر تھی۔

گوالیار کی شورش سنہ ۱۸۴۳ء

اس سال ریاست گوالیار میں گورنر جنرل کو دخل اندازی کرنی پڑی جنکا جی سندھیا کی وفات پر اُس کی بیوہ انتظام حکومت کو اپنے قبضہ میں نہ کرسکی گوالیار کی فوج چالیس ہزار سے زیادہ تھی اور اُس کی طرف سے انگریزوں کو خطرہ تھا۔ لارڈ النبرا نے اس وقت دخل دینے کی کوشش کی۔ چنانچہ جنگ چھڑ گئی۔ مہاراجپور اور پنیار کے مقامات پر سندھیا کی فوج کو شکست ہوئی۔ رانی نے انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی۔ گوالیار کی فوج ایک تہائی کردی گئی اور یہ طے ہوا کہ انتظام ریاست کے لئے ایک ریجنسی کونسل قائم کی جائے اور وہ انگریزی ریزیڈنٹ کے ماتحت کام کرے۔ سنہ ۱۸۴۴ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے لارڈ النبرا کو واپس بلالیا اور اُس کی جگہ سر ہنری ہارڈنج گورنر جنرل مقرر ہوکر آیا۔

باب ۴۸

سر ہنری ہارڈنج۔ سکھوں کی پہلی لڑائی

رنجیت سنگھ مغلیہ سلطنت کے زوال پر جس طرح بنگال۔ اودھ مہاراشٹرا اور حیدرآباد وغیرہ میں خود مختار ریاستیں قائم ہوگئی تھیں۔ اُسی طرح پنجاب میں بھی رنجیت سنگھ نے ایک وسیع سلطنت

قائم کرلی تھی۔ دریائے ستلج کے پار تمام وہ ملک جو اس وقت پنجاب۔ صوبہ سرحد اور کشمیر میں شامل ہے اُس کے قبضے میں تھا۔ انگریزوں کی سلطنت بھی اب جمنا تک پہنچ گئی تھی۔ ستلج اور جمنا کے درمیان چند چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں جن پر رنجیت سنگھ قبضہ کرنا چاہتا تھا لیکن انگریزوں نے اُن کو اپنی حفاظت میں لے لیا تھا اور صلحنامۂ امرتسر کی رو سے یہ طے ہو گیا تھا کہ رنجیت سنگھ کو اُن ریاستوں سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ رنجیت سنگھ کے تدبّر کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک وہ زندہ رہا اسوقت تک سکھ اور انگریزوں کے تعلقات دوستانہ رہے۔ دونوں کو معلوم تھا کہ لڑائی میں دونوں کے لئے خطرہ ہے۔ اپنی وسیع سلطنت کو قبضے میں رکھنے کے لئے رنجیت سنگھ نے ایک زبردست فوج تیار کی تھی اور

سر ہنری ہارڈنج

یورپی افسروں کو اُس میں مقرر کیا تھا۔ اُس کے پاس بہت عمدہ توپ خانہ تھا۔ فوجی ترقی کے علاوہ اُس کی سلطنت کا انتظام بہت باقاعدہ تھا۔ وہ جاہل تھا مگر انتظامی قابلیت اُس میں خداداد تھی۔ جب ۱۸۳۹ء میں اُس کا انتقال ہوا تو سکھوں کی سلطنت بہت وسیع اور مستحکم تھی اور اُن کی فوج نہایت مرتب اور منظم لیکن اُس کی اولاد میں کوئی بھی اس قابل نہ تھا کہ اس خودمختار اور طاقتور سلطنت کا انتظام کر سکے۔

سکھوں کی پہلی لڑائی کے اسباب

رنجیت سنگھ کے بعد پنجاب کی حالت خراب ہوگئی۔ حکومت کے اختیارات فوج کے ہاتھ میں آگئے اور خانہ جنگی اور فتنہ و فساد کا دور شروع ہوگیا۔ فوجی افسروں کے مقابلہ میں راجاؤں کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ قتل و غارت کا سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ آخر کار ۱۸۴۵ء میں رنجیت سنگھ کا چھوٹا لڑکا دلیپ سنگھ تخت پر بیٹھا۔ اُس وقت اُس کی عمر صرف پانچ سال کی تھی۔ چنانچہ اُس کی ماں نائب سلطنت مقرر ہوئی اور اُس کا دوست لال سنگھ وزیر بنا دیا گیا۔ یہ رانی نہایت چالاک اور خود غرض تھی۔ وہ فوج کا بہت خیال رکھتی تھی۔ لیکن دل سے یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اس فوج کو انگریزی فوج سے لڑا دے۔ یہی وجہ تھی کہ لڑائی میں بہت سے سکھ سردار دشمن سے ملے ہوئے تھے اور اُن کے نزدیک اُن کی فوج کی کامیابی بھی اُتنی ہی خطرناک تھی جتنی کہ اُس کی شکست۔ سکھوں کی فوج بہادر تربیت یافتہ اور قابل تعریف تھی لیکن اُس کی رہنمائی کے لئے کوئی قابل سردار نہ تھا۔ بہرحال دسمبر ۱۸۴۵ء میں سکھ فوج نے دریائے ستلج کو عبور کر کے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ اب انگریزوں اور سکھوں کے درمیان لڑائی یقینی تھی۔ کیونکہ انگریز بھی مقابلہ کے لئے تیار تھے۔

لڑائی کے واقعات اور نتائج

سکھ اور انگریزی فوجوں کا پہلا مقابلہ مدکی کے مقام پر ہوا۔ سکھ نہایت بہادری سے لڑے اور اگرچہ آخر میں اُن کو شکست ہوئی لیکن انگریزوں کے بھی بہت کافی آدمی مارے گئے۔ دوسری لڑائی ۲۱ دسمبر ۱۸۴۵ء کو بمقام فیروزشاہ ہوئی۔ یہ بہت سخت لڑائی تھی۔ سکھ بھاگ تو گئے۔ لیکن

انگریزی فوج میں بھی بہت لوگ زخمی ہوئے اور مارے گئے۔ نئے سال یعنی ۱۸۴۶ء میں دو لڑائیاں علی وال اور سبراؤن کے مقامات پر ہوئیں۔ دونوں میں سکھوں کو شکست ہوئی اور انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ صلحنامۂ لاہور کی رو سے کمپنی کی سلطنت بجائے ستلج کے بیاس تک بڑھ گئی۔ سکھوں نے ڈیڑھ کروڑ روپیہ بطور تاوان ادا کیا۔ لاہور میں ایک ریزیڈنٹ مقرر ہوا اور پنجاب کا انتظام ایک کونسل کے سپرد کر دیا گیا۔ چونکہ تاوان کی رقم خزانۂ لاہور سے ادا نہیں کی جا سکتی تھی اس لئے ریاست کشمیر گلاب سنگھ راجہ جموں کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ سکھوں کی فوج بہت زیادہ کم کر دی گئی اور ہنری لارینس کو ریزیڈنٹ مقرر کیا گیا۔ اسی سال کے آخر میں ایک دوسرا صلحنامہ ہوا جس کی رو سے آٹھ سرداروں کی ایک ریجنسی کونسل مقرر ہوئی اور ہنری لارینس اُس کا صدر بنایا گیا۔ یہ انتظامات آٹھ سال کے لئے کئے گئے تھے تاکہ جب تک دلیپ سنگھ حکومت کرنے کے قابل ہو اُس کی سلطنت میں کوئی فساد نہ ہو۔ لیکن جیسا کہ تم آگے پڑھو گے دو سال بھی نہ گذرے تھے کہ سکھوں کی دوسری لڑائی شروع ہو گئی اور اُس کے اختتام پر پنجاب سلطنت انگریزی میں شامل ہو گیا۔

لارڈ ہارڈنج کی اصلاحات

لارڈ ہارڈنج کو اپنے مختصر عہد میں ایک بڑی طاقتور قوم سے لڑنا پڑا۔ لیکن پھر بھی اُس نے ملک میں بہت سے اچھے کام کئے جن سے اس ملک کے باشندوں کو آرام اور فائدہ پہنچا۔ وہ پہلا گورنر جنرل تھا جس نے ہندوستان میں ریل جاری کرنے کی کوشش کی۔ اُسی کے زمانہ میں دریائے گنگا کی مشہور اور بڑی نہر کھودنے کی تجویز پیش ہوئی۔ تعلیمی انتظامات میں بھی بہت سی

اصلاحیں کی گئیں۔ ستی۔ دختر کشی اور انسان کی قربانی وغیرہ کی حیاسوز رسوم
کو مٹانے کی عملی تدبیریں کی گئیں۔

باب ۴۹

لارڈ ڈلہوزی ۱۸۴۸ء-۱۸۵۶ء

لارڈ ڈلہوزی جنوری ۱۸۴۸ء میں نیا گورنر جنرل یعنی لارڈ ڈلہوزی کلکتہ پہنچ گیا۔ اس وقت اُس کی عمر صرف چھتیس سال

لارڈ ڈلہوزی

کی تھی اور اس سے پہلے کوئی گورنر جنرل اتنی کم عمر میں ہندوستان نہیں آیا تھا۔ بحیثیت صدر بورڈ آف ٹریڈ اُس نے کافی شہرت حاصل کرلی تھی اور ہندوستان میں بھی اُس کا دورِ حکومت ایک خاص تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ ڈلہوزی بہت قابل اور ہوشیار مدبر تھا اور اپنے فرائض کو نہایت محنت اور تن دہی سے انجام دیتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کے حق میں انگریزی حکومت ایک نعمت ہے اس لئے دیسی ریاستوں کو

انگریزی سلطنت میں شامل کرنے میں اُس کو ذرا پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ اُس کی رائے میں ہندوستان کی ترقی کے لئے مغربی تہذیب ضروری تھی۔ چنانچہ اُس نے اس ملک میں مغربی تہذیب کو رائج کرنے کی بہت کوشش کی اور اُس کے عہد میں ہمارے ملک میں نئی تہذیب اور مغربی زندگی کے بہت سے آثار نظر آنے لگے۔ اُس کی ان اصلاحات کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا جائے گا۔

سکھوں کی دوسری لڑائی
۱۸۴۸-۱۸۴۹ء

ابھی ڈلہوزی کو آئے ہوئے تین مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ پنجاب میں فساد شروع ہوا اور آخرکار انگریزوں کو سکھوں سے دوسری لڑائی لڑنی پڑی۔ پہلی لڑائی کے بعد پنجاب کی حکومت ایک ریجنسی کونسل کے سپرد کردی گئی تھی لیکن سکھ فوج اور سکھ سردار اس انتظام سے خوش نہ تھے کیونکہ اُن کی آزادی میں خلل آتا تھا۔ سنہ ۱۸۴۸ء میں ملتان کے حاکم مولراج سے حساب صاف کرنے اور مالیہ کا روپیہ داخل کرنے کو کہا گیا۔ اس پر وہ مستعفی ہوگیا اور اُس کے ساتھیوں نے اُن دو انگریز افسروں کو جو اُس سے چارج لینے کے لئے ملتان بھیجے گئے تھے قتل کردیا۔ اب مولراج نے بھی بغاوت شروع کردی۔ گورنر جنرل نے کمانڈر ان چیف سے مشورہ کیا تو اُس نے صلاح دی کہ جب تک موسم سرما نہ آئے سکھوں سے نہیں لڑنا چاہیئے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا اور کئی مہینہ تک سکھوں کی بغاوت فرو کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ لیکن اسی زمانہ میں ایک انگریزی افسر لفٹننٹ ایڈورڈس نے جو اُس طرف کچھ انتظامات کے سلسلہ میں گیا ہوا تھا مولراج کا مقابلہ کیا اور ایک مختصر فوج جمع کرکے مولراج کو مجبور کیا کہ وہ ملتان میں پناہ لے۔ ریزیڈنٹ نے لاہور سے شیر سنگھ کو ایک فوج کے ساتھ مولراج کے خلاف بھیجا۔

لیکن شیر سنگھ اس سے مل گیا اور اب بہت سے سکھ سردار مولراج اور شیر سنگھ کے پاس پہنچ گئے۔

ڈلہوزی کو ان واقعات کی اطلاع ملی تو اُس نے اکتوبر میں جنگ کا اعلان کر دیا اور بہت پُرزور الفاظ میں سکھوں سے لڑنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ انگریزی کمانڈر ان چیف نے ۱۶ نومبر کو دریائے راوی عبور کیا اور چھ روز بعد رام نگر کے مقام پر سکھوں سے لڑائی ہوئی جس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کے بعد جنوری ۱۸۴۹ء میں پھر دونوں فریقوں کا مقابلہ چلیانوالہ کے میدان میں ہوا۔ یہ لڑائی نہایت سخت تھی۔ لارڈ گف نے شام کے وقت سکھوں پر حملہ کیا تھا اس لئے لڑائی ختم ہونے سے پہلے اندھیرا ہو گیا۔ اس لڑائی میں انگریزوں کا بہت نقصان ہوا۔ تقریباً ڈھائی ہزار آدمی مارے گئے اور کئی جھنڈے چھن گئے۔ اس لڑائی کا اثر اتنا زبردست ہوا کہ یہ طے کر لیا گیا کہ لارڈ گف کی بجائے سر چارلس نیپیر کو ہندوستان کا کمانڈر ان چیف مقرر کر کے بھیجا جائے۔ لیکن اُس کے پہنچنے سے پیشتر لارڈ گف نے گجرات کے مقام پر سکھوں کو شکست فاش دی۔ اس شکست کے بعد سکھوں کی قوت اور سلطنت کا خاتمہ ہو گیا اور مارچ ۱۸۴۹ء میں ڈلہوزی نے پنجاب کو انگریزی سلطنت میں شامل کر لیا۔ دلیپ سنگھ کی پنشن مقرر کر دی گئی اور انگلستان بھیج دیا گیا۔ وہاں اُس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔

نئے صوبہ کے انتظام کے لئے تین کمشنر مقرر ہوئے جن میں سے دو ہنری اور جان لارنس تھے۔ گورنر جنرل نے خود پنجاب کا دورہ کیا تاکہ وہاں کے حالات سے اُس کو پوری واقفیت حاصل ہو جائے۔ سرحد کی حفاظت کے لئے بہت سے نئے قلعے بنائے گئے اور باغی سرداروں کی سرکوبی اور رعایا کی خوشحالی کی

تدبیریں کی گئیں۔ ان انتظامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ پنجاب نے بہت جلدی ترقی کر لی اور اب وہ کسی صوبے سے پیچھے نہیں۔

مسئلۂ الحاق لارڈ ڈلہوزی نے جو طریقے دیسی ریاستوں کو انگریزی سلطنت میں شامل کرنے کے اختیار کئے تھے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ ہندو راجاؤں کو متبنیٰ کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تاریخ میں اس کا ذکر "مسئلۂ الحاق" کے نام سے کیا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں گود لینے یا متبنیٰ کرنے کے رواج کی غرض صرف یہی نہیں تھی کہ سلطنت اُس خاندان میں قائم رہے بلکہ کچھ مذہبی رسوم ایسی تھیں جن کے پورا کرنے کے لئے یہ قانون ضروری تھا۔ مسلمانوں کے عہد میں اس قانون پر برابر عمل ہوتا رہا اور حکومت کی طرف سے کوئی دخل اندازی نہیں کی گئی۔ لیکن ڈلہوزی نے اس مسئلہ کو اُٹھایا کہ ہر وہ دیسی ریاست جو کمپنی کے تابع ہو اور جس کے راجہ کے کوئی اولاد نہ ہو سلطنت انگریزی میں شامل کر لینی چاہیئے۔ ڈلہوزی کے اس رویّہ پر مورخین نے بہت بحث کی ہے۔ کہ کس حد تک اُس کی پالیسی جائز تھی۔ بہرحال اس میں اب ذرا بھی شک نہیں ہے کہ گورنر جنرل کا اصلی مقصد کمپنی کی سلطنت کو زیادہ وسیع کرنا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ڈلہوزی اس طریقۂ کار کا موجد نہیں تھا لیکن اُس نے کئی بڑی ریاستوں کو اسی طرح اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ چنانچہ اکثر "مسئلۂ الحاق" اُسی کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔

سب سے پہلے ستارا کی ریاست اس طریقہ سے انگریزی سلطنت میں شامل کی گئی۔ مرہٹوں کی آخری لڑائی میں مارگوئیس آف ہیسٹنگز نے شیواجی کے خاندان کو یہ ریاست عطا کی تھی۔ گورنر جنرل نے کہا کہ کمپنی کو یہ اختیار ہے کہ

راجہ کو گود لینے کی اجازت نہ دے۔ چنانچہ ۱۸۴۸ء میں ستارا کمپنی کے قبضہ میں آگیا۔ اسی اصول پر جھانسی ۱۸۵۲ء اور ناگپور ۱۸۵۳ء میں شامل کر لئے گئے۔ ان کے علاوہ چار چھوٹی ریاستیں اسی اصول کے مطابق انگریزی سلطنت میں ملالی گئیں۔ ڈلہوزی نے کچھ خطابات اور پنشنیں بھی بند کر دیں۔ ارکاٹ کے نواب اور تنجور کے راجہ کے خطابات ختم کر دئے گئے۔ باجی راؤ کے متبنیٰ لڑکے نانا صاحب کا وظیفہ بھی بند کر دیا گیا اور مغل شہنشاہ بہادر شاہ کے ولیعہد سے کہدیا گیا کہ بہادر شاہ کے بعد اُس کو دہلی سے جانا پڑے گا۔ نظام حیدرآباد پر کمپنی کا قرضہ بہت زیادہ ہو گیا تھا کیونکہ مالی حالت خراب ہونے کی وجہ سے وہ روپیہ وصول نہیں ہوتا تھا جو عہدنامہ کی رو سے ریاست کو کمپنی کی فوج کے اخراجات کے لئے ادا کرنا ضروری تھا۔ ڈلہوزی نے نظام سے نیا معاہدہ کیا جس کی رو سے برار کا علاقہ انگریزوں کو اس شرط پر دیا گیا کہ اُس کی آمدنی سے فوج کے اخراجات کے بعد جو کچھ روپیہ باقی بچے وہ نظام کے خزانہ میں داخل کیا جائے۔

برما کی دوسری لڑائی ۱۸۵۲ء

پہلی لڑائی میں حکومت برما کو شکست ہوئی تھی لیکن اس سے وہاں کے راجاؤں کے غرور اور بد دماغی میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ انگریزی تاجروں کو رنگون میں راجہ کے ظلم و ستم سے اکثر شکایت رہا کرتی تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۱ء میں ان تاجروں نے حکومت ہند سے فریاد کی۔ ڈلہوزی نے اپنے ایک افسر کو رنگون بھیجا۔ لیکن وہاں کے لوگوں نے ایسا برتاؤ کیا کہ لڑائی ضروری ہو گئی۔ برما کی فوج کمپنی کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی اور بہت جلد جنوبی برما اور رنگون انگریزوں کے پاس آگئے اور برما کا جو حصہ راجہ کے پاس باقی رہا اُس کا

تعلق سمندر سے بالکل جاتا رہا اور اُن کے پاس کوئی بندرگاہ نہ رہا۔ ڈلہوزی پر انگلستان میں بہت سے اعتراضات کئے گئے۔ لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ ہم اس سے لگا سکتے ہیں کہ خلیج بنگال کے ہر دو ساحل راس کماری سے لے کر ملایا تک انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔

اودھ

لارڈ ولزلی کے عہد میں نواب وزیر اودھ کے اختیارات اور سلطنت کا اہم حصہ کمپنی نے لے لیا تھا۔ لارڈ ہیسٹنگز نے نواب اودھ کو بادشاہ کا خطاب عطا کیا۔ اس وقت سے شاہانِ اودھ کا رویہ جہاں تک کمپنی کا تعلق تھا کسی صورت سے قابل اعتراض نہیں تھا لیکن وہ اپنے ملک اور رعایا کی خوشحالی کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کرتے تھے اور اودھ کی انتظامی حالت دن بدن بدتر ہوتی جاتی تھی۔ ڈلہوزی کا خیال تھا کہ اودھ کا انتظام کمپنی اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن شاہانِ اودھ کے خطابات محلات اور اعزاز اسی طرح قائم رہیں۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے اُس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا اور اُس سے کہا کہ اودھ کی ریاست بھی کمپنی کی سلطنت میں شامل کرلے۔ یہ کوشش کی گئی کہ شاہ اودھ خود تخت سے دست بردار ہو جائے لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوا۔ چنانچہ فروری ۱۸۵۶ء میں اودھ بھی کمپنی کی سلطنت میں شامل کرلیا گیا اور وہاں کے آخری بادشاہ واجد علی شاہ کو وظیفہ دیکر کلکتہ بھیج دیا گیا۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے کمپنی کے اس برتاؤ کو جو اودھ کے ساتھ کیا گیا قابل تعریف نہیں کہا جا سکتا۔ نوابانِ اودھ ابتدا سے انگریزوں کے ساتھ رہے اور اُن کی وفاداری اور فرماں برداری میں اُنھوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ لیکن آخرکار کمپنی نے اُن کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو دوسری ریاستوں کے ساتھ کیا تھا۔

اصلاحات ڈلہوزی نے اپنے عہد میں بہت سی اصلاحات کیں۔ جن سے اس ملک کے باشندوں کو بہت آرام پہنچا۔ ۱۸۵۳ء میں ہندوستان میں سب سے پہلے ریلوے لائن بمبئی اور تھانہ کے درمیان قائم کی گئی۔ بنگال میں بھی کلکتہ سے لے کر رانی گنج تک ریل چلنے لگی۔ ریلوں کے قیام سے ملک کی تجارت اور دستکاری پر بہت بڑا اثر ہوا جو بالکل ظاہر ہے۔ کلکتہ۔ آگرہ۔ دہلی اور لاہور کے درمیان تار کا انتظام کیا گیا۔ اسی طرح ملک میں خط بھیجنے کی فیس بہت کم کر دی گئی تاکہ ہر شخص چاہے وہ کسی قدر غریب کیوں نہ ہو خطوط بھیج سکے۔ ڈلہوزی نے ہندوستان میں تعمیرات اور نہروں کے لئے مستقل محکمے قائم کئے۔ نہروں کی ضرورت اس ملک میں بہت زیادہ تھی اور اُس نے ایک بہت بڑی کمی کو پورا کیا۔ اس کے علاوہ ایک بہت اہم اصلاح جو اُس کے زمانہ میں ہوئی وہ تعلیم کی ترقی کے لئے کی گئی تھی۔ ۱۸۵۴ء میں سر چارلس ووڈ صدر بورڈ آف کنٹرول نے ہندوستانیوں کی تعلیم کے متعلق ایک زبردست مراسلہ بھیجا جس کی رو سے کلکتہ۔ بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور پرائیویٹ اسکولوں کو گورنمنٹ کی طرف سے مالی امداد ملنے لگی۔ ہندوستانی زبانوں میں ابتدائی تعلیم دینے کا انتظام بھی کیا گیا۔ انڈین سول سروس کی بنیاد بھی اسی زمانہ میں پڑی اور اُس کے لئے مقابلہ کے امتحانات انگلستان میں ہونے لگے۔ اس گورنر جنرل نے پہلی مرتبہ رعایا کی مالی اور اخلاقی حالت اور اُس کی ترقی کی رپورٹ تیار کرائی۔ اوپر جو اصلاحات بیان کی گئی ہیں اُن کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ڈلہوزی نے اپنے عہد میں ہندوستان میں بہت سی ایسی چیزیں جاری کیں جنہوں نے ہندوستانیوں کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کیا۔ دیسی

ریاستوں کے ساتھ جو سلوک اُس نے کیا اُس پر اکثر اعتراضات کئے جاتے ہیں اور بہت سے اعتراضات درست بھی ہیں۔ لیکن اُس کے کارناموں کی فہرست لڑائیوں اور فتوحات ہی تک محدود نہیں۔ اس ملک کی تاریخ میں اُس کا نام اُن اصلاحات کی وجہ سے زندہ رہے گا جنہوں نے ملک کی صورت اور زندگی کو بالکل بدل دیا ہے۔ ڈلہوزی اعتراضات سے بالکل نہیں ڈرتا تھا اور وہی کرتا تھا جو اُس کی رائے میں مناسب اور صحیح ہوتا تھا۔ وہ بجا طور پر عظیم الشان گورنر جنرلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

نیا چارٹر ۱۸۵۳ء ۱۸۵۳ء میں کمپنی کے چارٹر کی بیس سالہ مدت ختم ہوتی تھی۔ اس لئے اُس کی تجدید کی گئی۔ اس چارٹر کی رُو سے کمپنی کے لئے کوئی مدت مقرر نہیں کی گئی۔ بنگال اور پنجاب کے لئے لفٹنٹ گورنروں کا تقرر کیا گیا اور مجلس قانون ساز کے ارکان کی تعداد بارہ کردی گئی۔

باب ۵۰

غدر اور اُس کے نتائج

لارڈ کیننگ کیننگ جو ڈلہوزی کا جانشین ہو کر فروری ۱۸۵۶ء میں ہندوستان آیا اپنی علمی قابلیت کی وجہ سے شہرت حاصل

کرچکا تھا۔ وہ قابل اور محنتی تو ضرور تھا لیکن اہم معاملات پر رائے قائم کرنے میں بہت دیر لگاتا تھا۔ وہ منصف مزاج اور نیک دل تھا اس میں شک نہیں کہ اگر اُس کے زمانہ میں غدر کی مصیبت نہ آتی تو اُس کا دورِ حکومت بہت کامیاب رہتا۔ لیکن اُس کو ہندوستان میں ایک ایسی زبردست تحریک کا مقابلہ کرنا پڑا جس کی مثال اس ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس دورِ انقلاب میں اُس نے جو رویہ اختیار کیا اُس پر بہت سے اعتراضات ہوئے لیکن آخرکار وہ اس قیامت خیز ہنگامے کو فرو کرنے اور اپنی سلطنت کی بنیاد مضبوط کرنے میں کامیاب ہوا۔ کیننگ کو آئے ہوئے تھوڑا ہی زمانہ گذرا تھا کہ اُس کو شاہ ایران کے مقابلہ میں جس نے ہرات پر قبضہ کرلیا تھا ایک فوج بھیجنی پڑی۔ پنجاب فتح ہونے کے بعد شمالی مغربی سرحد کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی تھی۔ اسی سلسلہ میں حکومتِ ہند کو شاہ ایران سے یہ لڑائی لڑنی پڑی۔ ایرانیوں کو بوشہر کے مقام پر شکست ہوئی اور اُن کو ہرات خالی کرنا پڑا۔

۱۸۵۷ء کا غدر۔ غدر کے اوپر بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوسکا ہے کہ آیا یہ صرف فوجی بغاوت تھی یا یہ کہ ملک کے باشندوں نے انگریزی حکومت کو ختم کرنے اور اپنے آپ کو آزاد کرنے کی ایک زبردست اور متحدہ کوشش کی تھی جس میں اُن کو ناکامیابی ہوئی۔ اگر ہم اس بغاوت کی تاریخ کو غور سے پڑھیں تو اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس تحریک میں خاص طور پر کمپنی کی فوج نے حصہ لیا۔ لیکن اس فوج کے ساتھ عام لوگ بھی بعض بعض مقامات پر شریک کار ہوگئے۔ اس واسطے کہ کافی تعداد میں لوگوں کو انگریزی حکومت کے سیاسی اور اقتصادی انتظامات سے نقصان پہنچا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کمپنی کی حکومت کو ختم کرکے اپنی قدیمی

ریاستیں قائم کرلیں۔ یہی سبب ہے کہ اس تحریک کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ نہ تو سب باغیوں کا مقصد ایک تھا اور نہ اُن کی رہنمائی کے لئے قابل لیڈر تھے۔ کچھ عرصہ تک فوجی سپاہی کامیابی حاصل کرتے رہے۔ لیکن بدنظمی کی وجہ سے آخرکار اُن کو شکست ہوئی۔ ان امور پر غور کرنے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت یا غدر کے اسباب صرف فوج کی بددلی ہی تک محدود نہیں تھے بلکہ سیاسی اور اقتصادی حالات کا بھی اُن سے بہت بڑا تعلق تھا۔

سیاسی اسباب

۱۸۵۷ء تک ہندوستان کا بیشتر حصہ کمپنی کے ہاتھ میں آچکا تھا لیکن پھر بھی بہت سی ریاستیں موجود تھیں اور دیسی حکمرانوں کو فکر تھی کہ کسی نہ کسی وقت اُن کی حکومت کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ لارڈ ڈلہوزی کی پالیسی نے تمام ملک میں بےچینی پھیلا دی تھی۔ گود لینے کی رسم بند کرنے سے ہندو ریاستوں کو بہت خطرہ ہو گیا تھا۔ اودھ کو شامل کر کے ڈلہوزی نے لوگوں کی بےاطمینانی اور شکوک کو بہت زیادہ بڑھا دیا تھا۔ اس لئے کہ اب وفادار سے وفادار ریاست بھی خطرہ سے خالی نہیں تھی مغلیہ خاندان پر جو ناجائز دباؤ ڈالا گیا تھا اُس سے دہلی کے لوگ بہت ناراض تھے۔ باجی راؤ کا متبنیٰ لڑکا نانا صاحب بھی انگریزوں کا جانی دشمن تھا۔ کیونکہ اُس کی پنشن بھی بند کر دی گئی تھی۔ جھانسی کی رانی کو بھی یہی شکایت تھی اور نانا صاحب کی طرح وہ بھی موقع کی منتظر تھی۔

معاشرتی اور مذہبی اسباب

رفتہ رفتہ انگریز لوگ ملک میں اس قسم کی اصلاحات کر رہے تھے جو اُس زمانہ کے لوگوں کو عجیب وغریب معلوم ہوتی تھیں۔ خاص طور سے ڈلہوزی نے اپنے عہد

میں بہت سے ایسے کام کیے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندوستان میں مغربی تہذیب پھیلانا چاہتا تھا۔ بے روزگاری اور مصیبت کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں کمپنی کی طرف سے بدگمانی پیدا ہو گئی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اُن کی تمام مصیبتوں کی ذمہ داری کمپنی ہی پر ہے۔ چنانچہ ڈلہوزی کے اچھے کاموں کو بھی شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جاہل لوگوں کا خیال تھا کہ اِن اصلاحوں سے انگریزوں نے اُن کے مذہب کو خراب کر دیا ہے۔ انگریزی تعلیم اور پادریوں کے ذریعہ عیسائی مذہب کی تبلیغ سے عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ کمپنی کی حکومت ہندوستانیوں کے مذہب اور اُن کی تہذیب و تمدن کو تباہ کرنا چاہتی ہے۔ انگریزوں سے پہلے مسلمان بادشاہ حکومت کرتے تھے یہ لوگ بھی باہر سے آئے تھے لیکن اُنہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور یہاں کے لوگوں کے ساتھ مل جلکر رہتے تھے۔ برخلاف اس کے انگریز بالکل غیروں کی طرح ایک علیحدہ قوم تھے۔ ایک اور شکایت یہ تھی کہ ملک کے انتظامات میں ہندوستانیوں کو کچھ بھی دخل نہیں تھا نہ اُن میں سے کوئی کونسل کا ممبر ہوتا تھا اور نہ کسی کو اعلیٰ عہدہ ملتا تھا۔ اُن کی تجارت صنعت و حرفت اور کاروبار برباد ہو چکے تھے۔ اُن کے ملک کی دولت دوسرے ملکوں کو جا رہی تھی۔ دیسی نواب اور راجہ انگریزوں کے مطیع اور فرماں بردار تھے اور بڑے بڑے معزز خاندان خوار اور تباہ ہو گئے تھے۔ غرض کہ تمام ملک میں ایک بدگمانی۔ بے اطمینانی اور بےچینی کی فضا پھیل گئی تھی۔ چنانچہ بغاوت شروع ہوتے ہی سارے شمالی ہندوستان میں نہایت تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔

فوجی اسباب

فوج بھی غیر مطمئن اور بےچین تھی۔ انگریزی فوج میں بہت سے سپاہی اودھ اور دہلی کے تھے اور اُنکے

دلوں میں کمپنی کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی تھی خاص طور پر الحاق اودھ کے بعد۔ فوج میں انگریز اور ہندوستانی سپاہیوں کا تناسب ایک اور پانچ کا تھا اور انگریز سپاہی کچھ اس طرح سے تقسیم ہو گئے تھے کہ بعض بعض چھاؤنیوں میں بالکل ہندوستانی فوج ہی تھی۔ ہندوستانی سپاہیوں کو کچھ ذاتی شکایات بھی تھیں۔ اُن کو تنخواہیں بہت کم ملتی تھیں اور اُن کی مرضی کے خلاف ہندوستان کے باہر اُن کو جانا پڑتا تھا۔ اسی بےچینی کی حالت میں یہ افواہ اُڑی کہ نئے کارتوسوں میں جو فوج کے لئے آئے ہیں گائے اور سور کی چربی لگی ہوئی ہے۔ بعد میں تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ خبر ایک حد تک صحیح تھی۔ اس خبر نے فوج کے سپاہیوں پر جادو کا سا اثر کیا انھوں نے اتفاق کر لیا اور مخالفت پر آمادہ ہو گئے۔

بغاوت کی ابتدا بغاوت سب سے پہلے کلکتہ کے قریب بارکپور میں شروع ہوئی۔ ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے افسروں کو مار ڈالا اور عمارتوں میں آگ لگا دی۔ بارکپور کی بغاوت تو جلد ہی فرو کر دی گئی لیکن ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں دیسی فوج بگڑ گئی۔ یورپی افسر قتل کر دئے گئے اور فوج کے سپاہی دہلی پہنچ گئے اور اس کو فتح کر لیا۔ مغل بادشاہ بہادر شاہ ثانی کو جو لال قلعہ میں رہتا تھا حقیقی طور پر بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور اس کا اعلان بھی کر دیا گیا۔ اِن تمام خبروں کی اطلاع بذریعہ تار لاہور کر دی گئی۔ دہلی کے میگزین کی حفاظت نو آدمی کر رہے تھے۔ جب اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی اور یقین ہو گیا کہ باغی اس پر قبضہ کر لیں گے تو ایک نوجوان انگریز سپاہی نے اس میں آگ لگا دی اور خود بھی اسی میں ہلاک ہو گیا۔ غدر کا سلسلہ برابر پھیلتا اور بریلی۔ لکھنؤ۔ کانپور۔ جھانسی اور دوسرے مقامات پر بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ اگرچہ ان تمام مقامات پر کم و بیش ایک ہی

زمانہ میں بغاوتیں ہوئیں لیکن ہر ایک مقام کے واقعات علیحدہ علیحدہ بیان کرنے میں سہولت ہو گی۔

دہلی ۱۸۵۷ء انگریزوں نے سب سے پہلے دہلی کی طرف توجہ کی۔ یہاں کی بغاوت جون سے ستمبر تک رہی۔ باغیوں سے دہلی واپس لینے کے لئے پنجاب سے فوج روانہ کی گئی۔ سکھ اور گورکھے انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ انگریزی فوج نے دہلی پہنچکر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن باغیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور یہ فوج اُن کے لئے کسی صورت سے کافی نہ ہوتی مگر لارنس نے پنجاب کی تقریباً تمام فوج دہلی بھیجدی۔ جولائی کے آخر میں جنرل نکلسن بھی دہلی پہنچگیا۔ دونوں فریق بڑی بہادری سے لڑتے رہے۔ لیکن آخرکار ستمبر میں انگریزوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ اس لڑائی میں اُن کے ساڑھے چودہ سو آدمی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ جنرل نکلسن بھی زخمی ہوا اور مر گیا۔ بعد میں باغیوں کو یا تو گولی سے اُڑا دیا گیا یا پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے میں گرفتار ہوا۔ لفٹننٹ ہڈسن نے نہایت بے دردی سے اُس کے دو بیٹوں اور ایک پوتے کو گولی سے مار دیا۔ بہادر شاہ پر ایک معمولی مجرم کی طرح مقدمہ چلایا گیا اور سزا کے طور پر اُس کو جلاوطن کر کے برما بھیجدیا گیا۔ خاندان تیموریہ کا یہ آخری فرمانروا قید کی حالت ہی میں مر گیا۔

کانپور جون ۱۸۵۷ء کے شروع میں بغاوت کا سلسلہ اودھ تک پہنچگیا تھا۔ کانپور اور لکھنؤ میں باغیوں کا دور دورہ تھا۔ کانپور میں باجی راؤ کا متبنیٰ لڑکا نانا صاحب انگریزوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ نانا صاحب نے انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور وعدہ کیا کہ وہ الہ آباد پہنچا دئے جائیں گے۔ لیکن جب یہ لوگ کشتی میں سوار ہوئے تو اُن کو گولیوں سے ہلاک کر دیا گیا۔

اب نانا صاحب نے پیشوا ہونے کا اعلان کیا اور اُن تمام انگریزوں کو جو اُس کے پاس قید تھے اور جن میں عورتیں اور بچے بھی تھے مروا ڈالا۔ جو فوج نانا صاحب کے مقابلہ کے لئے الہ آباد سے روانہ کی گئی تھی وہ ایک دن دیر سے پہنچی۔ نانا صاحب نے ان سب بے گناہ قیدیوں کو قتل کروا کر ایک کنوئیں میں ڈلوا دیا تھا جو آج تک موجود ہے۔

لکھنؤ الہ آباد سے جو فوج کانپور آئی تھی اُس کا ایک حصّہ تو وہیں رہ گیا اور باقی فوج جنرل ہیولاک کے ساتھ لکھنؤ کی طرف چلی گئی۔ یہاں سر ہنری لارنس نے نہایت قابلیت سے فوج کو منظم کر لیا تھا اور ریزیڈنسی کے چاروں طرف خندق کھدوالی تھی۔ وہ خود تو گولی کھا کر مر گیا تھا لیکن اُس کے ساتھی ہمت اور بہادری کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کر رہے تھے۔ ستمبر میں ہیولاک اور اوٹرم لکھنؤ تک پہنچ گئے اور اُس فوج کو ہلاک ہونے سے بچا لیا جس نے خندق کے اندر پناہ لی تھی۔ لیکن ابھی لکھنؤ باغیوں کے ہاتھ میں تھا۔ آخر کار سر کالن کیمبل ایک فوج لے کر پہنچا کہ لکھنؤ کو فتح کرے۔ اسی زمانہ میں تانتیا توپی نے جو ایک نہایت قابل مرہٹہ سردار تھا کانپور پر قبضہ کر لیا تھا۔ کیمبل نے کانپور سے باغیوں کو مار کر بھگا دیا اور مارچ ۱۸۵۸ء میں لکھنؤ بھی فتح ہو گیا۔

جھانسی جھانسی کی نوجوان رانی صرف بیس سال کی تھی لیکن اُس نے نہایت ہوشیاری کے ساتھ جنگ کی تیاری کی تھی اور خود بھی مردوں کی طرح گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ میں لڑتی تھی۔ تانتیا توپی اُس کا خاص مددگار تھا لیکن اُس کی قابلیت اور بہادری کے باوجود جھانسی کا قلعہ فتح ہو گیا اور کالپی پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ تانتیا توپی نے اسی

اُنساریں گوالیار پر حملہ کر دیا۔ سر ہیو روز نے اُس کا پیچھا کیا۔ لڑائی میں رانی ایک سپاہی کے ہاتھ سے ماری گئی۔ تانتیا ٹوپی بھاگ گیا اور ایک سال تک ہاتھ نہیں آیا۔ ۱۸۵۹ء میں وہ گرفتار ہو کر آیا اور پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

شمالی ہند میں اب امن تھا۔ نانا صاحب ترائی کی طرف بھاگ گیا اور پھر اُس کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ ۱۸۵۸ء کے آخر تک غدر تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ کم از کم اہم مقامات میں امن قائم ہو چکا تھا۔ چنانچہ گورنر جنرل نے امن کا اعلان بھی کر دیا۔

کمپنی کا خاتمہ

۱۸۵۷ء کی بغاوت ہندوستان کی تاریخ کا ایک بہت اہم واقعہ ہے۔ ہندوستانی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن پھر بھی سیاسی نقطۂ نظر سے اس کے نتائج بہت اہم ہیں۔ حکومت برطانیہ نے یہ طے کر لیا کہ اب ہندوستان کی حکومت کمپنی سے لے لی جائے۔ کمپنی کی تجارتی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ اب اُس کی سیاسی زندگی کا بھی خاتمہ کر دیا گیا۔ پارلیمنٹ نے کورٹ آف ڈائرکٹرس اور بورڈ آف کنٹرول کو توڑ دیا اور ہندوستان کی حکومت کے لئے ایک سکریٹری آف اسٹیٹ اور اُس کی کونسل کو مقرر کیا۔ اس کونسل میں پندرہ ممبر ہوتے تھے۔ ہندوستان کا گورنر جنرل اب وائسرائے بھی ہو گیا اور لارڈ کیننگ پہلا وائسرائے مقرر ہوا۔ پہلی نومبر ۱۸۵۸ء کو وائسرائے نے الہ آباد میں ایک دربار کیا اور ملکہ معظمہ کا اعلان سُنایا۔ یہ اعلان ہمارے ملک کی تاریخ میں بہت خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس اعلان کے ذریعہ سے ملکہ وکٹوریہ نے اس ملک کے باشندوں کو یہ اطمینان دلانے کی کوشش کی کہ ہندوستانیوں کے حقوق کا خیال کیا جائے گا اور اُن کے مذہبی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی حکومت کی طرف

سے نہیں ہوگی ۔ اعلان میں یہ الفاظ موجود ہیں "یہ ہماری عین خسروانہ مرضی اور خوشی ہے کہ کسی شخص پر اُس کے مذہبی عقائد اور رسوم کی وجہ سے ظلم نہ کیا جائے ۔ بلکہ قانون سب کو بالکل برابر سمجھے ۔ ہم نہایت تاکید سے یہ بات اُن لوگوں پر جو ہماری ماتحتی میں ہیں واجب العمل قرار دیتے ہیں کہ وہ ہماری رعایا کے مذہبی عقائد یا عبادت میں خلل اندازی کرنے سے پرہیز کریں ۔ اس کی خلاف ورزی ہمارے انتہائی عتاب کا باعث ہوگی ۔ یہ بھی ہماری منشار ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ہماری رعایا خواہ وہ کسی نسل یا مذہب سے تعلق رکھتی ہو آسانی اور غیر جانبداری سے سرکاری ملازمت میں داخل کی جائے ۔ جس کے فرائض کی ادائیگی کے لئے وہ اپنی تعلیم قابلیت اور دیانت داری کے لحاظ سے اہل ہو ۔"

باب ۱۵

دستور اساسی اور نظام حکومت ۱۸۵۸ء - ۱۹۴۰ء

وزیر ہند اور اُس کی کونسل

اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ غدر کے بعد ہندوستان کے نظام حکومت میں بہت تبدیلیاں ہوئیں ۔ کمپنی کا خاتمہ ہو گیا اور سلطنت برطانیہ نے ہندوستان کا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا ۔ اس مقصد کے لئے ایک وزیر مقرر کیا گیا ۔

جو کیبنٹ کا رُکن ہے اور اُس کی مدد کے لئے ایک کونسل قائم کی گئی جس کو "انڈیا کونسل" کہتے ہیں۔ اس میں پندرہ ممبر تھے جن میں سے آٹھ کو بادشاہ نے نامزد کیا تھا اور سات کو کورٹ آف ڈائرکٹرز نے۔ لیکن اگر ان سات ممبروں میں سے کسی کی جگہ خالی ہوتی تو کونسل خود اُس جگہ کے لئے کسی کو ممبر بنا لینے کا حق رکھتی تھی۔ مالی امور میں کونسل کی منظوری ضروری تھی۔ دوسرے معاملات میں وزیر ہند (یا سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا) کو کونسل کی رائے کے خلاف اپنی مرضی اور ذمہ داری پر کام کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ چونکہ ممبروں میں سے زیادہ ایسے تھے جو کم ازکم دس سال ہندوستان میں رہے ہوں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ پارلیمنٹ کا مقصد یہ تھا کہ حکومت ہند کے معاملات میں وزیر ہند کو اُن لوگوں کا مشورہ ملے جو ہندوستان سے بخوبی واقف ہیں۔

ابتدا میں اس کونسل کے اختیارات بہت وسیع تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد پارلیمنٹ نے رفتہ رفتہ کونسل کے اختیارات کم کرکے وزیر ہند کے اختیارات کو بڑھایا۔ کونسل کے قیام کے دس سال بعد خالی جگہوں پر ممبروں نامزد کرنے کا حق اُس سے لے لیا گیا۔ یہ بھی طے ہوگیا کہ ممبروں کا تقرر دس سال کے واسطے کیا جائے اور خاص خاص حالتوں میں صرف پانچ سال کی توسیع کی جائے۔ ۱۸۸۹ء میں وزیر ہند کو اختیار دیا گیا کہ وہ کونسل میں جو جگہیں خالی ہوں اُن کو ویسے ہی رہنے دے یہاں تک کہ ممبروں کی تعداد صرف دس رہ جائے۔ ۱۹۰۷ء میں ہندوستانیوں کو بھی اس کونسل کا ممبر بنایا گیا اور اسی زمانہ میں ممبروں کی تعداد پھر بڑھا کر چودہ کر دی گئی اور ممبری کی مدت بجائے دس کے سات سال ہوگئی۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی رو سے کونسل آف انڈیا کو قائم رکھا گیا۔ لیکن گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء نے یہ طے کر دیا ہے کہ

اس کونسل کو ختم کر دیا جائے اور اس کی بجائے "سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا" کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ کم از کم تین اور زیادہ سے زیادہ چھ ایڈوائزرس (مشیر) مقرر کرے۔ ان میں سے کم از کم نصف ایسے ہونگے جو دس سال یا اس سے زیادہ مدت تک ہندوستان میں ملازمت کر چکے ہیں۔

گورنر جنرل اور ایگزیکٹو کونسل

کمپنی کے خاتمہ پر گورنر جنرل کو وائسرائے کا خطاب بھی عطا ہوا یعنی اب وہ گورنر جنرل اور وائسرائے ہند کہلانے لگا۔ کیننگ کا خیال تھا کہ گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنی یہ تجویز حکومت برطانیہ کے سامنے پیش کی۔ لیکن دو سال کے اندر ہی اُس کو تجربہ سے معلوم ہوا کہ بغیر اس کونسل کے حکومت کو متعدد دقتوں کا سامنا ہو گا۔ لہذا اُس نے اپنی تجویز واپس لے لی اور ۱۸۶۱ء کے ایکٹ کی رو سے اس کونسل کو قائم رکھا گیا۔ اب اُس کے پانچ معمولی ممبر تھے اور کمانڈر ان چیف کو خاص طور پر ممبر بنا لیا جاتا تھا۔ ایک اہم تبدیلی یہ کی گئی کہ کونسل کے ہر ممبر کو ایک یا ایک سے زاید محکموں کا ذمہ دار بنا دیا گیا۔ غدر سے پہلے تمام کاغذات ہر ممبر کے پاس جایا کرتے تھے۔ اس میں بہت وقت ضائع ہوتا تھا۔ اب ہر محکمہ کے معاملات وہ ممبر طے کرنے لگا جو اُس کا ذمہ دار تھا اور صرف اہم معاملات کونسل کی میٹنگ میں پیش ہوتے تھے۔ گورنر جنرل نے اپنے ذمہ فارن ڈپارٹمنٹ یعنی امور خارجی لئے لیکن ہر اہم معاملہ اُسی کی رائے سے طے ہوتا تھا۔ اس طرح سے گورنر جنرل کے اختیارات بمقابلہ پیشتر کے اور زیادہ ہو گئے۔

۱۸۷۴ء میں ایک ممبر کا اضافہ ہو گیا اور پبلک ورکس ڈپارٹمنٹ (یعنی محکمہ امور عامّہ) اُس کے سپرد کیا گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد محکمہ صنعت و حرفت اسکے

سپرد ہوا۔ ۱۹۰۵ء میں اس کونسل میں ایک اہم تبدیلی کی گئی۔ کونسل میں کمانڈر ان چیف کے علاوہ ایک ملٹری (فوجی) ممبر بھی ہوتا تھا۔ فوجی بجٹ کی تیاری اور رسد وغیرہ کی خریداری اسی کے سپرد تھی۔ جب لارڈ کرزن کے عہد میں لارڈ کچنر کمانڈر ان چیف ہوا تو اس نے اس پر اعتراض کیا۔ کرزن نے اس کی مخالفت کی۔ حکومت برطانیہ نے اس مسئلہ میں کچنر کی رائے کو ترجیح دی اور ملٹری ممبر کی بجائے ملٹری سپلائی ممبر کا تقرر ہوا۔ جس کے اختیارات بہت کم تھے۔ چار سال بعد یعنی ۱۹۰۹ء میں اس جگہ کو بالکل ختم کر دیا گیا اور تعلیم اور صفائی کے لئے ایک نئے ممبر کا تقرر کیا گیا۔ اب ہندوستانی بھی اس کونسل کے ممبر بنائے جانے لگے۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ نے بھی اس کونسل کو قائم رکھا۔ چنانچہ اس وقت تک وہ قائم ہے لیکن ۱۹۳۵ء میں جو ایکٹ پاس ہوا ہے اس کی رو سے ایگزیکٹو کونسل کی بجائے گورنر جنرل کو مدد دینے کے لئے کونسل آف منسٹرس (یا مجلس وزرا) ہوگی اور ان کے علاوہ گورنر جنرل کو اختیار دیا گیا ہے کہ مذہبی امور، خارجی تعلقات اور سرحدی علاقوں کے معاملات کے لئے تین ایڈوائزرس (یعنی مشیر) مقرر کر سکتا ہے۔ ابھی تک ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کا وہ حصہ نافذ ہوا ہے جس کا تعلق صوبوں کی حکومت سے ہے اور مرکزی حکومت وہی ہے جو ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی رو سے قائم کی گئی تھی۔

لیجسلیٹو کونسل (مجالس وضع قوانین) ۱۸۵۸-۱۸۹۲ء

حکومت برطانیہ نے ۱۸۵۳ء میں گورنر جنرل کی کونسل کو وضع قوانین کی اختیارات دیدئے تھے اور اس غرض کے لئے ایگزیکٹو کونسل میں چھ ممبروں کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں یہ کونسل از سر نو

ترتیب دی گئی۔ ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں کے علاوہ کم از کم چھ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ممبر اور رکھے گئے۔ اب ہندوستانیوں کی خواہش تھی کہ کچھ ہندوستانی بھی کونسل کے ممبر بنائے جائیں۔ سر سید احمد خاں نے اسی زمانہ میں ایک پمفلٹ لکھا اور اس میں بتلایا کہ اگر لیجسلیٹو کونسل میں ہندوستانی ممبر ہوتے تو وہ قوانین نہ بنتے جن سے نقصان پہنچا۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء میں تین ہندوستانیوں کو نامزد کیا گیا یعنی مہاراجہ پٹیالہ۔ راجہ بنارس اور سر دِنکر راؤ (یہ ہلکر کی ریاست کا وزیر اعظم تھا) بعد میں انگریزی علاقے سے بھی ہندوستانی ممبر لئے جانے لگے۔ ایک اور تبدیلی جو اس ایکٹ کی رو سے ہوئی یہ تھی کہ بمبئی، مدراس اور بنگال میں لیجسلیٹو کونسلیں قائم ہوگئیں اور ۱۸۸۶ء میں یہ حق صوبہ شمالی مغربی کو بھی مل گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد صوبہ پنجاب میں بھی کونسل قائم کردی گئی۔ ۱۸۹۲ء میں پارلیمنٹ نے ایک اور ایکٹ پاس کیا جس کی رُو سے ہندوستان کی حکومت اور کونسلوں میں کچھ تبدیلیاں ہوئیں۔ اب ملک کے حالات کا رنگ بدلنے لگا تھا۔ ہندوستانیوں میں قومی احساس شروع ہوگیا تھا۔ کانگریس قائم ہو چکی تھی اور ہندوستانیوں کی طرف سے مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ کونسلوں کے ممبر کی تعداد بڑھائی جائے۔ اُن کا تقرر بذریعہ انتخابات ہو اور اُن کے اختیارات بھی وسیع کر دئے جائیں۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کی رو سے وائسرائے کی لیجسلیٹو کونسل (یعنی مجلس وضع قوانین) کے غیر سرکاری ممبروں کی تعداد کم از کم دس[1] اور زیادہ سے زیادہ سولہ کر دی گئی۔ کونسل کو بجٹ پر بحث کرنے اور انتظام حکومت پر سوالات کرنے کا حق بھی دیدیا گیا لیکن سب سے اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ کونسل کے کچھ ممبروں کا انتخاب صوبوں کی کونسلوں

کے ممبر کرنے لگے - اسی طرح صوبوں کی کونسلوں میں ممبروں کی تعداد زیادہ کر دی گئی اور اُن میں سے بھی کچھ ممبروں کا انتخاب ڈسٹرکٹ بورڈ۔ میونسپل بورڈ اور یونیورسٹیوں کے ذریعہ سے ہونے لگا۔ لہذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس ایکٹ کی رو سے پہلی مرتبہ ہندوستان کی لیجسلیٹو کونسلوں میں کچھ ممبروں کا تقرر بذریعہ انتخابات ہوا یعنی حکومت نے الکشن کے اُصول کو تسلیم کر لیا۔

مارلے منٹو ریفارمس ۱۹۰۹ء

ہندوستان کی تاریخ میں بیسویں صدی کے ابتدائی چند سال ایک خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اب ہندوستانیوں میں قومیت کا احساس بہت کافی ہو چکا تھا اور برابر بڑھ رہا تھا۔ لارڈ کرزن کے عہد میں بہت سی ایسی باتیں ہوئیں جنہوں نے قومی تحریک میں جان ڈال دی۔ کانگریس کے دو حصے ہو گئے تھے۔ انتہائی پسند طبقے نے بہت قوت حاصل کر لی تھی۔ پونا میں تلک کی کوشش کامیاب ہو چکی تھی۔ تلک اور اُس کے ساتھی چاہتے تھے کہ ہندوستان میں صرف ہندوؤں کی حکومت ہو اور اُن کے نزدیک مسلمان بھی انگریزوں کی طرح پردیسی تھے۔ اُس نے شیواجی کو قومی ہیرو بنانے کی کوشش کی۔ بنگال کے نوجوانوں میں بھی بہت زیادہ جوش تھا۔ تقسیم بنگال کے بعد یہ جوش اور بڑھ گیا۔ کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ بھی اس میں شریک ہو گئے۔ بنگالیوں کا خیال تھا کہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک ایسا صوبہ بنایا گیا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ چنانچہ انگریز افسروں پر حملے اور ہندو مسلمان فسادات شروع ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا

ہے کہ جب لارڈ منٹو نے حکومت ہند کو اپنے ہاتھ میں لیا تو ملک کی حالت خراب تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح ان تحریکوں کو روکے۔ لیکن اس کو اس میں بہت زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔

بہرحال وزیر ہند اور گورنر جنرل نے یہ طے کر لیا کہ ہندوستان کے نظام حکومت میں کچھ اصلاحات ضروری ہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی تجاویز برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کریں اُن کو بہت سے اُمور پر غور کرنا تھا۔ سب سے زیادہ اہم مسلمانوں کی نمایندگی کا مسئلہ تھا۔ ۱۸۹۲ء کی اصلاحات کے بعد سے ایسے واقعات پیش آ رہے تھے جنہوں نے مسلمانوں کے دلوں میں ہندوؤں کی طرف سے کچھ شکوک پیدا کر دیے تھے۔ مسلمانوں کی آبادی ایک چوتھائی تھی لیکن کونسلوں میں مسلمان ممبروں کی تعداد تیرہ فیصدی سے زیادہ نہیں بڑھی اس سے اُن کو خطرہ تھا کہ آیندہ بھی اُن کو یہی نقصان اُٹھانا پڑے گا۔ سر ولنٹائن چرول کا قول کچھ زیادہ غلط نہیں کہ "جس قدر بھی اختیارات ہندوستانیوں کو زیادہ دیے جائیں گے اس کے یہی معنی ہو سکیں گے کہ عملی حیثیت سے ہندو اکثریت کے اختیارات بڑھا دیے جائیں" ہندو لیڈروں نے مسلمانوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ خاص طور پر تقسیم بنگال کے مسئلہ پر انہوں نے مسلمانوں کے جذبات کو بہت بڑا صدمہ پہنچایا تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کا ایک وفد آغا خاں کی سرکردگی میں گورنر جنرل کے پاس گیا اور مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی نمایندگی کے لئے خاص طور پر قوانین بنائے جائیں۔ گورنر جنرل نے اُن کے اس مطالبہ کو جائز سمجھا اور نئی اصلاحات میں "انتخاب جداگانہ" کے اصول کو تسلیم کیا گیا اور مسلمانوں کے لئے اُن کی آبادی ہی نہیں بلکہ سیاسی اہمیت کے لحاظ سے کونسلوں میں جگہیں مقرر کر دی گئیں۔

آخرکار ۱۹۱۹ء میں پارلیمنٹ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا۔ جس کی رو سے کونسلوں کے ممبروں کی تعداد بھی زیادہ ہوگئی اور اختیارات بھی وسیع کر دئے گئے۔ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبروں کی تعداد سہ چند ہوگئی۔ صوبوں کی کونسلوں میں بھی ممبروں کی تعداد قریب قریب دوگنی ہوگئی۔ مرکزی کونسل کے ممبروں میں سے ستائیس کا انتخاب رعایا کی طرف سے ہوتا تھا۔ ان میں سے بعض کو تو خاص خاص جماعتیں مثلاً مسلمان اور زمیندار وغیرہ منتخب کرتے تھے اور بقیہ صوبوں کی کونسلوں کے غیر سرکاری ممبر منتخب کرتے تھے۔ صوبوں کی کونسلوں میں بھی غیر سرکاری ممبروں کی تعداد سرکاری ممبروں کے مقابلہ میں زیادہ ہوگئی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ مرکزی اور نیز صوبوں کی ایگزیکٹو کونسلوں میں ہندوستانی ممبر مقرر کئے گئے۔ اس طرح سے ہندوستانیوں کو ملک کی حکومت اور وضع قوانین میں کافی حصہ مل گیا اور کونسلوں کی کارروائی پارلیمنٹ کی طرح ہونے لگی لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ حکومت برطانیہ نے اپنے اختیارات میں بہت زیادہ کمی کرلی۔ کیونکہ اب بھی پارلیمنٹ کو ہندوستان کے معاملات پر مکمل اختیارات تھے۔ لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس ایکٹ کے ذریعہ سے ہندوستانیوں نے ذمہ دارانہ حکومت کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ اس کے بعد اگلی منزلیں طے ہونے لگیں۔

شاہی دربار ۱۹۱۱ء

ان اصلاحات سے قومی تحریک نہ رک سکی۔ تقسیم بنگال اور دیگر مسائل ابھی تک اسی حالت میں تھے اور انتہا پسندوں کی کوششیں بھی اسی طرح جاری تھیں۔ لارڈ منٹو کا جانشین لارڈ ہارڈنج کو کیا گیا۔ اس کے عہد کا ایک عظیم الشان واقعہ دہلی کا دربار ہے۔ شہنشاہ جارج پنجم اور ملکہ میری نے دسمبر ۱۹۱۱ء میں بڑی شان

و شوکت کے ساتھ دہلی میں دربار کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ شہنشاہ برطانیہ وہند نے یہاں آکر دربار کیا اور انعامات اور بخششوں کے علاوہ بہت سے اہم معاملات کے متعلق اعلانات کئے۔ مثلاً تقسیم بنگال کو جس کی وجہ سے ملک میں شورش ہو رہی تھی منسوخ کر دیا گیا۔ مشرقی بنگال و آسام کا صوبہ توڑ دیا گیا۔ اُس کا جنوبی حصہ مع ڈھاکہ کے بنگال میں شامل کر دیا گیا۔ آسام ایک چیف کمشنر کے سپرد ہو گیا۔ بنگال میں گورنر کا تقرر ہوا اور اُس کی مدد کے لئے ایک ایگزیکٹو کونسل بھی قائم کی گئی۔ بہار۔ اڑیسہ اور چھوٹا ناگپور ملا کر ایک نیا صوبہ بنایا گیا جس کا دارالسلطنت پٹنہ ہوا۔ بنگال کا دارالسلطنت کلکتہ ہی رہا۔ لیکن ہندوستان کا دارالسلطنت دہلی کو بنا دیا گیا۔ اب دہلی کو نئے مغربی طرز پر بنانے کی کوشش کی گئی۔ چنانچہ آج وہ نئی دہلی یا رائے سینا کے نام سے مشہور ہے۔

مسلمانوں میں بیداری

یہ رعایتیں اور اعلانات انتہا پسندوں کو خاموش نہیں کر سکیں یہاں تک کہ سنہ ۱۹۱۲ء میں وائسرائے پر بم پھینکا گیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اب مسلمانوں کا رویہ بدل گیا تھا۔ اس وقت تک یہ قوم حکومت کی ایسی مخالفت نہ کرتی تھی جیسے کہ ہندو کرتے تھے۔ لیکن بعض واقعات نے اُن کو بھی مخالفت پر مجبور کر دیا۔ مسلمانوں میں یہ تبدیلی صرف ہندوستان کے واقعات ہی سے نہیں ہوئی بلکہ اس میں بیرونی حالات کا بھی بہت کافی اثر تھا۔ اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر لیا تھا۔ انگریزوں اور روسیوں کے درمیان ایران کے متعلق ایک عہد نامہ ہو گیا تھا اور اب ترک جنگ بلقان میں یورپ کی سلطنتوں سے لڑ رہے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر ہندی مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ رفتہ رفتہ

تمام خود مختار اسلامی ریاستوں کو یورپ کی قومیں ختم کردیں گی۔ ترکوں کو تباہی اور بربادی سے بچانے کے لئے انجمنیں قائم ہوئیں۔ چندہ لیا گیا اور ایک میڈیکل مشن بھی روانہ کیا گیا۔ مسلمانوں کے قومی جوش کا ثبوت کانپور کی مسجد کے واقعہ میں ملتا ہے۔ یہاں ایک سڑک بنانے کے سلسلہ میں ایک مندر اور ایک مسجد کا کچھ حصہ توڑنے کی تجویز پیش کی گئی بعد میں مندر تو بچ گیا لیکن مسجد نہ بچ سکی۔ اس پر مسلمان بگڑ گئے۔ اُن پر گولیاں چلائی گئیں اور معاملہ بہت طول پکڑ گیا۔ وائسرائے کو خود اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے کانپور جانا پڑا۔

جنگ عظیم اور اُس کے نتائج ۱۹۱۴-۱۹۱۸ء

ابھی یہ شورش ختم نہیں ہوئی تھی کہ یورپ میں جنگ عظیم چھڑ گئی۔ لڑائی کا اثر لوگوں پر اس قدر زیادہ ہوا کہ انہوں نے ہر طرح سے حکومت برطانیہ کو مدد دینے کا وعدہ کیا۔ اگرچہ بعض انتہا پسند اب بھی حکومت کے مخالف تھے۔ لیکن ملک کے باشندوں کی کثیر تعداد گورنمنٹ کے ساتھ تھی۔ ہندوستان میں فوج کی بھرتی شروع ہوئی اور روپیہ بھی کافی جمع ہوا۔ ہندوستانی فوجیں فرانس۔ افریقہ اور عراق میں لڑیں لیکن رفتہ رفتہ لڑائی کا سلسلہ بڑھتا گیا اور اب یہ امر ظاہر ہو گیا کہ "اتحادی" بھی جلد اور آسانی سے فتح نہیں حاصل کر سکتے۔ ۱۹۱۶ء میں لارڈ ہارڈنج نے لارڈ چیمسفورڈ کو چارج دیا۔ اسی زمانہ سے ہندوستانیوں کے رویہ میں تبدیلی نظر آتی ہے۔ مسلمان تو ابتدا ہی سے اس لڑائی سے گھبرائے ہوئے تھے۔ کیونکہ خلیفۃ المسلمین یعنی سلطان ترکی انگریزوں کے خلاف جنگ کر رہے تھے۔ عربوں نے سلطان ترکی کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور خطرہ تھا کہ

ترکوں کی قوت کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ خیالات زور پکڑتے رہے اور آخرکار اُن کا نتیجہ "خلافت" کی تحریک میں ظاہر ہوا۔ ہندوؤں میں بھی جنگ کے لئے اب زیادہ جوش نہیں تھا۔ آئرلینڈ کی بغاوت نے ان کو اور بھڑکا دیا تھا۔ تاجر لوگ بھی حکومت کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھے۔ تلک نے مسز بیسنٹ کی مدد سے کانگریس پر اثر قائم کر لیا اور ہوم رول یا سوراج کی تحریک شروع کر دی۔ تلک اور اُس کے ساتھیوں کا تعصب اب بہت کم ہو گیا تھا۔ چنانچہ مسلم لیگ اور کانگریس میں لکھنؤ کے مقام پر سنہ ۱۹۱۶ء کے آخر میں ایک عہد نامہ ہوا۔ مسلم لیگ نے سوراج کی تحریک میں حصہ لینے کا وعدہ کیا اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے حق کو تسلیم کر لیا۔ ہندو اور مسلمانوں کے اتفاق نے اس تحریک کو بہت مضبوط بنا دیا۔ چنانچہ ۲۰ اگست سنہ ۱۹۱۷ء میں مسٹر ای۔ ایس۔ مانٹیگو وزیر ہند نے حکومت برطانیہ کی طرف سے ایک نہایت اہم اعلان کیا کہ "اہل ہند کو نظام سلطنت کے ہر شعبہ میں حصہ لینے کا پہلے سے زیادہ موقع دیا جائے گا۔ حکومت برطانیہ کا یہ منشا ہے کہ ہندوستانیوں کو بتدریج اس قابل کر دیا جائے کہ حکومت خود اختیاری کی ذمہ داریوں سے آشنا ہو جائیں اور آئندہ اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لے سکیں"۔ اس اعلان کے بعد مسٹر مانٹیگو خود ہندوستان آئے اور وائسرائے کے ساتھ مل کر ایک رپورٹ تیار کی جو مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے نام سے مشہور ہے۔ اسی رپورٹ کے اصولوں پر ہندوستان کا نیا دستور اساسی وضع کیا گیا۔

اصلاحات سنہ ۱۹۱۹ء

سنہ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی رو سے وضع قوانین کے لئے بجائے ایک کے دو مجلسیں قائم ہو گئیں یعنی "کونسل آف اسٹیٹ" اور "لیجسلیٹو اسمبلی"۔ کونسل آف اسٹیٹ کے

ساٹھ ممبروں میں سے تینتیس منتخب کئے جاتے ہیں اور باقی کو گورنمنٹ نامزد کرتی ہے۔ ان میں سے زیادہ سے زیادہ بیس ممبر سرکاری ملازموں میں سے لئے جا سکتے ہیں۔ کونسل کے صدر کا تقرر حکومت کرتی ہے لیجسلیٹو اسمبلی کے مقابلہ میں کونسل آف اسٹیٹ کی اہمیت بہت کم ہے لیجسلیٹو اسمبلی میں ایک سو پینتالیس ممبر ہیں۔ ان میں سے ایک سو چار کا انتخاب ملک کے رہنے والوں نے کیا ہے اور اکتالیس ممبروں کو حکومت نے نامزد کیا ہے۔ جن میں سے چھبیس سرکاری ملازم ہیں۔ پریزیڈنٹ اور ڈپٹی پریزیڈنٹ کا انتخاب اسمبلی کے ممبر خود ہی کرتے ہیں۔ اسمبلی کی میعاد تین سال مقرر کی گئی ہے لیکن گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ اس مدت کو کم یا زیادہ کر دے۔ مسلمانوں اور انگریزوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا ہے اور ان کے علاوہ پنجاب میں سکھوں کو اور مدراس و بمبئی میں بھی کچھ قوموں کو یہ حق ملا ہے۔ یعنی جداگانہ انتخاب کے اصول کو صرف تسلیم ہی نہیں کیا گیا بلکہ اس کو اور زیادہ وسیع کر دیا گیا۔ ان مجلسوں کو وضع قوانین کے لئے بہت وسیع اختیارات دئے گئے ہیں اور بجٹ پر بھی بحث کرنے اور ووٹ دینے کا حق ہے لیکن گورنر جنرل کو اختیار ہے کہ اگر یہ مجلسیں بجٹ کے کسی حصے کو نامنظور کریں اور وہ یہ سمجھے کہ وہ ضروری ہے تو اس کو وہ خود پاس کر سکتا ہے۔

اس ایکٹ کی رو سے صوبوں میں "ڈائرکی" یا "دو عملی حکومت" کا نفاذ ہوا۔ یعنی اعلیٰ محکمہ جات کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ بعض محکمے جیسے تعلیم، زراعت، حفظانِ صحت وغیرہ وزیروں کے سپرد کر دئے گئے اور صوبہ کی کونسل کے سامنے ان وزیروں کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔

وزیروں کی تنخواہ کا انحصار بھی کونسل کے ووٹ پر تھا۔ باقی محکمے مثلاً

فوج۔ پولیس جیل اور مالیات وغیرہ گورنر اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے ہاتھ میں رہے۔ صوبوں کی لیجسلیٹو کونسلوں میں منتخب شدہ ممبروں کی تعداد ستر فیصدی کردی گئی اور یہ بھی طے کردیا کہ سرکاری ملازموں میں سے جو ممبر نامزد کئے جائینگے اُن کی تعداد بیس فیصدی سے زیادہ نہ ہوگی۔

سیاسی شورش

مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارمس سے سیاسی شورش میں کمی نہیں ہوئی۔ ایکٹ پاس ہونے سے پہلے مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اسی زمانہ میں "رولٹ کمیٹی" نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کمیٹی کے مقرر کرنے کی غرض یہ تھی کہ ایسی تدابیر سوچی جائیں جن سے شورش کا انسداد ہوسکے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ پر "رولٹ ایکٹ" نافذ کیا گیا اس نے ملک میں اور زیادہ بےچینی پھیلادی اور ہر طرف سے اُس کی مخالفت ہوئی۔ چند مقامات پر زبردست ہنگامے ہوئے۔ خاص کر پنجاب کے چند اضلاع میں جہاں مارشل لا (یا جنگی قانون) نافذ کردیا گیا اور جلیانوالہ باغ میں بہت سے ہندوستانی ہلاک ہوئے۔ اس موقع پر جنرل ڈائر کے حکم سے فوج کے سپاہیوں نے پبلک پر گولی چلائی کیونکہ یہ لوگ قانون کے خلاف جلسہ کررہے تھے۔ پونے چارسو آدمی مارے گئے اور بارہ سو زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کے فوراً ہی بعد ایک دوسرے مقام پر ہوائی جہازوں کے ذریعہ گولے برسائے گئے اور مجموں کو منتشر کرنے کے لئے مشین گن کام میں لائی گئی۔ یہ ظاہر ہے کہ ان واقعات سے سیاسی شورش کی آگ اور زیادہ بھڑک گئی ان حالات میں اصلاحات کی سخت مخالفت ہوئی اور گاندھی جی اور علی برادران کی رہنمائی میں ہندو مسلمانوں نے متفقہ طور پر عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لیا۔ مسلمانوں کی بےچینی ان واقعات کے علاوہ مسئلہ خلافت کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گئی

تھی۔ غرض یہ کہ اندرونی اور بیرونی واقعات ایسے پیش آئے کہ تحریک ترک موالات میں ہندو اور مسلمانوں نے بڑے جوش سے حصہ لیا۔ اس تحریک کے رہنماؤں نے لوگوں کو تلقین کی کہ انگریزی حکومت سے ترک تعاون کریں۔ ولایتی کپڑے کا استعمال چھوڑ دیں۔ سرکاری نوکری کو خیرباد کہیں۔ سرکاری عدالتوں اور مدارس کو بائیکاٹ کریں۔ ٹیکس دینا بند کر دیں اور کونسلوں میں نہ جائیں۔

لارڈ ریڈنگ ۱۹۲۱-۱۹۲۶ء

۱۹۲۱ء میں لارڈ ریڈنگ کو ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ نئے گورنر جنرل نے نہایت ہوشیاری اور سختی کے ساتھ قومی تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ بہت سے لیڈروں کو بغاوت کے الزام میں قید کر لیا گیا۔ ترک موالات کی تحریک پر اس کا بہت اثر ہوا اور رفتہ رفتہ وہ ختم ہو گئی۔ ہندو اور مسلمانوں کے تعلقات بھی خراب ہونے شروع ہو گئے۔ موپلوں کی بغاوت نے اس نفاق کو بہت بڑھا دیا۔ یہ لوگ مالابار کے ساحل پر آباد تھے۔ ان کے آبا و اجداد عرب سے آئے تھے، لیکن بعد میں یہیں آباد ہو گئے۔ موپلوں نے ہندوؤں پر بھی حملے کئے۔ حکومت نے اُن کی شورش کو فوجی طاقت کے ذریعہ سے دبا دیا اور بہت سے موپلوں کو گرفتار کر کے حبس دوام اور دوسری سخت سزائیں دیں۔ تحریک ترک موالات کی ناکامیابی سے گاندھی جی کا اثر ملک اور کانگریس میں کم ہو گیا۔ مسٹر سی۔ آر۔ داس اور پنڈت موتی لال نہرو نے سوراج پارٹی کی بنیاد ڈالی اور یہ طے کیا کہ ہندوستانیوں کو کونسلوں میں جانا چاہیے۔ لارڈ ریڈنگ نے گاندھی جی کو اور لیڈروں کے ساتھ جیل خانہ بھیجدیا۔

جنگ عظیم کے بعد اور ملکوں کی طرح ہندوستان کی بھی مالی حالت نہایت خراب ہوگئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی کہ اس کی حالت درست کرنے کے لئے اپنی تجاویز پیش کرے۔ اس کمیٹی کا کام مصارف میں تخفیف کرنا اور بجٹ کی صورتیں نکالنا تھا۔ اُس نے تخفیف کے لئے بعض کچھ تجویزیں پیش کیں اور نمک کا محصول زیادہ کر دیا۔ یونیورسٹیوں کی اصلاح کے لئے بھی ایک کمیشن مقرر ہوا۔ دہرہ دون میں فوجی تعلیم کے لئے ایک کالج کھولا گیا۔

لارڈ اِروِن ۱۹۲۶ء-۱۹۳۱ء

نئے گورنر جنرل اور وائسرائے لارڈ اِروِن ۱۹۲۶ء میں یہاں آئے۔ وہ شریف۔ ملنسار۔ خوش اخلاق اور بہت عمدہ آدمی تھے۔ اُن کو زراعت سے بہت دلچسپی تھی اور اکثر دیہاتوں میں زراعت اور کاشتکاروں کی حالت دیکھنے کو دورہ کرتے تھے۔ وہ اپنی ان خوبیوں کی وجہ سے اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انگلستان واپس جانے سے پہلے اُنھوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ اس ملک کا دستور اساسی اب انگریزوں اور ہندوستانیوں کی متحدہ کانفرنسوں اور مشوروں کے بعد تیار ہوا۔

سائمن کمیشن ۱۹۲۷ء

مانٹیگو چیمسفورڈ رپورٹ میں وعدہ کیا گیا تھا کہ دس سال بعد پارلیمنٹ پھر تحقیقات کرے گی کہ ہندوستان میں اصلاحات کامیاب ہوئیں یا نہیں۔ لیکن دس سال گزرنے سے پہلے ہی پارلیمنٹ نے ایک کمیشن اس مقصد کے لئے مقرر کیا جس کا صدر سر جان سائمن تھا۔ ملک میں ابھی شورش جاری تھی اور جب یہ اعلان ہوا کہ کمیشن میں صرف انگریز ہی ممبر ہوں گے تو ہندوستانیوں کی ناامیدی اور بڑھ گئی اور سیاسی لیڈروں میں سے بہت سے ایسے

تھے جنہوں نے اس کمیشن کو بائیکاٹ کیا۔ بہرحال کمیشن ہندوستان آیا۔
یہاں اسمبلی کے ممبروں کی ایک کمیٹی مقرر ہوئی کہ کمیشن کے ساتھ ملک میں دورہ
کرے اور تحقیقات کے بعد اپنی ایک علیحدہ رپورٹ تیار کرے۔ ۱۹۲۸ء میں
ایک اور کمیشن سر ہارکورٹ بٹلر کی زیر صدارت مقرر ہوا کہ دیسی ریاستوں
میں دورہ کرکے ایک رپورٹ پیش کرے کہ آئندہ دستور اساسی میں برطانوی
ہند اور ریاستوں کے کیا تعلقات ہونے چاہئیں۔ یہ رپورٹ ۱۹۲۹ء میں
تیار ہوگئی۔

تحریک سول نافرمانی

اوپر بیان کیا گیا ہے کہ سائمن کمیشن پر ہندوستانیوں کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس میں کوئی
ہندوستانی شامل نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں شورش بہت بڑھ گئی۔
کانگریس اور بعض دوسری جماعتوں نے کمیشن کو بائیکاٹ کیا اور گاندھی جی کی
رہنمائی میں سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی۔ تحصیل بارڈولی میں لگان
دینے سے انکار کیا گیا۔ اس شورش کو دور کرنے کی غرض سے لارڈ اردن نے
سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے سے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان
کے آئندہ دستور اساسی کے متعلق غور و فکر اور بحث مباحثہ کے لئے نومبر
۱۹۳۰ء میں ایک گول میز کانفرنس ہوگی۔ اس میں شرکت کے لئے سیاسی
رہنماؤں، تجربہ کار مدبروں، دیسی حکمرانوں اور باثر زمینداروں کو دعوت دی گئی۔
لیکن کانگریس نے اب بھی بائیکاٹ کیا کیونکہ کانفرنس میں اس وقت تک جانا
بیکار تھا جب تک کہ ہندوستانیوں کو ذمہ دارانہ حکومت دینے کا وعدہ
نہ کیا جائے۔ اب گاندھی جی نے ستیہ گرہ شروع کیا۔ قانون کے خلاف نمک
بنایا۔ اس پر وہ خود اور بہت سے دوسرے لیڈر گرفتار ہوگئے۔ ملک میں

یہ فضا تھی جبکہ پہلی گول میز کانفرنس لندن میں منعقد ہوئی۔ لیکن پہلی کانفرنس کے بعد حکومت کانگریس سے صلح کرنے میں کامیاب ہوئی اور "گاندھی ارون صلحنامہ" ہو جانے پر سول نافرمانی بھی بند ہوگئی اور قیدی بھی رہا کر دئے گئے۔ لارڈ ارون کا یہ بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں وہ انگلستان واپس چلے گئے اور لارڈ ولنگڈن وائسرائے مقرر ہو کر ہندوستان آئے۔

گول میز کانفرنس اور جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی

"ارون گاندھی عہدنامہ" کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ستمبر ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس لندن میں ہوئی تو کانگریس نے اس میں شرکت کی اور گاندھی جی کو اپنا نمایندہ بنا کر بھیجا۔ اس عرصہ میں انگلستان میں بجائے "لیبر منسٹری" کے "نیشنل گورنمنٹ" قائم ہو چکی تھی۔ کانفرنس کی کارروائی کانگریس کی نظر میں قابل اطمینان نہ تھی۔ لہذا گاندھی جی واپس آ گئے اور سول نافرمانی دوبارہ شروع کرنے کی تیاریاں ہوئیں۔ لیکن اُن کو اور دوسرے لیڈروں کو گرفتار کر لیا گیا۔ کانفرنس میں سب سے اہم مسئلہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے اتفاق اور تعلقات کا تھا۔ اس پر ہندوستان کے نمایندے متحد نہیں ہو سکے۔ آخر کار انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے اعلان کیا کہ اگر آپ لوگ اس مسئلہ کو خود طے نہیں کر سکیں گے تو حکومت برطانیہ کو طے کرنا پڑے گا اور ایسا ہی ہوا۔ ہندوستان کے لیڈر اُس کو طے نہ کر سکے اور حکومت برطانیہ نے اپنا فیصلہ دیا جو "کمیونل اوارڈ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی رو سے جداگانہ انتخاب کا حق مسلمانوں، سکھوں، عیسائیوں، اینگلو انڈین اور یوروپین قوموں کو دیا گیا ہے۔ اسی طرح اچھوت قوموں کو ہندوؤں سے علیحدہ کر دیا گیا تھا،

لیکن گاندھی جی نے اس کی مخالفت کی اور جب اُن کو کامیابی نہیں ہوئی تو اُنہوں نے فاقہ شروع کر دیا کہ اگر اچھوت قوموں کو ہندوؤں کے ساتھ نہیں ملایا جائیگا تو وہ اپنی جان ہلاک کر دیں گے۔ اس پر حکومت اور اُن کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا جو "پونا کا عہد نامہ" کہلاتا ہے۔ اس کی رو سے اچھوت قوموں کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ ہر جگہ کے لئے جو کونسل میں اُن کو ملی ہے چار نمائندے منتخب کریں اور بعد میں یہ چار نمایندے جنرل الکشن میں اُسی جگہ کے لئے کھڑے ہوں اور تمام (یعنی ہندو اور اچھوت قوموں کے) ووٹر ان چار میں سے ایک کا انتخاب کرلیں۔

سنہ ۱۹۳۲ء کے آخر میں تیسری گول میز کانفرنس ہوئی۔ یہ پہلی کانفرنسوں کے مقابلہ میں مختصر تھی لیکن اس کے ختم ہونے پر حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی کے متعلق اپنی تجاویز ایک "وہائٹ پیپر" یا قرطاس سفید کی شکل میں شائع کیں اور اُس کے فوراً ہی بعد پارلیمنٹ نے ایک جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی مقرر کی جس کے صدر لارڈ لنلتھگو تھے۔ اس کمیٹی میں کوئی ہندوستانی ممبر تو نہیں تھا لیکن کچھ ہندوستانیوں کو انگلستان بلا کر یہ اجازت دی گئی کہ وہ کمیٹی کے ساتھ بیٹھ کر شہادتیں وغیرہ سنیں۔ یہ لوگ بحث کر سکتے تھے لیکن ووٹ دینے یا رپورٹ پر دستخط کرنے کا حق ان کو نہیں دیا گیا تھا۔ نومبر سنہ ۱۹۳۴ء میں اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ شائع کی۔ فروری سنہ ۱۹۳۵ء میں "گورنمنٹ آف انڈیا بل" پیش ہوا اور سال ختم ہونے سے پہلے یہ ایکٹ پاس ہو گیا۔

سنہ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ اس ایکٹ کی رو سے ہندوستان کے نظام حکومت میں بہت سی اہم تبدیلیاں ہو جائیں گی۔

یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں دیسی ریاستوں اور صوبوں
کی ایک فیڈریشن قائم کی جائے اور صوبوں کی حکومتیں خودمختار ہو جائیں۔
کئی صوبوں میں بجائے ایک کے دو مجلسیں وضع قانون کے لیے قائم کی گئی
ہیں۔ انتخاب کرنے والوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا ہے تاکہ زیادہ سے
زیادہ لوگ ملکی معاملات میں حصہ لے سکیں۔ مرکزی اور صوبہ کی حکومتوں کے
درمیان جھگڑے طے کرنے کے لئے ایک فیڈرل کورٹ بھی وضع کی گئی ہے۔
غرض یہ کہ ان اصلاحات نے ہندوستان کی حکومت کے اکثر بنیادی اصول
بدل دئے ہیں۔ لیکن اب بھی وزیر ہند گورنر جنرل اور گورنروں کے اختیارات
اس قدر وسیع ہیں کہ ہندوستان کی قومی اور سیاسی جماعتیں اس دستور
اساسی سے مطمئن نہیں۔ کانگریس اور مسلم لیگ اور ملک کی دوسری
جماعتیں اس میں تبدیلی چاہتی ہیں۔

عدالتی نظام ۱۸۵۸ء تا ۱۹۳۵ء غدر کے بعد عدالتی نظام میں بھی
بہت ترقی ہوئی۔ اس سے پہلے
مختلف قوانین رائج تھے یعنی انگریزی قوانین کے علاوہ ہندو اور مسلم قوانین
اور مقامی رسوم و ضوابط کا رواج تھا۔ اب جہاں تک قانون فوجداری
کا تعلق تھا تعزیرات ہند کا نفاذ ہو گیا اور ہر مذہب و ہر قوم کے افراد کے لئے
ایک ہی قانون ہے۔ ۱۸۶۱ء کے "انڈین ہائی کورٹس ایکٹ" کی رو سے کلکتہ
مدراس اور بمبئی میں ہائی کورٹس قائم ہو گئیں۔

۱۸۶۶ء میں صوبہ شمالی مغربی (جو آجکل یو۔ پی کہلاتا ہے) میں
ہائیکورٹ اور پنجاب میں چیف کورٹ قائم کی گئی۔ اس کے بعد اور قوانین
وضع کئے گئے جن کی رو سے تمام صوبوں کی عدالتوں میں قانونی کارروائی کا

طریقہ یکساں ہو گیا۔ ۱۹۱۱ء میں ایک اور انڈین ہائی کورٹس ایکٹ پاس ہوا اور لاہور، پٹنہ اور رنگون میں ہائی کورٹس قائم ہو گئیں۔ اس ایکٹ کی رُو سے ہائی کورٹ کے ججوں کی جو زیادہ سے زیادہ تعداد مقرر تھی اس میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۵ء کا ایکٹ پاس ہونے پر ایک فیڈرل کورٹ کی ضرورت تھی چنانچہ اب دہلی میں فیڈرل کورٹ قائم ہے اور اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔

سرکاری ملازمتیں ۱۸۵۳-۱۹۳۵ء

کمپنی کے عہد میں جو لوگ ملازم رکھے جاتے تھے اُن کا تقرر کورٹ آف ڈائرکٹرس کی طرف سے ہوتا تھا۔ اس طرح سے اکثر قابل لوگوں کو ملازمت کا موقع نہیں ملتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۳ء میں سول سروس کے لئے مقابلہ کا امتحان جاری کیا گیا۔ لیکن ہندوستانیوں کے لئے یہ امتحان زیادہ مفید نہ تھا کیونکہ انگلستان میں امتحان ہوتا تھا اور بہت ہی کم ہندوستانی اس میں بیٹھ سکتے تھے۔ ۱۸۷۰ء تک صرف ایک ہندوستانی مقابلہ کے امتحان میں کامیابی حاصل کر سکا تھا۔ ۱۸۸۶ء میں ایک کمیشن ملازمتوں کے متعلق مقرر ہوا اور اُس کی تجاویز کے لحاظ سے ملازمتوں کے تین درجے ہو گئے یعنی امپیریل، پراونشیل اور سب آرڈینیٹ۔

اس میں سے امپیریل گریڈ کے تقررات وزیر ہند کرتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ نے ایک شاہی کمیشن اور مقرر کیا۔ لیکن جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے اس کمیشن کی سفارشات پر عمل نہ ہو سکا۔ مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارمس میں اس مسئلہ پر بھی بحث کی گئی ہے۔ اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد اب زیادہ کر دی گئی اور مقابلہ کے امتحانات ہندوستان میں بھی ہونے

لگے۔ اس کے بعد ایک اور کمیشن مقرر کیا جس کے صدر لارڈ لی تھے۔ اس کمیشن نے بہت سی تجاویز پیش کیں جن سے اعلیٰ درجے والے ملازموں کی حالت اور بہتر ہوگئی ہے۔ اس کمیشن کی رپورٹ پر پبلک سروسز کمیشن جس کا ذکر ۱۹۱۹ء کے ایکٹ میں تھا قائم کیا گیا۔ اس وقت تک مقابلے کے امتحانات اور دوسرے ذرائع سے سرکاری محکموں میں ملازموں کا تقرر یہی کمیشن کرتا ہے۔

مالی انتظام ۱۸۵۸ء-۱۹۳۵ء حکومت اور رعایا دونوں کے نقطۂ نظر سے صیغۂ مالیات اہم ترین صیغوں میں ہے کمپنی کے عہد میں ہندوستان کا مالی نظام قابل اطمینان نہ تھا چنانچہ غدر کے بعد جب نظام حکومت کمپنی کے ہاتھ سے حکومت برطانیہ کے قبضہ میں آیا تو کمپنی پر بہت قرضہ تھا۔ اس دقت کی وجہ سے حکومت نے جیمس ولسن کو وائسرائے کی کونسل کا پہلا فنانس ممبر مقرر کیا۔ اُس نے فوج کے اخراجات میں بہت کمی کی۔ بجٹ کو قاعدہ کے ساتھ مرتب کیا اور آمدنی بڑھانے کے لئے انکم ٹیکس جاری کیا۔ لارڈ میو کے زمانہ تک مالیات کا انتظام مرکزی حکومت کے ہاتھ میں تھا۔ اُس نے کچھ حصہ صوبوں کی حکومتوں کے انتظام میں دیدیا بعض مدّیں مرکزی حکومت کے پاس ہی رہیں۔ یہ اصلاح بہت کامیاب ثابت ہوئی اور کچھ عرصہ بعد لارڈ لٹن اور لارڈ رپن نے اپنے اپنے عہد میں اُس انتظام میں کچھ تبدیلیاں کیں اور اسی اسکیم کو ترقی دی۔ اس سے مرکزی حکومت کے کام میں کچھ کمی ہوگئی اور صوبوں کی حکومتوں کو مالیات کے انتظام میں کسی قدر آزادی مل گئی۔ ان اصلاحات اور تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت ہند کی آمدنی برابر بڑھتی رہی۔ لارڈ کرزن کے عہد میں سولہ کروڑ کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۳ء میں ہندوستان کی آمدنی ۱۸۶۰ء کے مقابلہ میں دوگنی ہوگئی۔

مرکزی اور صوبوں کی مالیات کے علیحدہ ہو جانے پر دونوں نے اپنے آمدنی کے ذرائع کو وسیع اور بہتر بنانے کی کوشش کی لیکن اب بھی بعض صوبوں کی آمدنی اُن کے خرچ کے لئے کافی نہیں ہو سکتی اور مرکزی حکومت کافی رقم ہر سال ان صوبوں کو دیتی ہے۔

فوج ۱۸۵۸ء-۱۹۳۵ء

غدر کے بعد فوج کو از سر نو ترتیب دینے کی ضرورت تھی سب سے اہم تبدیلی یہ کی گئی کہ فوج میں ہندوستانیوں کی تعداد کم کر دی گئی اور انگریزوں کی تعداد بڑھا دی گئی۔ ۱۸۶۴ء میں جب فوجی اصلاحات جاری ہو چکی تھیں تو انگریزی فوج کی تعداد چونسٹھ ہزار تھی اور ہندوستانی فوج کی دو لاکھ پانچ ہزار۔ ایک اور اصلاح یہ کی گئی کہ تینوں پریزیڈنسیوں کے فوجی حسابات ایک اکاؤنٹنٹ جنرل کے سپرد کر دئے گئے۔ ۱۸۸۵ء میں پنجدہ کے واقعہ کے بعد یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ شمالی مغربی سرحد کو اور زیادہ محفوظ کیا جائے۔ چنانچہ ہندوستانی فوج میں بیس ہزار آدمیوں کا اضافہ مختلف طریقوں سے کیا گیا۔ برما کی تیسری لڑائی کے بعد وہاں انتظام کرنے کے لئے فوج کو اور زیادہ بڑھانا پڑا۔ اب تجربہ سے یہ بھی ثابت ہو گیا تھا کہ پنجابی اور نیپالی بمقابلہ دوسرے لوگوں کے زیادہ بہتر سپاہی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی بھرتی بہت زیادہ کی جاتی تھی ۱۸۹۵ء میں ایک کمیشن کی سفارشات پر سب پریزیڈنسیوں کی فوجیں ایک جگہ کر دی گئیں اور سارے ہندوستان میں ایک فوج اور ایک کمانڈر ان چیف ہو گئے۔

لارڈ کچنر نے جو کرزن کے عہد میں ہندوستان کا کمانڈر ان چیف تھا یہ تجویز پیش کی کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ملیٹری ممبر نہیں ہونا چاہئے اور فوج کے انتظام وغیرہ کے سارے معاملات کمانڈر ان چیف کے اختیار میں ہونے چاہئیں۔

لارڈ کرزن نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ لیکن حکومت برطانیہ نے کچنر کی تجویز کو مان لیا اس پر لارڈ کرزن نے استعفا دیدیا۔ سنہ ۱۹۰۹ء سے تمام فوجی انتظامات کمانڈر ان چیف ہی کے ہاتھ میں ہے۔

یورپ کی جنگ عظیم میں ہندوستانی فوجیں بڑی تعداد میں مختلف مقامات پر لڑیں۔ اس زمانہ میں تقریباً سات لاکھ سپاہی اور چار لاکھ دوسرے آدمی فوج میں بھرتی ہوئے۔ اس کے علاوہ اٹھاون ہزار آدمی نیپال نے دئے۔ بارہ لاکھ سے زیادہ آدمی ہندوستان کے باہر بھیجے گئے۔ ان خدمات کے صلے میں حکومت برطانیہ نے بہت سے حقوق ہندوستانی سپاہیوں اور افسروں کو عطا کئے۔ اس کے بعد سائمن کمیشن نے ہندوستان کی حفاظت کے مسئلہ پر غور کیا اور کچھ تجاویز کیں۔ جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہوا۔ تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد یہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اگرچہ ہندوستان کی حفاظت کی ذمّہ داری ہندوستان ہی پر ہونی چاہئے لیکن موجودہ حالات میں یہ مناسب نہیں کہ مسئلہ حفاظت ملک کی ترقی کو روکے۔ لہٰذا ہندوستانی نمائندوں کا یہ مطالبہ کہ فوج بھی ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آجائے نہیں پورا کیا گیا۔ لیکن یہ اصول مان لیا گیا کہ رفتہ رفتہ فوج بھی ہندوستانیوں کے پاس آجانی چاہئے۔ چنانچہ اس اصول پر عمل کیا جا رہا ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں اسکین کمیٹی کی سفارش پر ایک فوجی کالج سینڈہرسٹ کے نمونہ پر دہرہ دون میں قائم کیا گیا جہاں ہندوستانی افسروں کو فوجی تعلیم دی جاتی ہے۔

حکومت ہند کو بحری فوج بھی رکھنی پڑتی ہے۔ قرون وسطیٰ میں بحری فوج اس قدر ضروری نہ تھی جیسی کہ اس زمانہ میں ہے۔ مغل بادشاہوں نے بحری فوج کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں کی، لیکن یورپ کی قوموں کی طاقت کا انحصار بحری

فوج پر ہی تھا۔ چنانچہ اُن کے آنے سے ہندوستان میں بحری فوج کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مرہٹوں کے پاس بھی جہازی بیڑا تھا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد قدرتی طور پر بحری فوج بھی رہنے لگی۔ ابتدا میں اس کا تعلق برطانیہ کی بحری فوج کے ساتھ تھا لیکن ۱۸۹۱ء میں "رائل انڈین میرین" یعنی ہندوستان کی بحری فوج قائم کی گئی۔ اب تجویز ہے کہ ہندوستان کے پاس بحری قوت مکمل اور اپنی ہی ہونی چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ بحری فوج کے علاوہ اب ہوائی فوج کی بھی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے انگریزی ہوائی جہاز ہندوستان کے شمالی مغربی حصہ میں موجود رہتے ہیں کیونکہ سب سے زیادہ خطرہ ہندوستان کو اسی طرف سے ہے۔ ملک کی حفاظت کے علاوہ یہ جہاز اور بھی کام آتے ہیں۔ مثلاً ۱۹۲۸ء میں جب افغانستان میں خانہ جنگی اور فساد ہوا تو تقریباً چھ سو مرد، عورتیں اور بچے وہاں تھے جن کو ہوائی جہازوں کے ذریعہ سے ہندوستان لایا گیا۔ ہوائی فوج کا یہ ایک اہم کارنامہ خیال کیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہندوستانی بھی اب ہوائی جہازوں میں اُڑنا سیکھ رہے ہیں اور اُمید ہے کہ بہت جلد ہندوستان کی ہوائی فوج میں ہندوستانیوں کی کافی تعداد ہو جائے گی۔ ۱۹۳۱ء میں ایک "انڈین ایرفورس ایکٹ" بھی پاس ہوا لیکن باوجود ان باتوں کے ہمارا ملک ہوائی فوج کے لحاظ سے بہت زیادہ پیچھے ہے۔ یورپ کے اور بعض ایشیا کے ملکوں میں ہوائی طاقت بہت زیادہ ترقی کر چکی ہے۔

باب ۵۲

حکومت ہند کی بیرونی پالیسی ۱۸۵۸-۱۹۳۵ء

حکومت ہند کے بیرونی تعلقات

حکومت ہند کی بیرونی پالیسی حکومت برطانیہ کے خارجی تعلقات پر منحصر رہی ہے۔ اُنیسوی صدی کے وسط میں حکومت برطانیہ کے سامنے دو مسئلے بہت اہم تھے۔ نوآبادیوں کے سلسلہ میں فرانس سے مقابلہ تھا اور وسط ایشیا میں روس سے۔ روس کی ایشیائی پالیسی کی وجہ سے کمپنی کے زمانہ میں افغانستان کی پہلی لڑائی ہوئی اور اُس میں حکومت ہند و برطانیہ کو بہت نقصان اُٹھانا پڑا۔ اس کے بعد ایک عرصہ تک عدم مداخلت کے اصول پر عمل کیا گیا۔ لیکن آخرکار صورت حالات ایسی بدل گئی کہ اس رویّہ کو ترک کرکے مداخلت کی کوشش کی گئی جس کا نتیجہ وہی ہوا جو پہلے موقع پر ہوا تھا۔ بیسویں صدی کے شروع میں جرمنی کی طاقت اور تجارت نے بہت ترقی کرلی اور نوآبادیوں کے سلسلہ میں جرمنی نے بھی انگریزوں کا مقابلہ شروع کردیا۔ اب برطانیہ کی خارجی پالیسی میں ایک زبردست تبدیلی رونما ہوئی۔ فرانس اور روس سے تعلقات بہتر ہوگئے اور یہ کوشش کی گئی کہ جرمنی کی طاقت کو کم کیا جائے۔ جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی حالت بہت کمزور ہوگئی تھی اور روس میں بھی انقلاب ہوگیا تھا۔ لیکن ان دونوں قوموں نے اپنی کھوئی

ہوئی طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کی بڑی زبردست کوشش کی اور پہلے سے بھی کہیں زیادہ طاقتور ہو گئے۔

حکومت ہند اور افغانستان کے تعلقات

پنجاب فتح ہونے کے بعد انگریزوں کی سرحد افغانستان کے بہت قریب پہنچ گئی تھی اور اب حکومت ہند کو افغانستان کے معاملات میں دلچسپی زیادہ ہو گئی تھی۔ چنانچہ ۱۸۵۵ء میں دوست محمد اور حکومت ہند کے درمیان ایک عہد نامہ ہوا جس کی وجہ سے انگریزوں کو ایرانیوں کے خلاف لڑنا بھی پڑا۔ لیکن ۱۸۶۲ء میں امیر دوست محمد نے ہرات پر قبضہ کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ایلگن نے اس کو منع کیا اور جب وہ نہیں مانا تو اپنے ایجنٹ کو جو کابل میں رہتا تھا واپس بلا لیا۔ دوست محمد نے ہرات پر قبضہ کر لیا لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ دوست محمد کے بعد کابل میں خانہ جنگی کا دور شروع ہوا لیکن لارنس نے جو اس وقت وائسرائے تھا عدم مداخلت کی پالیسی پر عمل کیا۔ اس کا خیال تھا کہ حکومت ہند کے لئے سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ کابل جس کے قبضہ میں بھی ہو اس کو امیر تسلیم کر لیا جائے۔ عدم مداخلت یا "پالیسی آف ماسٹرلی ان ایکٹیوٹی" میں کئی خرابیاں تھیں۔ شیر علی کو جواب امیر کابل مان لیا گیا تھا یہ یقین ہو گیا کہ حکومت ہند کو اس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں اور اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے یہ کہ روسیوں نے خیوا۔ بخارا اور تاشقند کے علاقوں پر اپنا اثر قائم کر کے ۱۸۶۷ء میں "روسی ترکستان" کے نام سے ایک نیا صوبہ بنایا تھا۔ روس کی اس کامیابی نے حکومت ہند کو ہوشیار کر دیا اور ۱۸۶۹ء میں لارڈ میو (۱۸۶۹-۱۸۷۲ء) نے انبالہ کے مقام پر امیر شیر علی سے ملاقات کی

اور اُس کو اپنی دوستی اور ہمدردی کا یقین دلایا لیکن کوئی خاص معاہدہ نہیں کیا۔ اُس کے جانشین لارڈ نارتھ بروک (۱۸۷۲-۱۸۷۶ء) نے بھی اسی پالیسی پر عمل کیا اور شیر علی کی اس درخواست کو کہ اُس کا بیٹا عبد اللہ خاں اُس کا ولیعہد تسلیم کر لیا جائے منظور نہیں کیا۔ اس کے برخلاف جب امیر نے روسی حکومت سے یہی درخواست کی تو اُس نے فوراً مان لیا۔ غرض کہ عدم مداخلت کی پالیسی کا نتیجہ ظاہر ہو گیا۔ امیر کابل کو انگریزوں پر اعتماد نہیں رہا اور روس نے وسط ایشیا میں اپنا اثر خوب اچھی طرح سے قائم کر لیا۔

افغانستان کی دوسری لڑائی

۱۸۷۴ء میں ڈسرائلی برطانیہ کا وزیر اعظم اور سیلسبری وزیر ہند مقرر ہوئے۔ ان کی کوشش تھی کہ افغانستان میں انگریزی اثر قائم کیا جائے، چنانچہ نارتھ بروک سے کہا گیا کہ وہ اپنا ایک ایجنٹ ہرات میں رکھے۔ وائسرا کو اس تجویز سے بالکل اتفاق نہ تھا۔ اس نے اس پر عمل کرنے سے انکار کیا اور کچھ عرصہ بعد مستعفی ہو کر چلا گیا۔ اُس کا جانشین لارڈ لٹن مقرر ہوا اُس نے اِدھر کوئٹہ پر قبضہ کیا اور اُدھر امیر شیر علی سے ایجنٹ کے تقرر کے متعلق گفت و شنید کی۔ اسی زمانہ میں روسی ایجنٹ بھی کابل پہنچ گیا۔ اب امیر پر روسیوں کا بہت کافی اثر تھا۔ چنانچہ اُس نے انگریزی ایجنٹ کو علی مسجد سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں دی۔ اس پر لارڈ لٹن نے اُس کو الٹی میٹم دیا اور جب وقت پر جواب نہیں ملا تو جنگ کا اعلان کر دیا۔

افغانستان کی پہلی لڑائی کی طرح ابتدا میں انگریزوں کو کامیابی ہوئی ہندوستان سے تین فوجیں افغانستان کی طرف روانہ ہوئیں اور معمولی مزاحمت کے بعد قندھار اور جلال آباد پر قابض ہو گئیں۔ شیر علی اپنا ملک چھوڑ کر

بھاگ گیا اور بلخ میں روسی امداد کا انتظار کر رہا تھا کہ بیمار ہو کر مر گیا۔ انگریزوں نے شیر علی کے بیٹے یعقوب خاں سے گنڈمک کا صلحنامہ کیا جس کی رو سے قرم۔ پشین اور سیبی کے اضلاع انگریزوں کو مل گئے اور امیر نے وعدہ کیا کہ وہ اُن کو کابل میں ایجنٹ رکھنے کی اجازت دیدیگا۔ اور بیرونی پالیسی کو اُن کی مرضی پر چھوڑ دے گا۔ جولائی ۱۸۷۹ء میں سر لوئس کوگ نری کابل میں سفیر بنا کر بھیجا گیا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد کابل میں بغاوت ہوئی اور کوگ نری اور اُس کے ساتھی قتل کر دیئے گئے۔ اس خبر کے ملتے ہی انگریزی فوج جو قندھار میں موجود تھی کابل روانہ ہو گئی اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ یعقوب خاں بھی بھاگ کر انگریزوں کے پاس آگیا۔ اُنھوں نے اُس کو تخت سے اُتار کر ہندوستان بھیجدیا۔ وائسرائے کا خیال تھا کہ افغانستان میں کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کر دی جائیں، لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ عبدالرحمٰن جو روسیوں کے پاس قید تھا رہائی پاکر کابل پہنچ گیا۔ اسی زمانہ میں انگلستان کی وزارت بدل گئی۔ لارڈ لٹن بھی استعفا دیکر چلا گیا اور اُس کا جانشین لارڈ رپن مقرر ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ لڑائی ختم کی جائے۔ اس غرض سے اُس نے عبدالرحمٰن کو امیر تسلیم کر لیا۔ شیر علی کے ایک بیٹے ایوب خاں نے قندھار پر قبضہ کر لیا تھا۔ جنرل رابرٹس کابل سے اُس کے خلاف روانہ ہوا تو عبدالرحمٰن نے اُس کو بہت مدد دی۔ ایوب خاں کو شکست فاش ہوئی اور حکومت ہند نے امیر عبدالرحمٰن سے صلح کر لی۔ انگریزوں نے اُس کو سالانہ ایک رقم دینے کا وعدہ کیا اور اُس نے اپنے بیرونی تعلقات اُن کی مرضی پر چھوڑ دیئے۔

اس لڑائی سے انگریزوں کو یہ فائدہ ہوا کہ کابل کا امیر اب اُن کا

دوست تھا اور اُس کی بیرونی پالیسی میں اُن کو دخل دینے کا حق تھا لیکن ہندوستان کو اس جنگ سے نقصان بھی ہوا۔ حکومت کا قرضہ بہت زیادہ بڑھ گیا اور لاتعداد جاندار ہلاک ہو گئے۔

پنجدیہ کا واقعہ ۱۸۸۵ء

اب لارڈ ڈفرن (۱۸۸۴ء-۱۸۸۸ء) کے سامنے یہ مسئلہ پیش تھا کہ روس اور افغانستان کی حد مقرر ہو جائے اس لئے کہ روسی اثر برابر بڑھ رہا تھا۔ مرو کے زرخیز علاقہ پر بھی روسیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ آخرکار حکومت برطانیہ کی کوشش سے یہ طے ہو گیا کہ انگریزوں اور روسیوں کے نمایندے پہلی اکتوبر ۱۸۸۴ء کو سرخس میں ملیں اور سرحد مقرر کر لیں۔ انگریزی نمایندے وقت پر پہنچ گئے لیکن روسیوں نے کہا کہ اُن کا نمایندہ بیمار ہو گیا ہے۔ یہی نہیں کہ روسی نمایندے وقت پر نہیں پہنچے بلکہ روسی فوجیں برابر بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ اُن میں اور افغانی سپاہیوں میں لڑائی ہوئی اور روسیوں نے پنجدیہ پر قبضہ کر لیا۔ حکومت برطانیہ اس وقت عجیب مشکل میں تھی۔ نہ وہ لڑنے کو تیار تھی اور نہ یہ ذلت برداشت کرنے کو۔ آخرکار کچھ وقت کے بعد کمیشن نے افغانستان کی شمالی سرحد قائم کر دی۔ امیر افغانستان کو پنجدیہ کے واقعہ میں انگریزوں سے کوئی مدد نہیں ملی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کو خاموش رہنا پڑا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا ملک انگریزوں اور روسیوں کے لئے میدان جنگ بنے۔ اُس کا مشہور قول ہے کہ افغانستان انگریزوں اور روسیوں کے درمیان اس طرح ہے جیسے کہ ایک بکری شیر اور ریچھ کے بیچ میں پھنس جائے لہٰذا اُس نے اپنی بہتری اسی میں سمجھی کہ پنجدیہ واپس لینے کی کوشش نہ کرے اور آیندہ کے لئے اس واقعہ سے سبق حاصل کیا جائے۔

حکومت ہند اور سرحدی قبائل

شمالی مغربی سرحد پر حکومت ہند کے لیئے دوسرا مسئلہ اُن سرحدی قبیلوں کا تھا جو دریائے سندھ اور حدود افغانستان کے درمیان پہاڑیوں اور وادیوں میں رہتے ہیں اور قدیم زمانہ سے تاجروں کے قافلوں اور زرخیز علاقے میں رہنے والوں کو لوٹنے کے عادی ہو چکے تھے۔ انگریزوں کے لیئے تو یہ مسئلہ نیا تھا لیکن اُن سے پہلے ہندوستان کی ہر حکومت کو اس دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے چند فوجی سرداروں کو سرحد پر علاقے دیدیئے تھے۔ ان میں سے ہری سنگھ حاکم ہزارہ اور فرانسیسی جنرل اویٹیبل حاکم پشاور اپنی سختیوں کے لیئے مشہور تھے لیکن پٹھانوں نے اپنی لوٹ مار کا سلسلہ بند نہیں کیا سکھوں کی سختی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض سرداروں کو سرحدی علاقے اس شرط پر دیئے گئے تھے کہ وہ خراج کے طور پر ہر سال سو پٹھانوں کے سر بھیجا کریں۔

پنجاب فتح کرنے کے بعد انگریزی سرحد قبیلوں کے علاقے تک پہنچ گئی۔ غدر کے بعد انگریزی حکومت کی پالیسی یہ تھی کہ جہاں تک ممکن ہو سرحد کے باہر رہنے والوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لیکن پٹھانوں نے لوٹ مار بند نہیں کی اور وہ پہاڑیوں سے اُتر کر میدانوں میں لوٹتے تھے اور چلے جاتے تھے حکومت ہند اس کے جواب میں اُن کے علاقے پر حملہ کرتی تھی اور اُن کی فصلیں وغیرہ تباہ کر دی جاتی تھیں۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۷۰ء کے درمیان اس قسم کے چھبیس حملے ہوئے۔ لیکن اُن کا نتیجہ کچھ نہیں نکلا کیونکہ فصلوں اور مویشیوں کی تباہی سے پٹھان لوگ لوٹ مار کرنے پر اور زیادہ مجبور ہو جاتے تھے۔ اس عدم مداخلت کی پالیسی میں پہلی تبدیلی سندھ میں ہوئی۔ ۱۸۶۷ء میں سر رابرٹ سینڈمن

نے جو ڈیرہ غازی خاں میں ڈپٹی کمشنر تھا انگریزی سرحد کے باہر کچھ قبیلوں سے تعلقات قائم کئے۔ اس کے بعد اسی اصول پر عمل ہونے لگا۔ افسروں کو حکم تھا کہ پشتو زبان سیکھیں۔ سینڈمن نے قلات کے خان سے ایک عہدنامہ کیا جس کی رو سے اُس کے علاقے میں ریل نکالی گئی اور ۱۸۷۶ء میں کوئٹہ پر قبضہ کر لیا گیا۔ اسی طریقہ پر دوسرے سرحدی علاقوں میں مختلف قبیلوں سے عہدنامے کئے گئے۔ حکومت ہند قبیلوں کے سرداروں کو بڑی بڑی رقمیں دیتی تھی کہ وہ پہاڑی درّوں کی حفاظت کریں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبیلے رہے تو خود مختار لیکن اُن کے ملک میں ریلیں اور سڑکیں وغیرہ نکالدی گئیں اور اُن کی لوٹ مار میں بہت کچھ کمی ہو گئی۔ حکومت ہند کے لئے بھی سرداروں کو روپیہ دینا اُن کے ملک پر حملے کرنے کے مقابلہ میں بہتر تھا کیونکہ اس میں اُن کا بہت کم روپیہ خرچ ہوتا تھا۔

پنجدیہہ کا واقعہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس کے بعد امیر عبدالرحمن سولہ سال تک زندہ رہا اور اس عرصہ میں اپنی خود مختاری حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ بعض موقعوں پر اُس میں اور حکومت ہند میں اختلاف بھی ہوا لیکن عام طور پر تعلقات اچھے ہی رہے۔ ۱۸۹۳ء میں سرمار ٹمر ڈیورنڈ نے امیر کو اس بات پر راضی کر لیا کہ ہندوستان اور افغانستان کی سرحد مقرر کر لی جائے۔ اس سرحد کو ڈیورنڈ لائن (یعنی خط ڈیورنڈ) کہتے ہیں۔ سرحد قائم کرتے وقت قبیلوں کے سرداروں سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا اور چار سال بعد سرحدی علاقے میں جو فساد ہوا اُس کا ایک سبب یہی تھا۔ آخرکار ۱۹۰۱ء میں امیر عبدالرحمن نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا حبیب اللہ تخت پر بیٹھا۔

اس زمانہ میں سرحد پر جو فسادات ہوئے اُن کی بہت سی وجوہات تھیں

لیکن لارڈ لینس ڈاؤن (۱۸۸۸ء-۱۸۹۴ء) اور لارڈ ایلگن ثانی (۱۸۹۴ء-۱۸۹۹ء)
کی فارورڈ (یا آگے بڑھنے کی) پالیسی کا خاص طور پر ذکر کرنا ضروری ہے۔
انگریزوں کا "حلقۂ اثر" برابر بڑھ رہا تھا۔ چترال بھی اس میں آچکا تھا۔ سنہ ۱۸۹۵ء
میں مہتر چترال قتل کر دیا گیا۔ تخت کے لئے دعویداروں میں جھگڑا ہوا۔ ایک
دعویدار نے برطانوی ایجنٹ کے قلعے کو گھیر لیا۔ اس کی مدد کے لئے ایک فوج
بھیجی گئی اور مختصر لڑائی کے بعد چترال پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ دوسری
لڑائی تراہ پر ہوئی۔ بعض سرحدی قبیلوں نے درۂ خیبر کے راستے کو روک
دیا۔ یہاں بھی حکومت کو فوج بھیجنی پڑی۔ قبیلوں کو شکست تو ہوئی لیکن وہ
پورے طور پر مغلوب نہیں ہوئے۔ جب لارڈ کرزن (سنہ ۱۸۹۹ء-۱۹۰۵ء) ہندوستان
کا وائسرائے ہو کر آیا تو لڑائی ختم ہو چکی تھی۔ لیکن قبیلوں کی شورہ پشتی میں
کوئی خاص کمی نہیں ہوئی تھی اگرچہ کہ حکومت نے اُن کی سرکوبی کے لئے فوج
بھی مقرر کر دی تھی۔ کرزن نے آتے ہی اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اُس
نے ایک نیا صوبہ "شمالی مغربی سرحدی صوبہ" کے نام سے قائم کیا اور خود
قبیلوں کے لوگوں میں سے ایک فوج بھرتی کی اور اس علاقے کا امن امان انہیں
کے سپرد کیا۔ اس فوج کی نگرانی کے لئے انگریزی فوج رکھی گئی۔ اس کے علاوہ
آمد و رفت کے ذرائع بہتر بنائے۔ سڑکیں تیار کرائیں اور ریلیں نکالیں۔

افغانستان کی تیسری لڑائی

کرزن کی پالیسی ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئی لیکن جنگ عظیم کے موقع
پر افغانوں نے حملہ کیا اور لڑائی چھڑ گئی۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ قتل کر دیا
گیا اُس کا بیٹا امان اللہ تخت پر بیٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کا ملک خود مختار ہو جائے
چنانچہ اُس نے اس کا اعلان کر دیا اور ساتھ ہی اپنی فوجیں آگے کی طرف بڑھا دیں۔

یہ لڑائی مختصر تھی۔ افغانوں کو بہت زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن بعض قبیلے اُن کے ساتھ ہو گئے۔ جب صلح ہوئی تو حکومت ہند نے سالانہ روپیہ دینا بند کر دیا اور افغانستان کی خارجی پالیسی میں دخل اندازی کا حق چھوڑ دیا یعنی افغانستان کی آزادی اور خود مختاری تسلیم کر لی گئی۔ امان اللہ کی حکومت کا خاتمہ بھی جلد ہو گیا۔ اُس نے بہت سے یورپ کے ممالک کی سیاحت کی اور واپسی پر اپنے ملک میں وہی مغربی چیزیں جاری کرنا چاہتا تھا جو وہاں دیکھی تھیں۔ اُس کو اس کوشش میں کامیابی نہیں ہوئی اور تخت اور ملک چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔

افغانستان سے صلح ہونے کے یہ معنی نہیں تھے کہ سرحدی قبائل کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ان لوگوں نے لوٹ مار کے سلسلے کو بند نہیں کیا اور حکومت ہند کو کئی مرتبہ اس علاقے میں حملے کرنے کی ضرورت ہوئی لیکن نتیجہ وہی رہا۔ اس وقت بھی حکومت کے سامنے یہ مسئلہ موجود ہے۔ کیونکہ جب بھی اُن کو موقع ملتا ہے وہ انگریزی علاقے میں آجاتے ہیں۔

برما کی تیسری لڑائی اور بالائی برما کا الحاق

دوسری لڑائی کے بعد انگریزوں کے تعلقات برما سے اچھے تھے لیکن ۱۸۷۸ء میں شاہ برما نے وفات پائی اور اُس کے اڑتالیس بیٹوں میں تخت کے لئے جھگڑا ہوا۔ آخر کار درباریوں نے تھیبا کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اُس نے شاہی خاندان کے بہت سے افراد کو مروا ڈالا۔

ایک سال بعد انگریزوں نے اپنے ریذیڈنٹ کو واپس بلا لیا۔ اسی زمانہ میں فرانسیسیوں کا اثر بڑھ رہا تھا اور ۱۸۸۳ء میں حکومت برما نے فرانسیسیوں سے دوستی کرنا چاہی۔ فرانسیسی بھی چاہتے تھے کہ برما میں ریل نکالیں اور کچھ

تجارتی حقوق حاصل کریں۔ انگریز یہ نہیں چاہتے تھے کہ برما میں فرانسیسیوں کا اقتدار بڑھے۔ لہٰذا انہوں نے مخالفت کی اور لڑائی چھڑ گئی۔ یہ لڑائی نہایت مختصر تھی انگریزی فوج نے مانڈلے پر قبضہ کرلیا۔ تھیبا جلاوطن کر دیا گیا اور ۱۸۸۶ء میں بالائی برما پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ مفتوحہ علاقے میں وہی نظام حکومت قائم کیا گیا جو جنوبی برما میں تھا اور ایک عرصہ کی متواتر کوششوں کے بعد ملک کی بدامنی دُور ہو گئی۔ لیکن برما کے باشندے مذہب، نسل، زبان اور روایات کے لحاظ سے ہندوستانیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ اُن کی یہی کوشش تھی کہ برما کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اب وہ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے اور نئی اصلاحات کی بنا پر برما کو ہندوستان سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔

تبت تبت کے لوگوں نے ہمیشہ سے اس کو ناپسند کیا ہے کہ دوسری قوموں سے اُن کے تعلقات زیادہ بڑھیں۔ چنانچہ اس وقت بھی ہم کو تبت کے حالات سے بہت کم واقفیت ہے۔ وارن ہیسٹنگز نے حکومت تبت سے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی کوشش کی تھی لیکن بہت جلد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ۱۸۸۸ء میں تبت والوں نے ریاست سِکم پر حملہ کیا جس میں اُن کو ناکامیابی ہوئی۔ اس کے بعد انگریزوں نے اُن سے تجارتی معاہدہ بھی کیا لیکن وہ بھی زیادہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ بہرحال جس وقت کرزن ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہو کر آیا تو حکومت ہند اور تبت میں کوئی خاص تعلقات نہیں تھے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ حکومت تبت نے ایک روسی سفیر رکھنا منظور کر لیا تھا۔ نئے وائسرائے کی رائے تھی کہ تبت سے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم کئے جائیں۔ جب اُس کی

کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تو اُس نے حکومت برطانیہ کو بمشکل اس پر راضی کیا کہ کچھ فوج تبّت کو روانہ کی جائے۔ تبّت والوں نے اُس کا مقابلہ کیا۔ اس پر اُن کے خلاف باقاعدہ جنگ شروع ہوگئی۔ آخرکار انگریزوں نے لاسہ فتح کر لیا اور تبّت سے ایک نیا صلحنامہ ہوا جس کی رو سے تبّت کو تاوانِ جنگ دینا پڑا اور تجارت کے متعلق کچھ شرائط قبول کرنی پڑیں۔

باب ۵۴

حکومت ہند اور دیسی ریاستیں

غدر کے بعد غدر کے بعد جب ہندوستان کی حکومت کی ذمّہ داری حکومت برطانیہ نے لی تو وہ معاہدے، عہدنامے اور صلحنامے جو کمپنی اور دیسی ریاستوں کے مابین ہوئے تھے اُسی طریقے سے قائم رکھے گئے۔ لیکن قدرتی طور پر اب حالات بدل گئے تھے۔ کمپنی صرف اپنی سلطنت کی ذمّہ دار تھی۔ لیکن حکومت برطانیہ نے کُل ہندوستان یعنی دیسی ریاستوں کی بھی ذمّہ داری خود لی۔ گویا کہ ملکۂ انگلستان صرف کمپنی ہی کے علاقے کی نہیں بلکہ سارے ہندوستان کی ملکہ تسلیم کی گئیں۔ ریاست کے حکمرانوں کو جو سندیں وغیرہ عطا ہوئیں اُن میں یہ صاف طور پر ظاہر کر دیا گیا کہ سرکار برطانیہ کی وفاداری نہایت ضروری ہے۔ ۱۸۷۶ء میں ملکہ وکٹوریہ

نے ملکۂ ہند کا لقب اختیار کیا۔ ایک اور اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ شاہی اعلان میں صاف طور پر یہ کہہ دیا گیا کہ ریاستیں سلطنت انگریزی میں شامل نہیں کی جائیں گی۔ ہندوؤں کو متبنیٰ کرنے کی اجازت مل گئی اور مسلمانوں کو بتلا دیا گیا کہ وہ اپنے قانون وراثت کے مطابق ان مسئلوں کو طے کر سکتے ہیں لہٰذا اب دیسی ریاستوں کے حکمراں خود مختار تو نہیں رہے لیکن اُن کو یہ اطمینان ہو گیا کہ اُن کی ریاست انگریزی سلطنت میں شامل نہیں کی جائیگی۔

مداخلت سب سے اہم تبدیلی جو حکومت کے رویّہ میں ہوئی یہ تھی کہ حکومت ہند اب دیسی ریاستوں کے اندرونی معاملات میں دخل دینے لگی۔ کمپنی کے زمانہ میں حکومت جہاں تک ممکن تھا ریاستوں کے انتظامی معاملات میں دخل نہیں دیتی تھی اور نہ اس ذمّہ داری کو قبول کرنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن غدر کے بعد یہ رویّہ بدل گیا۔ ریاست کا کوئی اہم معاملہ حکومت کی مرضی کے خلاف طے نہیں ہو سکتا تھا۔ تاریخ میں بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں حکومت ہند کو ریاستوں کے اندرونی معاملات میں دخل دینا پڑا۔ مثال کے طور پر گائکوار کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں ملہر راؤ بڑودہ کی گدّی پر بیٹھا۔ اس نے اپنی رعایا پر سختی اور ظلم شروع کر دیا جس سے ریاست میں فساد کا اندیشہ تھا۔ حکومت ہند نے ایک کمیشن بٹھلایا کہ کچھ اصلاحات کی جائیں۔ لیکن ملہر راؤ نے اس کمیشن کی سفارشوں پر توجہ نہیں کی اور ریزیڈنٹ سے جھگڑنا شروع کر دیا۔ آخر کار اُس پر ریزیڈنٹ کو زہر دلوانے کا الزام لگایا گیا اور ایک کمیشن مقرر ہوا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ کرے۔ کمیشن کے ہندوستانی ممبروں کی رائے میں جرم کا ثبوت ناکافی تھا۔ لیکن پھر بھی حکومت نے یہ طے کیا کہ ملہر راؤ میں

حکومت کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ چنانچہ اُس کو معزول کر دیا گیا اور ایک نابالغ لڑکے کو راجہ تسلیم کیا گیا۔ ریاست کا انتظام کچھ دنوں کے واسطے ایک کونسل کے سپرد ہو گیا۔ یہ ضرور ہے کہ کمپنی کے زمانہ میں گائکوار پر مقدمہ نہیں چلایا جاتا لیکن بہت ممکن تھا کہ ریاست بڑودہ سلطنت انگریزی میں شامل کر لی جاتی۔

میسور میسور کی ریاست ۱۸۳۱ء سے حکومت ہند کے زیر انتظام تھی۔ ۱۸۶۸ء میں معزول شدہ راجہ نے وفات پائی۔ مرنے سے پہلے اُس نے ایک لڑکے کو متبنیٰ کر لیا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں حکومت ہند نے اُسی کو راجہ تسلیم کر لیا۔ لیکن جو محدود اختیارات اُس کو دیئے گئے اور جو الفاظ کاغذات میں استعمال کئے گئے ہیں، اُن سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ریاست کا انتظام گویا امانت کے طور پر دیا گیا ہے۔ اگر ہم اس عہدنامہ کا مقابلہ جس کے ذریعہ سے ریاست میسور ۱۸۸۱ء میں راجہ کو منتقل کی گئی ہے اُس عہدنامے سے کریں جو ۱۷۹۹ء میں ولزلی نے میسور کے نئے راجہ کو گدی پر بٹھلاتے وقت کیا تھا تو ہم کو معلوم ہوگا کہ ولزلی چاہتا تھا کہ ریاست بیرونی حملوں سے محفوظ رہے اور اُس کی مالی حالت قابل اطمینان ہونی چاہیئے۔ برخلاف اس کے ۱۸۸۱ء کے عہدنامہ میں شاہ انگلستان کی فرمانروائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

جو واقعات اوپر بیان کئے گئے ہیں اُن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کے رویہ میں کیا تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کے علاوہ ریل، تار، ڈاک، اخبارات اور اقتصادی ضروریات نے مداخلت کی پالیسی کو اور بھی زیادہ مدد پہنچائی۔ ان حیرت انگیز ایجادوں کی وجہ سے ریاستوں کا تعلق انگریزی صوبوں سے اسقدر زیادہ ہو گیا کہ اب یہ ممکن نہ تھا کہ تہذیب اور تمدن کا معیار قریب قریب

یکساں نہ ہو۔ اس کے لئے حکومت ہند کو بہت سے معاملات میں مداخلت کرنی پڑتی تھی یہاں تک کہ لارڈ کرزن نے ریاستوں کے حکمرانوں کو بتلایا کہ اُن کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ بار بار یورپ جائیں اور زیادہ عرصہ تک وہاں قیام کریں۔ ایک دوسرے موقع پر اسی وائسرائے نے کہا کہ دیسی رئیس حکومت ہند کے شریک ہیں اور اُن کو اس کا پورا احساس ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی رعایا کے آقا بھی ہیں اور خادم بھی۔

بیسویں صدی کے شروع میں ہندوستان میں سیاسی شورش اور بے چینی کا دَور شروع ہوا تو حکومت ہند کو دیسی ریاستوں کے ساتھ اپنا رویہ پھر بدلنا پڑا۔ اب اُن سے دوستانہ تعلقات قائم کئے گئے اور اُن پر اعتماد بڑھنے لگا۔ جنگ عظیم میں دیسی ریاستوں نے اپنی وفاداری کا بہت زبردست ثبوت دیا لیکن اصلاحات کے آنے سے رئیسوں میں ایک قسم کی بے چینی پیدا ہونے لگی۔ وہ چاہتے تھے کہ اُن کے تعلقات بجائے حکومت ہند کے سرکار برطانیہ سے براہ راست رہیں۔ ان حالات اور واقعات کا ایک اور اہم نتیجہ یہ ہوا کہ رئیسوں کو باہمی تعلقات پیدا کرنے کی اجازت ہو گئی۔ اُنیسویں صدی میں لارڈ لٹن نے اور اس صدی کے شروع میں لارڈ کرزن اور منٹو نے کوشش کی تھی کہ دیسی رئیسوں کی ایک کونسل بنا دی جائے تاکہ وہ باہم مشورہ کر سکیں۔ حکومت برطانیہ نے اس کی مخالفت کی۔ مگر یورپ کی جنگ عظیم کے بعد مسٹر مانٹیگو اور لارڈ چیمسفورڈ نے اپنی رپورٹ میں ایوان روسا (چیمبر آف پرنسز) قائم کرنے کی سفارش کی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں اس ایوان (چیمبر آف پرنسز) کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس کے ذریعہ سے دیسی ریاستوں کو حکومت ہند سے اور آپس کے تعلقات بڑھانے کا موقع مل گیا۔

گذشتہ بیس سال میں جو تبدیلیاں ہندوستان کی سیاسی حالت میں رونما ہوئی ہیں اُن کا اثر دیسی ریاستوں نے بھی قبول کیا ہے۔ مجوزہ فیڈریشن میں شریک ہونے سے پہلے یہ رئیس چاہتے ہیں کہ ایسے انتظامات کر لئے جائیں کہ آئندہ اُن کے اختیارات اور حیثیت میں کوئی زبردست تبدیلی نہ ہو اور ہر حال میں اُن کے تعلقات براہ راست حکومت برطانیہ سے رہیں۔

لوکل سیلف گورنمنٹ یعنی مقامی سوراج

اس نئے دور میں یہ امر تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ہر تہذیب یافتہ ملک کی حکومت وہیں کے لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیئے اور یہی وجہ ہے کہ روشن خیال انگریزوں نے اکثر کہا ہے کہ ہندوستان کی حکومت رفتہ رفتہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آنی چاہیئے اور اسی اصول کے ماتحت اصلاحات جاری کی جا رہی ہیں۔ ۱۸۵۸ء کے شاہی اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہندوستانی ہر سرکاری عہدے کے اہل سمجھے جائیں گے۔ اس کے چند سال بعد ہی ہندوستانی ممبر کونسلوں کے لئے نامزد کئے جانے لگے۔ اس کے علاوہ غدر سے پہلے ہی ایسے قوانین وضع کئے گئے تھے جن کی رو سے بعض بڑے بڑے شہروں میں میونسپلٹیاں قائم ہو گئی تھیں۔ لارڈ میو نے اپنے عہد میں اُن کو ترقی دی۔

اُن کے فرائض اور اختیارات وسیع کردئے اور انتخاب کا طریقہ بھی جاری کیا۔
۱۸۸۰ء میں لارڈ رپن ہندوستان کا وائسرائے مقرر ہو کر آیا۔ اُس نے بہت سی
اصلاحات جاری کیں۔ لیکن مقامی حکومت خود اختیاری کو زیادہ کامیاب بنانے
کے لئے جو قوانین اُس نے وضع کئے وہ اب تک مشہور ہیں اور اس وقت بھی
اُنہیں اصولوں پر عمل ہو رہا ہے۔ اُس نے اصول انتخاب کو وسیع کر دیا اور غیر
سرکاری لوگ صدر منتخب ہونے لگے۔ اس سے پہلے صدر کی نامزدگی گورنمنٹ
کرتی تھی۔ میونسپلٹیوں کو مالی اختیارات دیدئے گئے جن کے ذریعہ سے وہ ٹیکس
لگا کر روپیہ وصول کر سکتی تھیں اور اپنے نئے فرائض کو بخوبی انجام دے سکتی
تھیں۔ اسی طرح ڈسٹرکٹ بورڈوں میں جو لارڈ میو کے زمانہ سے قائم تھیں تبدیلیاں
کی گئیں۔ ۱۹۱۵ء میں میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈس کے اختیارات اور بڑھا
دئے گئے۔ انتخابی ممبروں کی تعداد زیادہ ہو گئی اور قریب قریب ہر جگہ غیر سرکاری
چیرمین منتخب ہونے لگا۔ مقامی حکومت خود اختیاری کا اولین مقصد یہ تھا کہ
ہندوستانیوں کو حکومت اور انتظام کرنے کے طریقے آجائیں اور ان باتوں کا
اُن کو تجربہ ہو جائے۔ چنانچہ لارڈ رپن کے زمانہ میں جو ریزولیوشن پاس ہوا تھا
اس میں یہ مقصد صاف طور پر ظاہر کر دیا گیا تھا۔ درحقیقت یہ صحیح ہے کہ ان اصلاحات
اور اختیارات کے ذریعہ ہندوستانیوں نے نظام حکومت کے جدید طریقوں اور
اصولوں کا تجربہ حاصل کیا اور اس سے اُن کو بہت فائدہ پہنچا۔

تعلیم

غدر سے پہلے ۱۸۵۴ء میں سر چارلس وُڈ صدر "بورڈ آف کنٹرول"
نے تعلیمی انتظامات کے متعلق ایک مراسلہ بھیجا تھا جس میں
اعلیٰ اور ابتدائی تعلیم کو رواج دینے کے لئے متعدد تجویزیں کی گئی تھیں چنانچہ
اس کے کچھ دنوں بعد کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور

صوبہ کی حکومتوں نے اپنے یہاں تعلیم کے محکمے کھولے ہندوستانی یونیورسٹیوں
نے لندن یونیورسٹی کو اپنا معیار بنایا اس لئے اُنہوں نے صرف امتحان لینے کی
ذمہ داری لی اور تعلیم دینے سے کچھ تعلق نہیں رکھا۔ لیکن آئندہ پچیس سال کے
تجربہ نے ظاہر کردیا کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم کا رواج تو بہت زیادہ بڑھ
رہا تھا اور ابتدائی تعلیم کی طرف توجہ بہت کم تھی۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے
ہنٹر کمیشن نے جو ۱۸۸۲ء میں مقرر ہوا تھا یہ تجویز پیش کی کہ حکومت کو ابتدائی
تعلیم پر بہت زیادہ توجہ کرنی چاہیئے اور اعلیٰ تعلیم جہاں تک ہو پبلک کے ہاتھ
میں دیدی جائے اس تجویز کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہائی اسکولوں کی تعداد بہت زیادہ
بڑھ گئی اور ابتدائی تعلیم کا رواج اتنا زیادہ نہیں ہوا جتنا کہ ہونا چاہیئے تھا۔
پنجاب اور الہ آباد میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں اور علی گڑھ میں سر سید
احمد خاں نے ایم، اے، او کالج و اسکول کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کو بھی
انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کیا۔

۱۹۰۱ء میں لارڈ کرزن نے تعلیم کے محکمہ کے اعلیٰ افسروں کی ایک کانفرنس
کی اور ایک یونیورسٹیز کمیشن مقرر کیا۔ کانفرنس نے بہت سی تجویزیں پیش کیں
صوبہ کی حکومتوں کو اب تعلیم کے لئے پہلے کے مقابلہ میں زیادہ روپیہ ملنے لگا۔
پونہ میں زراعتی کالج قائم کیا گیا اور حکومت نے ایک انسپکٹر جنرل تعلیمات کا
تقرر کیا۔ یونیورسٹیز کمیشن نے یونیورسٹیوں کے نظام اور معیار کو بہتر بنانے کے
لئے بھی بہت سی تجویزیں کیں، لیکن اُن کی ماہیت میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی۔
اور اب بھی وہ زیادہ تر امتحان لینے کا کام ہی انجام دیتی تھیں۔ لیکن ۱۹۱۶ء
میں کلکتہ یونیورسٹی کمیشن نے اس پر زور دیا کہ بجائے امتحان لینے والی یونیورسٹیوں
کے تعلیم دینے والی مقامی یونیورسٹیاں قائم ہونی چاہئیں اور علیگڑھ مسلم یونیورسٹی

اور بنارس ہندو یونیورسٹی اسی اصول کے ماتحت قائم ہوئیں۔ باوجود ان اصلاحات اور کوششوں کے ہندوستان کا تعلیمی نظام اب بھی قابل اطمینان نہیں اور ملک کی ضروریات اور تعلیمی نصاب میں وہ مطابقت نہیں جو ملک کی ترقی کے لئے ضروری اور مفید ہے۔ حال ہی میں کانگریس نے ایک کمیٹی مقرر کرکے ابتدائی تعلیم کا ایک نیا نصاب تیار کرایا ہے جو "وار دھا اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ بعض مسلمان لیڈروں کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ نصاب نقصان دہ ثابت ہوگا اور اسی بنیاد پر آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس نے کمیٹیاں مقرر کی ہیں کہ مسلمان بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم کا ایک نصاب تیار کریں۔

اخبارات انگریزی حکومت کے قیام پر اس ملک میں اخباروں کا رواج ہوا سب سے پہلے کچھ انگریزوں نے انگریزی اخبار نکالے۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہندوستانیوں نے بھی انگریزی اور اپنی زبانوں میں اخبار نکالنے شروع کردئے۔ حکومت کی طرف سے پہلے تو سختی ہوئی لیکن ۱۸۳۵ء میں سر چارلس مٹکاف نے ان کو آزادی دیدی۔ اخباروں کو آزادی ملنے پر حکومت کی پالیسی اور نظام پر نکتہ چینی شروع ہوگئی اور ہندوستانی اخبار بھی انگلستان کے اخباروں کی طرح اپنی رائے کا اظہار آزادی کے ساتھ کرنے لگے۔ آخرکار لارڈ لٹن کے زمانہ میں ورناکیولر پریس ایکٹ پاس ہوا جس کی رو سے ہندوستانی اخباروں پر بہت سی قیود لگادی گئیں۔ لارڈ رپن نے اس ایکٹ کو منسوخ کردیا۔ اُنیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی چند سال میں ہندوستانی پریس نے بہت زبردست ترقی کی اور کھلم کھلا حکومت پر نکتہ چینی شروع کردی مثال

کے طور پر تلک کا مشہور اخبار کیسری پیش کیا جاسکتا ہے۔ سیاسی سورش اور بےچینی سب سے زیادہ اخباروں ہی کے ذریعہ سے پھیلتی ہے۔ چنانچہ ان کی روک تھام کے لئے گورنمنٹ نے اکثر اخباروں پر بہت سخت قیود لگائیں۔ لیکن پھر بھی اخباروں کے رواج اور اُن کی آزادی میں زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت کافی ترقی ہو رہی ہے۔

نئی ایجادات اٹھارویں اور اُنیسویں صدی میں سائنس کی حیرت انگیز ایجادوں نے اہل یورپ کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب پیدا کیا۔ رفتہ رفتہ اس کا اثر ہندوستان پر بھی ہوا۔ غدر سے پہلے ڈلہوزی کے عہد میں ریلوے اور تار گھر وغیرہ کھولے گئے جن سے آمد و رفت اور خبروں کے پہنچنے میں بہت سہولت ہو گئی۔ جہاز رانی نے بھی ترقی کی اور اب مہینوں کا سفر ہفتوں اور دنوں میں طے ہونے لگا۔ ۱۸۶۹ء تک ہندوستان سے یورپ کے لئے تار ایران وغیرہ ہو کر جاتے تھے لیکن نہر سوئیز بننے کے بعد سمندر میں تار ڈالدیا گیا اور خبروں کے پہنچنے میں کوئی خطرہ نہیں رہا۔ اس کے علاوہ ہر قسم کی مشینیں بجلی سے چلنے لگیں اور مختلف چیزوں کے کارخانے قائم ہو گئے۔ بیرونی تجارت اور ملکی صنعت میں بہت ترقی ہوئی۔ تجارت اور صنعت کی ترقی کے ساتھ کلکتہ، بمبئی، مدراس، کراچی اور دوسرے بندرگاہوں نے بھی ترقی کی اور بعض اندرونی شہر بھی بہت جلد بڑھ گئے۔ مثلاً دہلی۔ کانپور۔ لکھنؤ وغیرہ۔

اس میں تو شک نہیں کہ ہندوستان کی قدیم صنعتیں تقریباً ختم ہو گئیں لیکن اُن کی جگہ دوسری صنعتوں اور دستکاریوں نے لی۔ سائنس کی ترقی اور ایجادوں کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اب بھی جاری ہے۔ وائرلیس اور ہوائی جہازوں نے جو زبردست کارنامے کئے ہیں اُن سے ہر شخص واقف ہے

حال میں ریڈیو کا رواج بہت ہو گیا ہے۔ اب شہروں میں جگہ جگہ اور گاؤں میں بھی بہت سے مقامات پر ریڈیو موجود ہیں اور وہ لوگ جو ایک زمانہ میں دنیا کے واقعات سے تقریباً بے خبر رہتے تھے اب روزانہ تمام دنیا کی خبریں سن سکتے ہیں۔ خبروں کے علاوہ ریڈیو کے ذریعہ اور بہت سی مفید باتیں اُن کو معلوم ہوتی ہیں۔ خاص طور پر گاؤں کے باشندوں کے لئے ریڈیو والے دیہاتی پروگرام رکھتے ہیں جس میں خبروں اور گاؤں کے علاوہ کھیتی باڑی کے متعلق بہت سی باتیں بتلائی جاتی ہیں۔ غرض کہ یورپ کے ملکوں کی طرح ہندوستانیوں کی زندگی میں بھی ریڈیو ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسی طرح ہوائی جہازوں سے فوجی زندگی اور لڑائی میں ایک زبردست تبدیلی ہو گئی ہے۔ ان نئی ایجادوں کا اثر کم و بیش دنیا کے ہر ملک پر ہوا ہے اور ہندوستان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہ سکتا تھا۔ تعلیم کے رواج، صنعت و حرفت کی ترقی اور آمد و رفت کے بہتر ذرائع نے ہندوستان اور یورپ کے تعلقات کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔ ان تعلقات کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں مغربی تہذیب کا اثر زیادہ ہو گیا اور بہت سی مذموم رسمیں جو پرانے زمانہ سے چلی آتی تھیں ختم ہو گئیں۔ غلامی دختر کشی اور ستی وغیرہ کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ان رسموں کو حکومت نے قانوناً بند کیا۔ لیکن انیسویں صدی میں بہت سے سوشل ریفارمر بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے ملک اور قوم کی بڑی خدمت کی۔ راجہ رام موہن رائے جنہوں نے بنگال میں برہمو سماج کی بنیاد ڈالی اور سرسید احمد خاں جنہوں نے مسلمانوں کی جہالت دور کرنے میں انتہائی کوشش کی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس وقت بھی ہماری سوسائٹی پر ایک بڑا داغ چھوت چھات کا ہے۔ مگر امید کی جا سکتی ہے کہ مہاتما گاندھی اور اُن کے رفقاء کی ان تھک کوششیں ضرور کامیاب ہوں گی کیونکہ اب بہت سے ہندوستانیوں کو اس کی خرابیوں کا احساس ہو گیا ہے۔

قحط اور اُس کے دور کرنے کی تدابیر

ہندوستان زراعتی ملک ہے اور یہاں کی آبادی کا بیشتر حصّہ زراعت پیشہ ہے۔ قدیم زمانہ سے یہاں کے لوگوں کو قحط کی مصیبت کا سامنا رہا ہے کیونکہ پانی کا ذریعہ بارش ہے۔ چنانچہ ملک کے جس حصّہ میں بارش کم ہوتی تھی، قحط پڑ جاتا تھا اور آمد و رفت کے ذرائع اسقدر ناکافی اور سُست تھے کہ دوسری جگہوں سے غلّہ بہ آسانی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ عہد قدیم اور قرون وسطیٰ میں اکثر سخت قحط پڑے جن کے واقعات ہم کو تاریخی کتابوں میں ملتے ہیں۔ اُس زمانہ کے حکمراں بیحد کوشش کرتے تھے کہ قحط زدہ لوگوں کی مدد کریں لیکن پھر بھی کامیابی بہت کم ہوتی تھی۔

کمپنی کی حکومت بھی اپنے ابتدائی دور میں کچھ زیادہ بہتر ذرائع نہ نکال سکی لیکن رفتہ رفتہ اُس نے نہریں کھدوانی شروع کردیں۔ گنگا کی مشہور نہر غدر سے پہلے ہی تیار ہو چکی تھی۔ ریلوں نے قحط کی مصیبتوں کو بڑی حد تک کم کر دیا پھر بھی ۱۸۶۶ء میں اُڑیسہ کے قحط میں بہت آدمی ہلاک ہوئے۔ اس پر حکومت نے ایک کمیشن مقرر کیا جس کی سفارشوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۸۶۷-۱۸۷۰ء کے قحط میں بہت لوگ بچ گئے۔ اس کے بعد بھی ایک کمیشن سر رچرڈ اسٹریچی کی صدارت میں مقرر ہوا۔ اُس نے بہت سی تجویزیں پیش کیں جن پر عمل کیا گیا اور جن کی وجہ سے ۱۸۹۶ء اور ۱۸۹۹ء میں قحط زدہ لوگوں کو بہت امداد ملی۔ ان کے بعد بھی کمیشن مقرر ہوئے اور اُنھوں نے پہلی تجاویز میں کچھ اضافہ کیا۔ اب ریلیں اور نہریں بھی بہت زیادہ ہو گئی تھیں۔ ان سب چیزوں کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ ۱۹۰۷ء میں جب یو۔پی میں سخت قحط پڑا تو بہت کم تعداد میں لوگ ہلاک ہوئے۔ ان حالات کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پہلے زمانے کے

مقابلہ میں اب قحط کی مصیبت کچھ بھی نہیں۔

علوم و فنون اُنیسویں صدی کے علوم و فنون پر مغربی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ ہندوستان سے قدیم زبانیں اور قدیم فنون اُٹھتے جاتے ہیں اور جدید علوم و فنون کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ فارسی اور عربی کی بجائے ہندی، اُردو اور صوبوں کی زبانوں کا رواج زیادہ ہو گیا ہے۔ غدر سے پہلے رئیسوں اور حکمرانوں کے درباروں میں شعرا اور فضلا کی قدر ہوتی تھی۔ دہلی لکھنؤ۔ رامپور۔ پٹنہ اور حیدرآباد میں بڑے بڑے صاحب کمال تھے۔ دلی۔ میر ذوق۔ غالب۔ سودا اور انیس کے نام سے ہر تعلیم یافتہ شخص واقف ہے۔ لیکن ان سب کا طرز پرانا تھا اور اُسی میں یہ لوگ کمالات دکھلاتے تھے۔ گجرات اور بنگال میں بھی شاعر موجود تھے۔

غدر کے بعد نظم و نثر دونوں کا طرز بدل گیا۔ ڈرامے بھی لکھے جانے لگے۔ اس زمانہ میں بنگالیوں نے بہت زیادہ ترقی کی اور بہت سے نامور شاعر اور نثر لکھنے والے وہاں پیدا ہوئے۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرت دنیا کے ہر حصہ میں پہنچ چکی ہے اُردو نثر اور شاعری نے بھی پلٹا کھایا اور نئے طرز کو اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں سرسید، نذیر احمد، شبلی اور آزاد نے بہت خدمت کی ہے۔ الطاف حسین حالی نے قومی نظمیں لکھکر شہرت دوام حاصل کی۔ ہندی میں نئے طرز کی بنیاد پڑ چکی ہے اور کثرت سے کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ مرہٹی زبان نے بھی اس دور میں نمایاں ترقی کی ہے۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہندوستان کے فنون میں بھی انحطاط شروع ہو گیا تھا۔ انگریزوں کی فتوحات نے ہندوستانیوں کو ہر لحاظ سے بزدل کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اُن کو اپنے کمالات پر بھی بھروسہ نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی

کاریگر اپنے طرز کو چھوڑتے جارہے تھے اور انگریزی فنون سے ابھی ناآشنا تھے۔ مثلاً فن تعمیر کے اس انحطاط کا ثبوت ہم کو نوآبادان لکھنؤ اور نوسار بنگال کی عمارتوں میں نظر آتا ہے۔ کچھ زمانہ کے بعد مغرب کی تقلید اور زیادہ بڑھ گئی اور جو عمارتیں اسوقت گورنمنٹ کے محکمۂ تعمیر نے تیار کرائی ہیں اُن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں کوئی خاص طرز موجود نہیں۔ لیکن اب حال میں کوشش کی گئی ہے کہ ایک نیا طرز نکالا جائے جس میں ہندوستان کے قدیم طرز کو مغرب کے جدید طرز کے ساتھ ملایا جائے۔ چنانچہ نئی دہلی کی عمارتیں اسی اصول پر بنائی گئی ہیں۔ فن تعمیر کی طرح مصوری میں بھی ہندوستانیوں کا مذاق برابر گرتا گیا اور بالآخر وہ مغرب کی اندھی تقلید کرنے لگے۔ لیکن اب اس فن میں بھی ایک انقلاب ہو رہا ہے اور بعض اہل فن کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے قدیم آرٹ کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور اُس کا معیار اور لوگوں کا مذاق بلند کیا جائے۔

قومی احساس دورِ جدید کی سب سے بڑی خصوصیت قومیت کا احساس ہے۔ پچھلے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستانیوں میں اُنیسویں صدی کے آخر میں قومی احساس شروع ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں انڈین نیشنل کانگریس کی خدمات کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ کن حالات کی وجہ سے مسلم لیگ قائم ہوئی۔ جنگ عظیم کے بعد ہندوستان میں قومیت کی لہر بہت تیزی کے ساتھ دوڑی اور ترک موالات اور خلافت کی تحریک نے ہر طبقہ کے لوگوں کو بیدار کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ سائمن کمیشن کے بعد ہندوستان کی ہر قوم نے اس امر کی کوشش کی کہ نئے دستور اساسی میں اُس کو زیادہ سے زیادہ حقوق ملیں۔

سنہ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو گیا اور اُس کے اُس حصّہ پر

جس کا تعلق صوبوں کی حکومتوں سے ہے نفاذ بھی ہو گیا لیکن ملک کی سیاسی جماعتیں اس سے مطمئن نہیں ہوئیں اور آزادی کے لئے جد و جہد جاری رہی۔

سنہ ۱۹۳۷ء میں مسٹر محمد علی جناح نے مسلم لیگ کو دوبارہ زندہ کیا اور مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد نے ان کی قیادت کو قبول کر لیا۔ مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح نے کوشش کی کہ کانگریس اور لیگ میں سمجھوتا ہو جائے اور دونوں ملکر ہندوستان کی آزادی کے لئے کوشش کریں۔ لیکن اختلافات اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ سمجھوتہ کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہوئی۔ مسلم لیگ نے پاکستان کا مطالبہ شروع کر دیا اور بالآخر ہندوستان دو مملکتوں میں تقسیم ہو گیا۔

بعض لوگ انگریزوں کی حکومت کے صرف تاریک پہلو کو دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی وجہ سے یہاں کی صنعتیں مردہ ہو گئیں۔ اور بے روزگاری بڑھ گئی۔ صحیح ہے کہ ہندوستان کی اقتصادی حالت انگریزوں کی وجہ سے خراب ہو گئی لیکن اس میں شک کی قطعاً گنجائش نہیں کہ انگریزوں کی حکومت سے ہندوستان کو بہت سے فائدے بھی ہوئے علم و ادب کی ترویج، سائنس کی ترقی، سیاسی احساس، معاشرتی زندگی کی اصلاح و تربیت، اس دور کی خصوصیات ہیں۔ مغربی تہذیب اور خیالات کی جھلک آج ہماری زندگی کے کس گوشہ میں نظر نہیں آتی۔ ہمارے خیالات میں وسعت، بین الاقوامی مسائل کا احساس، سائنس کی ترقی، تعلیم کے نئے اصول، ــــــ انگریزی حکومت کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

باب ۵۵

دوسری جنگ عظیم سے ہندوستان کی آزادی تک

۱۹۳۹ء میں پولینڈ پر جرمنی کے حملے سے دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہوا۔ ایک جانب فرانس اور برطانیہ تھے اور دوسری جانب جرمنی اور اٹلی۔ ۱۹۴۱ء میں روس اور امریکہ ریاست ہائے متحدہ نے جمہوری طاقتوں کی جانب سے اور جاپان نے محوری طاقتوں (AXIS POWERS) یعنی اٹلی اور جرمنی کی جانب سے جنگ میں شرکت کی۔ اور اس طرح سے اس جنگ کا محاذ بہت پھیل گیا۔ اور اس کے شعلوں نے ایشیا افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چونکہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کو بغیر ہندوستانی لیڈروں، یا صوبائی وزیروں، سیاسی جماعتوں (POLITICAL PARTIES) اور قانون بنانے والی جماعتوں (LAGISLATURES) سے مشورہ کئے بغیر جرمنی کے خلاف ایک فریق جنگ قرار دیدیا تھا اسلئے کانگریس نے اس کے خلاف پُرزور احتجاج کیا۔ اس کا مطالبہ یہ تھا کہ جنگ میں شریک ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ صرف ہندوستان کے لوگ اپنی نمائندہ جماعتوں کے ذریعہ سے کر سکتے ہیں۔ برطانوی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اس تجویز کو مان لے کہ جنگ کے اختتام پر ہندوستانی اپنا دستور حکومت (CONSTITUTION) ایک دستور ساز اسمبلی (CONSTITUENT ASSEMBLY)

کے ذریعہ سے بنائیں گے۔ اس مطالبہ کو برٹش حکومت نے یہ کہہ کر نامنظور کر دیا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم اختلافات بہت زیادہ ہیں۔ جب تک کہ ان کا حل نہیں کیا جاوے گا یہ مطالبہ نہیں مانا جا سکتا۔ اس پر بطور احتجاج آٹھ صوبوں کی کانگریسی وزارتیں مستعفی ہو گئیں۔ اور اُن صوبوں کا انتظام حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء میں اس کا صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ ہندوستان مکمل آزادی سے کم کسی چیز کو منظور نہیں کر سکتا۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں آزادی تقریر (FREEDOM OF SPEECH) کو منوانے کے لئے انفرادی ستیہ گرہ (INDIVIDUAL SATYAGRAH) شروع کی اس میں جنگ کے خلاف نعرے لگائے گئے اور کہا گیا کہ یہ لڑائی برطانوی شہنشاہیت (IMPERIALISM.) کو برقرار رکھنے کے لئے لڑی جا رہی ہے۔ لہذا ہندوستان اس میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا۔ ایک سال تک یہ تحریک چلتی رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد صدر کانگریس، پنڈت جواہرلال نہرو سابق کانگریس وزیر، کانگریس کے دوسرے تمام لیڈر، اور ہزاروں کی تعداد میں کانگریسی کارکن گرفتار کئے گئے، اور بہت سے لوگ جنگ میں رکاوٹیں ڈالنے کے الزام میں نظر بند کئے گئے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں جاپان کے اٹلی اور جرمنی کے حلیف (ALLY) کی حیثیت سے جنگ میں شریک ہو جانے سے نقشۂ جنگ بالکل بدل گیا۔ اس سے پہلے جون ۱۹۴۱ء میں روس کے خلاف بھی جرمنی نے اعلان جنگ کر دیا تھا۔ اب لڑائی کا محاذ بہت لمبا ہو گیا۔ ایک طرف مصر کی سرزمین پر جرمن، اطالوی فوجیں برطانوی فوجوں سے برسرِ پیکار تھیں تو دوسری طرف مارچ ۱۹۴۲ء میں برما پر جاپان کا قبضہ ہو جانے سے

جنگ بالکل ہندوستان کے سر پر آگئی تھی۔ جاپانی ہوائی جہازوں نے کلکتہ اور ہندوستان کے دوسرے ساحلی مقاموں پر بھی بم باری شروع کر دی تھی۔ اس خطرہ کے پیش نظر برطانوی حکومت نے ضروری سمجھا کہ ہندوستان سے کوئی سمجھوتہ کر لیا جاوے تاکہ متحدہ کوششوں سے جاپان کا مقابلہ کیا جائے۔ اس غرض سے سر اسٹیفورڈ کرپس کہ جن کی کوششوں سے روس اور برطانیہ ایک دوسرے کے حلیف بن گئے تھے برطانوی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے ہندوستانی سیاسی جماعتوں سے گفت و شنید کرنے ہندوستان آئے۔ اور اس گفتگو کا سلسلہ کئی ہفتہ تک جاری رہا۔ ہندوستان کے لیڈروں کے سامنے انہوں نے برطانوی حکومت کی پیش کش (OFFER) پیش کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ جنگ کے ختم ہونے پر انڈین یونین کا قیام عمل میں آئے گا جس کا دستور ایک دستور ساز اسمبلی (CONSTITUENT ASSEMBLY) بنائے گی۔ اس اسمبلی کو صوبوں کی اسمبلیاں منتخب کریںگی اور اس کے ممبروں کی تعداد صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کی $\frac{1}{10}$ تعداد کے برابر ہوگی۔ اس میں ہندوستانی ریاستوں (INDIAN STATES) کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔ اگر کوئی صوبہ اس یونین سے الگ رہنا چاہے تو اُسے علیحدگی کا حق حاصل ہوگا۔ جنگ کے دوران میں گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ (EXECUTIVE COUNCIL) میں کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے نمائندے بھی شامل کئے جائیں گے۔ سوائے کمانڈر انچیف اور گورنر جنرل کے باقی سب ممبر ہندوستانی ہوں گے۔ لیکن جنگ کے متعلق جملہ امور کمانڈر انچیف کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اس مسئلہ پر کانگریس، اور

برٹش حکومت کے مابین اختلاف پیدا ہو گیا۔ کانگریس کا مطالبہ تھا کہ
کمانڈر اِن چیف ڈیفینس منسٹر (DEFFNCE MINISTER) یا وزیر جنگ
کی ماتحتی میں رہے گا اور گورنر جنرل کی پوزیشن ایک دستوری حاکم
(CONSTITUTIONAL HEAD) کی رہے گی مگر اس مطالبہ کو برٹش
گورنمنٹ نے نہیں مانا اور بالآخر یہ گفت وشنید ناکام رہی۔ کرپس مشن
کی ناکامی سے ملک میں سیاسی بے اطمینانی اور بے چینی بڑھنے لگی اور
ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ اس مصیبت اور
تباہی کے وقت بھی برٹش گورنمنٹ سیاسی اقتدار کو اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی
ہے اور ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالنا چاہتی ہے۔

اگست ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے یہ رزولیوشن
پاس کیا کہ انگریز ہندوستان کو خالی کر دیں اور سیاسی اقتدار ہندوستانیوں
کو دیدیں۔ ان کے اس وقت چلے جانے سے ہندوستان جنگ کے خطرے
سے محفوظ رہے گا اور اگر جاپان یا کسی دوسری طاقت نے حملہ کیا تو ہندوستانی
اس طاقت کو بآسانی شکست دے سکیں گے۔ اس غرض کے لئے گاندھی جی
کی رہنمائی میں "انگریز و ہندوستان چھوڑ دو" (quit India) کی تحریک
بہت بڑے پیمانہ پر چلانے کا فیصلہ کیا گیا لیکن قبل اس کے کہ یہ تحریک شروع
کی جاتی برٹش گورنمنٹ نے کانگریس کے تمام لیڈروں کو گرفتار کر لیا اور
کانگریس کو خلاف قانون جماعت قرار دیا۔ اس دوران میں کانگریس اور
مسلم لیگ میں اختلافات کی خلیج بہت وسیع ہو چکی تھی۔ مسلم لیگ مسلمانوں
کے سیاسی حقوق (POLITICAL RIGHTS) کی حفاظت کرنے کے
لئے قائم کی گئی تھی۔ ۱۹۳۷ء میں الیکشن میں یو۔پی میں خاص طور سے

ان دونوں جماعتوں کے لیڈروں نے مل کر زمیندار پارٹی (National-
Agriculturist Party) کا مقابلہ کیا تھا۔ لیگ کے
لیڈروں کا خیال تھا کہ کانگریس اپنی وزارتوں میں لیگ والوں کو بھی شریک
کرے گی۔ مگر کانگریس نے ملی جلی (Coalition) وزارت بنانے کے بجائے
ایک جماعتی (One Party) یا خالص اپنی وزارت بنانا طے کی۔
اس پر دونوں جماعتوں میں شدید اختلاف پیدا ہوا۔ بعض کانگریسی
وزارتوں، لیڈروں اور کارکنوں کی تنگ نظر پالیسی سے بھی مسلمانوں
کے بہت بڑے طبقہ کو شکایت پیدا ہوئی۔ خاصکر زبان کے اور ملازمتوں
کے مسئلوں کے بارہ میں بھی اور ان میں لیگ کی ہمدردی کا جذبہ
پیدا ہوا۔ اور اس طرح سے مسلم لیگ بھی ایک عوامی جماعت
(Mass Organization) بن گئی۔ لیگ نے فیڈرل اسکیم
سے اپنا اختلاف ظاہر کیا اس لئے کہ ایک مرکزی (Central)
حکومت کے ماتحت مسلمان ایک مستقل بے بس اور کمزور اقلیت
(Minority) کی پوزیشن میں رہیں گے۔ سنہ ۱۹۴۰ء میں اس نے
اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں تقسیم ہند (Partition
of India) کی تجویز پیش کی جو پاکستان ریزولیوشن کے نام سے موسوم
ہے۔ اس کی رو سے ہندوستان کے پیچیدہ دستوری (Consti-
tutional) مسئلہ کا یہ حل پیش کیا گیا کہ شمالی ہند اور مشرقی
ہندوستان کے یعنی پنجاب، سندھ، شمالی مغربی سرحدی صوبہ
اور بنگال کے صوبوں کہ جن میں مسلمان بلحاظ آبادی اکثریت میں ہیں
کی ایک علیحدہ آزاد حکومت قائم کردی جائے جس کا کوئی تعلق

ہندوستان کی مرکزی حکومت سے نہ ہو۔ اس ریزولیوشن میں یہ
بھی کہا گیا کہ ہندو اور مسلمان دو بالکل علیحدہ علیحدہ قومیں ہیں۔
ان میں آپس میں کوئی چیز مشترک نہیں اس لئے بہترین اور قابل عمل صورت
صرف یہ ہے کہ ہر دو قوموں کی علیحدہ علیحدہ حکومتیں قائم کر دی جائیں۔
لیگ کو کانگریس کے اس مطالبہ کی بھی شدت سے مخالفت تھی کہ ہندوستان
کا دستور اساسی (Constitution) کوئی ایک دستور ساز اسمبلی
(Constituent Assembly) تیار کرے۔ وہ اپنے کو مسلمانوں
کی واحد نمایندہ جماعت کہتی تھی۔ وہ کانگریس کو ہندوستان کی قومی
جماعت ماننے پر تیار نہ تھی اس لئے کہ اس کے نزدیک ہندوستان
میں کسی مشترک قومیت کا وجود نہ تھا۔
Quit India تحریک کی بھی اس نے یہ کہکر مخالفت کی کہ
یہ مسلمانوں کی مخالفت ہے۔ جب تک کانگریس پاکستان نہیں تسلیم کرتی
اسوقت تک مسلم لیگ اس تحریک کی تائید نہیں کر سکتی۔ Quit India
تحریک کا اصل پروگرام یہ تھا کہ جنگی تیاریوں میں رکاوٹیں ڈالی جائیں
کانگریسی لیڈروں کی گرفتاری کے بعد یہ تحریک بے لیڈر کی رہ گئی۔ ملک
میں زبردست شورش برپا ہوئی۔ مہینوں گڑبڑ کا سلسلہ جاری رہا۔
سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ اُن کو جلا دیا گیا۔ ریلوں کی
پٹریاں اکھاڑ دی گئیں۔ تار کے کھمبے اکھاڑ دئے گئے۔ گورنمنٹ نے
انتہائی سختی سے فوج کی مدد سے اس تحریک کو کچل دیا۔ فائرنگ اور
لاٹھی چارج میں سیکڑوں ہندوستانی جان سے مار دئے گئے۔
ہزاروں آدمی جیلوں میں ڈال دئے گئے۔ جلسے اور جلوسوں کو ممنوع

قرار دیا گیا۔ اخباروں سے ضمانتیں مانگی گئیں۔ گاؤں پر اجتماعی جرمانے لگائے گئے۔ جون ۱۹۴۵ء تک ہندوستانی سیاسی تعطل (Dead lock) قائم رہا۔ ۱۹۴۳ء میں بنگال میں زبردست قحط پڑا جس میں لاکھوں آدمی بھوکوں مر گئے۔ جنگ کا پانسہ بھی پلٹ چکا تھا اور اتحادی ہر جگہ فتحیاب ہو رہے تھے۔ اپریل ۱۹۴۵ء میں جرمنی کو شکست فاش ہوئی اور اس کے بعد جاپان کو بھی۔ جون ۱۹۴۵ء میں سیاسی تعطل کو دور کرنے کے لئے لارڈ ویول نئے وائسرائے نے شملہ میں سیاسی لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب کی۔ اس سے پہلے مئی ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی خرابی صحت کی بنا پر رہا کئے جا چکے تھے۔ مسلم لیگ اور کانگریس میں سمجھوتے کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۴۴ء میں گاندھی جی نے مسٹر جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ سے مشہور کانگریس رہنما مسٹر راج گوپال آچاریہ کے فارمولے کی بناء پر گفتگو کی۔ اس فارمولے کا لب لباب یہ تھا کہ مسلم اکثریت والے علاقوں یعنی بنگال، پنجاب، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، برٹش بلوچستان اور سندھ کو ہندوستان سے علیحدہ ہونے کا حق دیدیا جائے مگر پنجاب اور بنگال کے غیر مسلم اکثریت والے ضلعوں کو بھی اس کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہو کہ وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا اس نئی اسٹیٹ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ تین ہفتہ کی گفت و شنید کے بعد یہ گفتگو ناکام ہو گئی۔

شملہ کانفرنس منعقدہ جون ۱۹۴۵ء میں کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں کو اس غرض کے لئے مدعو کیا گیا کہ سیاسی تعطل کو ختم کیا جائے اور ان تمام پارٹیوں کے نمائندوں کو گورنر جنرل کی ایگزیکیٹو کاؤنسل میں

شامل کر کے عارضی قومی نمایندہ حکومت (Interim National Government) قائم کی جائے۔ مسلم لیگ نے اس کانفرنس میں یہ مطالبہ پیش کیا کہ چونکہ مسلمانوں کی واحد نمایندہ جماعت وہی ہے اسلئے کونسل کے تمام مسلمان ممبروں کو نامزد کرنے کا حق صرف اسے حاصل ہونا چاہئے۔ کانگریس کو اس کا حق نہیں پہونچتا کہ وہ کسی مسلمان کو اس کونسل میں بطور ممبر نامزد کرے۔ کانگریس نے اس مطالبہ کی اس لئے مخالفت کی کہ اس کو تسلیم کر لینے سے اس کی قومی حیثیت (National Character) ختم ہو ئی جاتی تھی۔ اس مسئلہ پر یہ کانفرنس ناکام ہو گئی اور برطانوی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کرادئے جائیں تاکہ دونوں پارٹیوں کی اصلی قوت اور نمائندہ حیثیت کا اندازہ ہو جائے۔ مسلم لیگ نے حصول پاکستان اور کانگریس نے متحدہ ہندوستان اور "انگریزو ہندوستان خالی کرو" کی بنیاد پر الیکشن لڑا۔ یہ الیکشن بڑے ہی جوش وخروش کے ساتھ لڑے گئے۔ یو۔پی، بہار، مدراس، بمبئی، آسام، سی۔پی اور اڑیسہ غرض کہ جملہ ہندو اکثریت والے صوبوں کی اسمبلیوں میں کانگریس کو عظیم الشان (Over whelming) اکثریت حاصل ہوئی۔ مرکزی اسمبلی کی جملہ مسلم سیٹیں مسلم لیگ کو ملیں۔ صوبہ شمالی مغربی سرحدی صوبے میں کانگریس کو غیر معمولی اکثریت حاصل ہوئی۔ بقیہ تینوں مسلم اکثریت والے صوبوں میں مسلم سیٹوں کی بہت بڑی تعداد اُسے حاصل ہوئی۔ یو۔پی اور بہار میں نیشنلسٹ اور کانگریس خیال کے مسلمانوں کو لیگ کے اندازے سے زیادہ سیٹیں حاصل ہوئیں۔ اپریل ۱۹۴۶ء میں کانگریس نے اپنے اکثریت

والے صوبوں میں وزارتیں بنا لیں۔ پنجاب میں (Unionist Party) اور کانگریس کی ملی جلی وزارت بن گئی۔ سندھ اور بنگال میں مسلم لیگی وزارتیں، برسر اقتدار آئیں اور اسی اثنا میں انگلستان میں مزدور جماعت (Labour Party) برسر اقتدار آچکی تھی اور ہندوستان اور بین الملکی حالات کے پیش نظر اس نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان سے جلد از جلد برطانوی اقتدار ختم کر دیا جائے اور ہندوستان کو آزاد کر دیا جائے۔ ان معاملات کو طے کرنے اور ہندوستانیوں کو ایک متفقہ حل پر راضی کرنے کے لئے لیبر (Labour) وزارت نے اپنے تین وزیروں لارڈ پیتھک لارنس (Lord Pethic Lawrence) سر اسٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے وی الیگزینڈر کو ہندوستان روانہ کیا۔ یہ مشن وزارتی مشن (Cabinet Mission) کے نام سے موسوم ہے۔ اس مشن نے کانگریس، مسلم لیگ اور دوسری سیاسی جماعتوں کے لیڈروں سے کئی ہفتے بات چیت کی اور اس کے بعد ۱۶ مئی ۱۹۴۶ء کو ایک تجویز شائع کی جو Cabinet Mission Plan کے نام سے مشہور ہے۔ اس تجویز یا Plan کے دو حصے تھے ایک تو Long term plan یعنی ہندوستان کے دستوری (Constitutional) مسئلہ کا مستقل حل اور دوسرا Short term plan یعنی جب تک کہ نیا دستور تیار نہ ہو جائے اس وقت تک کی درمیانی مدت کے لئے عارضی حکومت کی تشکیل Long term plan کے ماتحت انڈین یونین قائم کرنے کی تجویز پیش کی گئی جو مشترک امور مثلاً امور خارجہ (Foreign Affairs) ملک کے تحفظ (Defence) اور مواصلات یا رسل و رسائل

(Communications) کا انتظام کرے۔ بقیہ امور صوبوں کو دیدئے گئے جنہیں مکمل خود مختاری حاصل تھی۔ صوبوں کو تین گروہوں یا گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔ Group A میں ہندو اکثریت کے صوبوں کو گروپ B میں بنگال اور آسام، اور تیسرے Group C میں پنجاب سندھ، شمالی مغربی سرحدی صوبہ اور برٹش بلوچستان کو رکھا گیا۔

اگر ان صوبوں کی اکثریت چاہتی تو ان گروہوں کی گروپ (Group) یا منطقہ وارانہ حکومت بھی قائم کر سکتی تھی۔ ہندوستان کا دستور اساسی (Constitution) بنانے کے لئے ایک دستور ساز اسمبلی تجویز کی گئی جو صوباتی اسمبلیوں کے ممبروں کی ۱/۱۰ تعداد پر مشتمل تھی۔ اس اسمبلی کو صوباتی اسمبلیوں کے ممبر منتخب کرتے اور اس کے بنائے ہوئے دستور اساسی کو برٹش پارلیمنٹ کی منظوری کے بعد نافذ کیا جاتا۔

Short term plan کی رو سے اس مدت تک کے لئے کہ جب تک ہندوستان کا کانسٹی ٹیوشن مکمل نہیں ہو جاتا ایک عارضی (Interim) حکومت بنائی جانا طے کیا گیا۔ اور اس غرض کے لئے گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹو کونسل میں ۶ کانگریس کے ۵ مسلم لیگ کے اور تین دوسری اقلیتوں کے نمایندوں کو شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ کانگریس نے Long term plan کو اس شرط کے ساتھ منظور کیا کہ صوبوں کو گروپ سے علیحدہ ہو جانے کا حق ہر وقت حاصل ہے۔ مسلم لیگ نے شروع میں دونوں تجویزوں کو منظور کر لیا۔ کانگریس کی طرف سے Short term plan یا عارضی حکومت میں شامل ہونے سے انکار پر، برطانوی حکومت نے عارضی حکومت (Interim Government)

کی تشکیل کو ملتوی کر دیا اور اس کی جگہ آئی۔سی۔ایس (.I. C. S)
والوں پر مشتمل ایک نگراں یا Care Taker گورنمنٹ مقرر کر دی۔
اس پر مسلم لیگ نے زبردست احتجاج کیا اور اسے برطانوی حکومت کی
عہد شکنی اور وعدہ خلافی سے تعبیر کیا۔ اور Long term plan
کی منظوری واپس لے لی۔ نیز برطانوی حکومت کی اس وعدہ خلافی کے
خلاف Direct Action یا سول نافرمانی کر ڈالنے کیا۔ جولائی ۱۹۴۶ء
میں دستور ساز اسمبلی (Constituent Assembly) کے الیکشن
ہوئے اور صوبائی اسمبلیوں نے اپنے نمائندے منتخب کئے۔ اسمبلی کی
۲۸۹ نشستوں میں سے ۲۰۵ سیٹیں کانگریس کو حاصل ہوئیں۔ مسلم
لیگ نے بھی اس انتخاب میں حصہ لیا۔ ستمبر ۱۹۴۶ء میں لارڈ ویول کی
دعوت پر پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس نے عارضی حکومت میں
کانگریس کے نمائندوں کے ساتھ شرکت منظور کر لی۔ اس کے خلاف لیگ
نے ملک بھر میں مظاہرے کئے۔ کلکتہ میں زبردست بلوہ ہوا اور ہندو
مسلم فضا بہت زیادہ مکدر ہو گئی۔ نواکھالی اور بہار میں خوں ریز بلوے
ہوئے۔ اکتوبر ۱۹۴۶ء میں وائسرائے کی کوششوں سے مسلم لیگ
بھی مسٹر لیاقت علی خاں کی سرکردگی میں اپنے چار دوسرے نمائندوں کے
ساتھ عارضی حکومت میں شامل ہو گئی مگر دونوں جماعتوں میں اختلاف
بڑھتا ہی گیا۔ مسلم لیگ نے مطالبہ پیش کیا کہ ہندوستان اور پاکستان کا
کانسٹی ٹیوشن بنانے کے لئے دو علیحدہ علیحدہ دستور ساز اسمبلیاں طلب
کی جائیں اور ایک دستور ساز اسمبلی کہ جسے Cabinet Mission
Plan کی رو سے منتخب کیا گیا تھا کے بائی کاٹ کا فیصلہ کیا۔

بہار، بنگال اور یو۔پی میں بلووں کا سلسلہ شروع ہوا اور زبردست Civil war کا خطرہ محسوس کیا جانے لگا۔

اس فضا میں ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس نئی دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں سوائے مسلم لیگ کے نمایندوں کے دوسرے تمام نمایندوں نے شرکت کی۔ اس اجلاس نے ڈاکٹر راجندر پرشاد موجودہ صدر جمہوریہ کو اسمبلی کا صدر منتخب کیا۔ دستور بنانے کے لئے مختلف کمیٹیاں مقرر کیں۔

لیگ اور کانگریس کے نہ حل ہونے والے اختلافات نے برطانوی حکومت کو ایک نئی پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ دسمبر ۱۹۴۶ء میں لندن میں پنڈت جواہر لال نہرو، مسٹر لیاقت علی خاں اور سردار بلدیو سنگھ کو ان اختلافات کے رفع کرنے کے لئے مدعو کیا گیا۔ مگر یہ لیڈر کسی سمجھوتے پر نہ پہونچ سکے۔ لہذا برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ ۱۵ ر جون ۱۹۴۸ء کو ہندوستان آزاد کر دیا جاوے گا۔ اور برطانوی سیاسی اقتدار وہاں سے ہٹا لیا جاوے گا۔ اگر اس وقت تک ہندوستانی دستوری مسئلہ پر کسی متفقہ حل پر نہ پہونچ سکے یا اگر انہوں نے کوئی متفقہ دستور مرتب نہ کر لیا تو پھر برطانوی حکومت اقتدار ایک سے زیادہ ہندوستانی حکومتوں کے لئے حوالہ کر دے گی۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ہندوستان میں ایک مرکزی حکومت نہیں رہے گی۔ اس اثنا میں لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماونٹ بیٹن (Mountbatten) کو نیا وائسرائے مقرر کیا گیا۔ انہوں نے ہندوستانی لیڈروں سے گفت و شنید کا سلسلہ شروع کیا۔ اور برطانوی حکومت کی منظوری کے بعد ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ایک نئی تجویز یا

Plan کا اعلان کیا جو Mountbatten plan
کے نام سے موسوم ہے۔ اس پلان کو کانگریس اور مسلم لیگ دونوں جماعتوں
نے منظور کر لیا۔ کانگریس نے اس لئے منظور کر لیا کہ اس کی رو سے
ہندوستان آزاد ہو جاتا تھا۔ اس تجویز کے ماتحت ہندوستان کو
۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے انڈین یونین (Indian Union) اور
پاکستان یا تقسیم شدہ یا مسلم اکثریت والے اضلاع پنجاب و بنگال،
شمالی مغربی سرحدی صوبہ، برطانوی بلوچستان اور سندھ پر مشتمل دو
ولایتوں (Dominions) میں تقسیم کر دیا گیا۔ نئے دستور کے تیار
ہونے تک ۱۹۳۵ء کے ترمیم شدہ ایکٹ کو دونوں ولایتوں کا عارضی دستور
(Constitution) قرار دیا گیا۔ ہند کی دستور ساز اسمبلی کو
انڈین یونین (Indian Union) کی کانسٹی ٹیوینٹ اسمبلی
(Constituent Assembly) مان لیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ
اس نئی پلان نے اسے پورے طور سے ایک با اقتدار اور با اختیار جماعت
(Sovereign Body) میں تبدیل کر دیا اور اسے پورا حق حاصل
ہو گیا کہ ہندوستان کے لئے جس قسم کا چاہے Constitution
بنائے۔ اور اسے جب چاہے نافذ کرے۔ برٹش پارلیمنٹ کی منظوری
کی قطعاً کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ دوسری بڑی اہم تبدیلی یہ ہوئی
کہ ایک کمزور اور محدود مرکزی حکومت کی جگہ ایک مضبوط اور پہلے سے
کہیں زیادہ وسیع الاختیار مرکزی حکومت نے لے لی۔ برٹش پارلیمنٹ
نے آزادیٔ ہندوستان کا ایکٹ Indian Independence Act.
پاس کیا جس نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ میں اہم ترمیمیں کیں۔

گورنر جنرل کو دستوری (Constitutional) حاکم بنادیا۔ اس کے اختیارات خصوص اور اختیارات تمیزی — (Discretionary powers) کا خاتمہ کر دیا گیا۔ گورنروں کے بھی اختیارات خصوص ختم کر دئے گئے۔ برطانوی پارلیمنٹ کا ہندوستانی امور پر جملہ اقتدار اور کنٹرول ختم کر دیا گیا۔ ہند یونین اور پاکستان دونوں کو برطانوی اقتدار سے کلیتہً آزاد کر دیا گیا۔ اسمبلی کو اس کا بھی حق حاصل ہو گیا کہ وہ جب چاہے برطانوی دولت مشترکہ (British Common-wealth) سے ہندوستان کے الگ ہونے کا فیصلہ کر سکتی ہے۔ برطانوی فوجیں ہندوستان سے ہٹالی گئیں اور اس کی تفصیل ایک معاہدہ کے ذریعہ سے طے کر دی گئی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء سے پہلے مرکزی حکومت کے اثاثے بھی دونوں ولایتوں میں تقسیم کر دئے گئے۔ اسی طرح سے فوجوں اور سرکاری ملازمتوں کی بھی تقسیم عمل میں آئی۔ اس طرح سے ۱۵ اگست ۴۷ء کو ہندوستان پھر سے دو سو سال کی غلامی کے بعد آزاد ہوا۔

باب ۵۶

جمہوریہ ہند کا دستور اساسی
(Constitution)

دستور ساز اسمبلی نے اپنے ابتدائی جلسوں میں ایک ریزدلیوشن پاس کیا جس میں مقاصد (Objectives) واضح کئے۔ اس سے کانسٹی ٹیوشن کے ڈھانچہ کی بنیاد پڑی اور اس کی رو سے "انڈین یونین" ایک آزاد اور خود مختار جمہوریہ۔ (Sovereign Democratic Republic) قرار دی گئی۔ حکومت کے سارے اقتدار اور اختیار کا سرچشمہ ہندوستانی عوام قرار پائے۔ اس ریزدلیوشن میں یہ بھی رکھا گیا کہ ہندوستان میں ایسا نظام حکومت قائم کیا جائے کہ جس میں ہر ایک کو سماجی (Social) معاشی (Economic) اور سیاسی برابری حاصل ہو۔ اور اس ملک کے ہر رہنے والے اور بسنے والے کو آزادی رائے، آزادی خیال اور آزادی مذہب حاصل رہے۔ ہر ایک کو قانون کی نگاہ میں برابر سمجھا جائے تاکہ وہ دنیا کی آزاد، ترقی یافتہ، اور متمدن قوموں کے دوش بدوش دنیا میں امن قائم رکھنے اور بہبودی عامہ کو ترقی دینے میں پورا پورا حصہ لے سکے۔

اسمبلی نے مرکزی حکومت یا یونین کے اختیارات، ریاستوں

(States) کے کانسٹی ٹیوشن، شہریوں کے بنیادی حقوق (Funda-mental Rights) چیف کمشنروں کے صوبوں، یونین حکومت اور ریاستوں کے درمیان مالی (Financial) تعلقات اور قبائلی علاقوں (Tribal Areas) کے مسئلوں کے متعلق سب کمیٹیاں مقرر کیں۔ ان کمیٹیوں نے ان مسئلوں پر غور کیا اور اپنی اپنی رپورٹیں پیش کیں انہی رپورٹوں نے کانسٹی ٹیوشن کے لئے مواد اور مسالہ فراہم کیا لیکن کانسٹی ٹیوشن کو آخری شکل (Drafting) یا مسودہ مرتب کرنے والی کمیٹی نے دی۔ جس کے چیرمین ڈاکٹر امبیدکر تھے جو اس وقت حکومت ہند کے وزیر قانون تھے۔ مسٹر گوپال سوامی آئنگر حال ڈیفنس منسٹر حکومت ہند یا مسٹر کے۔ ایم۔ منشی موجودہ گورنر اُتر پردیش۔ مسٹر الادی کرشن سوامی آئر، مسٹر ٹی۔ ٹی کرشنام چاری موجودہ وزیر تجارت حکومت ہند، سر بی۔ ایل متّر اور سر سید محمد سعد اللہ تھے۔ اس کمیٹی نے آٹھ مہینے کی محنت کے بعد مسودہ مرتب کیا اور اسے منظوری کی غرض سے اسمبلی کے سامنے پیش کیا۔ اس کی ایک ایک دفعہ پر بحث و مباحثہ ہوا اور ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو دو سال گیارہ مہینے اور اٹھارہ دن کے بحث و مباحثہ کے بعد اسمبلی نے کانسٹی ٹیوشن منظور کیا۔ اور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے اس کا نفاذ ہوا۔ ڈاکٹر راجیندر پرشاد کا انتخاب بہ حیثیت عارضی صدر جمہوریہ ہند عمل میں آیا۔ جنوری۔ فروری ۱۹۵۲ء میں اس دستور کے ماتحت عام انتخابات ہوئے اور مرکز اور ریاستوں میں نئی وزارتیں قائم ہوگئیں۔

دستور کی خصوصیتیں جمہوریہ ہند کے کانسٹی ٹیوشن میں ۲۹۵ دفعات (Clauses) اور آٹھ شیڈول

(Schedules) ہیں۔ یہ دنیا کا طویل ترین دستور اساسی ہے۔

ایک نئی اور نوزائندہ اسٹیٹ کو شروع میں بے شمار مشکلوں اور دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جمہوریہ ہند بھی ایک ایسی ہی اسٹیٹ ہے۔ اس لئے ان تمام دقتوں کو رفع کرنے کے لئے کانسٹی ٹیوشن میں دفعات رکھدی گئی ہیں۔

کانسٹی ٹیوشن تیار کرنے والوں نے دوسرے جمہوری ملکوں کے Constitutions کو اپنے سامنے رکھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء اور ویمار جمہوریہ (Weimar Republic) کے کانسٹی ٹیوشن سے بہت کچھ لیا۔ بعض چیزیں Eire اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن سے لی گئیں۔

دستور کی رو سے سارا اختیار ہندوستانی عوام کو حاصل ہے اور ہندوستان ایک با اقتدار اور خود مختار جمہوریہ ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار بلا تفریق و تخصیص و امتیاز مذہب و ملت، جنس یا رنگ، یا ذات ہر بالغ کو ووٹ دینے کا حق دیا گیا ہے اور پارلیمنٹری جمہوری حکومت قائم کی گئی ہے۔ آبادی کے لحاظ سے یہ دنیا کی سب سے بڑی پارلیمنٹری جمہوری حکومت ہے۔ تقریباً ۱۸ کروڑ انسانوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔

دستور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس رو سے ہندوستان میں غیر مذہبی (Secular) جمہوری حکومت قائم کی گئی ہے اور ہندوستان کے تمام باشندے بلا امتیاز و تفریق و تخصیص مذہب و ملت ایک مشترک شہریت (Common Citizenship) میں منسلک کر دئے گئے ہیں۔ اور کسی کو مذہب یا ذات پات کی بنا پر شہریت کے حقوق سے محروم نہیں کر

جاسکتا۔ اور انہیں اسٹیٹ کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

جمہوریہ ہند کا دستور وفاقی (Federal) ہے۔ اس میں وفاقی دستور کی جملہ خصوصیتیں موجود ہیں۔ یہ ایک لکھی ہوئی (Written) دستاویز ہے جس میں مرکز اور ریاستوں کے اختیارات کی تصریح کر دی گئی ہے۔ ایک آزاد سپریم کورٹ بھی قائم کر دی گئی ہے جو مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختلافی چیزوں کا فیصلہ کرے گی اور کانسٹی ٹیوشن کی تشریح کرے گی۔

مرکزی حکومت کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ریاستوں کو اہم مسئلوں میں یکساں پالیسی اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ ہندوستانی فیڈریشن خاصا لچک دار ہے اور ہنگامی صورتوں (Emergencies) میں مرکز ریاستی حکومت کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔

کانسٹی ٹیوشن میں شہریوں کے بنیادی حقوق کو بیان کیا گیا ہے ان کی رو سے ہر شہری قانون کے سامنے برابر ہے۔ مذہب، ذات، رنگ، جنس یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی کے خلاف کسی قسم کا امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شہری کو آزادیٔ رائے، آزادیٔ خیال اور آزادیٔ مذہب حاصل ہے۔ چھوت چھات کا خاتمہ کر دیا گیا ہے۔ اسے برتنا جرم قرار دیا گیا ہے۔ سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کا حق ہر شہری کو حاصل ہے۔ اقلیتوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کو اس کا بھی حق حاصل ہے کہ اپنے علیحدہ اسکول اور مدرسے قائم کریں۔ اپنی تہذیب، تمدن، زبان اور رسم الخط کو قائم اور برقرار رکھیں اور انہیں ترقی دیں۔ کسی شہری کو اس کی جائداد سے اسٹیٹ

صرف اسی حالت میں محروم کر سکتی ہے کہ جب قانون نے اس کا اختیار دیدیا ہو۔ اگر حکومت کی طرف سے ان حقوق میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ یا پابندی عائد کی جائے تو اُن کو منوانے کے لئے ہر شہری سپریم کورٹ میں درخواست دے سکتا ہے اور یہ عدالت اس کے متعلق فیصلہ کر سکتی ہے۔

کانسٹی ٹیوشن میں جملہ Articles کی تین بڑی تقسیمیں کی گئی ہیں۔ ایک میں مرکزی اور ریاستی عدالتوں، یونین کے عاملانہ اختیارات (Executive Powers) کی وسعت، یونین اور ریاستوں کے باہمی تعلقات، یونین ریاستی اور مشترک امور کی فہرستوں، پارلیمنٹ میں ریاستی نمائندوں اور صدر جمہوریہ الیکشن کا بیان ہے۔ دوسری تقسیم کے ماتحت بقیہ دفعات کی بڑی تعداد کو رکھا گیا ہے۔ پہلی تقسیم کے ماتحت دفعات میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم تب ہی ہو سکتی ہے کہ پارلیمنٹ میں دو تہائی اکثریت سے پاس ہو جانے کے بعد Part A اور Part B کی ریاستوں کی کم سے کم نصف قانون ساز جماعتیں ان ترمیموں کو منظور کریں۔ دوسری تقسیم کے ماتحت دفعات کو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں (Houses) کے حاضر اور ووٹ دینے والے ممبروں کی دو تہائی اکثریت تبدیل کر سکتی ہے۔ بقیہ دفعات میں محض کثرت رائے سے ترمیم کی جا سکتی ہے۔

اس دستور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اُس کے وفاقی ڈھانچہ کو ہنگامی صورت حال میں وحدانی (Unitary) ڈھانچہ میں آسانی سے بدلا جا سکتا ہے۔ اس صورت حال میں مرکزی حکومت تمام معاملوں کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے۔ پارلیمنٹ ریاستی امور کے بارہ میں بھی قانون بنا سکتی ہے۔

دستور کی رو سے ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں جمہوریہ ہند کی سرکاری

زبان قرار دیا گیا ہے لیکن ہندسہ انٹرنیشنل یا Roman رہیں گے۔ مگر پندرہ سال تک سرکاری کام انگریزی ہی میں ہوگا۔ مگر اس مدت سے پہلے بھی ہندی انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے۔

ریاستی قانون ساز جماعتیں علاقائی (Regional) زبانوں میں کسی ایک یا ایک سے زیادہ کو اس قانون کے چلانے کے لئے اختیار کر سکتی ہیں۔ دستور کے آخری شیڈول میں علاقائی زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان زبانوں کی تعداد ۱۴ ہے اور ان میں اردو بھی ہے۔

دستور کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں پس ماندہ (Backward) قبیلوں کے لئے مخصوص دفعات رکھی گئی ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ ان علاقوں اور قبیلوں کی بہبودی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا جائے گا۔ اور ان کو سماجی آزادی دی جائے گی۔ ابتدائی دس سالوں میں قانون بنانے والی جماعتوں اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے لئے سیٹس (Seats) محفوظ رہینگی۔ قبائلی علاقوں کے انتظام کے لئے بھی مخصوص دفعات موجود ہیں۔ آسام میں ان علاقوں کے لئے ضلع کی کونسلیں اور علاقہ وار خودمختار کونسلیں (Autonomous Regional Council) ہیں۔ اور اس طرح Administration چلانے میں قبائلیوں کا ہاتھ رہے گا۔ اس کے علاوہ ان علاقوں اور ان سے متعلق جملہ امور کا انچارج ایک علیحدہ وزیر بھی ہوا کرے گا۔ صدر جمہوریہ ایک کمیشن بھی مقرر کرے گا جو اس کی رپورٹ پیش کریگا کہ ان علاقوں کی فلاح اور بہبود کے لئے اب تک کیا کیا گیا ہے۔

بنیادی حقوق

بنیادی حقوق کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حکومت یا مجلس قانون ساز (Legislature) کو مطلق العنان

ہونے سے روکا جائے اور افراد (Individuals) کو اس کا موقعہ دیا جائے کہ وہ ایسی شخصیت کی تعمیر کر سکیں اور حکومت کی بیجا دست اندازی یا مداخلت سے محفوظ رہیں۔ مگر بہبودی عامہ کے پیش نظر یہ بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ ان حقوق کا استعمال افراد کی طرف سے اس طرح سے کیا جائے کہ اسٹیٹ کو کسی قسم کا نقصان نہ پہونچے۔

جمہوریہ ہند کے دستور نے اس کی کوشش کی ہے کہ تمام شہری انفرادی (Individual) اور اجتماعی (Collective) دونوں حیثیتوں سے جمہوریت سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اور اُن کو وہ تمام باتیں حاصل ہوں جو انکی زندگی کو اچھا اور مفید بنانے میں معین اور مددگار ثابت ہوں۔

وہ تمام قوانین جو بنیادی حقوق سے کسی طرح بھی متصادم ہوتے ہوں یا ٹکراتے ہوں یا اُن میں سے کسی حق کو منسوخ کرتے ہوں دستور کی طرف سے قطعاً ناجائز ٹھہرتے ہیں۔

بنیادی حقوق حسب ذیل ہیں :—

(۱) برابری یا مساوات کا حق (Right to Equality) اس کی رو سے ہر ہندوستانی بلا تفریق و تخصیص یا تمیز مذہب و ملت سماجی اور شہری حیثیت سے برابر ہے۔ مذہب ذات پات، رنگ یا جنس یا ان میں سے کسی ایک کی بنا پر اسٹیٹ کسی کے ساتھ کسی قسم کا امتیازی یا ترجیحی سلوک نہیں کر سکتی۔ سماجی برابری حاصل کرنے کے لئے جملہ خطابات منسوخ کر دئے گئے ہیں۔ صرف مذہبی اور علمی اعزاز مستثنیٰ ہیں۔ ہندیونین کا کوئی شہری کسی دوسرے اسٹیٹ سے کوئی خطاب نہیں قبول کر سکتا۔ اس سلسلہ میں سب سے بڑا انقلابی قدم چھوت چھات کی منسوخی ہے۔ چھوت چھات کسی بھی شکل میں

برتنا جرم قرار دیا گیا ہے۔ ہوٹل۔ ریسٹورینٹ۔ تعلیم گاہیں۔ تفریح گاہیں۔ سڑکیں ہر ایک کے استعمال کے لئے ہیں کسی کو چھوت چھات کی بنا پر ان کے استعمال سے نہیں روکا جا سکتا۔

(۲) شہری آزادی (Civil Liberty)

دستور جملہ شہریوں کو آزادی تقریر، آزادی تحریر، پُر امن طریقہ سے، بغیر ہتیاروں کے جمع ہونے کا حق، انجمن بنانے کا حق، ہندیونین میں آزادی سے چلنے پھرنے کا حق، جائداد حاصل کرنے اور اُسے فروخت کرنے یا علیحدہ کرنے کا حق، کسی پیشہ کو اختیار کرنے کسی کاروبار تجارت یا بیوپار کرنے کا حق عطا کرتا ہے۔ لیکن آزادی تقریر یا تحریر سے یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو اس کی آزادی بھی حاصل ہے کہ وہ دوسرے کی توہین یا دل آزاری کرے یا تہذیب و اخلاق سے گری ہوئی زبان استعمال کرے یا حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے لوگوں کو ترغیب دے یا تخریبی کارروائیوں کی حمایت کرے۔ علی ہذا اسٹیٹ کو اس کا بھی حق حاصل ہے کہ کسی پیشہ یا کاروبار کو اختیار کرنے کے لئے کسی قسم کی Technical یا فنی قابلیت کی ضرورت ہے۔

کسی شخص کو قانون شکنی کرنے پر اس وقت سزا دی جاتی ہے کہ جب وہ الزام جو اس پر لگایا گیا ہو قانون کی نگاہ میں جرم ہو۔ کسی شخص کو اس جرم کی ایک دفعہ سے زیادہ سزا نہیں دی جائے گی اور نہ کوئی ملزم اپنے خلاف شہادت دینے پر مجبور کیا جائے گا۔ کسی کو غیر معین مدت کے لئے نظر بند نہیں کیا جا سکتا۔ گرفتاری اور نظر بندی کی صورت میں جس قدر جلد ممکن ہو سکیگا گرفتاری یا نظر بندی کی وجہ بتا دی جائے گی۔ نیز قانونی مشیر سے مشورہ

کرنے اور قانونی چارہ جوئی کرنے کا پورا پورا حق حاصل رہے گا۔ کسی شخص کو تین مہینہ سے زیادہ کی مدت تک نظر بند نہیں رکھا جا سکتا بجز اس کے کہ مشاورتی بورڈ (Advisary Board) مدت نظربندی میں سفارش کرے۔

انسانوں کی خرید و فروخت، بیگار یا جبری خدمت کی دوسری شکلوں کو دستور نے ممنوع قرار دیا ہے۔ بچوں کو کسی کارخانہ یا کان میں نوکر نہیں رکھا جا سکتا اور نہ انہیں کسی خطرے کے کام پر لگایا جا سکتا ہے۔

(۳) مذہبی آزادی امن عامہ، اخلاق عامہ اور صحت کا لحاظ رکھتے ہوئے دستور ہر شہری کو ضمیر کی آزادی اور بلا کسی روک ٹوک کے کسی بھی مذہب کو ماننے، اس پر عمل کرنے اور اس کے پھیلانے کا حق عطا کرتا ہے ہر مذہبی فرقے یا ملّت کو اس کا بھی حق حاصل ہے کہ مذہبی اور خیراتی غرضوں کے لئے ادارے قائم کرے، اپنے مذہبی معاملوں اور مسئلوں کا خود انتظام کرے، منقولہ اور غیر منقولہ جائدادوں کا مالک ہو لیکن کسی شخص کو ایسے ٹیکس کے ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ جن کی آمدنی خاص طور پر کسی مذہب یا مذہبی فرقہ کی تبلیغ یا ترویج پر خرچ کی جاتی ہو۔

(۳) حکومت کی طرف سے تسلیم شدہ یا امداد دئے جانے والے تعلیم گاہوں میں کسی طالب علم کو کسی مخصوص مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا مخصوص عبادت میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا لیکن مذہبی تعلیم کے غیر سرکاری اداروں میں تعلیمی اوقات سے باہر انتظام کیا جا سکتا ہے۔

(۴) تہذیبی اور تعلیمی حق اقلیتوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کلچر (تمدن) زبان اور رسم خط کو برقرار رکھیں۔

ان کو اس کا بھی حق دیا گیا ہے کہ وہ جس طرح کے چاہیں تعلیمی ادارے قایم کریں اور اُن کو چلائیں۔ ان اداروں کو امداد دینے میں حکومت کسی قسم کا امتیازی سلوک نہیں کرے گی یعنی سب کو امداد دیگی۔

اقلیت (minority) کے کسی بھی فرد کو کسی سرکاری ادارے میں اسوجہ سے داخل ہونے سے نہ روکا جائے گا کہ اس کا تعلق کسی اقلیت سے ہے۔

(۵) جائداد کے متعلق حق

کسی آدمی کو اس کی جائداد سے صرف اسی حالت میں محروم رکھا جا سکتا ہے کہ جب بذریعہ قانون اس کا اختیار حکومت کو دے دیا گیا ہو۔ حکومت صرف اسوقت کسی جائداد پر خواہ وہ منقولہ ہو یا غیر منقولہ کر سکتی ہے کہ جب قانون کے مطابق یا تو معاوضہ کی رقم مقرر کر دی گئی ہو یا اس کے اصول بیان کر دیئے گئے ہوں یا وہ طریقے طے کر دئے گئے ہوں کہ جن کے بموجب معاوضہ دیا جائیگا صدر جمہوریہ کی منظوری کے بغیر کسی جائداد پر جبراً قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔ حکومت جائدادوں پر ٹیکس بھی لگا سکتی ہے۔

(۶) دستوری دادرسی کا حق
Right to Constitutional Remedies

بنیادی حقوق بے کار ہیں اگر اُن کو منوانے کے لئے شہریوں کے پاس کوئی موثر ذریعہ نہ ہو۔ دستور کی رو سے اُن حقوق کو منوانے کے لئے سپریم کورٹ میں چارہ جوئی کی جا سکتی ہے۔ اس سے شخصی آزادی کی تحفظ کی گارنٹی ہو جاتی ہے۔ سوائے ہنگامی صورت حال (Emergencies) کے جس کا کہ باضابطہ اعلان کر دیا گیا ہو اس حق میں دستوری دادرسی کے حق کو معطل نہیں کیا جا سکتا۔ اس حق کی رو سے سپریم کورٹ کو پروانۂ حاضری ملزم

Habeas Corpus پروانہ امر (*Mandamus*) اور پروانہ منہی یا حکم امتناعی (*Prohibition*) جاری کرنے اور اس قسم کی ہدایتیں جاری کرنے کا حق حاصل ہے اور ریاستی یا مرکزی حکومتیں ان ہدایتوں کو ماننے کے لئے مجبور ہیں۔

حکومت کی پالیسی کی رہنمائی کے لئے کچھ بنیادی اصول دستور میں بیان کئے گئے ہیں جو *Directive principles of State Policy* کے نام سے موسوم ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ جمہوریت نہ صرف سیاسی ہو بلکہ اقتصادی ہو اور ریاستی اور مرکزی حکومت کا ڈھانچہ جمہوری ہو۔ قانون بناتے وقت ان کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ ان کی رو سے اسٹیٹ کا فرض ہے کہ وہ سب کی بھلائی کے لئے سرگرم رہے اور جہاں تک ہو سکے ایک ایسا سماجی نظام قائم کرنے کی کوشش کرے کہ جس میں سماجی، سیاسی اور معاشی انصاف نمایاں ہو۔

اسٹیٹ اپنی پالیسی میں مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کی طرف خاص توجہ کرے گی۔

(۱) تمام شہریوں کو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت یکساں طور پر ایسے وسائل معاش حاصل ہوں کہ جو ان کی ضرورتوں کے لئے کافی ہوں۔

(۲) ملک کے قدرتی ذرائع اور وسائل کو اس طرح سے تقسیم کیا جائے کہ وہ بہترین طریقہ پر سب کی بھلائی کا ذریعہ بن سکیں۔

(۳) ملک کی معاشی تنظیم اس طرح سے ہو کہ دولت اور پیداوار کے ذریعوں پر قبضہ یا اختیار ایک جگہ نہ جمع ہونے پائے کہ جس سے مشترکہ مفاد کو کسی قسم کا نقصان پہونچے۔

(۴) مردوں اور عورتوں کو یکساں کام یا ایک سے کام کی یکساں اجرت ملے۔

(۵) کام کرنے والے مردوں اور عورتوں کی قوت، تندرستی اور بچوں کی کم عمری سے بیجا فائدہ نہ اٹھایا جائے کہ وہ معاشی ضرورتوں سے مجبور ہوکر ایسے پیشوں میں لگ جائیں کہ جوان کی عمر یا قوت کے اعتبار سے اُن کے لئے نامناسب ہوں۔

(۶) بچوں اور کم عمروں کو نفع کمانے کا ذریعہ بننے اور اخلاقی اور مادی بیچارگی سے بچایا جائے

(۷) ہر شہری کو ابتدائی تعلیم مفت دی جائے اور اسٹیٹ اس کی کوشش کرے کہ دستور کے نافذ ہونے کے دس سال کے اندر ملک کے چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام ہو جائے۔

(۸) جہاں تک معاشی حالات اور وسیلے اجازت دیں اس کا بہتر سے بہتر انتظام کیا جائے کہ کام کرنے اور تعلیم پانے کا حق ہر ایک کو حاصل ہو۔ بے روزگاری، بڑھاپا، معذوری، بیماری اور دوسری ناگہانی حالتوں میں سرکاری امداد بھی ملے۔ قانون کے ذریعے روزگار یا ملازمت کی شرطوں میں انصاف اور رحم دلی ہو۔ زچگی یا ولادت کے موقعہ پر طبی امداد کا انتظام ہو۔ مزدوروں کو گذارہ بھر کی مزدوری ملے اور کام کی شرطیں ایسی ہوں کہ انکی زندگی کا میعار اونچا ہو اور وہ سماجی اور کلچرل دلچسپیوں کے لطف اندوز ہوسکیں۔

(۹) پس ماندہ طبقوں اور قبیلوں کی تعلیمی اور معاشی بہتری پر زور دیا جائے۔ انہیں سماجی بے انصافی اور بے جا نفع کمانے کے ذریعہ نہ بننے دیا جائے۔

(۱۰) عوام کی زندگی کا معیار بلند کیا جائے۔
(۱۱) شراب اور دوسری نشیلی چیزوں کو ممکن طور سے ختم کیا جائے۔
(۱۲) تمام شہریوں کے لئے ایک مشترک Civil قانون بنانے کی کوشش کی جائے۔
(۱۳) گاؤں میں پنچایتیں قائم کی جائیں تاکہ گاؤں والے اپنے معاملات خود طے کر سکیں۔
(۱۴) زراعت کی ترقی کے لئے خاص کوشش کی جائے۔ مویشیوں کی عمدہ اور بہتر افزایشی نسل کی خاص کوشش کی جائے علی الخصوص گائے اور دوسرے دودھ دینے والے جانوروں کے ذبیحہ (Slaughter) کے روکنے کی کوشش کی جائے۔
(۱۵) اہم قومی اور تاریخی یادگاروں اور مقاموں کی حفاظت کی جائے انھیں قایم اور برقرار رکھا جائے۔
(۱۶) عدلیہ (Judiciary) کو ایگزیکیوٹو سے علیحدہ کیا جائے۔
(۱۷) امن عامّہ کو ترقی دی جائے مختلف قوموں اور ملکوں سے باعزت تعلقات قایم رکھے جائیں اور بین الملکی سمجھوتوں اور معاہدوں کی پابندیوں کا لحاظ کیا جائے۔

دستور کی رو سے انڈیا یعنی بھارت اور ریاستوں کی ایک یونین ہے کسی بھی اسٹیٹ کو اس سے علیحدہ ہونے کا حق حاصل نہیں۔ اس طرح سے یونین کا اتحاد برقرار رکھا گیا ہے۔ اس وقت ہندیونین ۲۷ ریاستوں وحدتوں پر مشتمل ہے جن کے نام پہلے شیڈیول کے حصہ الف (A) ب (B) اور ج (C) میں بیان کئے گئے ہیں ان ریاستوں میں گورنروں صوبے

ہندوستانی ریاستوں کی یونین (Union) اور مرکزی حکومت کے زیر انتظام علاقے (Centrally administered Area) چیف کمشنروں کے صوبے اور وہ تمام ہندوستانی ریاستیں شامل ہیں جو کسی ریاستی یونین میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

انگریزی عہد حکومت میں ریاستیں برٹش انڈیا سے بالکل علیحدہ تھیں یعنی ان کا انتظام برطانوی حکومت کے زیر انتظام علاقوں سے بالکل مختلف تھا۔ پارلیمنٹری جمہوریت یا جمہوریت کا نام ونشان تک نہ تھا۔ عام لوگوں کو برائے نام حقوق حاصل تھے۔ شہری آزادی تقریباً مفقود تھی۔ اس کے بجائے مطلق العنان شخصی حکومت تھی۔ جاگیردارانہ نظام تھا۔ غرضکہ ریاستی ہند کی دنیا ہی دوسری تھی۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد دستوری نقطہ نگاہ سے یہ مسئلہ نہایت پیچیدہ تھا۔ مگر اس مسئلہ کو کانگریسی حکومت نے بڑی خوش اسلوبی سے حل کر لیا۔ اب ان کو یا تو برطانوی ہند کے صوبوں میں شامل کر دیا گیا ہے یا متعدد ریاستوں کو ملا کر ایک یونین بنا دی گئی ہے۔ حیدرآباد۔ میسور اور کشمیر صرف تین ایسی ریاستیں جن کی سابقہ جداگانہ حیثیت قایم ہے اور جمہوری نظام حکومت قائم کر دیا گیا ہے۔ راجاؤں اور مہاراجاؤں کی مطلق العنانی بالکل ختم کر دی گئی ہے۔

نئی ریاستوں یا صوبوں کو بنانا یا ان کی سرحدوں، ناموں اور رقبوں میں کسی قسم کی تبدیلی یا ردوبدل کرنا پارلیمنٹ کے ہاتھ میں ہے۔ مگر ایسا کرنے سے پہلے صدر جمہوریہ متعلقہ ریاستوں کی قانون ساز جماعتوں کی رائے معلوم کرے گا۔

ہند یونین کا دستور ایک وفاقی (Federal) دستور ہے۔

اسلئے مرکز اور ریاستوں کے درمیان اختیارات کی صاف اور واضح تقسیم کردی گئی ہے۔ ایک آزاد سپریم کورٹ قائم کی گئی ہے جو مرکز اور ریاستوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کیا کرے گی۔ پھر ریاستوں کو اختیارات براہ راست دستور عطا کئے ہیں۔

بہت سے اہم امور میں ہندوستان فیڈریشن امریکہ اور دوسرے فیڈریشنوں سے مختلف ہے۔ مثلاً امریکہ میں Double Citizenship ہے یعنی ہر ریاست کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حدود میں رہنے والوں کو شہریت کے حقوق عطا کرے لیکن جمہوریہ ہند میں دوہری شہریت کا کوئی وجود نہیں۔ شہریت کے حقوق صرف مرکزی یا یونین حکومت عطا کرسکتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ریاستوں کو اپنا کانسٹی ٹیوشن بنانے کا حق حاصل ہے مگر ہند یونین کی ریاستوں کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔

متعدد فیڈریشنوں میں دوہری یا دوقسم کی حکومتوں کی وجہ سے دوقسم کی قانون ساز جماعتیں یا عدالتیں اور سرکاری ملازمتیں ہوتی ہیں۔ مگر ان کے ہونے سے ایک قسم کے انتشار پھیلنے کا بھی امکان ہے۔ جمہوریہ ہند کے دستور نے اس انتشار کو اس طرح سے کم کرنے اور روکنے کی کوشش کی ہے کہ عدالتوں کا نظام ایک ہی رکھا ہے۔ دیوانی اور فوجداری کے قوانین میں بنیادی طور سے یکسانیت رکھی گئی ہے۔ مرکزی یا آل انڈیا سرکاری ملازمتیں مشترک رکھی گئی ہیں اور اس طرح سے قانونی اور انتظامی (Administrative) معاملات میں اتحاد قائم رکھا گیا ہے۔

وفاقی (Federal) کانسٹی ٹیوشن میں لچک نہیں ہوتی۔ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنی مشکل ہوتی ہے۔ ہندوستانی فیڈریشن اس نقص سے

بری ہے۔ حالات کے مطابق اس میں تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ عام حالت میں یہ فیڈرل ہے مگر ہنگامی یا غیر معمولی صورت حال مثلاً ملک میں شدید بدامنی کے رونما ہو جانے یا جنگ چھڑ جانے پر یہ وحدانی (Unitary) صورت بھی اختیار کر سکتا ہے۔

فیڈرل کانسٹی ٹیوشن کے نقائص کو دور کرنے کے لئے دستور نے مرکزی پارلیمنٹ کو ۹۷ امور کے بارے میں قانون بنانے کا پورا پورا حق دیا ہے۔ عام حالت میں بھی مرکز کی قانون سازی کا دائرہ وسیع کیا جا سکتا ہے۔ اگر کونسل آف اسٹیٹس کی دو تہائی اکثریت کسی ریاستی مسئلہ کے بارے میں یہ فیصلہ کرے کہ وہ سارے ملک کے لئے ایک اہم مسئلہ ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ دستور میں کسی قسم کی تبدیلی یا ترمیم کرنی بھی دوسرے فیڈریشنوں کے لئے مقابلہ میں نسبتہً زیادہ آسان ہے۔

قانون سازی کی غرض سے جملہ امور تین فہرستوں میں تقسیم کر دئے گئے ہیں۔ (۱) یونین کی فہرست (۲) ریاستی امور کی فہرست (۳) مشترک امور (Concurrent) کی فہرست۔

یونین اور ریاستوں کے دائرہ ہائے اختیار اور ان کے باہمی تعلقات کو واضح طور سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اگر کسی مشترک مسئلہ کے بارے میں مرکزی مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ کوئی قانون پاس کر دے تو پھر اس بارے میں ریاستی مجلس قانون کے بنائے ہوئے قانون کے مقابلہ میں مرکزی قانون کو ترجیح دی جائے گی۔ کناڈا کی طرح سے وہ تمام اختیارات کہ جن کا ذکر کانسٹی ٹیوشن میں نہیں ہے مرکز ہی کو حاصل ہیں۔ اگر دو یا دو سے زیادہ ریاستیں اس بات پر متفق ہو جائیں کہ انٹرنیشنل معاہدوں کی تعمیل کرنے

کی غرض سے کسی ریاستی مسئلہ پر مرکز کی طرف سے قانون بنانا ضروری ہے تو پارلیمنٹ اس مسئلہ کے بارے میں بھی قانون بنا سکتی ہے۔

دستور نے اس کی کوشش کی ہے کہ یونین یا مرکز اور ریاستوں میں اتحاد عمل قائم رہے اور ریاستیں اپنے عاملانہ اختیارات (Executive powers) کو اس طرح سے استعمال کریں کہ پارلیمنٹ یا مرکزی مجلس قانون ساز کے بنائے ہوئے قانونوں اور ہدایتوں کی تعمیل پوری پوری ہو جائے۔ مرکزی حکومت ریاستوں کو فوجی یا قومی اہمیت رکھنے والے وسائل اور ذرائع سفر و خبر رسانی کو بنانے اور قائم رکھنے کی ہدایت کر سکتا ہے۔ پارلیمنٹ اور ریاستی حکومت کی رضامندی سے صدر جمہوریہ اس حکومت یا اس کے افسروں کو یونین کے زیر اختیار کسی بھی امر کا انتظام سپرد کر سکتا ہے اور اس سلسلے کے مصارف مرکزی حکومت ادا کرے گی۔

ریاستوں میں باہمی ہم آہنگی (Co-ordination) قائم رکھنے اور اتحاد عمل کو ترقی دینے کے لئے صدر جمہوریہ ایک ریاستی کونسل قائم کریگا جو ریاستوں کے باہمی جھگڑوں کا تصفیہ کرے گی اور مشورہ دے گی کہ کسی طرح سے یونین اور ریاستوں کے مشترک مفاد کو ترقی پہونچے۔

یونین اور ریاستوں میں آمدنی کے ذرائع اور وسائل کو بھی تقسیم کر دیا گیا ہے اس کی تفصیلات ایک مالیاتی کمیشن (Financial Commission) طے کرے گا جسے صدر جمہوریہ مقرر کرے گا۔

ناگہانی یا ہنگامی صورت حال کے رونما ہو جانے مثلاً ملک میں شدید بدامنی رونما ہو جانے یا کسی ملک سے جنگ چھڑ جانے یا کسی ریاست کی مالی پوزیشن خراب ہو جانے یا دستوری تعطل (Political dead lock) پیدا

ہونے کی صورت میں یونین کے عاملانہ (Executive) اور قانون سازی (Legislation) کے اختیارات کا اطلاق ریاستی امور پر ہوگا۔ اس صورت حال کے رونما ہونے کا اعلان صدر جمہوریہ کی طرف سے کیا جائے گا۔ اور صدر اس اعلان کے ذریعہ اس ریاست یا حصّہ ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے گا۔

دستور نے پارلیمنٹری جمہوری حکومت قایم کی ہے اسلئے ایگزیکیوٹو یا عاملہ یعنی حکومت چلانے والی جماعت مرکزی مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ کے سامنے اپنی ساری پالیسیوں اور باتوں کے لئے جواب دہ اور ذمہ دار ہے۔ مرکزی حکومت کا Executive Head صدر جمہوریہ ہے مگر یہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر سے بالکل مختلف ہے۔ صدر امریکہ اصل ایگزیکیوٹو ہے مگر صدر جمہوریہ ہند کو اتنے وسیع اختیارات حاصل نہیں۔ وہ قوم کی نمائندگی ضرور کرتا ہے مگر اس پر حکومت نہیں کرتا۔

صدر جمہوریہ کا انتخاب بالواسطہ طریقہ سے (Indirect) ایک Electoral College یا انتخابی کالج جس میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے ممبر اور ریاستی مجالس قانون ساز کے چنے ہوئے ممبر شامل ہوں گے کرے گا۔ یہ انتخاب بذریعہ تناسب (Proportional Representation) طریقۂ انتخاب اور قابل انتقال ووٹ (Single Transferable Vote) کے ذریعہ سے ہوگا۔ اس الیکشن میں اس کا خیال رکھا جائے گا کہ مختلف ریاستوں کی نمائندگی کی نسبت یکساں یا ایک سی (Uniform) ہو جائے۔

ہر وہ شخص کہ جو ہند یونین کا شہری ہو اور کم سے کم ۲۵ سال کا ہو

اور ایوان عام (House of People) کی ممبری کی شرطیں پوری کرتا ہو۔ جمہوریہ کی صدارت کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔ سرکاری ملازم اس عہدے کے لئے نہیں کھڑے ہو سکتے۔

صدارت کے عہدے کی مدت ۵ سال ہے۔ لیکن اس سے مستعفی ہونے کا حق حاصل ہے۔ دستور کی خلاف ورزی کرنے پر اس سے مواخذہ کیا جا سکتا ہے یعنی Impeach کیا جا سکتا ہے۔ اس کے رہنے کے لئے ایک خاص سرکاری عمارت ہوگی اور دس ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملے گی۔ جس میں کوئی کمی اس کے عہدے کی مدت کے زمانہ میں نہیں کی جائے گی۔

چونکہ جمہوریہ ہند کی صدارت کا عہدہ معزز ترین اور بلند ترین عہدہ ہے اسلئے اس کے اختیارات اور فرائض کی بجا آوری کے سلسلہ میں کسی قسم کی بازپرس کسی عدالت میں نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ کوئی مقدمہ اس کے خلاف دائر کیا جا سکتا ہے۔

اگر وہ دستور کی خلاف ورزی کرے تو پھر اس کا مواخذہ کیا جا سکتا ہے۔ پارلیمنٹ کا کوئی ایک ایوان (House) اس کے خلاف فرد جرم پیش کر سکتا ہے لیکن اس کی تحریک ایسے رزولیوشن کی صورت میں کرنی ہوگی کہ جس کا تحریری نوٹس کم سے کم ایک چوتھائی ممبروں نے دیا ہو اور کم سے کم چودہ دن کا نوٹس دیا گیا ہو اور اس تجویز کو دو تہائی اکثریت سے اس ایوان نے پاس کیا ہو۔ اس کے بعد دوسرا ایوان اس الزام یا الزامات کی تحقیقات خود کرے گا اور اس کے نتیجہ کے طور پر اگر ممبروں کی دو تہائی تعداد نے یہ تجویز منظور کر لی کہ صدر پر جو الزامات لگائے گئے ہیں صحیح ہیں تو ایسی حالت میں صدر کو تجویز کے منظور ہو جانے

کی تاریخ سے اپنے عہدہ سے برطرف سمجھا جائے گا۔

دستور کی رو سے ہندیونین کے جملہ عاملانہ (Executive) اختیارات صدر کو حاصل ہیں۔ ہندیونین کی جملہ فوجوں کی اعلیٰ کمان اسکے ہاتھ میں ہے اسے اختیار ہے کہ وہ کسی شخص کو جسے کسی جرم کے پاداش میں سزا دی گئی ہو معاف کر دے، ملتوی کر دے، مہلت دیدے، باقی سزا معاف کر دے یا سزا میں کمی کر دے یا اس کی نوعیت بدل دے۔ تمام اہم عہدوں پر تقرر وہی کرے گا۔ جن میں وزیراعظم مرکزی کابینہ (Cabinet) کے وزیر، ریاستوں کے گورنر، دوسرے ملکوں میں ہندیونین کے سفارتی نمایندے سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج، یونین پبلک سروس کے چیرمین، ممبر اور اٹارنی جنرل شامل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ الیکشن اور مالیاتی کمیشن شیڈولڈ علاقوں کے نظم ونسق، اور پس ماندہ طبقوں کی سماجی اور تعلیمی حالت کے بارے میں رپورٹ پیش کرنے والے کمیشن اور دوسرے کمیشن بھی مقرر کرے گا۔ اس کے قانون سازی کے اختیارات میں پارلیمنٹ کی چھٹی (Recess) کے زمانہ میں آرڈی نینس (Ordinance) جاری کرنا اور شیڈولڈ علاقوں میں اچھی حکومت قایم رکھنے کے لئے قاعدے اور ضابطے بنانے ہیں۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ کے پاس کئے ہوئے بلوں کو دوبارہ غور کرنے کے لئے بھیج سکتا ہے۔ جب ضرورت ہو تو پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں یا کسی ایک ایوان کا اجلاس طلب کرسکتا ہے۔ ایوان عام (House of People) کو منتشر (Dissolve) کرسکتا ہے۔ ان کے اجلاسوں میں تقریر کرسکتا ہے کسی معاملہ کے متعلق ایک یا دونوں ایوانوں میں پیغام (Message) بھیج سکتا ہے۔ پارلیمنٹ

کوئی رقم اُس وقت تک منظور نہیں کرسکتی کہ جب تک صدر اس کی سفارش نہ کرے۔ قانون اُس وقت ہند یونین میں نافذ ہو سکتا ہے کہ جب صدر اس کی منظوری دے دے۔

اگر صدر یہ سمجھے کہ شدید بدامنی کسی حصۂ ملک میں رونما ہو گئی ہے یا کسی دوسرے ملک سے جنگ چھڑ گئی ہے تو وہ بذریعہ خاص اعلان کے ہنگامی صورت حال کے قایم ہونے کا اعلان کرسکتا ہے اور اس اعلان کے بعد یونین حکومت ملک کے اُن حصّوں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیگی اور پارلیمنٹ ان حصوں کے لئے قانون بنائے گی۔ یہ صورت حال زیادہ سے زیادہ تین سال تک قایم رہ سکتی ہے۔ اگر کسی ریاست میں دستوری تعطل (Political Deadlock) پیدا ہو جائے تو صدر اس ریاست کی حکومت اپنے ہاتھ میں لے گا اور پارلیمنٹ اس ریاست کے بارے میں جملہ اُمور کے متعلق قانون بنائے گی۔ علیٰ ہذا اگر کسی ریاست کی مالی حالت خراب ہو جائے تو صدر اس ریاست کا سارا مالی انتظام اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے۔

نائب صدر جمہوریہ ہند کا ایک نائب صدر بھی ہوگا جو اپنے عہدے کے اعتبار سے ریاستوں کی کونسل (Council of States) کا صدر ہوگا اور صدر جمہوریہ کی بیماری، برطرفی یا مستعفی ہو جانے کی صورت میں اس کی جگہ کام کرے گا۔ نائب صدر کا انتخاب پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے ممبر ایک مشترک اجلاس میں کریں گے یہ انتخاب Proportional Representation اور Single Transferable Vote کے ذریعہ عمل میں آئے گا۔ ہند یونین کا ہر شہری بشرطیکہ اس کی عمر کم از کم ۳۵ سال کی ہو اور ریاستوں

کی کونسل کی ممبری کے لئے انتخاب کی شرطیں پوری کرتا ہو نائب صدارت کے الیکشن کے لئے کھڑا ہو سکتا ہے۔ تحریک عدم اعتماد (Vote of no confidence) پاس ہونے کی صورت میں یا کسی بیماری، یا حادثہ کی وجہ سے ناقابل ہو جانے کی صورت میں اُسے اُس کے عہدے سے ہٹایا جا سکتا ہے۔

وزیروں کی کونسل دستور کی رو سے ایک وزیروں کی کونسل (Council of Ministers) ہوگی جس کا لیڈر وزیر اعظم ہوگا جو ایوان عام کی اکثریت رکھنے والی پارٹی میں سے مقرر کیا جاوے گا۔ اس کونسل کا کام صدر کو اس کے فرائض کی بجا آوری میں مشورہ دینا ہوگا۔ یہی کونسل ملک کا سارا انتظام کریگی۔ اور اس وقت تک یہ کام انجام دیگی کہ جب تک اُسے ممبروں کی اکثریت کی تائید حاصل رہے۔ دوسرے وزیروں کا تقرر وزیر اعظم کی سفارش پر صدر کرے گا۔ وزیر اعظم کونسل یا کابینہ (Cabinet) کے فیصلوں کی اطلاع صدر کو برابر دیتا رہیگا۔ یہ کونسل ایوان عام کے سامنے ذمہ دار اور جواب دہ ہوگی اور گورنمنٹ کی پالیسی بھی طے کرے گی۔

پارلیمنٹ دستور کی رو سے جمہوریہ ہند کی مرکزی مجلس قانون ساز (Central Legislature) کا نام پارلیمنٹ ہے جو صدر جمہوریہ اور دو ایوانوں پر مشتمل ہے۔ ان ایوانوں کے نام ریاستوں کی کونسل (Council of States) اور ایوان عام (House of people) ہیں۔ صدر کی منظوری کے بغیر پارلیمنٹ کے پاس کئے ہوئے بل ملک کا قانون نہیں بن سکتے۔

ہر وفاقی (Federal) دستور کی طرح جمہوریہ ہند کے دستور میں بھی مرکزی مجلس قانون ساز دو ایوانی (Bi Cameral) ہے۔ ایوان بالا کا نام ریاستوں کی کونسل (Council of States) ہے جو ریاستوں کی نمایندگی کرتی ہے۔ یہ ایک مستقل جماعت ہے یعنی یہ منتشر (Dissolve) نہیں کی جائے گی بلکہ ہر دوسرے سال کے ختم پر اس کے ممبروں کی ایک تہائی تعداد کی مدت ممبری ختم ہو جایا کرے گی۔ اس کے ممبروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ۲۵۰ ہے۔ ان میں سے ۱۲ کو صدر جمہوریہ نامزد کرے گا۔ یہ وہ اشخاص ہوں گے جو علوم، فنون، سائنس، ادب یا سماجی خدمات (Social Service) میں غیر معمولی پوزیشن کے مالک ہوں۔ باقیماندہ ممبر ریاستوں کے نمائندے ہوں گے جو بذریعہ الیکشن منتخب ہوں گے۔ کونسل کا انتخاب Indirect ہوگا یعنی اُسے عام لوگ نہیں منتخب کریں گے بلکہ ریاستی اسمبلی کے ممبر Proportional Representation اور Single Transferable ووٹ کے ذریعہ سے ہوگا۔

پارلیمنٹ کے ایوان زیرین (Lower House) کا نام House of People یا ایوان عام ہے۔ اس کے ممبروں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ۵۰۰ ہوگی اور ممبروں کا انتخاب براہ راست اور بلا واسطہ عام ووٹر کریں گے۔ شیڈول میں مندرج ذاتوں یعنی اچھوتوں اور قبیلوں کے لئے سیٹس محفوظ (Reserve) کر دی گئی ہیں۔ اگر اینگلو انڈینوں کو معقول نمایندگی نہ حاصل ہو تو صدر ان کے نمایندوں کو ایوان کا ممبر نامزد کر سکتا ہے۔

ہند یونین کی ریاستیں علاقہ وار انتخابی حلقوں (Territorial-Constituencies) میں ایوان عام کے انتخاب کے لئے تقسیم کردی جائیں گی اور ان حلقوں سے نمایندے اس حساب سے چنے جائیں گے کہ ہر ساڑھے سات لاکھ باشندوں کا کم سے کم ایک نمایندہ ضرور لیا جائے اور ۵ لاکھ باشندوں کے لئے کسی طرح ایک سے زیادہ نمایندہ نہ ہو۔ بالعموم ایوان عام ۵ سال تک کام کرے گا بجز اس کے کہ اس سے پہلے وہ منتشر یا برخاست (Dissolve) کر دیا جائے۔ ہنگامی صورت حال (Emergency) میں اس کی مدت کار میں ایک وقت میں ایک سال کی توسیع کی جاسکتی ہے۔

اس مقصد کے لئے کہ الیکشن جائز طریقہ سے ہوں اور برسر اقتدار پارٹی کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہ ہو ایک آزاد اور غیر جانب دار الیکشن کمیشن مقرر کیا جائے گا جو ووٹروں کی فہرست تیار کرے گا اور الیکشن کی نگرانی کرے گا۔ چیف الیکشن کمیشن کو بدیں وجہ ایک آزاد اور غیر جانبدارانہ پوزیشن حاصل رہے گی۔

دستور کی رو سے سال میں کم سے کم دو بار دونوں ایوانوں کے اجلاس ہونے چاہئیں۔ اور اس کے آخری اور دوسرے اجلاس کی پہلی نشست کے درمیان چھ مہینے سے زیادہ کا وقفہ نہ ہونا چاہئے۔ اجلاس کو مدعو کرنا اور برخاست کرنا صدر جمہوریہ کا کام ہے۔

ہر ایوان کے ممبروں کی $\frac{1}{10}$ تعداد کی موجودگی کے بغیر اس ایوان کا اجلاس نہ ہو سکے گا۔ ہر مسئلہ حاضر اور ووٹ دینے والے ممبروں کی اکثریت سے طے کیا جا دے گا۔ ہر ایوان کے صدر کو Casting Vote

دینے کا حق بھی حاصل رہے گا۔

ایوان عام کے صدر کا نام اسپیکر اور نائب صدر کا (Deputy Speaker) ڈپٹی اسپیکر ہوگا۔ ایوان بالا یا Council of States کے صدر کا نام چیرمین اور نائب صدر کا نام ڈپٹی چیرمین ہوگا۔

ہر وہ شخص پارلیمنٹ کا ممبر ہو سکتا ہے کہ جو ہندوستان کا شہری ہو کونسل آف اسٹیٹس کی ممبری کے لئے ضروری یہ ہے کہ کم سے کم سال کا ہو اور ایوان عام کے لئے ضروری ہے کہ کم سے کم ۲۵ سال کا ہو اس کے لئے وہ تمام شرطیں پائی جانی چاہیئں جو پارلیمنٹ کی طرف سے مقرر کی جائیں۔

وہ شخص پارلیمنٹ کا ممبر نہیں رہ سکتا جو کسی سرکاری ملازمت پر فائز ہو، یا پاگل ہو گیا ہو یا کسی دوسری اسٹیٹ کا شہری ہو گیا ہو یا جسے پارلیمنٹ نے کسی قانون کے ذریعہ نااہل قرار دیدیا ہو۔

پارلیمنٹ کے ممبروں کو آزادی تقریر حاصل ہے۔ یعنی پارلیمنٹ کے اجلاس یا اس کی کسی کمیٹی میں کوئی بات کے کہنے یا رہنے دینے کی بنا پر ان کے خلاف عدالت میں کسی قسم کی کارروائی نہ کی جاسکے گی۔ علیٰ ہذا پارلیمنٹ یا اس کے ایوانوں کی کارروائی کی چھپی ہوئی روداد کے خلاف کسی عدالت میں کوئی کارروائی نہ کی جاسکے گی۔

قانون سازی کا ضابطہ

اگرچہ پارلیمنٹ دو ایوانی (Bicameral) ہے مگر دستور نے قانون سازی (Legislation) میں ایوان عام (House of People) کو زیادہ با اختیار مانا ہے۔ مالی معاملوں میں اسی کا فیصلہ

آخری ہے۔ ضابطہ (Procedure) کی تفصیل ہر ایوان خود طے کرے گا
ہر قانون بجز مالیاتی بل (Financial Bill) کے کسی بھی ایوان میں
پیش کیا جا سکتا ہے لیکن مالیاتی بل (Financial Bill) صرف
ایوان عام ہی میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کی منظوری کے بعد اُسے
کونسل آف اسٹیٹس میں بھیجا جائے گا۔ جسے دو ہفتہ کے اندر اپنی
رائے کے ساتھ ایوان عام میں بھیج دینا ضروری ہوگا۔ ایوان عام کو اختیار
ہے کہ کونسل کی رائے کو مانے یا نہ مانے۔ جس صورت میں بھی یہ قانون
ایوان عام منظور کرے گا وہ دونوں ایوانوں سے پاس شدہ سمجھا جائیگا۔

صدر جمہوریہ دونوں ایوانوں میں ہر مالی سال کے متعلق حکومت ہند
کی آمدنی اور خرچ کا تخمینہ یا بجٹ پیش کرے گا۔ اس میں وہ رقمیں دکھائی
جائیں گی جو

(۱) اس خرچ کو پورا کرنے کے لئے جسے دستور میں ہند کی آمدنی سے
واجب الادا قرار دیا گیا ہو ضروری ہوں۔

(۲) وہ کہ جس سے دوسرے خرچ کہ جو ہند یونین کی آمدنی سے کئے
جانے تجویز ہوں پورے کئے جائیں۔

پہلی قسم میں صدر جمہوریہ کی تنخواہ، الاؤنس اور اس کے عہدے کے
متعلق دوسرے مصارف، پارلیمنٹ کے دونوں کے صدر و نائب صدر کی
تنخواہیں اور الاؤنس، سپریم کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں، الاؤنس اور
پینشن، فیڈرل کورٹ کے ججوں کی پینشن، قرض کے مطالبات مع سود،
ہائی کورٹ کے ججوں کی پینشن، ایسی تمام رقمیں جو کسی عدالت کے حکم، ڈگری
یا فیصلہ کے مطابق دینی ہوں یا اور کوئی خرچ جسے پارلیمنٹ واجب الادا

قرار دے شامل ہونگی - یہ رقمیں پارلیمنٹ کے سامنے ووٹ کے لئے پیش نہ ہونگی - مگر ان کے بارے میں بحث کی جاسکے گی -

دوسری قسم میں جو مصارف شامل ہیں وہ خرچ کے مطالبوں کی صورت میں ایوان عام کے سامنے پیش کی جائیں گی اور ایوان عام کو اُسے منظور کرنے یا نا منظور کرنے یا کم کر دینے کا حق حاصل ہوگا - مطالبوں کی منظوری کے بعد صرف میں لانے کا بل (Appropriety Bill) پیش کیا جائیگا جو ایوان عام کے سامنے پیش کیا جائیگا - فائینس بل کہ جس پر ٹیکسوں کے متعلق گورنمنٹ کی تجویزیں شامل ہونگی اسی ایوان کے سامنے صدر کی سفارش کے ساتھ پیش کیا جائیگا اور ایوان کی منظوری کے بعد اس کا نفاذ ہوگا - اگر اس خرچ کے علاوہ کہ جو ہند یونین کی آمدنی میں سے اس سال منظور کیا گیا ہو مزید خرچ کی ضرورت پڑ جائے تو ایوان عام صدر کی سفارش پر اس قسم کے زاید مطالبوں کی منظوری دے سکتا ہے ہنگامی یا فوری ضرورتوں کے فنڈ سے ایوان کی منظوری حاصل کرنے سے پہلے صدر ان مطالبات کی ادائیگی پیشگی طریقہ پر کر سکتا ہے -

ریاستیں دستور کی رو سے ہند یونین کی وحدتوں (Units) کا نام States یا ریاستیں ہیں - ان کے ناموں کو پہلے شیڈول کے Part A , B and C میں بیان کر دیا گیا ہے - ان ریاستوں کی کل تعداد ۲۷ ہے -

Executive. ہر ریاست کا عاملانہ Executive Head گورنر ہوگا جسے ۵ سال کے لئے صدر جمہوریہ مقرر کرے گا - صرف ان ہی اشخاص کو اس عہدہ پر مقرر کیا جاوے گا کہ جو

کم سے کم ۳۵ سال کے ہوں اور ہند یونین کے شہری ہوں۔ تقرری کے بعد انھیں قانون ساز مجالس سے خواہ وہ مرکزی ہوں یا ریاستی مستعفی ہونا پڑیگا۔ اگر تقرر سے پہلے وہ ان مجالس کے ممبر ہوں۔

گورنر کے رہنے کے لئے ایک خاص سرکاری عمارت ہوگی اور اُسے ساڑھے پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملا کرے گی اور وہ تمام الاؤنس اور خاص حقوق حاصل ہوں گے جو پہلے صوبوں کے گورنروں کو حاصل ہیں۔

گورنر چیف منسٹر کا تقرر کرے گا اور اُس کی سفارش پر دوسرے وزیروں کو مقرر کرے گا۔ ایڈووکیٹ جنرل کو بھی وہی مقرر کرے گا۔ ریاستی حکومت کا نظم ونسق چلانے کے لئے قاعدے اور ضابطے بنائیگا، اسے مجرموں کو معاف کر دینے، ان کی سزا کم کر دینے، ملتوی کر دینے، اور بقیہ سزا معاف کر دینے کا حق حاصل ہے۔ ریاستی مجالس قانون ساز کے اجلاس وہی طلب کر سکتا ہے اور ان اجلاسوں کو ملتوی بھی کر سکتا ہے۔ اسمبلی کو برخاست کر سکتا ہے۔ اسمبلی یا مجالس قانون ساز کے منظور کئے ہوئے جملہ بلوں پر یا تو وہ خود اپنی منظوری دے سکتا ہے۔ یا انہیں صدر کے مزید غور کے لئے محفوظ کر سکتا ہے۔ وہ کسی قانون کو مجلس قانون ساز کے پاس دوبارہ غور کے لئے بھیج سکتا ہے اور پیغام بھیج سکتا ہے۔ وہ اس مجلس کو ایڈریس (Address) کر سکتا ہے اور اسکی تعطیل کے زمانہ میں آرڈیننس بھی جاری کر سکتا ہے۔ بغیر اس کی سفارش کے کوئی مالیاتی بل مجلس قانون ساز میں پیش نہیں کیا جا سکتا اور نہ کوئی مالی مطالبہ منظوری کی غرض سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

مرکز کی طرح سے ریاستوں میں بھی حکومت کا کام چلانے کے لئے وزیروں کی کونسل یا کابینہ بھی ہوگی جس کا رئیس یا Head چیف منسٹر ہوگا یہ مجلس قانون ساز کی اکثریتی پارٹی کا لیڈر ہوگا کابینہ (Cabinet)

کے فیصلوں سے وہ گورنر کو برابر مطلع کرتا رہے گا اور ہر معاملہ کے متعلق
جملہ ضروری اطلاعات گورنر کو باہم پہونچائے گا اور ان تمام معاملوں کو پیش
کریگا جن پر اس وقت تک Cabinet نے غور نہیں کیا ہے۔
گورنر کا فرض خصوصی ہوگا کہ مرکزی حکومت کی ہدایتوں اور احکام کی
پوری پوری تعمیل کریں۔ ہنگامی صورت حال میں وہ صدر جمہوریہ اُسے کسی بھی
معاملہ کے بارے میں کام کرنے کا حکم دے سکتا ہے۔
Part B اسٹیٹس کا ایگزیکٹو ہیڈ راج پرمکھ ہوگا۔ ان کا تقرر گورنمنٹ
آف انڈیا اور ہندوستانی ریاستوں کے باہمی معاہدوں کے ذریعہ سے ہوا تھا
ان معاہدوں کی رو سے اُن کی تنخواہیں طے کر دی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ اُن کو
وہ الاونس بھی ملیں گے جو صدر جمہوریہ مقرر کرے۔ ان ریاستوں کی حکومت
چلانے کے لئے بھی چیف منسٹر اور کابینہ وزارت ہوگی جو دس سال تک ان
ریاستوں کی حکومتیں حکومت ہند کے زیر نگرانی کام کریں گی اور اُن کا فرض
ہوگا کہ صدر کی ہدایتوں پر پوری طرح سے کاربند رہیں۔
ریاست جموں اور کشمیر کے معاملات میں مرکز صرف ان ہی امور میں مداخلت
کرسکتا ہے کہ جن کی تصریح Instrument of acession
میں کر دی گئی ہے۔ دوسرے امور میں مرکزی حکومت صرف اس وقت مداخلت
کرسکتی ہے کہ جب ریاستی حکومت اور اس کے مابین کوئی معاہدہ ہو جائے۔
Part C اسٹیٹس کی ریاستوں کا نظم و نسق چلانے کے لئے صدر
جمہوریہ چیف کمشنر اور لیفٹیننٹ گورنر مقرر کرے گا۔ ان ریاستوں میں بھی
وزیروں کی کونسلوں اور Advisory کونسلوں کے بارے میں پارلیمنٹ دفعات
منظور کرسکتی ہے اور اس کے فرائض اور اختیارات کی تصریح کرسکتی ہے۔

ریاستی مجلس قانون ساز
State Legislatures

مرکز کی طرح سے ریاستوں میں بھی قانون ساز مجلس گورنر یا ایک یا دو ایوانوں پر مشتمل ہوگی۔ مدراس، بمبئی، اتر پردیش، پنجاب، مغربی بنگال، بہار اور میسور میں ریاستی اسمبلی کے علاوہ ایوان بالا (Legislative Council) بھی ہوگی۔ بقیہ ریاستوں میں ایک ایوانی مجلس قانون ساز ریاستی اسمبلی (State Legislative Assembly) کے نام سے ہوگی اگر متعلقہ ریاست کی اسمبلی اس بارے میں ریزولوشن پاس کر دے تو پارلیمنٹ اس ریاست کی Legislative کونسل کو ختم کر سکتی ہے یا قائم کر سکتی ہے۔

بالعموم اسمبلی کی مدت کار پانچ سال ہوگی بجز اس کے کہ وہ اس سے پہلے برخاست کر دی جائے۔ ہنگامی صورت حال میں اس کی مدت کار میں ایک سال کی توسیع کی جا سکتی ہے۔

دستور کی رو سے کسی ریاست کی اسمبلی کے ممبروں کی تعداد پانچسو سے زیادہ اور ساٹھ سے کم نہ ہوگی۔ ممبروں کا انتخاب آبادی کی بنا پر اس طرح سے کیا جائے گا کہ ہر ۵۰ ہزار باشندوں پر ایک نمائندہ اسمبلی میں لیا جائیگا۔ لیکن آسام کے خود مختار (Autonomous) ضلع اور شلانگ کی میونسپلٹی بوجہ کمی آبادی اس سے مستثنیٰ سمجھے جائیں گے۔ ریاستوں کی آبادی کا فیصلہ بجل مردم شماری کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ شیڈولڈ قبیلوں اور اچھوت ذاتوں کو چھوڑ کر اور کسی فرقہ کے لئے سیٹس Reserve نہیں کی جائیں گی۔ اگر گورنر اینگلو انڈینوں کی نمائندگی کی ضرورت محسوس کرے تو وہ اس فرقہ کے ممبروں کو اسمبلی کا ممبر نامزد کر سکتا ہے۔

اسمبلی کی ممبری کے لئے ضروری ہے کہ ممبر ہند یونین کا شہری ہو اور کم سے کم ۲۵ سال کا ہو اور وہ شرطیں پوری کرتا ہو جو پارلیمنٹ نے مقرر کی ہوں۔
لیجسلیٹو کونسل کم سے کم ۴۰ ممبروں پر مشتمل ہوگی اور کسی صورت میں بھی ریاست کی اسمبلی کی ۱/۴ تعداد سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس کے ممبروں میں مختلف قسم کے لوگ شامل ہوں گے۔ ایک تہائی ممبروں کا انتخاب میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبر کریں گے ۱/۱۲ تعداد کا انتخاب وہ رجسٹرڈ گریجوئٹس (Registered graduates) کریں گے کہ جنہیں اپنے کو رجسٹرڈ کرائے ہوئے تین سال ہو گئے ہوں۔ ۱/۱۲ کا انتخاب کم سے کم تین سال کا تعلیمی تجربہ رکھنے والے Teachers کریں گے۔ ان میں سیکنڈری اسکولوں کے ٹیچرس بھی شامل ہوں گے۔ ایک تہائی کا انتخاب لیجسلیٹو اسمبلی اپنے غیر ممبروں میں سے کرے گی۔ بقیہ کو گورنر نامزد کرے گا۔ ان میں وہ لوگ ہوں گے کہ جو علوم، فنون، ادب یا سوشل سروس میں غیر معمولی یا امتیازی پوزیشن کے مالک ہوں۔
یہ مجلس ایک مستقل جماعت ہوگی۔ ہر دوسرے سال اس کے ایک تہائی ممبروں کی مدت ممبری ختم ہو جایا کرے گی اور نیا الیکشن ہوا کرے گا۔
کونسل کا ممبر ہونے کے لئے ضروری ہے کہ کم سے کم ۳۰ سال کی عمر ہو بقیہ شرطیں وہی ہیں کہ جو اسمبلی کی ممبری کے لئے ہیں۔
ریاستی مجالس قانون ساز کے ممبروں کو وہ جملہ حقوق حاصل ہیں جو مرکزی مجلس قانون ساز کے ممبروں کو حاصل ہیں۔
ریاستی مجالس قانون ساز کی قانون سازی کے ضابطے تقریباً وہی ہیں جو مرکزی مجلس قانون ساز کے ہیں۔ مالی بل (Financial Bill) کی ابتدا

صرف اسمبلی میں کی جائے گی لیکن ریاست میں دو ایوانی (Bicameral-
Legislature) مجلس قانون ساز ہونے کی صورت میں کوئی بل صرف
اس وقت پاس سمجھا جائے گا کہ جب دونوں ایوانوں نے اُسے پاس کر دیا ہو
اختلاف رائے کی صورت میں دونوں ایوانوں کا مشترک اجلاس طلب کیا جائیگا
اور اکثریت سے فیصلہ کیا جائے گا۔ اور اس فیصلہ کے بعد یہ بل دونوں ایوانوں
سے پاس شدہ سمجھا جائے گا۔

مالی بل کی منظوری تمام تر اسمبلی کے ہاتھ میں ہے۔ مرکز کی طرح ریاستی
بجٹ میں بھی دو قسم کے خرچے شامل ہیں ایک تو وہ جو اس خرچ کو پورا کرنے کے
لئے ضروری ہوں کہ جنھیں دستور نے ریاست کی آمدنی سے واجب الادا
قرار دیا ہو۔ اور دوسرے وہ خرچے جو ریاست کی آمدنی سے پورے کئے جائینگے۔

گورنر کی تنخواہیں اور الاؤنس اور اس کے عہدے سے متعلق دوسرے
خرچے، اسمبلی اور کونسل کے صدر اور نائب صدر کی تنخواہیں اور الاؤنس
قرض سے متعلق مطالبے معہ سود، اور وہ دوسرے خرچے جو قرض سے جاری
رکھنے اور چکانے سے متعلق ہوں، ہائی کورٹ کے ججوں کی تنخواہیں پنشن
اور الاؤنس، اور وہ تمام رقمیں کہ جو کسی عدالت کے حکم، ڈگری یا فیصلے کے
مطابق ادا کرنے ضروری ہوں پہلی قسم میں شامل ہیں۔ یہ حصہ اسمبلی کے
سامنے ووٹ کے لئے پیش نہ کیا جائے گا۔ مگر تخمینوں کا وہ حصہ جس کا
تعلق دوسرے خرچوں سے ہے اسمبلی میں خرچ کے مطالبوں کی شکل میں
اسمبلی کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا اور اسمبلی کو ان مطالبوں کے
منظور، نا منظور کرنے یا کم کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ خرچ کا مطالبہ صرف
گورنر کی سفارش پر کیا جاسکے گا۔

گورنر اپنے دستخط سے ایک شیڈیول کی تصدیق کرے گا جس میں وہ
رقمیں درج ہونگی جنہیں اسمبلی نے اپنے ووٹ سے منظور کر دیا ہو اور وہ مختلف
رقمیں بھی درج ہونگی جو ریاست کی آمدنی سے واجب الادا خرچ کو پورا کرنے
کے لئے ضروری ہوں۔ یہ شیڈیول اسمبلی میں پیش کیا جائیگا مگر قانون ساز جماعت
میں اس پر بحث نہ ہوگی اور نہ ووٹ لیا جائے گا۔

زاید خرچ کی منظوری کے لئے وہی ضابطہ اختیار کیا جائے گا جو بجٹ
کے سلسلہ میں اختیار کیا جاتا ہے۔ عدلیہ (Judiciary) دستور نے عدلیہ
(Judiciary) کو آزاد اور غیر جانب دارانہ پوزیشن عطا کی ہے۔

سپریم کورٹ

ہندیونین کی سب سے بڑی عدالت سپریم کورٹ ہے
جو ایک چیف جسٹس اور سات دوسرے ججوں پر مشتمل ہوئی
چیف جسٹس کا تقرر کرتے وقت صدر جمہوریہ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ان
ججوں سے مشورہ کریگا جن سے مشورہ کرنا وہ ضروری اور مناسب سمجھے۔ دوسرے
ججوں کے تقرر میں وہ چیف جسٹس سے مشورہ کرے گا۔

صرف وہی شخص اس عدالت کے جج ہونے کا اہل ہو سکتا ہے کہ جو ہندیونین
کا شہری ہو اور کم سے کم پانچ سال تک کسی ہائی کورٹ کا جج رہ چکا ہو یا کم سے کم
دس سال تک کسی ہائی کورٹ کا ایڈوکیٹ رہ چکا ہو۔ یا اس غیر معمولی قابلیت کا
مالک ہو کہ اس عدالت کا جج ہو سکے۔ ہر جج ۶۵ سال کی عمر تک کام کر سکتا
ہے۔ اُسے صرف ثابت شدہ بداعمالی یا نالایقی کی بناء پر برطرف کیا جا سکتا ہے۔
برطرفی کے لئے ضروری ہے کہ پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے حاضر اور ووٹ
دینے والے ممبروں کی دو تہائی اکثریت صدر جمہوریہ کے سامنے ایک ایڈریس
پیش کرے۔ سپریم کورٹ کا ریٹائرڈ جج ہندیونین کی کسی عدالت

میں بطور وکیل کام نہ کر سکے گا۔

چیف جسٹس اور ججوں کے رہنے کے لئے مفت مکان ملیں گے چیف جسٹس کو ۵ ہزار اور دوسرے ججوں کو ۴ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ ملے گی۔ مگر کسی جج کی تنخواہ اور رخصت یا پنشن کے حقوق میں اُس کی تقرری کے بعد کوئی ایسی تبدیلی نہ کی جائے گی جس سے اس کا نقصان ہو۔

کام زیادہ ہونے کی صورت میں عارضی (Ad-hoc) اور زاید جج (Additional Judge) معہ ججوں کے صدر جمہوریہ کی منظوری سے مقرر کر سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اُن میں وہ تمام شرطیں موجود ہوں کہ جو ایک جج میں ہونی چاہئیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرح ہند یونین میں بھی ریٹائرڈ ججوں کو صدر جمہوریہ کی منظوری سے چیف جسٹس مقرر کر سکتا ہے۔

چیف جسٹس کی عدم موجودگی میں صدر سپریم کورٹ کے کسی جج کو قائم مقام چیف جسٹس مقرر کر سکتا ہے۔ بالعموم سپریم کورٹ کے اجلاس دہلی ہی میں ہوں گے۔ مگر صدر کی منظوری سے چیف جسٹس دوسری جگہوں پر بھی اس کے اجلاس طلب کر سکتا ہے۔

سپریم کورٹ کو بہت زیادہ وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ دستور کی آخری تشریح اور تعبیر (Final Interpretation) یہی کرتی ہے سول (Civil) مقدموں میں یہی آخری عدالت اپیل ہے۔ فوجداری مقدموں میں بھی یہ اپنے یہاں اپیل کرنے کی خاص اجازت دے سکتی ہے تیز شدہ مقدموں میں اسے اپیل سننے کا اختیار حاصل ہے۔ اس کے علاوہ یہ توہین عدالت (Contempt of Court) کا مقدمہ بھی چلا سکتی ہے۔

اگر مرکزی یا یونین حکومت اور کسی ریاستی حکومت یا ریاستوں کے درمیان

کسی دستوری (Constitutional) مسئلہ پر اختلاف ہو تو سپریم کورٹ کو اس اختلافی مسئلے پر ابتدائی اختیار سماعت حاصل ہے اور اس کے فیصلہ کے مطابق یہ حکومتیں عمل کریں گی۔

سپریم کورٹ کو دستوری (Constitutional) سول (Civil) اور فوجداری مقدمات میں اپیل سننے کا اختیار حاصل ہے۔ دستوری مسئلوں کی اپیل اس عدالت میں اس وقت کی جا سکتی ہے کہ جب کوئی ہائی کورٹ اس کی تصدیق کر دے کہ اس خاص مسئلہ میں کوئی اہم قانونی پیچیدگی پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ سپریم کورٹ محسوس کرے کہ کسی مسئلہ میں قانونی پیچیدگی پائی جاتی ہے تو وہ اپیل کرنے کی خاص اجازت دے سکتی ہے۔ ہائی کورٹ کی اس تصدیق کے بعد کم سے کم ۲۰ ہزار روپیہ کی مالیت کا مقدمہ دائر کیا گیا ہے۔ سول مقدموں کی کورٹ میں اپیل کی جا سکے گی۔

فوجداری مقدموں کی اپیل سپریم کورٹ میں اس وقت کی جا سکتی ہے کہ جب ہائی کورٹ نے اپیل پر مجرم کی بریت (acquittal) کے فیصلہ کو بدل دیا ہو اور اُسے سزائے موت دیدی ہو یا کسی ماتحت عدالت سے مقدمہ خود اپنے یہاں لے لیا ہو اور مجرم کو سزائے موت دیدی ہو یا اس کی تصدیق کر دی ہو کہ اس مقدمہ کی اپیل سپریم کورٹ میں کی جا سکتی ہے۔

اس کے علاوہ صدر جمہوریہ کسی بھی اہم دستوری (Constitutional) مقدمہ کے بارے میں سپریم کورٹ سے مشورہ کر سکتا ہے۔

صدر جمہوریہ کی منظوری اور پارلیمنٹ کی بنائی ہوئی دفعات کے ماتحت سپریم کورٹ اپنے طریقۂ کار کے لئے ضابطے بنا سکتی ہے۔ فیصلہ ججوں کی کثرت رائے سے کیا جاویگا۔ ہر جج کو اختلافی فیصلہ دینے کا بھی حق حاصل ہے۔

اس عدالت کے فیصلوں کی پابندی ہند یونین کی تمام عدالتوں کو کرنی ہوگی۔ اس کی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے دستور نے چیف جسٹس، ججوں اور جملہ اسٹاف کی تنخواہوں اور پنشنوں کو پارلیمنٹ کے ووٹ سے مستثنیٰ رکھا ہے۔

ہائی کورٹ High Court

دستور کی رو سے ہر ریاست میں ایک ہائی کورٹ ہوگا۔ ججوں کی تعداد کا فیصلہ صدر جمہوریہ کرے گا۔ چیف جسٹس کا تقرر صدر جمہوریہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس اور ریاست متعلقہ کے گورنر کے مشورہ سے کرے گا۔ دوسرے ججوں کے تقرر میں وہ ہائی کورٹ متعلقہ کے چیف جسٹس سے مشورہ کریگا۔ ۶۵ سال کی عمر پر پہونچنے کے بعد جج ریٹائر ہو جائیں گے۔

ہند یونین کا ہر وہ شہری ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا جاسکتا ہے کہ جو دس سال تک کسی جوڈیشل عہدہ پر رہ چکا ہو یا کسی ہائی کورٹ کا ایڈوکیٹ اس مدت تک رہ چکا ہو۔

ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کو چار ہزار ماہانہ اور دوسرے ججوں کو ساڑھے تین ہزار روپیہ ماہانہ تنخواہ ملے گی۔ اور اس کے علاوہ وہ الاؤنس ملیں گے جو صدر جمہوریہ طے کرے۔ عہدے کی مستقلی کو برقرار رکھنے کے لئے دستور میں یہ بات صاف کہدی گئی ہے کہ تقرر کے بعد تنخواہ، یا الاؤنس یا کسی حق میں کسی قسم کی تبدیلی اس طرح نہیں کی جائے گی کہ ججوں کو کسی قسم کا نقصان پہونچے۔

ہائی کورٹ ریاست کی سب سے بڑی عدالت ہے۔ دستور اور مجلس قانون ساز کے بنائے ہوئے قوانین کے ماتحت ہائی کورٹوں کو

سابقہ اختیارات حاصل ہیں۔ مالگزاری کے مقدمات کے بارے میں ان کو ابتدائی حق سماعت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ ان کو بنیادی حقوق کے جاری کرنے کے لئے احکام جاری کرنا یا ماتحت عدالتوں پر نگرانی کرنے اور ان سے اپنے یہاں مقدمے منتقل کرلینے کے اختیارات حاصل ہیں۔ صرف پارلیمنٹ ہی ان کے اختیارات کم کرسکتی ہے۔ ریاستی مجلس یا کونسل کو اس کا حق حاصل نہیں۔

پبلک سروس کمیشن

دستور نے کوشش کی ہے کہ سرکاری ملازمتوں میں ہر فرقہ اور گروہ کے قابل ترین افراد آسکیں اس لئے سرکاری ملازموں کے لئے ایسے حقوق اختیارات اور تقرر کے قاعدے کہ جن میں تنخواہیں اور الاؤنس بھی شامل ہیں رکھے ہیں کہ کسی شخص کو محض مذہب، فرقہ یا ذات یا رنگ کی بنا پر سرکاری ملازمت سے محروم نہ کیا جائے۔ چونکہ اچھوت اور قبیلے تعلیمی اور مختلف اعتباروں سے بہت پست اور پس ماندہ ہیں اسلئے ان کے لئے سرکاری ملازمتوں کا کچھ حصہ Reserve کردیا گیا ہے۔

ہر جمہوری ملک کی طرح جمہوریہ ہند میں بھی جملہ سرکاری ملازمتوں پر تقرر پبلک سروس کمیشن کرے گا۔ مرکزی ملازمتوں کے لئے یونین پبلک سروس کمیشن اور ریاستی ملازمتوں کے تقرر کے لئے ہر ریاست میں ریاستی پبلک سروس کمیشن ہوگا۔ یہ کمیشن مقابلے کے امتحانات منعقد کرائیں گے اور اس میں سب سے زیادہ تمیز پانے والے امیدواروں کے تقرر کی سفارش مرکزی یا ریاستی حکومت سے کریں گے تاکہ اس طرح سے قابل ترین افراد

محض قابلیت کی بنا پر سرکاری ملازمتوں میں آسکیں اور سرکاری ملازمتیں سیاسی جماعتوں کے اثر سے بالکل علیحدہ رہیں۔

سرکاری ملازمین کی بھرتی، ترقی اور اس قسم کے جملہ مسئلے پبلک سروس کمیشن ہی کے مشورہ سے طے کئے جائیں گے۔

یونین پبلک سروس کمیشن کا تقرر صدر جمہوریہ اور ریاستی پبلک سروس کمیشن کا تقرر گورنر کرے گا۔ ان کمیشنوں کا خرچ کہ جن میں ممبران اور صدر کی تنخواہیں اور الاؤنس شامل ہونگے واجب الادا رقم سے ادا کیا جائے گا۔

کمیشن کے ممبروں کو ثابت شدہ بداعمالی (Misbehaviour) پر صدر عہدے سے برطرف کرسکتا ہے۔